خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

سسپنس ڈائجسٹ

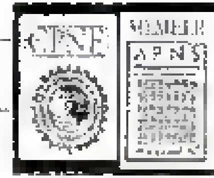
ستمبر 2014

نگران اعلیٰ
معراج رسول

طاہر جاوید مغل
کے قلم سے نئی داستان ستاروں پہ کمند
اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیں



جلد 44 • شمارہ 08 اگست 2014 • زرسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: (021)35895313 فیکس (021)35802551 E-mail:jdpgroup@hotmail.com



پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

آزادی

وقت نے بہت سے دشمنوں کو دوست بنایا ہے اور بہت سے دوستوں کو دشمن۔ سیاسی اور اجتماعی حکمتِ عملی کے تقاضے حالات کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ سیاسی اور اجتماعی حکمتِ عملی تو کیا، خود کائنات ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے۔ یونان کے عظیم ترین فلسفی ہرقلیطاس نے کہا ہے کہ آپ ایک دریا میں دوبار پاؤں نہیں ڈال سکتے۔ ہرقلیطاس نے جو بات کہی ہے وہ اپنی جگہ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ آپ دریا میں ایک بار بھی پاؤں نہیں ڈال سکتے۔ اس لیے کہ آپ جس لمحے دریا میں پاؤں ڈال رہے ہوں گے، اس لمحے کے لاکھویں حصے میں دریا یکسر بدل چکا ہوگا۔

آج کا دشمن آنے والی کل کا بہترین دوست اور آج کا دوست آنے والی کل کا بدترین دشمن ثابت ہوسکتا ہے۔ جو لوگ حقیقت کو جامد، وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، ایک ٹھہرا ہوا پانی سمجھتے ہیں، ان کی رگوں میں جوہڑ تے ہیں اور ان کے سانس زندگی کی زندگی پر، ہر فضا میں زہر پھیلاتے ہیں۔

ہمارے عہد کی دشمن ترین قومیں آج ایک دوسرے سے افہام وتفہیم کی دانشمندانہ حالت میں گفتگو کر رہی ہیں۔ تاریخ سیاست کے وقتی رویوں سے کہیں بڑی حقیقت ہے۔ تاریخ عظیم اور جلیل وقت کی نمائندگی کرتی ہے اور تاریخ کے حساب سے پچاس ساٹھ برس لمحوں کے کھٹول سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ قوموں کو تاریخ کا اور تاریخ کی خلاق حرکت کا پوری طرح احترام کرنا چاہیے اور اس کی عظمت کو سلام کرنا چاہیے...... مؤدبانہ سلام۔ جو قومیں تاریخ کے شعور کا ثبوت دینے میں ہچکچاہٹ سے کام لیں گی، وہ اپنے قتل نامے کے ''محضر'' پر مہر ثبت کریں گی۔ زندگی کی تمام حقیقتوں کو نظرانداز کیا جاسکتا ہے لیکن تاریخ، پُرجلال تاریخ کے تقاضوں کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ تاریخ کے تقاضوں کو نظرانداز کرنے کی جو بھیانک سزا بھگتنی پڑتی ہے، اسے ہم میں سے بہت سے لوگ جانتے ہیں۔

پاکستان اور ہندوستان گزشتہ کئی برسوں سے باہمی دشمنی کو اپنا اخلاقی اور سیاسی فرض سمجھتے رہے ہیں۔ تاریخ سے مخول کرنا ان کی عادت بن چکا ہے۔ ہمیں اپنے نقطۂ نظر کے صحیح ہونے پر ہرگز کوئی اصرار نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان دونوں کی باہمی دشمنی ہی ان دونوں کے پیچیدہ ترین مسئلوں کا حل ہو لیکن ہم آپ سے ایک سوال کرنا چاہتے ہیں اور وہ سوال یہ ہے کہ کیا آپ دونوں کی باہمی دشمنی نے آپ کے پیچیدہ ترین مسئلوں کو حل کیا ہے یا انہیں اور پیچیدہ تر بنا دیا ہے۔ اگر آپ ہمارے اس سوال کا جواب دینے سے گریز کرتے ہیں تو پھر ہمیں اپنے اس سوال کا خود ہی جواب دینا ہوگا اور وہ جواب یہ ہے کہ آپ ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہیں بلکہ دردناک حد تک خود اپنے دشمن ہیں، آپ دونوں اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے جس سمت میں چلتے اور آگے بڑھتے رہے ہیں اس سمت کی ہوا میں آپ کے سانسوں کے لیے زہر ہی زہر ہے۔

سمت کے لفظ پر خیال آیا کہ نفرت اور خون ریز عداوت اور تباہ کن خیالوں اور رویوں کا سارا کھیل شمال کے آسمان کے نیچے اور شمال کی زمین کے اوپر کھیلا جاتا رہا ہے۔ دوسری سمتوں کا عیب وہنر تو بس یہ تھا کہ وہ تھیں اور یہ ہے کہ وہ ہیں۔ ان سمتوں کو یہ بات سن کر ہرگز یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ان کی ''اہمیت'' کو نظرانداز کیا جارہا ہے، یہ تو ایک اور ہی بات ہے جو نہایت اذیت کے ساتھ کہی جارہی ہے۔

آسمان شام کے پرندے شمال کی طرف پرواز کر رہے ہیں اور معراج رسول اور میں اسلام آباد، دلی، لاہور اور لکھنؤ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آخر ان پرندوں کے پروبال پر کیا گزرتی ہے؟ ہمیں بتایا جانا چاہیے کہ آخر کیا گزرتی ہے ان پرندوں کے پروبال پر اور ان کے ساتھ دوسری سمتوں کی طرف پرواز کرنے والے پرندوں کے پروبال پر؟

ہم بہت سوچتے ہیں مگر کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ ہمارے بزرگوں نے انگریزی سامراج کی پتھر یلی دھاندلی سے آخر کیوں ٹکر لی تھی۔ انہوں نے اس سامراج سے آزادی حاصل کرنے کے لیے کیوں اپنا لہو بہایا تھا، کیوں اذیتیں اٹھائی تھیں اور کیوں عذاب بھگتے تھے، کیا یہ وہی آزادی تھی جس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں؟

آپ کے خط

محترم قارئین

السلام علیکم!

اگست 2014ء کا دلچسپ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ مہینا ایک عرصے سے ہمارا امتیاز، ہمارا فخر ہے۔۔۔ جب امیدوں کے گلستان میں رحمتوں کی بارش برسی اور بے شمار قربانیوں کے نتیجے میں اللہ رب العزت نے پاک سرزمین کی یہ کائنات مسلمانوں کو عنایت کی۔ جو آنے والی نسلوں کے محفوظ مستقبل کی ضامن ہے لیکن آج نئی اور پرانی دونوں نسلیں کیسی تفریق اور افراتفری کا شکار ہیں، جس کی کوئی وجہ ہے، نہ مقصد۔۔۔ بے بنیاد باتوں پر ماضی کے ساتھ ساتھ حال اور مستقبل بھی داؤ پر لگا ہوا ہے۔۔۔ اپنوں کے ہاتھوں اپنوں کا خون قیامت سے بڑی قیامت ہے۔ اللہ اس مملکت خداداد کو ہمیشہ اپنی حفظ وامان میں رکھے اور جانے والی نسلوں کی قربانیاں آنے والی نسلوں کے مستقبل کو محفوظ اور روشن کردیں (الٰہی آمین)۔ اس پرچے کی تزئین و ترتیب کے دوران رمضان المبارک کے خوش گوار لمحات بھی ساتھ ساتھ گزر رہے ہیں، تمام اہالیان وطن کو ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشن کی جانب سے عید کی ڈھیروں مبارک باد قبول ہو۔۔۔ ان لمحات میں بہت سے لوگ ہماری توجہ کے منتظر ہیں، ان خوشیوں پر ان کا بھی حق ہے۔۔۔ جن کا خیال رکھ کر ہمیں انسان ہونے کا حق اور انسانیت کا فرض ادا کرتے رہنا چاہیے۔ آج کل مختلف چینلز پر انعامات کی برسات پر مشتمل پروگرامز کی بھرمار ہے، جن میں ایک دوڑ۔۔۔ اور مقابلہ بازی کا رجحان غالب ہے۔۔۔ مانا کہ یہ اشتہار بازی کا زمانہ ہے لیکن کیا ہی اچھا ہوتا اگر ان میں کوئی ایک سگمنٹ ایسا بھی دکھ لیا جاتا جس سے حقیقی ضرورت مندوں کی ضرورت بھی انتہائی مہذب انداز میں پوری ہو جاتی۔۔۔ زندگی کے کئی شعبے ہماری توجہ کے منتظر ہیں جن میں ذہین طالب علموں کی راہ میں اعلیٰ حصول تعلیم کے سلسلے میں معاشی رکاوٹیں۔۔۔ کئی غریب گھرانوں کی بچیاں جہیز کی آس میں بیٹھی ہیں۔۔۔ کتنے ہی ایسے سفید پوش بیمار انسان جو اپنے کنبے کے واحد کفیل بھی ہیں مگر پیسے کی قلت انہیں اپنے علاج سے روکے ہوئے ہے۔۔۔ اگر اس جانب بھی تھوڑی سی محنت کرلی جاتی۔۔۔ انہیں بھی تلاش کرکے پروگرام میں شامل کرلیا جاتا تو ان پروگرامز کی افادیت میں اضافہ ہوسکتا تھا۔۔۔ اور کھیل ہی کھیل میں بہت سے لوگ اپنے حالات سے مقابلہ بھی کرجاتے۔۔۔ جبکہ اس سے یہ احساس بھی ہوجاتا کہ میڈیا صرف دوسروں کو ہی مسائل کی نشاندہی نہیں کرتا بلکہ خود بھی اس کارخیر میں ایک فعال کردار ادا کرتا ہے۔۔۔ اور جناب اب بادی ہے اپنے سندیسوں کی۔۔۔ جن کی مہکار ہر سو پھیلی ہوئی ہے۔۔۔ تو آیئے قدم بڑھایئے اپنی محفل کی جانب۔

☩ محمد شکیل حیدر واصو، جھنگ سے تشریف لائے ہیں ”اس بار سسپنس 17 تاریخ کو ملا۔ سرورق خوب صورت تھا۔ حنائی ہاتھ والی حسینہ گلاب کی مسحور کن خوشبو کے نشے میں مدہوش نظر آئیں۔ آپ کی طرف سے عید کی ایڈوانس مبارک باد بھی اچھی لگی۔ جون صاحب کی حکمت عملی بھی پسند آئی۔ کرسیٔ صدارت پر محمد خواجہ براجمان نظر آئے۔ حساب دوستاں اپنے اختتام کو پہنچی۔ آپ نے الیاس صاحب کو خراج تحسین پیش کرنے کا یہ اچھا سلسلہ شروع کیا ہے۔ معاہدہ کی صورت میں کاشف صاحب مغربی ادب سے اچھی سوغات لائے۔ زندہ لاش بھی ایک اچھی تحریر تھی۔ آنگن ٹیڑھا میں فرقان بھائی کی سادہ لوحی پہ بہت ہنسی آئی۔ انہوں نے کسی اور کی پراپرٹی پر لاکھوں روپے خرچ کردیے، حیرت ہے۔ کوکھ کا دکھ ایک مختصر مگر جھنجوڑنے والی کہانی تھی، کہانی نے کافی دیر اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ فرار اور لاوا بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ اسلامی سلسلے میں حکیم الاولیا ایک انتہائی معیاری تحریر تھی۔ ماں کی خدمت کے بدلے حکیم صاحب کو خضر دینی اور دنیاوی تعلیم دیتے رہے۔ اس بار مجھے سب سے زیادہ جو کہانی پسند آئی، وہ ہے چل جھوٹی۔ منظر صاحب آپ کو میری طرف سے بہت مبارک ہو۔ یہ کہانی ہمارے معاشرے کی آئینہ دار تھی۔ راحیلہ نے اپنے خاوند سے جھوٹ بولا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ اس کی محبت میں کتنا آگے جاسکتا ہے لیکن آخر میں یہ داؤ کھلا وہ کیا اڑیا بے چارہ نابینا تھا۔ ماروی کا سفر بھی ابھی جاری ہے۔ مغل صاحب کی ستاروں پر کمند کا آغاز بہت زبردست ہے۔ عادل اور شہزادی آپس میں ایک ہوسکیں گے یا نہیں، اس کے لیے عادل کو آگ کے دریا سے ڈوب کر جانا پڑے گا۔ محفل شعر و سخن میں سوہائی لاہور کا شعر بہت پسند آیا۔ تمام دوستوں کو عید کی خوشیاں مبارک ہوں۔“

☩ رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن کراچی سے لکھتے ہیں ”آکاش کے جگمگاتے ستاروں کے ہمراہ فیروزی ڈریس، گھنیری پلکیں، سندر کومل حنائی ہاتھ کی زینت محبت کے جذبات کا عکاس من پسند سرخ گلاب ذاکر جی کی کمال مصوری کا حسین شاہکار۔ کہانیوں کی فہرست دیدہ زیب۔ ملک خداداد کی حالت زار پر نوحہ کناں جون ایلیا کا انشائیہ ”حکمت عملی“ سیاست مداریوں کے لیے مقام عبرت لفظ لفظ، سطر سطر حقیقت پر مبنی۔۔۔ اداریے میں ذاتی تبصروں اور نوک جھوک کو حذف کرنے کی نوید سنا کے باذوق قارئین کے دل جیت لیے۔ سب کی عزتیں محفوظ کرنے پر ادارہ کو زبردست خراج تحسین۔ محفل کو مکمل ادبی رنگ دینے پر خصوصی شکریہ۔ قارئین کو ایڈوانس عید مبارک۔ ملک سعید دعا ہے اللہ پاک آپ کو امتحان میں بہترین پوزیشن عطا فرمائے، آمین۔ محفل شعر و سخن میں رمضان پاشا کا انتخاب پسند آیا۔ کہانیوں کی ابتدا محبوب تحریر ”حساب دوستاں“ کے دوسرے اور آخری حصے سے کی، مالک کائنات کے حضور میرے لب دعا گو مرحوم الیاس سیتاپوری کو کروٹ کروٹ جنت نصیب ہو۔ محبتوں کے نقیب، محبتوں کے لکھاری، محبوب فیورٹ قلم کار دعالی جناب طاہر جاوید مغل کی ستاروں پر کمند سسپنس کی مقبولیت کے نئے ریکارڈ بنائے گی۔ شوخ و چنچل کاشف زبیر کی معاہدہ بھی خوب رہی۔ سلیم انور کی زندہ لاش دلچسپ رہی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کوکھ کا دکھ ملول کرگئی۔ تصوف کی خوب صورت لڑی

کا سچا موتی نگینہ ”حکیم الاولیا“ ضیا تسنیم بلگرامی کا تحفہ خاص رہی۔ طویل وقفے کے بعد ڈاکٹر ساجد امجد خوب صورتی سے آخری صفحات پر جلوہ گر ہوئے طوفانی لہروں میں نبرد آزما ایک دوشیزہ کی ”آب طلب“ سسپنس کے آخری صفحات کا خوش رنگ جھومر سسپنس کو چار چاند لگا گئی کستوری لگا کے۔۔۔“

☩ اشوک کمار، میرپور خاص سے محفل میں شریک ہیں ”17 جون کو دلکش ٹائٹل اور عید کی مبارک باد کے ساتھ اپنا ساتھی سسپنس ڈائجسٹ ملا۔ انشائیہ میں جون صاحب کی حکمتِ عملی پر عمل کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ اداریے نے اپنے خطرناک عزائم سے آگاہ کیا۔ بزم دوستاں پہ نظر پڑی تو ہم چکرا کے رہ گئے کیونکہ اس محفل میں تو خزاں کا موسم چھایا ہوا تھا۔ ایسی کایا پلٹ، پلیز کچھ نظر ثانی کریں۔ جناب اعجاز احمد راحیل کا محبتوں کے سفیر بنام مغل صاحب قابل داد ہے۔ اب اپنا سامنہ لے کر چلتے ہیں کہانیوں کی طرف، کیونکہ کچھ اور لکھنے کی اجازت جو نہیں۔ سب سے پہلے الیاس سیتاپوری کی حساب دوستاں نے حساب بے باق کیا۔ حق دار کو حق ملا اور لالچ بری بلا ہے کی حقیقت سامنے آئی۔ پھر آگے ستاروں پر کمند سے انصاف کیا، دل خوش کردیا طاہر جاوید مغل صاحب۔ اب ہماری تلاش ختم ہوئی۔ زبردست، عادل کے ساتھ ہمیں بھی بہت کچھ دیکھنا نصیب ہوگا۔ محی الدین نواب جی مقابلہ سخت شروع ہوگیا ہے آپ بھی ذرا تیز دوڑ لگائیں۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کوکھ کا دکھ نے بے حد اداس کردیا۔ باقر بدنصیب لے کر اس دنیا میں آیا، کوکھ میں تو ماں نے اس کو بچا لیا مگر اس ظالم دنیا سے نہ بچا سکی۔ چل جھوٹی، منظر امام صاحب کو تسلیم کرنے کو جی چاہتا ہے دیلڈن جی، راحیلہ نے جھوٹ بول کر اپنی اہمیت بڑھائی لیکن شوہر جی بھی کمال نکلے۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی آب طلب شاندار تحریر، ایک عجیب سے احساس سے ہمکنار کرگئی۔ درخشاں کے من کی پیاس بجھ نہ سکی۔ محفل شعر و سخن اپنے جوبن پر تھی۔“

☩ لیلیٰ، کراچی سے حاضر ہیں ”جولائی 2014ء کا سسپنس بروقت مل گیا۔ ہم سرورق دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بھئی ذاکر انکل نے ہمیں کہاں دیکھ لیا۔ حکمتِ عملی میں جون ایلیا صاحب نے بہت اچھی باتیں لکھیں۔ بہرحال ان پر عمل کرنا مشکل کام لگتا ہے۔ اداریہ دیکھ کر ہماری طبیعت ناساز ہوگئی۔ لو جی یہ کیا ایڈیٹر صاحب نے نوک جھوک پر بھی پابندی لگادی۔ اپنی محفل میں حاضر ہونے سے پہلے یہ شکوہ ضرور کروں گی۔ ہمیں پچھلے دو ماہ سے کیوں نظرانداز کیا جارہا ہے؟ محترم شاعر اعجاز احمد راحیل کے طاہر جاوید مغل کے بارے میں لکھے گئے الفاظ ہمیں بے حد پسند آئے۔ حساب دوستاں سے استفادہ کیا۔ یونس اور قاضی اپنے انجام کو پہنچے۔ طاہر جاوید مغل کی ستاروں پر کمند بہت ہی زبردست تحریر ہے۔ آنے والے وقت میں یہ ایک یادگار تحریر ثابت ہوگی۔ مرزا امجد بیگ نے اپنے ٹھوس دلائل سے قاضی وحید جیسے شاطر مجرم کو بے نقاب کیا۔ زندہ لاش پڑھ کر اندازہ ہوگیا۔ انسان اپنی زندگی میں کچھ کام ایسے بھی کرجاتا ہے جس کے بعد سوائے پچھتانے کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ آخری صفحات پر آب طلب بھی ڈاکٹر ساجد امجد کی خوب صورت تحریر پڑھنے کو ملی۔ درخشاں کے حالات زندگی پر افسوس ہوا۔ ماروی بھی اس دفعہ کافی تیز رہی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کوکھ کا دکھ حقیقت کے قریب تر لگی۔ ماں کا دل واقعی بہت نرم ہوتا ہے وہ اپنی اولاد کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔ بابر نعیم کی لاوا بہت بیسٹ تحریر ہے۔ واقعی محبت کرنے والوں کو اظہار بھی کرنا چاہیے۔“

☩ بشریٰ افضل، بہاولپور سے تبصرہ کررہی ہیں ”21 جون کو سسپنس کافی لیٹ ملا۔ میرے خوابوں میں جو آئے آکے مجھے بھول تھا گیا، یہ سوچ ہے مصنف نازک کی۔ ہماری طرف سے پیشگی عید مبارک۔ انشائیہ پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ اپنی محفل میں انٹری دی۔ یہ کیا، مابدولت نہ ہی محفل میں اور نہ ہی ویٹنگ لسٹ میں! انکل ڈاک کو کوستے ہوئے تبصروں کی جانب متوجہ ہوئے۔ انکل جی بجلی کی لوڈشیڈنگ گرمی نے تو مت ماردی ہے انسان کی۔ محمد خواجہ کو کرسی صدارت پر پایا، واقعی تبصرہ قابل تعریف تھا۔ اسی لیے قرعہ فال آپ کے نام نکلا مبارک ہو۔ مہرین ناز صاحبہ عمرے کی سعادت مبارک ہو۔ سسپنس ہمارے دکھ سکھ کا ساتھی ہے یہ جب آتا ہے تو پریشانیاں تو دو گیارہ ہوجاتی ہیں۔ محفل کے لوگ ایک خاندان کی طرح ہیں کہ اپنے ساتھی کی پریشانی سے خود بھی پریشان ہوجاتے ہیں۔ محبتوں کے سفیر اعجاز احمد کا محبت نامہ دل کی تاروں کو چھو گیا۔ یہ ان کا طاہر جاوید مغل کے لیے محبت کا انداز ہی تو ہے۔ چل جھوٹی، منظر امام کی مختصر مگر جامع تحریر تھی۔ اس کا اینڈ خوب صورت انداز میں ہوا۔ لاوا محبت کا لاوا، اکیاون سال سات مہینے اور گیارہ دن بعد پھٹ نکلا اور وہ مہرین کے پاس اظہار کے لیے پہنچ گیا۔“

☩ ساہیوال سے اعجاز احمد راحیل کی خوشی ”ماہ جولائی کا خوش رنگ شمارہ مجھے میرے اپنوں نے سائن کرکے گفٹ کیا جو کہ مجھے بے انتہا خوشیاں دے گیا۔ سرورق پر محبوبہ دلنواز کے ہاتھ اور ہاتھوں میں گلاب کا پھول قابل توجہ ٹھہرے۔ فہرست کی ترتیب کو سراہتے ہوئے انشائیہ میں جون ایلیا جی کی حکمت عملی پڑھ کر ان کے عمیق مشاہدے کا قائل ہونا پڑا۔ اداریہ ہمارے حکمرانوں کی بے حسی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ میں انچارج محفل آپ کے خط کا تہ دل سے مشکور ہوں کہ انہوں نے محترم طاہر جاوید مغل صاحب کے حوالے سے میری لکھی گئی تحریر محبتوں کے سفیر کو نمایاں جگہ دی اور میرے احساسات وجذبات کی قدر کی۔ زندہ دلوں کے شہر خوب صورت شخصیت اور دل کے مالک طاہر جاوید مغل کی نیو اسٹوری ستاروں پر کمند کی پہلی قسط ہی دل خوش کرگئی۔ عادل اور شہزادی کی لو اسٹوری کہانی کو بلندیوں پہ لے جائے گی۔ سرمد کا بھید بھرا کردار متاثر کن رہا۔ محی الدین نواب صاحب اب ماروی کو کچھ بہتری کی طرف لارہے ہیں، امراؤ اس دفعہ فل ایکشن میں نظر آیا۔ حساب دوستاں کا دوسرا حصہ بیسٹ رہا۔ دولت کی ہوس رکھنے والے کا انجام یونس اور قاضی لبیب جیدی کی طرح ہی ہوتا ہے۔ لیٹ کی سچائی رنگ لائی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی آب طلب ایک شاہکار اسٹوری ہے۔ بلاشبہ انسان کی سبھی خواہش کبھی پوری نہیں ہوتیں، قسمت کے کھیل نرالے ہوتے ہیں کچھ انسان دریا کے کنارے پہ رہ کر بھی پیاسے رہ جاتے ہیں۔ کوکھ کا دکھ اک ماں کے احساس وجذبات کی صحیح

عکاسی کی گئی ہے، ویلڈن سید صاحب۔"

✠ مہرین ناز، حیدرآباد سے شریکِ محفل ہیں "اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی امان میں رکھے۔ آج کل کے دور میں اس سے بہتر کوئی دعا نہیں۔ بہرحال رمضان المبارک کا بابرکت ماہ ایک بار پھر ہم سب کے درمیان ہے۔ بہت خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو مکمل صحت کے ساتھ اس ماہ کو پائیں گے۔ ماہِ جولائی کا شمارہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ گرمیوں کے طویل دنوں میں یہ ہمارا بہترین وقت گزار ہے۔ سرورق پر ایڈوانس میں عید کی مبارک باد مل گئی ہے۔ انشائیہ میں تین قسم کی حکمتِ عملی سامنے لائی گئی، کاش ہم اور ہمارے حکمران اس پر عمل پیرا ہوتے۔ اداریہ میں پاکستان کی تصویر پیش کی گئی، روتا ہے دل اس تصویر کو دیکھ کر۔ اس محفل میں سب سے نمایاں چیز مجبوں کے سفیر کے نام سے شاعر اعجاز احمد راحیل کے خیالات تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مغل صاحب کی ستاروں پر کمند پڑھی، زبردست تعارفی قسط ہی بہت کچھ عیاں کرگئی۔ عادل کو سرمد صاحب ایک نئی دنیا میں لے کر جا رہے ہیں۔ دوسری کہانی الیاس سیتاپوری کی حسابِ دوستاں پڑھی۔ لالچی اور بے حس لوگوں کا یہی انجام ہوتا ہے جو یونس کا ہوا۔ لیث کو اپنا مقام مل گیا۔ محی الدین نواب کی ماروی اپنی ڈگر پر جاری و ساری ہے۔ منظر امام صاحب کی چل جھوٹی لبوں پر مسکراہٹیں بکھیرنے میں کامیاب رہی۔ میاں بیوی کے رشتے میں چھوٹی موٹی تبدیلیاں ہونی چاہئیں۔ کاشف زبیر کی معاہدہ، جیول کے ہوش ٹھکانے لگانے میں کامیاب رہی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کوکو کا دکھ ہمیں بھی اندر تک دکھی کرگئی۔ باقر کوکو کے درد لے کر لحد میں اتر گیا۔ مرزا امجد بیگ صاحب اس بار آنگن ٹیڑھا لے کر آئے۔ جائداد کی ہوس انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی آب طلب نے کافی متاثر کیا۔ واقعی نصیب کا لکھا کوئی نہیں ٹال سکتا۔ درخشاں پیاسی کی پیاسی ہی رہی۔ محفلِ شعروسخن اچھی رہی، تمام انتخابات دل کو چھو گئے۔"

✠ جنید نواز، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور سے تشریف لائے ہیں "جولائی کا شمارہ 17 تاریخ کو ہی مل گیا۔ سرورق کی حسینہ پھول ہاتھ میں لیے نہ جانے کس کا انتظار کر رہی تھی۔ جون ایلیا کی حکمتِ عملی پڑھی لیکن ہمیشہ کی طرح سمجھ بالکل نہیں آئی۔ پھر ہم پہنچے محفلِ دوستاں میں۔ ارے بھئی واہ! محمد خواجہ اور کرسیِ صدارت۔ تبصرہ بھی تو اتنا پیارا اور دلکش ہے لیکن افسوس کہ کچھ پرانے تبصرہ نگار جیسے تفسیر عباس، ماہا ایمان، طاہرہ یاسمین غائب ہیں۔ خیریت تو ہے نا۔ سب سے پہلے ماروی پڑھی، اس لیے نہیں کہ ماروی ہمیں پسند ہے بلکہ اس لیے کہ ماروی کا مصنف ہمارا محبوب مصنف ہے۔ ویسے ماروی کہانی بہت اچھی جارہی ہے۔ خدا کرے آخر میں ماروی صرف مراد کو ہی ملے۔ اس کے بعد کاشف صاحب کی معاہدہ پڑھی۔ بے حد پسند آئی۔ حسابِ دوستاں میں عثمان لیث کو ہی ملی، بہت اچھا اختتام تھا۔ ہمارے پیارے اور ہردل عزیز مصنف کی ستاروں پر کمند کی پہلی قسط بہت جاندار اور شاندار رہی۔ طاہر صاحب ستاروں پر کمند ڈال کر ہی رہیں گے۔ بابر نعیم کی لاوا ایک خوب صورت، مختصر لیکن اداس کر دینے والی تحریر تھی۔ منظر امام نے چل جھوٹی میں خوب ہنسایا۔ آب طلب کچھ خاص نہیں لگی۔ مریم کے خان بہت عرصے بعد مستقل لے کر آئیں۔ ان کی باقی کہانیوں کی طرح یہ بھی بہت اچھی لگی۔ محفلِ شعروسخن میں جنید احمد ملک، محمد امجد ریاض، تبسم فاطمہ، تفسیر عباس، رضوان تنولی، اشوک کمار، عرفان احمد عاجز اور سوہا جی کے انتخاب بہت اچھے تھے۔ سسپنس کی پوری ٹیم کے لیے نیک خواہشات اور مزید کامیابیوں کے لیے دل سے دعا۔"

✠ زویا اعجاز، لاہور سے تشریف لائی ہیں "جان لیوا گرمی، مہنگائی کے زوردن انجکس، لوڈشیڈنگ سے بے حال اور سیاستدانوں کے نت نئے ٹوپی ڈراموں سے نبرد آزما اہلِ وطن کو رمضان کی صورت میں ملنے والی واحد خوشی و رحمت بے حد مبارک ہو۔ سسپنس ڈائجسٹ نے اس بار ہمارے ہاتھوں کو 17 جون کو شرف بخشا۔ ٹائٹل پر قمر و کباب کے سوا کچھ بھی لائقِ دید نہ تھا۔ شربت فولاد کو اچنتی نگاہ سے دیکھ کر فہرست پر نظر دوڑائی جو ایک نئے انداز میں خوب صورت جیب دکھلا رہی تھی۔ جون ایلیا کی بیان شدہ حکمتِ عملی سے ہم قطعی متفق نہیں۔ حقیقی مسائل کا حل صرف اور صرف قرآن و سنت میں پوشیدہ ہے۔ جسے ہم نے طاقِ نسیاں کے حوالے کر رکھا ہے۔ اداریہ میں دی جانے والی بریکنگ نیوز نے دل گارڈن گارڈن کردیا۔ بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔ (دیر آید درست آید) اس تاخیر سے کیے گئے تاریخی فیصلے کی ہم غیر مشروط حمایت کا اعلان کرتے ہیں۔ حسابِ دوستاں میں لیث کی احمقانہ سادگی اور قاضی کی خباثت بہت سبق آموز تھی۔ ستاروں پر کمند ہمارے ہردلعزیز مغلِ اعظم کے شاہکار قلم سے ایک اور گوہرِ نایاب برآمد ہوا ہے۔ ماروی نے ناممکنات کے بیان کا ورلڈ ریکارڈ قائم کردیا ہے۔ ایک گاڑی بین الاقوامی مجرموں کو چشم زدن میں دھول چٹا دیتا ہے تو کہیں کوئی دوا جناس میں زندگی بخوبی گزار رہا ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد بہت فکر انگیز تحریر لائے ہیں۔ درخشاں کے ارمانوں کو اس کی والدہ کے غلط فیصلوں نے ذات پات اور احساسِ برتری کی بھینٹ چڑھا دیا۔ معاشرے کے دہرے معیار سے ہی درخشاں جیسے ذہنی مریض وجود میں آتے ہیں جو محبت نہ ملنے کا انتقام اپنی ہی ذات سے لیتے ہیں۔ کوکو کا دکھ میں باقر اور اس کی والدہ کے دکھ نے دل کو بہت ملول کیا۔ آنگن ٹیڑھا میں کچھ بھی نیا نہیں تھا۔ منظر امام کے کیا کہنے! دریا کو کوزے میں بند کرنا کوئی ان سے سیکھے۔ مترجم کہانیوں میں مسز اینڈ مسز کاشف زبیر خان بازی لے گئے۔ دونوں کہانیاں انتہائی سسنی خیز اور سطر سطر دلچسپی سمیٹے ہوئی تھیں۔ ویلڈن! لاوا نے کافی حیران کیا۔ مغربی تہذیب میں جہاں محبت لباس کی طرح بدلی جاتی ہے اکیاون سال تک قائم رہنے والی محبت کے لیے دل نے بے اختیار کہا۔ ہاؤ سویٹ! حکیم الاولیا میں نفس کی کارستانیاں دکھائی گئیں۔ کترنوں میں ہر سو رضوان تنولی کا نام چھایا رہا۔"

✠ طاہر الدین بیگ، میرپور خاص سے محفل کی زینت بنے ہیں "جولائی کا سسپنس سخت ترین گرمی اور لمبی لوڈشیڈنگ میں منظرِ عام پر آیا۔ سسپنس میں اس دفعہ کترنیں بہت ہی لاجواب رہیں۔ لاجواب کہانی تو شروع کی اور آخری کی بھی تھیں بلکہ بہت خوب تھیں۔ وکیل صاحب نے خوب کام

کیا اور آخر میں مجرم سامنے آگیا۔"

✠ مظہر سلیم، رحیم یار خان سے تشریف لائے ہیں "اس بار ہم نے سوچا کہ بس اب خط نہیں لکھا کریں گے۔ پھر یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ نہیں لکھیں گے تو کیسے رہ پائیں گے؟ دل آدھی ملاقات سے محرومی پر سراپا احتجاج ہوگیا۔۔۔ سو کاغذ قلم سنبھالا اور خط لکھنے بیٹھ گئے۔ جولائی کا شمارہ اٹھارہ جون کو ملا۔ سرورق اس دفعہ اچھا نہیں لگا۔ جون ایلیا کے انشائیہ اور آپ کے اداریے کے ذیل میں ہم اتنا کہیں گے کہ کوئی بھی طبقہ اس وقت تک زوال آشنا نہیں ہوتا جب تک اس میں ایک بھی زندہ احساس اور مثبت سوچ رکھنے والا ادیب موجود ہو۔ مسند نشین ہر سال بجٹ کے اعداد و شمار کی گرد اڑا کر آنکھوں کی بینائی معطل کر دیتے ہیں۔ اللہ پاک ان کو ہدایت دے۔ آمین۔ خطوط میں محمد خواجہ کا تبصرہ اعزازی قرار پایا۔ سب سے پہلے آخری صفحات کی کہانی ڈاکٹر ساجد امجد کی آب طلب پڑھی۔ محبت میں ناکامی پر ایسے رویے سامنے آتے ہیں۔ درخشاں کی خواہشات ماں کی جھوٹی انا اور دو غلے پن کی بھینٹ چڑھ گئیں، بہت اچھی کہانی تھی۔ ماروی میں ایک نئے کردار ڈاکٹر عدیلہ کی انٹری ہوئی۔ مجموعی طور پر کہانی بہت دلچسپ ہے، تاہم بعض جگہوں پر کافی باتیں ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ منظر امام کی کہانی "چل جھوٹی" مختصر مگر اچھی کہانی تھی۔ راحیلہ اور اس کے شوہر کے درمیان آنے والا شخص نابینا نہ ہوتا تو واقعات مختلف رخ اختیار کرتے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تحریر "کوکو کا دکھ" اس ماہ کی سب سے بہترین تحریر لگی۔ باقر کی بے وقت موت پہ ایک ماں بیٹے کی جدائی میں کرب و اذیت میں جتلا تھی۔ کہانی کے واقعات نے آنکھوں کے گوشے نم کردیے۔ الیاس سیتاپوری صاحب نے بے جا طوالت سے گریز کرتے ہوئے حسابِ دوستاں کو منطقی انجام تک پہنچایا۔ بہت تاثر انگیز کہانی تھی۔ اب بات کرتے ہیں ڈائجسٹ میں شامل ہونے والی نئی قسط وار کہانی "ستاروں پر کمند" کی۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی کہانی میں ایسا سحر ہوتا ہے کہ ہم خود کو گویا محبت نگر کا باسی سمجھنے لگتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ہر موسم کے رنگ ہوتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے کردار مسکراتے ہیں تو ہم بھی ہنس پڑتے ہیں۔ کردار پریشان ہوں تو ہم بھی مضطرب ہو جاتے ہیں۔ مغل صاحب قاری کو اور کردار کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ستاروں پر کمند پہلی قسط سے ہی جداگانہ پہچان بنانے میں کامیاب رہی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عادل، شہزادی کے حصول کے لیے تایا کو دیا گیا چیلنج پورا کرتا ہے یا نہیں۔"

✠ جنید احمد، کورنگی، کراچی سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "تقریباً 16 سال سے سسپنس کا خاموش قاری ہوں اور شاید حیات کے آخری پل تک خاموش ہی رہتا پھر شریکِ حیات کے ہمت دلانے پر سوچا خاموشی توڑ دوں۔ جولائی کا شمارہ 18 جون کو ملا۔ سرورق پر ایک بدذوق حسینہ گلاب کے پھول سے بیزاریت ظاہر کر رہی تھی۔ انشائیہ میں جون ایلیا کی حکمتِ عملی پر سر دھنتے ہوئے محفلِ دوستاں میں پہنچے۔ محمد خواجہ فرام کورنگی سرِفہرست تھے، واقعی بہت جاندار تبصرہ تھا۔ حسابِ دوستاں کا انجام توقع سے تھوڑا ہٹ کر ہوا۔ کاشف زبیر کی معاہدہ میں جیول تخت اور جان تو محنت کے بعد جہنم سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی ستاروں پر کمند نے بہت تیز رفتاری سے اسٹارٹ لیا ہے۔ پسِ زنداں کا آغاز بہت سلو تھا لیکن آخری قسط میں حیرت انگیز طور پر فاسٹ ہوگئی تھی۔ بہرحال عادل کے پاس وقت کم ہے اور چیلنج بہت بڑا ہے۔ اس پر صحیح تبصرہ کچھ عرصے بعد ہی ممکن ہوگا۔ آنگن ٹیڑھا میں بیگ صاحب حسبِ روایت بے گناہ کو قانون کے بے رحم شکنجے سے نجات دلانے میں کامیاب ہوئے۔ واقعی یہ قاضی جیسے لوگ ہی ہیں جن کی وجہ سے لوگوں کا ایک دوسرے سے اعتبار اٹھ رہا ہے۔ کوکو کا دکھ ڈاکٹر شیر شاہ صاحب کی شاندار تحریر تھی۔ محفلِ شعروسخن میں جنید احمد ملک کا انتخاب واقعی عمدہ تھا۔ دیگر کہانیوں میں فرار اور زندہ لاش اوسط درجے کی رہیں۔ لاوا مختصر پُراثر ثابت ہوئی۔ ضیا تسنیم بلگرامی نے اللہ تعالیٰ کے ایک خاص بندے کا ماجرا بیان کیا جو نہایت متاثر کن تھا۔ مریم کے خان کا خالص مغربی ماجرا سن کر افسوس ہوا۔ آخری صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کا نام دیکھ کر کئی امیدیں پروان چڑھ گئیں لیکن کہانی پڑھ کر مایوسی سی ہوئی بہرحال مجموعی طور پر رسالہ بہت اچھا رہا۔ میں سسپنس کی مزید کامیابیوں کے لیے دعاگو ہوں۔"

✠ ایم افضل کھرل، ننکانہ صاحب سے محفل میں چلے آرہے ہیں "ہمت کبھی نہ کبھی انسان کو اس کی منزل پر پہنچا ہی دیتی ہے۔ ماہِ جولائی کا تازہ ترین سسپنس ایک طویل انتظار کے بعد بیس تاریخ کو ہاتھوں کی زینت بنا۔ ٹائٹل پر حسینہ کروٹ کے بل سپنوں کے دیپ جلائے... ہوئے تھی۔ انشائیہ میں جون ایلیا سے ملاقات کی۔ ایلیا صاحب ایک اہم مسئلے عدم اعتماد کو نہایت خوب صورت پیرائے میں بیان فرما رہے تھے۔ خطوط کی بزم میں شامل خطوط پر نظر ڈالی تو اپنا تبصرہ شامل دیکھ کر اداس لبوں پر مسرت دوڑ گئی۔ کچھ نئے دوست اس بزم میں نظر آئے سب کو میری طرف سے خلوص بھرا اسلام۔ اس بار صدارت کی نشست محمد خواجہ کو سونپی گئی۔ سنبھل کر بیٹھیے بھائی صاحب گرمی کا درجہ حرارت بے حد شدید ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ چکر کھا کر گر جائیں۔ کہانیوں کا آغاز ستاروں پر کمند سے کیا جو عادل اور شہزادی کے درمیان گھوم رہی تھی۔ پہلی قسط ہی دل کے آنگن میں اتر گئی۔ مرزا امجد بیگ کی کہانی آنگن ٹیڑھا میں ایک ایسے انسانی حواس کو اجاگر کیا گیا ہے کہ دولت کی ہوس میں انسان کس قدر اندھا ہو جاتا ہے۔ زندہ لاش کچھ عجیب سی لگی۔ آخری صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد کی کہانی کی تعریف نہ کرنا خورشید کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ اس ماہ کی بیسٹ کہانی آب طلب اپنی مثال آپ تھی۔ درخشاں جب کوئی اپنا بچھڑتا ہے تو دل کا گلشن ویران سا ہو جاتا ہے لیکن ہمت زندگی کا دوسرا نام ہے۔ محفلِ شعروسخن میں محمد صفدر معاویہ، تبسم فاطمہ، تحسین سلطان، سوہا جی، گڑیا اور محمد جاوید عباسی کا انتخاب سب سے اعلیٰ تھا۔ تمام قارئین کو میری طرف سے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ایڈوانس عید مبارک ہو۔"

✠ رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں ”جولائی 2014ء کے سسپنس کا سرورق بہت ہی دلکش تھا۔ ادھ کھلے گلاب کے پھول سے عید مبارک کی شکل میں خوشبو نکلتے دکھایا، بہت اچھا لگا۔ اس بار فہرست کے تزئین کار نے قاری کو چکر میں ڈال دیا۔ ڈیزائن بہت خوب صورت تھا۔ جون صاحب کی حکمتِ عملی بھی خوب رہی۔ آپ کا اداریہ بہت نکھرا نکھرا تھا۔ شاعر اعجاز احمد راحیل کا خصوصی خط بہت خوب تھا۔ حسابِ دوستاں پوری داستان میں بوریت زیادہ تھی، سسپنس کم مگر اختتام بہت شاندار تھا۔ مگر دل میں ایک ملال رہ گیا کہ قاضی کو کوئی عبرت ناک سزا نہیں دی گئی۔ بہترین کہانی معاہدہ تھی۔ مغل صاحب کی رومانی کہانی ستاروں پر کمند تجسس اور سسپنس بھی شامل ہے۔ آثار بتا رہے ہیں کہ آگے بھی مزید تجسس اور سسپنس کی مقدار بڑھنے والی ہے۔ زندہ لاش سراغ رسانی کے سلسلے کی یہ کہانی کچھ منفرد دانائی اور اچھی لگی۔ آنگن ٹیڑھا کہانی بہت عمدہ تھی، عدالتی کارروائی میں خوب مزہ آیا۔ کوکھ کا دکھ ڈاکٹر صاحب کا انداز بہت سیدھا سادہ ہوا کرتا ہے جو مجھے بہت پسند ہے۔ ماردی میں سسپنس اور تجسس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ عادل اور عدیلہ کا کھیلا بھی خوب ہے۔ لاوا دیہ ایک مختصر رومانی کہانی تھی۔ مستقبل دیہ ایک سبق آموز کہانی تھی مگر سبق امریکی نو عمر بچوں کے لیے۔ آب طلب کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا کہ یہ کہانی کافی عرصے تک یاد رہے گی۔ اشعار کی محفل میں اظہر حسین بچار کا شعر اتنا اچھا تھا کہ اسے پہلے نمبر پر لگانا چاہیے تھا۔“

✠ حجاب کنول، ملکوال سے چلی آرہی ہیں ”ان گنت ماہ وسال کی غیر اعلانیہ غیر حاضری کے بعد بہنوں، بھائیوں، دوستوں کی خوش رنگ مسکراہٹوں، کھنکتے قہقہوں سے سجی سنوری پھول اور کانٹوں کی انجمن اور تمام اہلِ سسپنس کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے سلام اور ایڈوانس عید مبارک! اداریہ میں ملک کے تمام بڑے مسائل کا ذکر مختصر پیرائے میں پڑھ کے انکل کی ذہانت کے مزید قائل ہو گئے۔ محمد خواجہ، ماہا ایمان تو محفل کا چراغ ہیں انہیں بھلا کون بھول سکتا ہے۔ ستاروں پر کمند کے اسٹیج میں پہلی قسط کا مکمل احوال و خلاصہ موجود ہے۔ مغل انکل شکریہ۔ ماردی اچھی مگر متوسط کہانی ہے۔ حسابِ دوستاں میں بالآخر حق داروں کو حق مل گیا۔ حق سرخرو ہوا۔ اسلامی تحریر ایمانی، روحانی تقویت کا باعث بنی۔ مریم کے خان کی مستقبل میں دین نے چوروں کے گروپ سے علیحدگی کا فیصلہ کر کے اپنا روشن مستقبل محفوظ کر لیا۔ لڑکیوں کی دیدہ دلیری پر حیرت و افسوس ہوا۔ آب طلب میں درخشاں کے ٹوٹ کر بکھرنے کا افسوس ہوا۔ درخشاں کے بکھرنے میں کچھ خاندانی ناجائز روایات کا قصور تھا تو کچھ فیصلے درخشاں نے بھی غلط کیے۔ کوکھ کا دکھ تحریر مضروب دل کو آزردہ کر گئی۔ اللہ تعالیٰ تمام مرد و زن کی اصلاح فرمائے۔ پُرتشدد مزاج شوہروں اتنا عرض کرتی ہوں ہم تو بقول تمہارے ناقص العقل ہیں مگر تم تو عقل والے ہو۔ پھر کیوں اس قدر مقدس رشتے پر غیر انسانی سلوک کر کے مقدس رشتے کی تذلیل کرتے ہو۔“

✠ ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے محفل کی زینت بنے ہیں ”جولائی کا سسپنس دیدہ زیب سرورق سے سجا سامنے ہے۔ ہاتھ میں گلاب کی پنکھڑی لیے حنائی ہاتھوں میں اور خوشبو کی مانند عید مبارک لکھا ہوا گویا الفاظ ستاروں سے گلے مل رہے ہیں۔ فہرست مضامین بھی پسندیدہ قرار پائی۔ اندر اشاریے میں حکمت اور دانائی کے موتی چنے سیاست کا ذکر ہو رہا ہے مخاطب سیاست دانوں کو کیا گیا ہے۔ جو سب سے بے حس قوم ہے جن کو نہ کسی کے جذبات کی پروا ہے نہ ہی روتے بلکتے بچوں کے لیے کوئی ہمدردی کا احساس ہے۔ جون کا مہینا آتے ہی عوام کے دل دھڑکنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ہر سال کی طرح اس سال کا بجٹ بھی عددوں کے ہیر پھیر کا گورکھ دھندا ثابت ہوا اور توقع کے مطابق ضروریاتِ زندگی کی چیزوں پر حسبِ معمول دام بڑھ گئے۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی ستاروں پر کمند بہت خوب صورت آغاز ہے۔ امید ہے یہ سلسلہ آخر تک اپنی دلچسپی برقرار رکھے گا۔ دیہی زندگی کے گرد گھومتی ہوئی کہانی حقیقت سے قریب تر لگی۔ ماردی بھی پڑھی جا رہی ہے مگر تکلف برطرف اب دلچسپی کا فقدان نظر آرہا ہے۔ منتظر ہیں کہ کہانی میں کیا موڑ آئے۔ اس کے بعد حسابِ دوستاں دوسری اور آخری قسط پڑھی جو الیاس سیتاپوری جیسے مانے ہوئے قلم کار کی بہترین تحریر تھی۔ کاشف زبیر کی معاہدہ نے بھی مزہ دیا۔ جیول پر آگہی کے در وا ہوئے۔ زندہ لاش، کوکھ کا دکھ قرار اچھی کہانیاں تھیں۔ چل جھوٹی منظر امام کی کہانی نے ہونٹوں پر ہنسی بکھیر دی۔ حکیم الاولیا میں ولی کامل محمد بن علی کا احوال پڑھا۔ واقعی اولیا کی برگزیدہ ہستیاں دنیا کی دولت کی محتاج نہیں ہوتیں۔ دنیا ان کے قدموں پر جھکتی ہے مگر وہ دنیا کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مستقبل میں دین کو بروقت خیال آگیا اور وہ جرم کی گہری دلدل میں دھنسنے سے بچ گیا۔ آخری صفحات کی کہانی آب طلب میں درخشاں کو زندگی نے دردہی دیے۔ من کی مراد نہ مل سکی اور زندگی نے تلخ یادوں کا در ہمیشہ کے لیے اس کا مقدر کر دیا۔ بیچ بیچ میں اقوالِ زریں کی جن کترنوں نے بھی محظوظ کیا۔ شعر و سخن میں شعروں کا انتخاب بھی اچھا تھا۔“

✠ احسان سحر، میانوالی سے تبصرہ کر رہے ہیں ”سب سے پہلے کچھ عرض کر دوں کہ ہم آج کل اپنے علاج میں معروف رہتے ہیں۔ دعا کریں کہ بیماری جلد سے جلد دور ہو جائے اور ہم پھر سے سسپنس کا باقاعدہ حصہ بن جائیں (اللہ آپ کو صحت یابی عطا فرمائے، آمین) کیونکہ ہمیں سسپنس سے محبت ہے۔ ٹائٹل پر صنفِ نازک کو عجیب سے انداز میں دکھایا گیا۔ آگے بڑھے جہاں جون ایلیا مرحوم کو تلخ اور حقیقت پر مبنی باتیں کرتے پایا۔ سچائی ہمیشہ تلخ ہی ہوتی ہے۔ الیاس سیتاپوری کی حسابِ دوستاں کا آخری حصہ پڑھا۔ لبوں کو چھوتے ہوئے لفظ دل میں گزرتے چلے گئے اور ایسا سرور ملا کہ ہوش ہی نہ رہا..... کب ختم ہو گئی کہانی۔ معاہدہ موت کا خوف ہو تو ہر چھوٹا بڑا مشکل اور آسان کام کرنا بھی پڑتا ہے۔ جیول نے بھی شیطان سے معاہدہ کیا اور جان ہتھیلی پر رکھ کر اسے پورا کیا۔ دھڑکنیں جس کے انتظار میں دھڑک رہی تھیں وہ آخر آغاز ہو ہی گیا۔ ستاروں پر کمند میں عادل کا ابتدائی اور غموں کا دور ہے اور بہت جلد خوشیاں بھی آئیں گی اور خوشیاں آسانی سے نہیں ملتیں۔ کٹھن اور جان لیوا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ زندہ لاش ضمیر کے بیدار ہونے کی علامت دکھائی گئی۔ کوکھ کا دکھ ایک ممتا کی قربانی کا احوال..... دنیا میں ایسی بے شمار مثالیں ہیں جو ان کی بے مثال قربانیوں سے بھری پڑی ہیں۔ جب دل اداس ہو تو مسکرایا نہیں جاتا۔ اس زبردستی کی مسکراہٹ کے ساتھ اہلِ پاکستان کو ایڈوانس میں عیدالفطر مبارک ہو۔ ماردی میں محبت اور زندگی کی جدوجہد جاری ہے۔ آخری کہانی، مقدر کی ستائی ہوئی لڑکی کا فسانہ دور رہا۔ جو در در کی ٹھوکریں کھاتی رہی۔ نہ دنیا کی ہوئی نہ اپنی ہوئی۔ مجموعی طور پر سسپنس اچھا رہا۔“

✠ حکیم سید محمد رضا شاہ بخاری، میانوالی سے تشریف لائے ہیں ”سب سے پہلے جون ایلیا کا پُرمغز مقالہ پڑھا۔ آپ کے خطوط کی محفل میں۔ میر اختر عباس تھراج یاد کرنے کا شکریہ۔ پرانے دوستوں تفسیر عباس اوکاڑہ، بابر عباس، قدرت اللہ خان نیازی، عادل خان، راجہ ثاقب نواز وغیرہ سب کو سلام اور دعا۔ کراچی ائرپورٹ پر دہشت گردوں کے حملوں سے شہید ہونے والے اہلِ وطن کی اموات پر بہت افسوس ہوا۔ طاہر جاوید مغل کے نام محبتوں کے سفیر میں شاعر اعجاز احمد راحیل (ساہیوال) نے اپنے عمدہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی سابقہ کہانی پس زنداں کا انجام پڑھ کر دکھ ہوا۔ عورت پر ہونے والے ظلم پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آگئے۔ حسابِ دوستاں کی دوسری قسط میں قاضی لبیب کے انجام پر خوشی ہوئی۔ طاہر جاوید مغل کا نیا طویل سلسلہ ستاروں پر کمند ایک خوب صورت آغاز ہے۔ مرزا امجد بیگ نے قاضی وحید کی کارستانی کو اجاگر کیا ہے۔ کوکھ کا دکھ، ڈاکٹر شیر شاہ سید کی اچھوتی معاشرتی کہانی ہے۔ ماردی محی الدین نواب کی طویل کہانی کی آٹھویں قسط پڑھی جس میں ماردی کے پہلے دو عشاق کے مقابلے میں ایک تیسرا بھی میدان میں آگیا ہے۔ بابر نعیم کی مختصر کہانی لاوا اور منظر امام کی چل جھوٹی نے بہت مزہ کیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی طویل آخری کہانی آب طلب میں بھی ایک عورت کی مخصوص نفسیات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ بے شک رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ درخشاں نے خود اپنے چاہنے مراد کو ٹھکرایا اور پھر حالات نے اس کی زندگی میں اندھیرے بھر دیے۔ اگر وہ مراد سے شادی قبول کر لیتی تو اس کو برے حالات سے واسطہ نہ پڑتا۔ قارئین کے لیے ایک اطلاع کہ ہمارا گاؤں دریائے سندھ کے کٹاؤ میں آگیا ہے اور ہم نقل مکانی کر کے روکھڑی موڑ آگئے ہیں۔ ہم نے ہجرت کی ہے۔ ہمارے حق میں دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں نئے حالات میں سرخرو فرمائے۔ آمین۔ محفلِ شعر و سخن میں اعجاز احمد راحیل، تفسیر عباس، محمد قدرت اللہ خان نیازی، ماہا ایمان اور اشوک کمار پسند آئے۔“

✠ بشیر احمد بھٹی، فوجی بستی، بہاولپور سے چلے آرہے ہیں ”جولائی کا سسپنس سامنے ہے۔ ٹائٹل حسبِ روایت سسپنس کے شایانِ شان ہے، آپ کے خط کے تمام تبصرے اچھے رہے۔ تاریخی کہانی حسابِ دوستاں کا دوسرا حصہ تیز رفتار رہا۔ مغربی ادب کا معاہدہ سسپنس سے بھرپور رہی۔ ستاروں پر کمند سادہ پیرائے کی پُرتجسس کہانی ہے۔ ماردی کو محی الدین نواب صاحب سندھ کی عکاسی کے طور پر آگے بڑھا رہے ہیں۔ حکیم الاولیا سسپنس کی جان ہے۔ آخری کہانی آب طلب عکاسی ہے اس ماحول کی۔ دفاتر میں ملازمت کرنے والی خواتین پر عملہ کس طرح کی نگاہ رکھتا ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے حکیم بن کر معاشرے کی دکھتی رگ پر قلم کی نوک رکھی ہے۔ اچھی کہانی ہے۔ مختصر کہانی لاوا کو دو بار پڑھنا پڑا۔ تب اس کی سمجھ میں آئی۔ چل جھوٹی دیسی ادب ہے اور مستقبل بدیسی ادب سے دو اچھی کہانیاں ہیں۔“

✠ عمران علی، ضلع جھنگ سے محفل میں شریک ہیں ”اس دفعہ جولائی کا شمارہ گرما گرم شام کو ملا۔ سرورق دیکھ کر حیران رہ گئے۔ خاص طور پر گلاب کے پھول سے عید مبارک کو پھوٹتے ہوئے دیکھ کر۔ اس بار سب کہانیاں ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالیں۔ بہت ہی مزہ آیا، نیم اور سکھ چین کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کے پڑھنے کا۔ جون ایلیا کی حکمتِ عملی پسند تو آئی لیکن سیاست میں آنے کے لیے ہماری سب کی توبہ، بابا نہ، ایسا ہم نہیں کر سکتے۔ مدیرِ اعلیٰ صاحب نوک جھوک ختم کر کے آپ نے بالکل ٹھیک کیا۔ اب کوئی دل آزاری کی شکایت نہیں کرے گا۔ ہم تو اپنے خط کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ یہ کیا ہوا مجھے تو لگا شاید میرے خط کو ایڈٹ کرتے وقت لائٹ چلی گئی ہو گی۔ بہرحال پھر بھی ہماری پُرخلوص جذبوں جیسی محبت آپ سب سے قائم و دائم رہے گی۔ رمضان کا رحمتوں برکتوں والا مہینا آگیا ہے۔ اللہ ہم سب کو پیارے مہینے کے صدقے نیک عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس مہینے کی برکتوں اور رحمتوں کو زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی توفیق عطا فرمائے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ماردی پڑھی۔ لگتا ہے ماردی کے نئے مطلب تیسرا عاشق بھی پیدا ہو گیا ہے، دیکھو اب وہ کیا کرتا ہے۔ حکیم الاولیا شیخ محمد بن علیؒ کی کہانی پڑھ کر دل اور ایمان کو تازگی ملی۔ بالکل اگر بڑھاپے میں والدین کی خدمت کر لی جائے تو دنیا کا سب کچھ مل جاتا ہے جن کی تعلیم حضرت خضرؑ کریں اس بندے کے کیا کہنے۔ حسابِ دوستاں کا آخری حصہ پڑھا۔ واقعی دولت اور سادہ لوحی انسان کے لیے وبال بن جاتی ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی کہانی آب طلب جب دل کی تشنگی پوری نہیں ہوتی۔ مرزا امجد بیگ کی کہانی آنگن ٹیڑھا میں واقعی آنگن ٹیڑھا تھا۔ جن لوگوں کو ناچنے کا ڈھنگ نہ آتا ہو وہ بھی آنگن ٹیڑھا کہہ کر اپنی ساری نالائقیوں کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوکھ کا دکھ ڈاکٹر شیر شاہ سید انسان دنیا کی سب سے خوب صورت محبت ممتا کی محبت کا کوئی متبادل نہیں لا سکتا۔ ایک ماں ہی واحد ہستی ہے جو اپنی اولاد خواہ کیسی ہو دکھ میں نہیں دیکھ سکتی۔ محبت کے دیوتا طاہر جاوید مغل کا نیا شاہکار ستاروں پر کمند نے ایک نئی لذت کو آشنا کیا۔ کاشف زبیر کی کہانی معاہدہ بہت اچھی کہانی تھی۔ جب انسان نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے تو اللہ اس کی مدد ضرور کرتا ہے۔ مریم کے خان کی کہانی مستقبل ہماری زندگی کے حالات کے بارے روشناس کراتی ہے جس طرح کا ہمارا حال ہو گا ویسا ہمارا مستقبل۔ منظر امام کی کہانی چل جھوٹی، انسان اپنی اہمیت خود بناتا ہے نہ کہ کسی کو کہنے سے کہ میں ایسا ہوں۔“

✠ محمد جاوید، تحصیل علی پور سے تبصرہ فرما رہے ہیں ”گرما گرم گرمی میں گوری نے گورے گورے حنا رنگ ہاتھ میں سجی ادھ کھلی گل سرخ کلی کی ملائم پتیوں کے سینے میں پھوٹتی ہوئی عید مبارک وصول کی۔ مفکرِ اعظم جون ایلیا نے کسی بھی معاشرے کی تنزلی و ترقی اصلاح و بگاڑ کا ذمے دار سیاست دانوں کو بجا ٹھہرایا۔ ستاروں پر کمند پرنگاہوں کی کمند ڈالی۔ آغاز اچھا ہے اور وہ ناقابلِ یقین بھید کون سا ہے؟ اس کا اگلے شمارے میں لگ



پچاجائے گا۔ سرمحی الدین نواب جو نام ہے اعتماد کا کے قلم کی تندی وتیزی اس بار عروج پر رہی۔ مزاج اور رومانس جیسے پہلوؤں سے محترم صرفِ نظر کر رہے ہیں؟ ستاروں پر کمند ہو یا ماوری دونوں کے انتقاد میں ہم نے باتیں آسماں کی ہوئی ہیں۔ خنسا اور ولیت کی دعائیں رنگ لائیں اور حساب دوستاں کا انجام خلاف توقع بالخیر رہا۔ سچ ہے جس کا کوئی نہیں اس کا اللہ تعالیٰ ضرور ہوتا ہے۔ سسپنس تھرل ایڈونچر، ہارر پر مبنی کاشف زبیر کی کھوج۔۔۔ معاہدہ اعلیٰ درجے کی کہانی ثابت ہوئی۔ ماں کی کوکھ کا دکھ ہمارے دل کا دکھ بن گیا۔ شاید آج تک کوئی ایسی اسلامی تحریر نہیں گزری جس میں موجود اللہ کی بے پایاں رحمتوں بے حساب معجزوں کو پڑھ کر آنسوؤں نے آنکھوں سے نکل کر رخساروں پر سجدہ نہ کیا ہو۔ پس حکیم الاولیا پڑھ کر بھی آنکھوں سے شبنم کا چشمہ پھوٹ پڑا۔ سسپنس سے بھرپور مریم کے خان کا ترجمہ مستقبل ڈبل زبردست ترجمہ ثابت دل دھک دھک کرنا بھول گیا تھا۔ اشوک کی ادکا شعر دل میں تیر کی طرح کھب گیا۔ لاوا میں ایک بوڑھے نے اپنی بوڑھی محبوبہ میرینا سے برسوں سے چھپی دل میں دبی محبت کا اظہار اقرار کر کے اپنے دل ناداں کی کسک دور کی۔ فراد میں پیر اللہ کو اپنوں کی محبت کھینچ لائی اور موت سے دوچار ہونا پڑا۔ اف ان لکھاریوں نے تو ہمیں رلانے کا تہیہ کر رکھا ہے جس رائٹر کو دیکھو ماسوائے منظر امام کے درد کی دکان کھولے بیٹھا ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد مبارک ہو آپ بھی ہمارا دل دکھانے میں ناکامیاب نہیں رہے۔ صرف اور صرف منظر امام واحد رائٹر ہیں جن کی ہر کاوش شگفتہ اثر قلب پر ثبت کرتی ہیں، باقی سب مایہ ناز رائٹر درد کے تاجر ہیں۔‘‘

✠ شوکت شہریار گورنمنٹ کالونی اوکاڑہ ’’سرورق کی حسینہ بڑے پرکشش انداز میں گلاب کے پھول کی مہک سونگھتی نظر آئی۔ اداریہ پڑھا تو مزہ آگیا کہ اب کوئی بھی ایک دوسرے پر طنز نہیں کر سکے گا۔ یہ آپ لوگوں کا ایک اچھا فیصلہ ہے کہ اب کسی کی بھی دل آزاری نہ ہوگی۔ مہرین ناز آپی آپ میری بہن اور میرے دل میں آپ کے لیے بہت زیادہ عزت ہے۔ اس مرتبہ گل مروت کی کمی بہت زیادہ محسوس ہوئی۔ سید اکبر شاہ آپ کے تبصروں کی طرح آپ کی تصویریں۔۔۔ بھی اچھی لگیں۔ اپنے پیارے بھائی اعجاز احمد راحیل کا خط بہت اچھا لگا، مغل صاحب کی اتنے پیارے انداز میں تعریف کی کہ کمال ہی کر دیا۔ آپ نے رمضان بادشاہ، اشوک کمار، فوزیہ تبسم، قیصر اقبال، یکی راجپوت، عاطف کے تبصرے اچھے تھے۔ محفل شعر وسخن میں تمام اشعار اچھے تھے۔ کترنیں بھی اس دفعہ کمال کی تھیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے حساب دوستاں پڑھی جس میں قاضی بھی اپنے بیٹے یونس کی فطرت کا نکلا۔ اختتام میں لیث کو اس کا حق مل گیا۔ معاہدہ ایک اچھی کہانی تھی۔ ستاروں پر کمند کی کیا بات ہے۔ آنکن تیز حا میں بیگ صاحب نے فرقان کو قاضی وحید کے شکنجے سے کامیابی سے نکالا لیکن کیا کوئی شخص اتنا بھی بے وقوف ہو سکتا ہے کہ ایک لاکھ روپیان پر لگا دیا اور کوئی رسید بھی نہیں لی؟ کوکھ کا دکھ پڑھ کے آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اب ذکر ہو جائے ماروی کا تو محی الدین نواب صاحب سے گزارش ہے کہ براہِ کرم طاہر صاحب جیسی کہانی لکھا کریں جو مبنی برحقیقت محسوس ہو۔ مریم کے خان کی مستقبل ایک اچھی اسٹوری تھی۔ آخری صفحات پر آب طلب دل کو دکھی کر گئی۔ درخشاں کو پتا نہیں کس بات کی سزا ملی۔ اس کو تو قدم قدم پر خود غرض لوگ ملے ہیں بہرحال یہ اسٹوری بھی بہت اچھی تھی۔‘‘

✠ احمد خان توحیدی، پاکستان اسٹیل کراچی ’’شمارہ جولائی 16 جون جلد ملنے پر شکریہ۔ انشائیہ۔ حکمت عملی، جون ایلیا، بعد ہمزاد سیاست کا تذکرہ۔ یعنی عبادت والی سیاست کو لوٹ مار کا ذریعہ بنا دیا گیا۔ محل سے چھلانگ آ کے ستاروں پر کمند ڈالنے جاوید مغل صاحب سے بغلگیر ہوئے۔ ابتدا ہی فل دیکھیں عادل ایک کوہ پیما بن کر چوٹی سر کر کے تین کروڑ لے کر کزن شہزادی تک کیسے پہنچتا ہے۔ پھر میم کی گردش میں ماروی کی طرف چلیے۔ مراد منگی کا دلتن دشمن رابرٹ کو جہنم واصل کرنا۔ پھر ڈاکٹر عادل، عدیلہ کا انوکھا روپ مرد، مردوں کا ہوتا ہے۔ محفل خطوط: واقعی بعض ساتھی محفل کے ساتھیوں پر ایسی تنقید کرتے ہیں جیسے ہمارے سیاستدان ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے ہیں۔ گھر کی محفل ہلکی شوخیوں تک محدود رہنی چاہیے۔ الیاس سیتاپوری صاحب کی دوسری اور آخری قسط حساب دوستاں خوب رہی۔ بیگ صاحب ریٹائرڈ ہونے کے باوجود آنگن ٹیڑھا جیسی تحریر فراہم کرنے پر شکریہ۔ بیگ صاحب اور ملک صفدر حیات صاحب۔ کوئی ایسی کہانی بھی پیش کریں جس میں سو فیصد برحق ہونے کے باوجود آج کے مقدمات کی طرح ناکام ہوتے ہوں۔ محفل شعر وسخن میں سب سے اچھا شعر حنا عروج کراچی کا ہے۔ فرار، زندہ لاش، معاہدہ، مستقبل وقت گزارہ کہانیاں ہیں۔‘‘

✠ ہارون رشید، مردان سے لکھتے ہیں ’’18 جون کی بات ہے جب ایک خوشگوار شام کو میں تھوڑا آوارہ گردی کرنے کی غرض سے صدر بازار کی سڑک پر نکلا تو فٹ پاتھ کے کنارے لگے ایک اسٹال سے جولائی کا تازہ شمارہ خرید لاور واپس ہاسٹل لوٹا۔ آرام سے بیٹھا اور سید حماد دوستوں کی محفل میں پہنچ گیا۔ اپنا نام ایک بار پھر ویٹنگ لسٹ میں دیکھا تو دل جیسے خون کے آنسو رو دیا۔ کچھ تو خیال رکھیے اس خانہ خراب دل کا۔ (اب خوش) واپس سرورق کی طرف لوٹا تو اندازہ ہو گیا کہ اس بار ڈاکٹر انکل کا ہاتھ کچھ ڈگمگایا ہوا سا ہے۔ کہانیوں کی ابتدا اپنی سلسلہ وار کہانی ’’ستاروں پر کمند‘‘ سے کی۔ پہلی قسط بھی ابتدا ہماری رائے کے مطابق اپنا خاص رنگ نہ جما سکی۔ مرحوم الیاس سیتاپوری کے ’’حساب دوستاں‘‘ کا دوسرا حصہ بھی پڑھ لیا۔ بہت ہی زبردست یار۔ یونس اپنے انجام کو پہنچا۔ حیرت انگیز حالات و واقعات پر مبنی نواب صاحب کی ماروی عجب تماشے دکھا رہی ہیں۔ نئے نئے کردار انٹر ہو رہے ہیں۔ ماروی کو اب عدیل کا چسکا لگ گیا۔ منظر امام صاحب کی کہانیاں ہمیشہ انوکھی اور لاجواب رہی ہیں۔ اسلامی صفحات پر ابن علی کے ایمان افروز واقعات بھی خوب رہے۔ مریم کے خان صاحب کی ’’مستقبل‘‘ تمام مغربی کہانیوں پر بھاری رہی۔ کہانی کا پلاٹ بہت عمدہ رہا۔ دین مستقبل شناس نکلا جو برے دوستوں کی صحبت سے چھٹکارا حاصل کر گیا۔ کاشف زبیر صاحب تو اس بار جیسے ایک میدان کارزار لے کر آئے تھے۔ ’’معاہدہ‘‘ ٹاپ کلاس اسٹوری رہی۔ البتہ شیطان کا کردار بالکل سمجھ میں نہیں آیا۔ آخری صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد صاحب ایک Sad اسٹوری لیے حاضر تھے۔ کسی کے ہجر و فراق میں اپنا دل تھوڑی رونا اور کھنا ہے۔ رہی سہی کسر ڈاکٹر صاحب نے پوری کر دی۔ درخشاں کے ساتھ بہت برا ہو گیا، بہت افسوس ہوا۔ محفل شعر وسخن میں محمد اکرام صدیقی کا انتخاب بہت



پسند آیا۔ باقی دوستوں کی کترنیں بھی سبق آموز اور مزے دار ہیں۔

✠ ملک رحمت، میانوالی سے شریک محفل ہیں ’’جولائی کا تمام رعنائیوں سے بھرا سسپنس ڈائجسٹ پھر دھوکا دے کر 19 تاریخ کو موصول ہوا۔ سرورق کی حسینہ کچھ دیکھی بھالی لگ رہی ہے شاید پہلے سسپنس کے کسی سرورق پر ملاحظہ کی ہے۔ محفل خطوط میں محمد خواجہ کو ایسی کرسی صدارت مبارک ہو۔ تنین سلطان ہم بھی آپ کی طرح آغا فرید احمد خان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ جلد انٹری ماریں۔ محفل میں خاص جگہ پانے والے اعجاز احمد راحیل کو بہت زیادہ مبارک۔ ہماری بھی خواہش ہے یہ جگہ پانے بلکہ ہر ماہ قبضہ کرنے کی۔ محبتوں کے سفیر طاہر جاوید مغل صاحب کو میرا پیار بھرا اسلام۔ ان کی ہر تحریر دل کی گہرائیوں سے اس طرح پڑھتا ہوں کہ گرد و پیش کی خبر تک نہیں رہتی۔ یہ حقیقت ہے کہ کون آیا کون گیا مجھے پتا نہیں چلتا۔ محبتوں کے سفیر یہ جملہ شاید بنا ہی ان کے لیے ہے۔ رسالے کی شروعات بھی ان کی تحریر ستاروں پر کمند سے کی، بہت ہی پسند آئی۔ اگر یہ کہوں کہ طاہر جاوید مغل کی تحریر سسپنس کی شہ رگ ہوتی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ دوسری بہترین تحریر کوکھ کا دکھ رہی۔ ممتا کا مت بولتا ثبوت نرم و نازک دلوں کے لیے۔ لاوا میں بوڑھے نے آخری عمر میں اظہار محبت کیا لیکن اب کیا فائدہ۔ منظر امام اس بار لبوں پر مسکراہٹ لانے میں ناکام رہے۔ مریم کے خان کی مستقبل بہت زیادہ پسند آئی۔ چلو اچھا ہوا آخر میں ایک نے تو برے کاموں سے توبہ کر لی۔ آخری صفحات کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکے۔ ماروی میں اس بار نواب صاحب نے منفرد سچویشن کری ایٹ کر دی۔ فراد میں اپنی عزت کی خاطر بھائی نے بھائی کو مار دیا۔ حیرت ہے مغرب میں بھی عزت کا خیال رکھا جاتا ہے۔‘‘

✠ کبیر عباسی عرف شہزادہ کوہسار مری سے لکھتے ہیں ’’جاسوسی میں ’’ستاروں پر کمند‘‘ کا اشتہار دیکھ کر ہی سوچا تھا کہ اب کے بار سسپنس ضرور لینا ہے مگر جب بذریعہ فیس بک اطلاع ملی کہ خطوط کی محفل سے نوک جھوک حذف کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے تو پھر سوچا کہ سسپنس نہ ہی لیں مگر پھر اپنے دماغ کو تھوڑی سی سوچ بچار کی اور زحمت دے کر سوچا کہ اس بارے میں آپ تک اپنی رائے تو پہنچانی چاہیے۔ ہمارے خیال میں تو جاسوسی اور سسپنس کی محفل کی خاص بات ہے ہی نوک جھوک اور پیار بھری لڑائیاں۔ رہا سوال دل آزاری کا تو اس کا تو یہی حل ہے کہ نامناسب کمنٹس ہی کو حذف کیا جائے۔ سرورق گرل کا نیلا لباس پسند آیا۔ فہرست کا جائزہ لینے کے لیے گردن ادھر ادھر ’’مروڑنی‘‘ پڑی مگر جب گردن دکھ گئی تو خیال آیا کہ ڈائجسٹ کو بھی تو گھمایا جا سکتا ہے۔ انشائیے کی جانب بڑھ گئے۔ سیاست کے بغیر سماج کے تصور پر منہ بنانا شروع کیا ہی تھا کہ احساس ہوا کہ جون ایلیا ہمارے ہاں رائج سیاست کے بغیر سماج کا ذکر کر رہے ہیں۔ سیاست تو واقعی حکمت عملی ہے۔ کردار نگاری میں طاہر صاحب کا کوئی ثانی نہیں۔ کاشف زبیر کی تحریر معاہدہ ایکشن، تھرل، سسپنس، جاسوسی اور سبق سے بھرپور تھی اور تو اور شیطان اور جیول کے ڈائیلاگز میں کافی مزاح بھی محسوس ہوا۔ خاص کر یہ جملہ پڑھ کر بے اختیار لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی جب جیول نے شیطان سے کہا ’’گو کہ تم شیطان ہو مگر عقل میں بھی رکھتا ہوں‘‘ مرزا امجد بیگ کو کافی عرصے بعد کیس حل کرتے دیکھا اس لیے مزہ آیا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی تحریروں میں یکسانیت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید نے بہت رلایا۔ لیکن ایک تحریر کے مقابلے میں موڈ دوبارہ فریش کرنے کے لیے کم از کم تین مزاحیہ تحریریں تو شامل ہونی چاہئیں۔ منظر امام کی چل جھوٹی کی تھیم نے متاثر کیا۔ زندہ لاش، لاوا اور فراد بس ٹھیک سی رہیں۔ کترنوں میں بشیر بھٹی کی کترن مزہ دے گئی۔‘‘

✠ محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن خانیوال ’’جولائی کا شمارہ 16 تاریخ کو ہی مل گیا۔ ڈاکٹر انکل نے اس بار ایک عجیب شاہکار بنایا۔ سب سے پہلے طاہر جاوید کی نئی سلسلے وار اسٹوری ’’ستاروں پر کمند‘‘ شروع کی۔ یہ معلوم ہوتے ہی کہ عادل کی محبوبہ شہزادی غیر شادی شدہ ہے۔ شکر ادا کیا کہ طاہر جی کی سابقہ ہیروئنز ہمیشہ شادی شدہ ہی رہی ہیں۔ ماروی میں ڈاکٹر عدیلہ کی انٹری سے کچھ دلچسپی پیدا ہونے کا امکان بنا ہے۔ دیکھیں نواب انکل اس کو کس حد تک کہانی کی صورت حال کو دلچسپ بنانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی ’’آب طلب‘‘ نے کافی اداس کیا۔ درخشاں کی ویران زندگی ذات پات اور نسل پرستی کی وجہ سے اپنوں کے ہاتھوں ہوئی۔ الیاس سیتاپوری کی ’’حساب دوستاں‘‘ میں لیث آخرکار خنسا اور دمنان دونوں کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ لیث کے غلام کی وفاداری پسند آئی۔ کاشف زبیر کی ’’معاہدہ‘‘ ایک تخیلاتی کہانی تھی۔ جیول کے مثبت طرز عمل نے اس کو سونے کا اکیلا حق دار بنا دیا۔ سلیم انور کی ’’زندہ لاش‘‘ نے بور کیا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی ’’کوکھ کا دکھ‘‘ اسٹوری آف دی منتھ رہی ایسے ظالم والد جو ماں کی گود میں آنے سے پہلے ہی بچوں کو تشدد کا نشانہ بناتے پھرتے ہیں پتا نہیں کیسے انسان ہوتے ہیں؟ منظر امام کی ’’چل جھوٹی‘‘ نے خوب ہنسایا۔ میاں بیوی ایک دوسرے کو بے وقوف بناتے نظر آئے۔ منظر امام کی اس بات سے اتفاق ہے کہ ’’محبت کا اظہار بہت ضروری ہے۔‘‘ پہلے ذکر ہو جائے آپ کے اداریہ کا۔ اداریہ ملک کے درہم برہم نظام اور مسائل کو بیان کرتا نظر آیا۔ ہماری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اپنے فضل و کرم سے پاکستان میں امن اور استحکام پیدا فرمائے! آمین۔ آپ کے اداریہ کے اختتامی جملوں نے نہ صرف مجھے بلکہ محفل کے تمام ساتھیوں کو بے حد مضطرب کر دیا ہے۔ فیس بک کے گروپ ’’چیں بہ جبیں‘‘ میں محفل کے تقریباً تمام شرکا موجود ہیں اور سب نے نوک جھونک کو حذف کرنے کے اعلان کو محفل کی دلچسپی ختم کرنے سے تشبیہ دی ہے۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ کانٹ چھانٹ ضرور کریں لیکن سرے سے نوک جھوک حذف کر دینا کسی طور پر بھی مناسب نہیں۔ اعجاز احمد راحیل آپ کا خط بلاشبہ قابل تعریف ہے الفاظ کا چناؤ اور بے ساختگی بھی خوب ہے۔‘‘

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

سید اکبر شاہ، اوگی مانسہرہ۔ سوہا جی، لاہور۔ سید زاہد احمد خان داد، کراچی۔ ہمایوں سعید، بنو۔ امجد اقبال بھٹی، ضلع ساہیوال۔

فقیر دوست

ڈاکٹر ساجد امجد

حکومت اور حکمرانی کا کوئی بھی انداز اور معیار ہو... طاقت، اصول اور کچھ روابط وضوابط ہر جگہ ضروری ہوتے ہیں ورنہ... نہ حکومت رہتی ہے اور نہ ہی حکمرانی کا خوب پورا ہوتا ہے... اور جو امراء ان پہلوئوں پر گہری نظر اور حالات سے نبرد آزما ہونے کی مہارت نہیں رکھتے انہیں یہ شاہی تخت و تاج زیادہ دیر اپنے پاس ٹھہرنے نہیں دیتے... التمش... تاریخ کا ایک یادگار باب، جسے ماضی کے اوراق سے کوئی نہیں نکال سکتا۔ تادیر حکمرانی اچھی حکمتِ عملی کی مظہر اور... ذہانت سے مشروط ہوتی ہے... سلطان التمش جو بخارا میں غلامی کی زندگی بسر کررہا تھا کہ قسمت کی دیوی مہربان ہوئی اور ایک فقیر نے اپنے کشفِ باطن کے ذریعے بادشاہت کی نوید دی اور ساتھ ہی فقیر وحاجت مندوں کے ساتھ شفقت وعاجزی کا سلوک روا رکھنے کی تلقین کی... کیا خبر تھی کہ حالات و واقعات رفتہ رفتہ اس پیش گوئی کے لیے راستے ترتیب دیتے جائیں گے... اور جب اسے دہلی کی بادشاہت عطا ہوئی تو تصور کی آنکھ سے اسے وہ منظر نظر آیا جب فقرا کی نگاہِ کیمیا کے اثر نے ایک معجزہ بن کر اسے تختِ شاہی سونپا تھا لیکن... اس وقت اسے قسمت پر نہ تو اعتبار تھا اور نہ ہی اپنے بارے میں کوئی گمان تھا۔

حاکم بدایوں التمش سننے کو بہت کچھ سن رہا تھا لیکن اسے یقین اس وقت آیا جب دہلی سے چلنے والے دو قاصد طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد بدایوں شہر میں داخل ہوئے اور اس وقت قصرِ عالی شان میں التمش کے سامنے بیٹھے تھے۔

''آرام شاہ بن قطب الدین ایبک کو عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیے صرف ایک سال ہوا ہے اور حال یہ ہے کہ تمام سلطنت انتشار کی نذر ہوگئی اور ملک میں تحت طوائف الملوکی پھیلی ہوئی ہے۔ ناصر الدین قباچہ نے سندھ میں پہنچ کر ملتان، اوچ بھکر اور شیوران نامی شہروں پر قبضہ کرلیا۔ بنگال میں خلجی امراء نے اپنی خودمختار حکومت قائم کرلی۔ مسلمان امراء کی خودسری کو دیکھتے ہوئے بعض ہندو راجاؤں میں بھی خودمختاری کا شوق پیدا ہوا۔ سلطنت کے تمام سرحدی علاقوں میں فتنہ وفساد کے شعلے بھڑکنے لگے ہیں۔'' قاصدوں نے اسے ضروری معلومات فراہم کیں۔

''یہ تم مجھے کون سی نئی باتیں بتارہے ہو اور کیوں بتا رہے ہو؟ میں بدایوں کا حاکم ہوں اور اپنے علاقوں کا ذمے دار ہوں۔ کوئی خودسری میری جانب سے ہوئی ہو تو جواب دہ ہوں۔ یہ تو ان امراء کے سوچنے کا مقام ہے جنہوں نے آرام شاہ کی اہلیت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا اور حکومت اسے سونپ دی۔''

''ان امراء نے ہی اپنی غلطی کے ازالے کے لیے آپ کے پاس بھیجا ہے۔''

''میرے پاس بھیجا ہے... مگر کیوں؟'' التمش نے چونک کر قاصدوں کی طرف دیکھا۔

''یہ امراء آرام شاہ کی جگہ آپ کو ہندوستان کا حکمران بنانا چاہتے ہیں۔''

''وہ یہ چاہتے ہیں میں اپنے آقازادے کے خلاف بغاوت کروں؟ وہ قطب الدین ایبک جس نے مجھے فرش سے عرش پر بٹھایا۔ مجھے بازار سے خریدا اور دربار میں لایا۔ مجھے بیٹا اور پھر داماد بنایا۔ میں اسی قطب الدین کے بیٹے کو

معزول کروں؟"

"آپ جو کچھ کریں گے، اپنے ولی نعمت قطب الدین ایبک کی سلطنت بچانے کے لیے کریں گے۔"

"اچھا یہ بتاؤ، وہ کون سے امراء ہیں جنہوں نے تمہیں میرے پاس بھیجا ہے۔ کیا میں ان پر بھروسا کرسکتا ہوں؟ ان میں سے چند کے نام تو بتاؤ۔"

"ان میں وہ امراء بھی شامل ہیں جو آرام شاہ کو اس کا حق دلانے میں پیش پیش تھے اور دیگر امراء بھی۔"

"وہ بھی تو ہوں گے جو اب بھی آرام شاہ کا ساتھ دے رہے ہوں گے؟"

"ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔"

"کیا آرام شاہ اتنی آسانی سے تخت سے نیچے اتر آئے گا؟"

"ممکن ہے وہ مقابلہ کرنے کی نادانی کرے لیکن جو لوگ آپ کے حق میں ہیں، ان میں لشکر کے سالار بھی شامل ہیں۔ علاؤ الدین جانی، سیف الدین کوچی وغیرہ۔"

"پھر اگر ان لوگوں نے اتفاق رائے سے مجھے بلایا ہے تو میں دہلی ضرور جاؤں گا۔ تم لوگ میری تیاری تک مہمان خانے میں رک کر تھکن اتارو۔"

التمش ان قاصدوں کو رخصت کرنے کے بعد جب تنہائی میں بیٹھا تو اس کی سوچوں کے دائرے وسیع ہوگئے۔ اس کا ذہن اسے اس دور میں لے گیا جب وہ بخارا میں تھا اور غلامی کی زندگی بسر کررہا تھا۔ اس کے آقا نے اسے ایک سکہ دیا اور بازار سے انگور لانے کے لیے کہا۔ وہ بازار گیا ضرور لیکن جب انگور خریدنے لگا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے ہاتھ سے سکہ کہیں گر گیا ہے۔ وہ آقا کے خوف سے ایک جگہ بیٹھ کر رونے لگا۔ اس وقت ادھر سے ایک صاحب باطن فقیر کا گزر ہوا۔ اس فقیر نے اپنے کشف باطن کے ذریعے اس کا حال معلوم کرلیا اور انگور خرید کر اسے دے دیے۔ یہ بھی کوئی ایسی بات نہیں تھی لیکن اس موقع پر اس فقیر نے کہا تھا۔ "اگر خدا تجھے کبھی بادشاہ بنا دے تو، تو فقیروں اور حاجت مندوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنا جو اللہ تعالیٰ نے اس وقت تیرے ساتھ کیا ہے۔"

تو کیا فقیر کی دعا پوری ہونے کا وقت آگیا تھا؟ کہاں ایک غلام اور کہاں بادشاہت۔

التمش کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ اس نے ملازم کو حکم دیا کہ اس کے لیے وضو کے پانی کا بندوبست کردے۔ وہ خدا کے حضور شکرانے کے نوافل ادا کرنے کے لیے سربسجود ہوگیا۔

رات کو عشا کی نماز ادا کرنے اور وظائف وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ خواب گاہ میں گیا اور تکیے پر سر رکھا تو زمانہ ماضی نے اس کے ذہن کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس مرتبہ اس نے خود کو بغداد میں دیکھا۔ ایک روز اس کے مالک نے کچھ صاحب باطن درویشوں کو مدعو کیا تھا۔ محفلِ سماع شباب پر تھی اور یہ فنافی اللہ لوگ بڑے ذوق وشوق کے ساتھ نعرہ ہائے مستانہ بلند کررہے تھے۔ یہ محفل رات بھر جاری رہی اور التمش رات بھر ہاتھ میں شمع لیے کھڑا رہا تھا۔

فقرائے پاک طینت التمش کی اس خدمت سے بے انتہا خوش ہوئے اور رخصت ہوتے وقت اس کے حق میں دعائے خیر کی تھی۔

التمش نے بے چین ہوکر تکیے سے سر اٹھالیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کیا یہ اس گروہ فقرا کی نگاہِ کیمیا اثر کا معجزہ نہیں کہ مجھے دہلی کی بادشاہت عطا ہورہی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ مجھے خود بلایا جارہا ہے۔

التمش ابھی تک گومگو کی کیفیت میں تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پارہا تھا کہ دہلی جائے یا نہیں۔ اسے کچھ یقینی خطرات نظر آرہے تھے لیکن اب وہ مطمئن تھا۔ فقیروں کی دعائیں میرے ساتھ ہیں۔ جو کچھ میرے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے وہ ضرور پورا ہوکر رہے گا۔

وہ تہجد کی نماز کے لیے کھڑا ہوگیا۔

التمش قراختائی ترکوں کے ایک بہت بڑے گھرانے کا بیٹا تھا۔ التمش کے باپ کا نام ایلم خان تھا اور وہ ایلبری قبیلے کا سردار تھا۔ اس نے اپنی دولت مندی، خدمت گاروں اور مصاحبوں کی کثرت کی وجہ سے آس پاس کے علاقوں میں شہرت حاصل کرلی تھی۔

التمش اپنی صورت اور سیرت کے لحاظ سے اپنے تمام بھائیوں میں ممتاز تھا۔ اسی وجہ سے ایلم خاں اپنے بیٹوں میں سب سے زیادہ اسے چاہتا تھا۔ التمش کے بھائی اس سے خوش نہ تھے لہٰذا انہوں نے التمش کے ساتھ وہی سلوک کیا جو یوسف کے ساتھ ان کے بھائیوں نے کیا تھا۔ انہوں نے اسے گلہ بانی کے بہانے اس کے باپ ایلم خاں سے جدا کرکے ایک سوداگر کے ہاتھ بیچ ڈالا اور پھر وہ مختلف سوداگروں کے ہاتھوں سے ہوتا ہوا حاجی جمال نامی سوداگر کے ہاتھ آیا جو اسے دہلی لے آیا اور قطب الدین ایبک نے اسے خرید لیا۔ قطب الدین نے اسے اپنا بیٹا بنا کر اپنے درباریوں میں شامل کرلیا۔

قطب الدین اپنے اس غلام پر بے حد اعتماد کرنے لگا۔ یہ اعتماد اور محبت اتنی بڑھی کہ قطب الدین نے اپنی تین بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح التمش سے کردیا۔

وہ ترقی کرتے کرتے ایک اہم عہدے تک جا پہنچا۔ پھر گوالیار کا قلعہ فتح کرکے التمش کو اس کا حاکم بنا دیا۔ پھر کچھ عرصے بعد التمش کو بلند شہر اور اس کے گرد ونواح کے علاقوں کی جاگیر دے کر بدایوں کا حاکم مقرر کردیا گیا۔ اب (قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد) امرائے دہلی اور اراکینِ سلطنت اسے بدایوں سے بلا کر دہلی کا حکمراں بنانا چاہتے تھے۔

التمش کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ آرام شاہ اور اس کے حامی امراء (گو تعداد میں کم ہوں) اسے اتنی آسانی سے دہلی میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ اس کے لیے اسے ممکن ہے جنگ کرنی پڑے۔ وہ چند روز کی تیاری کے بعد اپنے امراء اور لشکر کے ہمراہ بدایوں سے دہلی کی طرف روانہ ہوا۔

آرام شاہ نالائق سہی لیکن تھا تو بادشاہ۔ خوشامدی امراء بھی ہر وقت اس کے گرد جمع رہتے تھے۔ انہیں کیسے یہ گوارا ہوسکتا تھا کہ عنانِ حکومت آرام شاہ کے ہاتھ سے نکل جائے اور التمش جیسا سخت گیر بادشاہ ان پر مسلط ہو۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ بعض قطبی امراء نے التمش کو بدایوں سے دہلی بلایا ہے تو وہ اس منصوبے کو ناکام بنانے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ آرام شاہ کو اس واقعے کی سنگینی کا احساس اس وقت ہوا جب اس کے محل کے چراغ تک سو گئے۔ وہ خود بھی خوبرو عورتوں کے جھرمٹ سے نکل کر ابھی ابھی اپنی خواب گاہ میں پہنچا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کے محافظوں میں سے ایک نے ہمت کرکے دروازے پر دستک دی تھی۔ آرام شاہ کے آرام میں خلل پڑے اور وہ خاموش رہے؟ وہ باہر آتے ہی محافظوں پر برس پڑا لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اتنی رات گئے اس کا ایک منہ چڑھا امیر ملاقات کے لیے آیا ہے تو اس کا سارا غصہ کافور ہوگیا۔ شمعیں روشن ہوگئیں، وہ اسے لے کر دیوان خانے میں پہنچ گیا۔

یہ ترکی امیر فرخ شاہ تھا۔ عموماً نازک مواقع پر ملاقات کے لیے آتا تھا اس لیے آرام شاہ اسے اہمیت دینے پر مجبور ہوگیا تھا۔

"اتنے ناوقت آئے ہو، کوئی خاص سبب؟"

"یہی تو وقت ہے۔ اب نہ آتا تو یہ وقت بھی نہ آتا۔"

"ایسی مایوسی کی باتیں آپ کے منہ سے اچھی نہیں لگتیں۔"

"آپ کے امراء آپ سے باغی ہوچکے ہیں۔"

"کن امراء کی بات کررہے ہو؟"

"تقریباً وہ سب جو آپ کی جانشینی کے وقت آگے آگے تھے۔"

"اب وہ کیا کہتے ہیں؟"

"انہوں نے التمش کے نام خط لکھ دیا ہے۔ وہ آپ کو بادشاہت سے ہٹا کر التمش کو بادشاہ بنانے کا پکا ارادہ کرچکے ہیں۔"

"وہی التمش جو میرے باپ کا غلام رہا ہے؟ اس کی کیا مجال جو دہلی میں قدم رکھے۔"

"اس کی تو مجال نہیں لیکن امرائے وقت اس کی حمایت کررہے ہیں۔"

"ابھی باہر جاؤ اور لشکر کے سالاروں کو ہمارے سامنے پیش کرو۔ علاؤ الدین جانی، سیف الدین، جلال الدین سب کو پیش کرو۔"

"مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ سب بھی اس سازش میں شریک ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ التمش کے آنے سے قبل یہ لوگ خود آپ کو تخت سے نیچے اتارنے کا بندوبست کردیں۔"

"بات یہاں تک پہنچ گئی اور تم مجھے اب آگاہ کررہے ہو؟"

"یہ سازش اتنی خاموشی سے تیار ہوئی ہے کہ مجھے بھنک بھی نہیں پڑسکی۔ میں یہی کرسکتا تھا کہ آپ کے لیے دہلی سے باہر نکلنے کا انتظام کردوں۔"

"تمہارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم التمش کے لیے میدان خالی کردیں؟"

"اس کے سوا کوئی راستہ بھی تو نہیں۔ کبھی کبھی آگے دوڑنے کے لیے پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔ ابھی التمش سے مزاحمت کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ کہیں اور رہ کر اپنی طاقت میں اضافہ کیجیے اور موقع دیکھ کر التمش کو دہلی سے باہر نکال دیجیے۔"

"میری طاقت تو یہی امراء تھے جو التمش سے مل گئے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ میں التمش سے امان طلب کرلوں۔"

"یہ آپ کیا ارادہ فرما رہے ہیں؟ بہت سے امراء اب بھی آپ کے ساتھ ہیں۔ وقت ملا تو ہم لشکر بھی جمع کرلیں گے۔"

آرام شاہ یہ خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھا لیکن فرخ شاہ نے اسے اکسانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ صبح تک اس نے چند اور امیروں کو آرام شاہ کی خدمت میں پیش کردیا جنہوں نے عہد کیا کہ وہ التمش سے مقابلہ کرنے میں اس کی مدد کریں گے۔ آرام شاہ ان کی باتوں میں آگیا اور اپنے عیال کو لے کر شہر سے نکلا اور دہلی کے قریبی علاقے میں قیام پذیر ہوگیا۔ اس کے حواری اور بہی خواہ بھی اپنے اپنے لشکروں

کے ساتھ اس کے ہمراہ تھے۔ اب انہیں کسی محفوظ جگہ پر رہ کر اپنی طاقت میں اضافہ کرنا تھا۔

التمش دہلی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ امرائے دہلی جنہوں نے قاصد دوڑا کر اسے بدایوں سے بلایا تھا، اس کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ آرام شاہ اور اس کے... ہمنوا پہلے ہی شہر سے جا چکے تھے۔ اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ کسی مزاحمت کے بغیر دہلی میں داخل ہوا اور شمس الدین کا لقب اختیار کر کے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور بہت جلد قطب الدین کے عہد کے امیروں اور درباریوں کو اپنے لطف و کرم سے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ لیکن اسے بہت جلد یہ بھی احساس ہو گیا کہ جب تک آرام شاہ اور اس کا ساتھ دینے والے سالاروں اور لشکریوں کو زیر نہیں کیا جاتا، اس وقت تک اس کی حکومت بے سکونی کا شکار رہے گی۔ اس نے آرام شاہ اور اس کے ساتھیوں سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا۔

آرام شاہ نے بھی اس وقت تک دہلی کے گرد و نواح سے اچھی خاصی فوج جمع کر لی تھی لہٰذا اس نے جب سنا کہ التمش اپنے لشکر کو لے کر آگے بڑھا ہے تو وہ بھی مقابلے پر آ گیا۔ دونوں فوجیں دریائے جمنا کے کنارے صف آرا ہوئیں، گھمسان کا رن پڑا۔ آرام شاہ نے اپنی دانست میں خوب مقابلہ کیا لیکن اس کے سردار اور کرائے کے فوجی التمش کے حملوں کی تاب نہ لا سکے۔ آرام شاہ میدان سے بھاگ نکلا۔

اس فتح کے بعد شمس الدین التمش ہندوستان کا مستقل بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ آرام شاہ کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد اب التمش کو ان لوگوں کی طرف متوجہ ہونا تھا جنہوں نے آرام شاہ کے دورِ انتشار سے فائدہ اٹھا کر سرکشی اختیار کی تھی۔

قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد "جالور" کے راجا اڈلیسہ کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ وہ نہ صرف مسلمان سلطان کی فرماں برداری سے باہر نکل گیا تھا بلکہ اس نے خراج دینا بھی بند کر دیا تھا۔ آرام شاہ بن قطب الدین ایبک کی عیش پرستی اور آرام طلبی نے اس راجا کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے گریز کیا تھا لیکن التمش کے لیے ضروری تھا کہ اپنی دھاک بٹھانے کے لیے اس پر حملہ آور ہو۔

التمش نے اپنے لشکر کے سالاروں کا اجلاس طلب کیا اور حکمتِ عملی طے کرنے کے لیے ان سے مشورہ کیا۔ ان سب نے بہ یک زبان التمش کی رائے کی تائید کی اور اس کا ساتھ دینے کا عہد کیا۔

جالور، اجمیر سے تقریباً ڈیڑھ سو میل جنوب مغرب میں ایک مقام تھا اور اس کا حاکم راجا اڈلیسہ تھا۔ اس نے جب سنا کہ سلطان التمش اس پر حملہ آور ہونے کے لیے دہلی سے کوچ کر چکا ہے تو وہ بھی جالور سے نکلا اور اپنے سرحدی علاقوں میں آ کر خیمہ زن ہو گیا۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ بغاوت پر تلا بیٹھا ہے۔

سلطان التمش جالور کی سرحد پر پہنچا تو راجا اڈلیسہ کے لشکر کو پہلے سے وہاں موجود دیکھا۔ اس نے بھی کچھ فاصلے پر پڑاؤ کر لیا۔

سلطان التمش نے مسلمان بادشاہوں کی روایت کے مطابق اپنا قاصد راجا اڈلیسہ کے پاس بھیجا اور اسے پیغام بھیجا کہ وہ جنگ سے گریز کرے اور جس طرح خراج ادا کرتا تھا، ادا کرنے کا وعدہ کرے۔ راجا اڈلیسہ نے غالباً اسے اس کی کمزوری سمجھا اور نہایت بے ہودہ الفاظ میں خراج ادا نہ کرنے کا پیغام بھجوا دیا۔

"اسے میری کمزوری نہ سمجھا جائے کہ میں تمہارے قاصد کو زندہ واپس بھیج رہا ہوں۔ میں اپنی سلطنت کا... خودمختار حاکم ہوں۔ تمہیں خراج دینے کا پابند نہیں۔ اب یہ فیصلہ تلوار سے ہو گا۔ تم میں ہمت ہے تو مجھ سے ٹکرا کر دیکھ لو۔"

التمش نے یہ جواب سن کر جنگ کا تہیہ کر لیا۔

دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہو گئے۔ التمش نے اپنے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ اپنے پاس رکھا اور دوسرے حصے کی کمانداری عزالدین کے سپرد کی۔ یہ وہی عزالدین تھا جو بعد میں سلطان غیاث الدین کے نام سے ہندوستان کا بادشاہ بنا۔

جنگ کا بگل بجا تو سلطان اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ حرکت میں آیا۔ دوسری جانب سے عزالدین نے اپنے لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ راجا اڈلیسہ نے اس دوطرفہ حملے کو دیکھا تو اس نے بھی جوابی کارروائی کا آغاز کر دیا۔

ایک خوفناک تصادم کا آغاز ہو گیا۔

دونوں لشکر تازہ دم تھے، خوب جم کر لڑ رہے تھے۔ راجا اڈلیسہ آگے بڑھ بڑھ کر حملے کر رہا تھا لیکن جب عزالدین اور التمش کی طرف سے دباؤ بڑھا تو راجا کی فکرمندی بڑھنے لگی۔ اس کے قدم ایسے ڈگمگائے کہ اس کی اگلی صفوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد اسے اپنی شکست صاف نظر آنے لگی۔ اس نے اپنا لشکر سمیٹا اور میدانِ جنگ

چھوڑ دیا اور اپنے مرکزی شہر میں جا کر محصور ہو گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ التمش اس کا تعاقب کرے گا۔ التمش نے نہ صرف اس کا تعاقب کیا بلکہ اس کے مرکزی شہر تک دوڑتا چلا گیا اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔

راجا اب بھی مطمئن تھا کہ التمش چند روز کے محاصرے کے بعد واپس چلا جائے گا لیکن جب محاصرے نے طول پکڑا تو راجا کو اندیشوں نے گھیر لیا۔ اگر محاصرہ طول پکڑ گیا اور شہر میں غذا کی قلت ہو گئی تو اہلِ شہر دروازہ کھولنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔ التمش غصے میں بپھرا ہوا شہر میں داخل ہو گا اور اس کے لشکری قتلِ عام کریں گے۔ مصالحت کا وقت گزر چکے گا۔ اس نے گزرتے وقت کو دونوں ہاتھوں سے تھامنے کی کوشش کی۔ التمش کے انتقام سے بچنے کا یہی ایک راستہ تھا۔ اس نے ایک وفد ترتیب دیا اور اسے سلطان کی خدمت میں بھیجا۔

یہ وہ رات تھی جس میں التمش فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ صبح ہوتے ہی شہر کو بزورِ قوت فتح کرنے کی کوشش کرے گا۔

راجا کا وفد جونہی سلطان کے پڑاؤ میں داخل ہوا، محافظوں نے اسے گھیر لیا۔ سلطان التمش کو اطلاع کی گئی۔ سلطان نے خدا کا شکر ادا کیا کہ طاقت کے استعمال سے پہلے ہی بات بن گئی۔ اس نے راجا کے وفد کو خیمہ شاہی میں طلب کر لیا۔ التمش کے مشیرانِ خاص بھی اس کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ اس وفد کے ارکان نے راجا کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے پہلے اس کی صفائی پیش کی اور پھر اس کا پیغام پہنچایا۔

"ہمارے راجا کا قصور اپنی جگہ کہ اس نے خراج دینے سے انکار کیا لیکن جناب اس میں حالات کی ابتری کا بھی ہاتھ ہے۔ خراج اس لیے ادا کیا جاتا ہے کہ جسے خراج ادا کیا جا رہا ہے، وہ اس کی حفاظت کرے گا لیکن آرام شاہ کے دورِ حکومت میں حالات اتنے بگڑ گئے تھے کہ حفاظت کی کوئی ضمانت نہیں رہ گئی تھی۔ ہر طرف خودمختاری اور سرکشی کے چرچے تھے۔ اس ماحول میں راجا نے خراج دینے سے انکار کر دیا۔"

"ہم آرام شاہ کی نہیں اپنی بات کر رہے ہیں۔ اس نے ہمیں بھی خراج دینے سے انکار کیا۔" التمش نے انہیں درمیان میں ٹوکا۔

"سلطانِ محترم! راجا جی اپنے اس فعل پر شرمندہ ہیں۔ آپ کے مقابلے میں آنے پر نادم ہیں۔ انہوں نے ہمارے توسط سے یہ پیغام بھیجا ہے کہ وہ آپ کی اطاعت کا دم بھرتے رہیں گے اور خراج کی رقم باقاعدگی سے ادا کریں گے۔"

"اپنے راجا کو ہمارا یہ پیغام دینا کہ اب صرف خراج ہی واجب الادا نہیں بلکہ اسے جنگ کا تاوان بھی ادا کرنا ہو گا۔ اس سے یہ بھی کہنا کہ وہ خود چل کر میرے پاس آئے اور معاہدہ کرے ورنہ میں شہر کو بزورِ شمشیر فتح کرنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔"

"آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔ ہم آپ کا پیغام راجا تک پہنچا دیں گے۔"

التمش نے نہایت عزت و احترام کے ساتھ وفد کو رخصت کیا۔

راجا اڈلیسہ کو اپنی قوت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ سلطان التمش کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ اگلے ہی دن التمش سے ملنے پہنچ گیا۔ التمش نے ہر تلخی کو بھلا کر اس کا استقبال اسی طرح کیا جس طرح ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کا کرتا ہے لیکن اپنے مطالبے پر قائم رہا۔ راجا کو خراج کی رقم بھی ادا کرنی پڑی اور تاوان کی رقم بھی۔

سلطان التمش اس شاندار فتح کے بعد خراج کی رقم وصول کر کے دہلی میں داخل ہوا تو اہلِ شہر کی خوشی دیدنی تھی۔ گلی کوچوں کو آراستہ کیا گیا تھا۔ چھتوں اور کھڑکیوں سے پھول نچھاور ہو رہے تھے۔

سلطان التمش کی یہ پہلی لشکر کشی اور پہلی فتح تھی۔

☆☆☆

تاج الدین یلدوز، شہاب الدین غوری کا نہایت چہیتا غلام تھا۔ اسی لیے شہاب الدین نے اپنے آخری زمانے میں تاج الدین کو ملبوسِ شاہی سے سرفراز کیا تھا اور لشکر کا علم بھی دیا تھا۔ شہاب الدین کی خواہش تھی کہ اس کے بعد تاج الدین یلدوز ہی اس کا جانشین ہو۔ چنانچہ جب شہاب الدین کا انتقال ہوا تو شہاب الدین کے بھتیجے سلطان محمود کے ایما پر حکومت غزنوی کا فرمان تاج الدین کے نام جاری ہوا۔ یلدوز نے غزنی کی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لیتے ہی آس پاس کے باقی شہروں پر قبضہ کر کے سلطنت کے کاموں میں مشغول ہو گیا۔ جب اس کی طاقت خوب بڑھنے لگی تو وہ ہندوستان پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھنے لگا۔ اس وقت ہندوستان پر قطب الدین ایبک کی حکومت تھی۔ تاج الدین نے تمام رعایتوں کو بالائے طاق رکھا اور لاہور پر حملہ آور ہو گیا اور وہاں کے حاکم کو شہر سے نکال کر خود لاہور پر قابض ہو گیا۔ اس کا یہ قبضہ عارضی ثابت ہوا۔ قطب الدین ایبک دہلی جاتے جاتے پلٹ آیا۔

دونوں کے درمیان خوف ناک معرکہ آرائی ہوئی۔ اس معرکے میں تاج الدین کو شکست ہوئی۔

اس شکست کے باوجود قطب الدین جب تک زندہ رہا، اس خوف سے لاہور میں مقیم رہا کہ تاج الدین دوبارہ حملہ آور نہ ہوجائے۔ قطب الدین کی وفات نے پانسا ہی پلٹ دیا۔ تاج الدین اپنے کاموں میں گھرا رہا اور آرام شاہ کی حکومت کا ایک سال گزر گیا۔ التمش تخت نشیں ہوا تو تاج الدین میں اس سے ٹکرانے کی ہمت نہیں تھی۔ اس کے برخلاف اس نے التمش کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور اس کے لیے چتر و علم روانہ کیے اور اس کی بادشاہت کو تسلیم کیا۔ التمش نے حکومتِ غزنی کے احترام میں ان تحفوں کو بڑی خوشی سے قبول کیا۔

تاج الدین کے دل میں التمش کا احترام باقی تھا لیکن حالات نے پلٹا کھایا۔ وہ سیستان اور ہرات کی مہمات میں کامیابیاں حاصل کرچکا تھا۔ ان کامیابیوں نے اس کے دل میں اپنی طاقت کا غرور پیدا کردیا اور وہ نادانستگی میں اپنے ہمسائے کی خوارزم شاہی سلطنت سے ٹکرا گیا۔ اس جنگ میں تاج الدین کو شکست ہوئی۔ خوارزمیوں نے غزنی پر قبضہ کرلیا۔ تاج الدین اپنی پرانی جاگیر کرمان تک محدود ہوکر رہ گیا۔

وہ غزنی کا حکمران رہ چکا تھا۔ معمولی سی جاگیر پر کس طرح قانع رہ سکتا تھا۔ ایک مرتبہ پھر اس کی آنکھیں ہندوستان پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھنے لگیں۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر غزنی کی حکومت اس سے چھن گئی ہے تو کیا ہوا، وہ ہندوستان کا بادشاہ بن کر اس کا ازالہ کرسکتا ہے۔ وہ کئی دن تک یہ خواب دیکھتا اور اپنی طاقت تولتا رہا اور بالآخر التمش کی جگہ خود کو ہندوستان کا بادشاہ بنانے کا فیصلہ کرلیا۔

تاج الدین یلدوز ایک بہت بڑا لشکر لے کر کرمان سے نکلا اور ہندوستان کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔ جب تک لشکر کی دہشت سے پرندے اڑتے، سلطان شمس الدین التمش کو غزنی کی ہواؤں نے باخبر کردیا۔ اس نے تیز رفتار مخبروں کو دوڑایا۔ اطلاع ملی کہ تاج الدین ترائن کے میدانوں سے ہوتا ہوا دہلی کی طرف کوچ کر رہا ہے۔ التمش نہیں چاہتا تھا کہ وہ دہلی تک پہنچے۔ اس نے اپنے لشکر کو ساتھ لیا اور ترائن کے میدانوں کی طرف چل دیا۔ یہ میدان دہلی سے چالیس کوس کے فاصلے پر دریائے سرسوتی کے کنارے پر تھا۔

ترائن کے میدانوں میں التمش نے اپنے لشکر کو پڑاؤ کرنے کا حکم دیا۔ اگلے دن تاج الدین بھی ایک لشکرِ جرار کے ساتھ ان میدانوں میں پہنچا اور التمش کے لشکر کے سامنے پڑاؤ کرلیا۔ فاصلہ اتنا تھا کہ دونوں ایک دوسرے پر نظر رکھ سکتے تھے۔

جب دونوں لشکروں نے صفیں تقسیم کرلیں تو التمش اپنے سالاروں کو جمع کرکے ان سے مخاطب ہوا۔

''میرے بہادر سالارو! شہاب الدین غوری کو اولادِ زرینہ کے نہ ہونے کے سبب ترکی غلام جمع کرنے کا شوق تھا۔ اس نے ایک مرتبہ اپنے ایک امیر کو مخاطب کرکے کہا تھا، عام طور پر بادشاہوں کے چند بیٹے ہوتے ہیں جو اپنے باپ کی وفات کے بعد حکومت کے وارث قرار پاتے ہیں لیکن میرے کئی ہزار ایسے سعادت مند بیٹے (غلام) ہیں جو میرے بعد عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر ایک مدت تک میرا نام زندہ رکھیں گے۔ اس کا یہ کہنا صحیح ثابت ہوا۔ اس کے غلاموں میں قطب الدین ایبک بھی تھا جس نے بیس سال تک ہندوستان پر نہایت کروفر کے ساتھ حکومت کی۔ اسی کے غلاموں میں تاج الدین یلدوز بھی ہے لیکن وہ اپنے ہی آقا کی سلطنت کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے پر تلا ہوا ہے۔ پہلے اس نے قطب الدین ایبک پر حملہ کیا اور اب مجھ پر حملہ آور ہوا ہے۔ تم گواہ ہو کہ پہل میں نے نہیں کی ہے لیکن جنگ میں پہل میں کروں گا۔ تاج الدین کا قلب میرے سامنے ہے۔ علاؤ الدین جانی لشکر کے دائیں پہلو پر ضرب لگائیں گے۔ سیف الدین کوچی بائیں جانب سے دشمن پر حملہ کریں گے۔ باقی امراء جنگ شروع ہونے کے بعد اس طرح لشکر پر ٹوٹ پڑیں گے کہ تاج الدین کے لشکر میں افراتفری پھیل جائے۔''

اس حکمتِ عملی کو سمجھانے کے بعد التمش نے عزالدین کے لشکر کو ساتھ لیا اور دشمن کے لشکر کے وسط میں حملہ آور ہوگیا۔ اس کے فوراً بعد علاؤ الدین جانی اور سیف الدین دائیں بائیں سے حرکت میں آگئے۔

تاج الدین بھی ہر سمت کا جواب دینے کے لیے اپنے لشکر کے ساتھ آگے بڑھا۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ دونوں لشکر اس طرح آپس میں گتھم گتھا ہوگئے کہ اپنے پرائے کی تمیز مشکل ہوگئی۔ اسی وقت التمش کی حکمتِ عملی نے کام دکھایا۔ اس کے باقی امراء اپنے اپنے لشکر لے کر تاج الدین کے لشکر پر ٹوٹ پڑے۔ یہ ایسی افتاد تھی کہ افراتفری پھیل گئی۔ دائیں بائیں کے حصے تقریباً ختم ہوگئے اور یہاں متعین سپاہی وسطی حصے میں پہنچ گئے۔ اب التمش کا پورا لشکر

متحد ہوکر تاج الدین کے قلب پر حملہ آور ہوگیا۔ دوبدو جنگ میں قتلِ عام شروع ہوگیا۔

یہ جنگ اور نہ جانے کب تک جاری رہتی اور نہ جانے اس کا نتیجہ کیا نکلتا کہ تاج الدین کو گرفتار کرلیا گیا۔ التمش کے لشکریوں نے اسے رسیوں سے باندھ کر ایک طرف بٹھادیا۔

تاج الدین کے لشکر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ تاج الدین گرفتار ہوگیا ہے۔ اس کے بچے کھچے لشکری بھاگ کھڑے ہوئے۔ میدان جنگ میں سپاہیوں کی جگہ دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اس دھوپ میں رسیوں سے بندھا تاج الدین یلدوز سر جھکائے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے التمش کے سامنے پیش کردیا گیا۔ تاج الدین کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ بولنے کی سکت نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے وہ اپنے لیے معافی کا خواستگار ہوا لیکن التمش نے اسے معاف نہیں کیا۔ وہ اسے پہلے اپنے ساتھ دہلی لایا اور پھر بدایوں کے قلعے میں قید کردیا۔

اس نے عالمِ اسیری میں کسی مرض سے یا زہر سے موت پائی۔

☆☆☆

قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد جہاں اور بہت سے لوگوں نے خودمختاری اور سرکشی کی راہ اختیار کی، وہیں شہاب الدین کے ایک غلام اور قطب الدین ایبک کے داماد نے اپنے علاقوں کو وسعت دینے کے لیے سندھ کی طرف قدم بڑھائے۔ اس نے آگے بڑھ کر سندھ کے بیشتر قلعوں اور شہروں پر قبضہ کرلیا۔ اس نے سندھ پر اپنی مستقل حکومت قائم کرلی اور دریائے سرسوتی کے کنارے تک کے مقامات اپنے قبضے میں کرلیے۔

ناصر الدین کے حوصلے اتنے بڑھے کہ اس نے التمش کے غضب کی پروا بھی نہیں کی اور لاہور پر حملہ کرکے کچھ علاقے اپنے قبضے میں کرلیے۔ یہ اس کی غلطی تھی ورنہ تو التمش اس کی حرص وہوس کو نظرانداز کیے ہوئے تھا۔ جب وہ لاہور تک آگیا اور سرہند کا علاقہ اپنے قبضے میں کرلیا تو اس کی یہ حرکت التمش کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ اس نے ناصر الدین کو سزا دینے کے لیے اپنے لشکر کو روانگی کا حکم دے دیا۔ دریا اپنے شباب پر تھا۔ طغیانی زوروں پر تھی۔ وہ اگر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرتا تو رزم گاہ تک پہنچنے میں دیر ہوجاتی۔ اس کا لشکر دریا پار کرتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ التمش نے ہمت کی اور اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ اس نے ہمت کی تو اس کے لشکر نے بھی گھوڑوں کو دریا میں ڈال دیا۔ پورا لشکر بخیر وخوبی دریا پار کرگیا۔

اس کی اس مستعدی کی خبر جب ناصر الدین کو ملی تو وہ خوف زدہ ہوگیا۔ وہ مقابلہ کرنے کے بجائے ملتان کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ التمش نے تعاقب کرنا مناسب نہ سمجھا۔ احتیاط کے طور پر چند روز وہاں قیام کیا۔ اس کے بعد وہ اپنے لشکر کو لے کر دہلی کی طرف چلا گیا۔

یہ ممکن تھا کہ التمش کسی وقت ناصر الدین پر حملہ کرتا کہ بڑے دنوں تک ایک واقعے نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کیے رکھی۔

یہ واقعہ تھا سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کی ہندوستان میں آمد۔ سلطان جلال الدین خوارزم شاہ ایک مقام ''بروان'' پر چنگیز خاں سے ٹکرایا تھا۔ اس معرکے میں جلال الدین خوارزمی نے چنگیز خاں کو شکست دے دی۔ چنگیز خاں اس وقت تو بھاگ کھڑا ہوا لیکن ایک دوسرے محفوظ مقام پر پڑاؤ ڈال کر بیٹھ گیا۔ اسے مناسب موقع کا انتظار تھا تاکہ اپنی شکست کا انتقام لے سکے۔ یہ موقع اسے خودبخود مل گیا۔

اس جنگ اور فتح کے دوران ایک بیش قیمت گھوڑا ہاتھ لگا۔ اس گھوڑے پر جلال الدین کے دو سالاروں کے درمیان تکرار ہوگئی۔ ان سالاروں کے نام سیف الدین اغراق اور امین الملک تھے۔ دونوں اس گھوڑے کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس تکرار کے دوران امین الملک نے سیف الدین کے سر پر گھوڑے کا چابک دے مارا۔ سیف الدین نے جلال الدین سے شکایت کی۔ امین الملک نہایت لائق سردار تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ تیس ہزار فوج اس کی کمانداری میں تھی۔ اس لیے جلال الدین نے اس کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ سیف الدین کو جلال الدین پر غصہ آیا۔ اس نے اپنے لشکر کو ساتھ لیا اور سلطان کو چھوڑ کر چلا گیا۔

چنگیز خاں موقع کی تاک میں تھا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ جلال الدین کا ایک سالار اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے تو اس نے موقع غنیمت جانا اور جلال الدین سے انتقام لینے کے لیے پیش قدمی شروع کردی۔

جلال الدین غزنی کے مشرق کی طرف پیچھے ہٹا لیکن مغل تیزی سے اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ اس نے نئے حلیفوں کو اپنی کمک کے لیے بلانے کو قاصد بھیجے لیکن ان کے راستے میں منگول حائل تھے جو تمام دروں پر قابض تھے اور ان کی نگرانی کر رہے تھے۔

جلال الدین خوارزم شاہ اپنی تیس ہزار فوج کے ساتھ

پہاڑیوں کے پیچھے اتر کے دریائے سندھ کی وادی میں پہنچا۔ اسے امید تھی کہ وہ دریائے سندھ کو عبور کرلے تو پھر اسے شمس الدین التمش کی مدد حاصل ہوجائے گی۔ چنگیز خاں کو اندازہ ہوگیا تھا کہ جلال الدین کس ارادے سے آگے بڑھ رہا ہے۔ وہ نہایت تیزی سے جلال الدین کا تعاقب کرنے لگا۔ یہ فاصلہ اس نے اتنی تیزی سے طے کیا کہ پانچ روز کی مسافت کا فاصلہ طے کرکے نصف روز کے فاصلے پر رہ گیا۔

جلال الدین نے جان پر کھیل کر دریا کا رخ کیا۔ دریا عبور کرنا چاہتا تھا لیکن یہ دیکھ کر ٹھٹک گیا کہ وہ ایسے مقام پر کھڑا ہے جہاں دریا کا بہاؤ اتنا تیز اور پانی اتنا گہرا ہے کہ دریا کو پار نہیں کیا جاسکتا۔ اب کیا کیا جائے؟ اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر آخری مقابلے کے لیے پلٹا۔ وہ اس وقت نہایت محفوظ مقام پر تھا۔ اس کا بایاں پہلو ایک پہاڑ کے تلے محفوظ تھا اور اس کے دائیں بازو پر دریا کا موڑ اس کی حفاظت کررہا تھا۔

جلال الدین نے حکم دیا کہ کنارے پر جتنی کشتیاں ہیں جلادی جائیں تاکہ کسی کے دل میں بھاگنے کا خیال تک نہ آئے۔ میدان جنگ میں اسے موقع کی جگہ مل گئی تھی۔ اب اس کا فرض تھا کہ یا تو اس جگہ کو سنبھالے یا نیست و نابود ہوجائے۔

رات کے اندھیرے میں منگولوں نے صف آرائی کرلی اور صبح ہوتے ہی آگے بڑھنے لگے۔ چنگیز خاں اور اس کا نشان اور خاقانی محافظ دستے کے دس ہزار سپاہی قلب لشکر کے پیچھے تھے۔

جلال الدین نے اپنے سپاہی آگے بڑھائے۔ سب سے پہلے امین الملک نے اس بہادری سے حملہ کیا کہ مغلوں کو دریا کے کنارے کنارے پیچھے ہٹنا پڑا۔ کئی مرتبہ جمع ہوئے اور کئی مرتبہ منتشر کردیے گئے۔

اونچے سنگلاخ پہاڑوں کی وجہ سے مغل رک گئے تھے۔ جلال الدین نے ''ابھی یا کبھی نہیں'' کے مصداق فوج کے منتخب دستوں کے ساتھ مغلوں کے لشکر پر دھاوا بول دیا۔ مغلوں کو کاٹتا ہوا، چنگیز خاں کو ڈھونڈتا ہوا ان کے قلب میں گھس گیا۔

جلال الدین کو چنگیز خاں کی تلاش تھی لیکن وہ وہاں تھا ہی نہیں۔ اس کا گھوڑا مارا جاچکا تھا اور وہ کسی اور گھوڑے پر سوار ہوکر کسی اور طرف چلا گیا تھا۔

مغلوں کا وہ برا حال تھا کہ معلوم ہوتا تھا خوارزمیوں نے فتح حاصل کرلی۔ مسلمانوں کے نعرے میدان میں گونج رہے تھے۔

مغل قلب لشکر جو اس دھاوے سے ہل گیا تھا، جم کے لڑتا رہا۔ چنگیز خاں نے حکم دیا کہ لشکر کا ایک حصہ جس طرح بھی ہو پہاڑوں کے اس پار پہنچ جائے۔

یہ مغلوں کی پرانی الٹ دینے والی چال تھی جس سے وہ اپنے نشان کے ساتھ دشمن پر چھا جاتے تھے۔ یہ لشکر سہ پہر تک اس چوٹی پر جا پہنچا جہاں جلال الدین نے بہت تھوڑے سے سپاہی چھوڑے تھے۔ یہ سب مارے گئے۔

پہاڑوں کی اس فصیل کی طرف سے خوارزمیوں کا بازو محصور ہوگیا۔ تھکے ماندے مسلمان اس بوڑھے مغل کی چالاکی اور فراست سے بالکل مجبور ہوگئے۔ اس نے آخری چالیں کچھ اس ہوشیاری سے چلیں کہ انجام قریب آگیا۔ جلال الدین نے مایوسی کے عالم میں آخری کوشش کی اور چنگیز خاں کے محافظ دستوں پر حملہ کردیا اور چاہا کہ اپنی فوج کو دریا کے کنارے سے ہٹالے۔ مغلوں نے اس کا تعاقب کیا۔ اس کے دستے منتشر ہوگئے۔

وہ دریا کے کنارے تک پہنچا تو اس کے ساتھ صرف سات سو ساتھی زندہ بچے تھے۔

جلال الدین کو یقین ہوگیا کہ اب آخری وقت آن پہنچا ہے۔ وہ ایک تازہ دم گھوڑے پر سوار ہوا۔ صرف تلوار کمر سے بندھی تھی، تیروں سے بھرا ترکش کندھے سے لٹکا رہا۔ وہ اونچی چٹان پر گھوڑے سمیت کھڑا تھا۔ نیچے بپھرا ہوا دریا تھا۔ جلال الدین نے منگولوں کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا اور پھر چٹان سے دریا میں چھلانگ لگادی اور کنارے پر پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔

چنگیز خاں جنگ کے میدان سے ہوتا ہوا دریا کے کنارے پہنچا جہاں اس نے بیس فٹ اونچی چٹان سے جلال الدین کو گھوڑے سمیت چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ خاموشی سے خوارزم شاہ کو دیکھتا رہا پھر انگشت بدنداں ہوکر بے ساختہ تحسین آمیز کلمات اس کی زبان پر آگئے۔

''وہ باپ خوش قسمت ہے جس کا بیٹا اتنا بہادر ہو۔''

جلال الدین نے دریا پار کرلیا اور بچے کھچے ساتھیوں کا انتظار کرنے لگا۔ جس وقت جلال الدین دریا میں کودا تھا، اس کا لشکر بھی پانی میں کود گیا تھا۔ جلال الدین تو آگے نکل گیا لیکن اس کے لشکریوں میں سے کچھ تو پانی میں ڈوب مرے اور کچھ منگولوں کے تیروں سے ہلاک ہوگئے۔

ایک صدمہ اسے یہ بھی اٹھانا پڑا تھا کہ جب دریائے

سندھ کے کنارے چنگیز خاں سے اس کا آخری معرکہ ہوا تو اس کا سالار امین الملک بھی جلال الدین کو چھوڑ کر پشاور کی طرف بھاگ گیا۔

جلال الدین کے لیے یہ دہرا صدمہ تھا۔ سیف الدین پہلے ہی اسے چھوڑ چکا تھا، امین الملک نے بھی بے وفائی کی۔ اسے ان دونوں کا انتظار نہیں تھا لیکن باقی لشکری بھی کٹ کٹا چکے تھے بہرحال کچھ لشکری اس کے پاس پہنچ گئے اور چند دنوں میں ان کی تعداد سو تک پہنچ گئی۔

چنگیز خاں نے جلال الدین کی تعریف تو بہت کی تھی لیکن وہ اسے زندہ چھوڑ کر کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس نے دوسرے دن اپنے ایک سردار کی سربراہی میں ایک چھوٹا لشکر جلال الدین کے تعاقب میں بھیجا۔ اس لشکر نے ایک پایاب مقام سے دریا کو پار کیا۔

اب جلال الدین ایک ایسا صحرا نورد تھا جس کا کوئی وطن نہیں تھا۔ وہ مقامی راجاؤں سے چھاپا مار جنگیں لڑ رہا تھا اور اپنی طاقت میں اضافہ کر رہا تھا۔ اس کے بچھڑے ہوئے ساتھی ایک ایک کرکے اس سے ملتے جا رہے تھے۔ مالِ غنیمت کے لالچ میں مقامی لوگ بھی اس کے ساتھ مل گئے تھے۔ اب اس کے لشکر کی تعداد پانچ چھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

منگولوں کا لشکر برابر اس کی تلاش میں لگا ہوا تھا۔ اس لشکر نے ملتان اور لاہور کو تاراج کیا۔ جلال الدین کا سراغ لگا کر تعاقب بھی کیا لیکن دہلی جانے والے قافلوں میں اس کا کھوج نہ لگ سکا۔

جلال الدین سخت مشکل میں تھا۔ تنگ آکر اس نے دہلی کا رخ کیا تاکہ سلطان التمش سے منگولوں کے خلاف امداد کا طالب ہو۔

دہلی کے قریب پہنچ کر جلال الدین نے اپنا ایک قاصد التمش کے دربار میں اس غرض سے بھیجا کہ وہ تمام واقعات التمش کے گوش گزار کرکے اس سے درخواست کرے کہ وہ اسے (جلال الدین کو) تھوڑی سی جاگیر عطا کردے تاکہ وہ منگولوں سے لڑنے کے قابل ہو جائے۔

التمش تک یہ پیغام پہنچا تو وہ عجیب کشمکش میں گرفتار ہو گیا۔ ایک طرف وہ جلال الدین کی بہادری سے خوف زدہ تھا، دوسری جانب منگولوں کی طرف سے خطرہ تھا۔ منگول جلال الدین کی تلاش میں تھے۔ اسے پناہ دینے کا خمیازہ التمش کو بھگتنا پڑ سکتا تھا۔

جلال الدین کو ٹالنے کے لیے اس نے قیمتی تحائف اس کی خدمت میں بھیجے اور یہ پیغام بھجوایا کہ ہندوستان کی آب وہوا اس کے لیے سازگار نہیں۔ اگر آپ پھر بھی بضد ہوں تو دہلی کے نواح میں زمین کا ایک ٹکڑا پیش کیا جا سکتا ہے۔

جلال الدین نے اس جواب سے سمجھ لیا کہ التمش اس کے قیام سے خوش نہیں۔ اس نے مایوسی کے عالم میں اپنے لشکر کو وطن واپسی کا حکم دے دیا۔ جب وہ واپس ہونے لگا تو اس نے شہر اوچ کو آگ لگا دی اور راستے میں جو بھی سندھ کا شہر اور قصبہ اس کو ملا جس کا تعلق ناصر الدین قباچہ سے تھا، اس کو برباد کرتا ہوا کیچ مکران کی طرف سے عراق چلا گیا کیونکہ اسے اطلاع مل چکی تھی کہ چنگیز خاں خرابی صحت کی بنا پر واپس اپنی سرزمینوں کی طرف چلا گیا ہے۔

جلال الدین کا چھوٹا بھائی غیاث الدین پیر شاہ عراق میں اپنے قدم جما چکا تھا۔ وہاں جلال الدین کی ضرورت تھی تاکہ اس کی مدد سے منگولوں کو مسلمانوں کے علاقوں سے نکالا جائے۔

چنگیز خاں کا بھیجا ہوا لشکر بھی ملتان اور لاہور کی گرمی سے اکتا گیا اور التمش کی تلاش چھوڑ کر واپس پلٹ گیا۔

یہ مصیبت بھی ٹلی۔ التمش اب قدرے پرسکون تھا۔ دونوں خطرے ایک ساتھ ہندوستان سے رخصت ہو گئے تھے۔

ناصر الدین قباچہ، جلال الدین خوارزمی کے خوف سے دبکا بیٹھا تھا۔ اس کے عراق روانہ ہوتے ہی اسے التمش کے ہاتھوں اپنی شکست یاد آگئی۔ وہ اب بھی التمش سے خوف زدہ تھا اس لیے کھل کر سامنے آنے کے بجائے خفیہ سازشوں میں مشغول ہو گیا۔

اس وقت ملتان میں حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی مقیم تھے۔ سلطان شمس الدین التمش جو ناصر الدین قباچہ کا حریف تھا چونکہ نہایت عابد و زاہد تھا اس لیے حضرت زکریا ملتانی کا رجحان قلبی اس کی طرف تھا۔ ملتان میں ناصر الدین کی عمل داری تھی اور وہ التمش کے خلاف سازشوں میں مصروف تھا۔ حضرت بہاء الدین زکریا اور ملتان کے قاضی مولانا شرف الدین اصفہانی نے ان سازشوں کو پسند نہ کیا۔

ایک روز شرف الدین اصفہانی بہاء الدین زکریا ملتانی کی خانقاہ پر حاضر ہوئے۔ دونوں بزرگوں نے ناصر الدین قباچہ کی ممکنہ سازش پر تبادلہ خیال کیا۔

”التمش دین اسلام کا نامور فرزند ہے۔ اولیاء اللہ کی صحبت میں رہتا ہے اور فقرا کی پذیرائی کرتا ہے۔ اگر وہ نہ رہا تو دین اسلام پر کاری ضرب لگے گی۔ اگر قباچہ اپنی سازش میں کامیاب ہو گیا تو التمش کی بادشاہت یقینی طور پر جاتی رہے گی۔ ہمارا فرض ہے کہ التمش کو اس سے باخبر کیا جائے۔“ حضرت بہاء الدین نے فرمایا۔

”آپ کے خیال میں کیا طریقہ مناسب ہوگا؟“

”ہم دونوں کو چاہیے کہ خطوط لکھ کر التمش کو مطلع کردیں۔“

”ناصر الدین کے آدمی قدم قدم پر لگے ہوئے ہیں۔ اگر یہ خطوط پکڑے گئے؟“

”ہمارا ضمیر مطمئن ہے۔ ہم دین اسلام کی سربلندی کے لیے یہ خطوط لکھیں گے۔ اگر یہ خطوط پکڑے گئے اور ہم سزا کے مرتکب ہوئے تو بھی ہم اللہ کی نظروں میں سرخرو ہوں گے۔“

اس کے بعد دونوں حضرات نے التمش کے نام الگ الگ خط لکھے اور دو مختلف قاصدوں کو دہلی کی طرف روانہ کردیا۔

جس خدشے کا اظہار کیا گیا تھا، وہی ہوا۔ ان دونوں بزرگوں کے خطوط قباچہ کے آدمیوں کے ہاتھ لگ گئے اور ناصر الدین تک پہنچا دیے گئے۔ وہ ان خطوط کو پڑھ کر نہایت مشتعل ہوا اور دونوں بزرگوں کو اپنی مجلس میں طلب کرلیا۔ حضرت بہاء الدین زکریا کو اپنی داہنی طرف بٹھایا اور قاضی شرف الدین کو اپنے سامنے بٹھایا۔

”یہ خط آپ ہی نے تحریر کیا ہے؟“ ناصر الدین نے خط ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”کیا میں اسے غداری تصور نہ کروں؟“

قاضی صاحب نے جواب میں خاموشی اختیار کی۔

”کیا میں اس خاموشی کو آپ کا جرم تصور کروں؟“

قاضی شرف الدین اس کے بعد بھی خاموش تھے۔

ناصر الدین قباچہ نے جلاد کو حکم دیا کہ اسی وقت قاضی شرف الدین کا سر قلم کردیا جائے۔ جلاد نے حکم کی تعمیل کی اور ان کو شہید کردیا۔

اس کے بعد حضرت شیخ بہاء الدین کا خط ان کے ہاتھ میں دیا۔

”مجھے امید ہے آپ بھی انکار نہیں کریں گے۔“

حضرت بہاء الدین، قاضی شرف الدین کی سزا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے لیکن اس کے باوجود نہایت بےخوفی سے فرمایا۔

”بے شک! یہ میرا خط ہے مگر میں نے خدائے تعالیٰ کے حکم سے لکھا ہے اور بالکل صحیح لکھا ہے۔“

ان کے اس کہنے میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ ناصر الدین کانپ اٹھا اور اس نے آپ سے معافی چاہی اور آپ کو نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کیا۔

ناصر الدین کو اب یہ شک ہو گیا تھا کہ ایسا ہی کوئی خط التمش تک پہنچ چکا ہو اور وہ چوکنا ہو گیا ہو۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی قدم اٹھائے، مجھے اپنے ارادوں کی تکمیل کر لینی چاہیے۔ وہ ایک لشکر کے ساتھ حرکت میں آیا اور سلطان التمش کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کرکے بیٹھ گیا۔ التمش کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ یہ حرکت کرے گا مگر جب ان واقعات کی اطلاع ہوئی تو وہ بھی ایک لشکر جرار کے ساتھ دہلی سے نکلا۔

منصورہ شہر کے نواح میں دریائے چناب کے کنارے دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہوئے۔

التمش نے اپنی روایت کے مطابق لشکر کا قلب اپنے پاس رکھا۔ دائیں پہلو پر عزالدین کو متعین کیا اور بائیں پہلو پر علاؤالدین جانی کو کماندار مقرر کیا۔ ایک اور سردار کذلک خاں کو پڑاؤ کے اندر رہنے کی تلقین کی اور حکم دیا کہ وہ اس وقت دشمن پر ضرب لگائے جب جنگ اپنے عروج پر ہو۔

جنگ کی ابتدا قباچہ نے کی کیونکہ وہ اپنے لشکر کی کثرت دیکھ کر یقین کرسکتا تھا کہ جیت اسی کی ہوگی۔

جنگ اپنے عروج پر تھی۔ گھمسان کا رن پڑ رہا تھا کہ کذلک خاں جو پڑاؤ میں ٹھہرا ہوا تھا، اچانک جنگ میں کود پڑا۔ وہ جس پہلو پر حملہ آور ہوا تھا، تباہ ہو کر رہ گیا۔ اس پہلو کے لشکری اپنی جانیں بچانے کے لیے لشکر کے دوسرے حصوں کی طرف کھسکنا شروع ہو گئے۔ لشکر میں ہلچل اور افراتفری پھیل گئی۔

ناصر الدین قلب میں ڈٹا ہوا تھا لیکن تھوڑی دیر میں اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کی شکست یقینی ہے۔ اس نے اپنے وزیر کو حکم دیا کہ وہ اس تمام خزانے کو جو قلعہ ”اوچ“ میں ہے، قلعہ بھکر میں منتقل کردے اور خود بھی قلعہ بھکر کی طرف بھاگ گیا۔

التمش نے عزالدین اور کذلک خاں کو اوچ روانہ کیا۔ اس کے چار روز بعد وہ خود بھی اپنے لشکر اور ہاتھیوں کے ساتھ اوچ پہنچ گیا۔ اس وقت تک ناصر الدین قلعہ بھکر کی طرف بھاگ چکا تھا۔ التمش نے اپنے وزیر نظام الملک محمد بن اسعد کو اس کے تعاقب میں قلعہ بھکر کی طرف بھیجا اور خود ایک ماہ تک قلعہ اوچ کا محاصرہ کرکے جنگ کرتا رہا۔

ناصر الدین کو اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کا آفتاب اقبال زوال پذیر ہے۔ اب کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنے چند رشتے داروں اور عزیزوں کے ساتھ زر و جواہر اور اشرفیوں کو صندوقوں میں بھروا کر کسی قریبی جزیرے کے ارادے سے روانہ ہوا۔ اتفاقاً اس کی کشتی جس میں وہ سوار تھا، غرق ہو گئی۔ پھر ناصر الدین کا بھی کچھ

پتا نہ چلا۔

ایک روایت ہے کہ وہ قلعہ اوچ کی فتح کی خبر سن کر دریائے سندھ میں ڈوب کر مر گیا۔ ناصرالدین قباچہ کی وفات کے بعد اس کی دولت اور خزانہ سلطان التمش کے پاس روانہ کر دیا گیا۔ التمش نے بندرگاہ دیبل سے تمام ملک اپنے قبضے میں لا کر اپنے عامل مقرر کر دیے۔

☆☆☆

لکھنوتی اور بہار کے علاقوں پر محمود خلجی کی حکمرانی تھی۔ وہ جب تک زندہ رہا، قطب الدین ایبک کا مخلص بن کر رہا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا غیاث الدین تخت نشین ہوا۔ اس نے تخت پر بیٹھتے ہی تمام عہدے اپنے تجربہ کار امیروں میں تقسیم کر دیے اور خود عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا۔

مؤرخین کا بیان ہے کہ اس نے اپنے حرم میں بہت سی خوب صورت کنیزیں جمع کر رکھی تھیں۔ کوئی ان میں ساز بجانے میں مہارت رکھتی تھی تو کوئی فنِ رقص میں بے مثال تھی۔ ان کنیزوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں بادشاہ کے حرم میں دس ہزار کے قریب کنیزیں اور راجاؤں کی بیٹیاں جمع ہو گئیں۔ بادشاہ نے ان عورتوں کو عہدے عطا کیے۔ کسی کو وکیل، وزیر اور دبیر اور منجم مقرر کیا تو کسی کو محتسب، مفتی، حافظ اور موذن بنایا۔ پانچ سو ترکی کنیزوں کو مردانہ لباس پہنا کر تیر اندازی اور نیزہ بازی ... کی تعلیم دلوائی اور ان کو سپاہ ترک کا لقب دیا۔ بوڑھی اور بدشکل عورتوں کو شاہی حرم سرا میں داخل نہ کیا جاتا تھا اور نہ ہی وہ کسی خدمت پر مامور ہو سکتی تھیں۔

ان عیش پرستیوں کے ساتھ ساتھ خوفِ خدا بھی بہت تھا۔ ہر رات اپنے تکیے کے نیچے ایک سو اشرفیاں رکھ کر سوتا تھا اور صبح ہوتے ہی ان اشرفیوں کو محتاجوں اور مستحقین میں تقسیم کر دیتا تھا۔ شاہی حرم میں ایک ہزار کنیزیں ایسی تھیں جنہوں نے قرآن حفظ کر رکھا تھا۔ بادشاہ نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ جب وہ لباس تبدیل کرے، اس وقت تمام کنیزیں قرآن مجید ختم کر کے شاہی لباس پر دم کریں۔ جب ایک گھڑی رات باقی رہ جاتی تھی تو بادشاہ بیدار ہو کر یادِ الٰہی میں مصروف ہو جاتا تھا۔ اس نے اہلِ حرم کو تاکید کر رکھی تھی کہ تہجد کی نماز کے لیے اسے بہر قیمت بیدار کیا جائے۔

بادشاہ نے یہ بھی حکم دے رکھا تھا کہ جب وہ عیش پرستی میں مشغول ہو یا دنیاوی امور میں مصروف ہو تو اس کے سامنے... ایسی چیزیں لائی جائیں کہ جس پر کفن کا اطلاق ہو سکے تاکہ وہ اپنے انجام سے بے خبر نہ رہے۔ اسی طرح اسے نشہ آور چیزوں سے نفرت تھی۔ اس کا زیادہ وقت حرم سرا میں گزرتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اپنے باپ کے زمانے میں اس کا زیادہ وقت میدانِ جنگ میں گزرا ہے اس لیے اب وہ باقی دن عیش و عشرت میں گزارے گا۔

دہلی کے سلطان لکھنوتی اور بہار کو سلطنت دہلی کا حصہ سمجھتے تھے۔ محمود خلجی ان علاقوں کا حکمران ضرور تھا لیکن قطب الدین ایبک کا فرماں بردار تھا اور اپنی آمدنی کا بڑا حصہ اسے دیا کرتا تھا لیکن جب غیاث الدین حکمران ہوا تو اس نے خراج دینا بند کر دیا۔ اس کی عیش پرستیوں کے قصے بھی التمش کے کانوں تک پہنچتے رہے تھے۔ اس نے غیاث الدین کے نام خط لکھا کہ وہ بہار اور لکھنوتی کے علاقے سلطنت دہلی کے حوالے کر دے۔ غیاث الدین کا حال یہ تھا کہ ہفتوں حرم سرا سے باہر نہ نکلتا تھا۔ تمام امور اس کے وزرا انجام دیا کرتے تھے۔ التمش کا خط پہنچ ضرور گیا تھا لیکن اسے غیاث الدین تک نہیں پہنچایا گیا۔ التمش نے اس تاخیر کو انکار سمجھا اور بہار کی طرف متوجہ ہونے کا ارادہ کرنے لگا۔

قطب الدین نے بہار کا علاقہ بختیار خلجی کو دے دیا تھا اور خود اسے فتح کرنے سے باز رہا تھا لیکن التمش نے اسے فتح کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کے دور میں بے اندازہ فتوحات ہو رہی تھیں لہٰذا لشکر تیار ہی رہتا تھا۔ لشکر میں اس لیے بھی جوش و خروش تھا کہ التمش بذات خود ہر معرکے میں شریک ہوتا تھا حالانکہ اس کے پاس ایسے سالار موجود تھے جن پر وہ ان مہمات کو چھوڑ سکتا تھا۔

اس نے عزالدین اور کزلک خاں کو طلب کیا اور بنگال کا نقشہ اپنے سامنے بچھا لیا۔ غیاث الدین کا ذکر نکل آیا۔ اس کے حرم کی باتیں سامنے آئیں۔

"جو شخص دنیا بھر کی عورتیں اپنے حرم میں جمع کرنے کا شوقین ہو اور تمام معاملات عورتوں کے سپرد کر دے، اس کی سلطنت کسی وقت بھی ختم ہو سکتی ہے۔ کسی مسلمان حکمران کے کمزور ہونے کا مقصد ہندوستان میں یہ ہے کہ کسی وقت بھی وہاں ہندوؤں کا غلبہ ہو سکتا ہے۔ بہار اور لکھنوتی قطب الدین ایبک نے محمد بختیار خلجی کے لیے چھوڑ دیے تھے اور اس نے انہیں فتح کیا تھا۔ اس لیے دراصل یہ علاقے دہلی کا حصہ ہی سمجھے جاتے ہیں۔ میں نے غیاث الدین خلجی کو خط لکھ کر مطالبہ کیا تھا کہ بہار اور لکھنوتی ہمارے حوالے کر دے لیکن اس نے خط کا جواب دینا بھی گوارا نہیں کیا۔ انکار تو ہم سن لیتے لیکن ہماری ایسی تذلیل کہ کوئی ہمارے خط کا جواب تک نہ دے۔ میں اس کے خلاف لشکر کشی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔"

دونوں سرداروں نے اس کی تائید کی اور لشکر کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ ایک مرتبہ پھر دہلی کے راستوں پر غبار بلند ہوا۔ اب التمش کی حکمرانی صرف دہلی تک محدود نہیں رہی تھی لہٰذا جس علاقے سے گزرا مختلف لشکر اس کے ساتھ ہوتے گئے۔

غیاث الدین کی سواری بازار سے گزر رہی تھی کہ ایک بڈھا اور بڑھیا سپاہیوں کے کوڑوں کی پروا کیے بغیر بادشاہ کی سواری تک پہنچ گئے اور فریاد کرنے لگے۔

"مالک! ہمارے ساتھ تو بہت برا ہوا ہے۔ ہماری لڑکی کو آپ کے ایک درباری نے اغوا کر لیا ہے۔ ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے۔"

"تم لوگ کس لڑکی کی بات کر رہے ہو؟"

"وہی جو آپ کا درباری اغوا کر کے لایا ہے۔"

غیاث الدین نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ لڑکی کے ماں باپ کو شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا جائے۔ جیسے ہی تفتیش کے بعد معلوم ہو گا، اس درباری کو سزا دی جائے گی۔

ان دونوں کو مہمان خانے میں ٹھہرا دیا گیا۔ معلوم کیا گیا تو اس لڑکی کا پتا لگ گیا۔ اس درباری کا علم بھی ہو گیا لیکن لطیفہ یہ ہوا کہ وہ لڑکی اس وقت خود بادشاہ کے حرم میں تھی۔ بادشاہ حیران تھا کہ وہ لڑکی اس کے حرم میں کیسے آ گئی۔ اس نے اس درباری کو بلایا جو اسے لایا تھا اور تفصیل معلوم کی۔

درباری نے بتایا۔ "آپ کو یاد ہو گا ایک روز آپ نے فرمایا تھا کہ میرے حرم میں ہزاروں عورتیں ہیں لیکن جس حسن کو میری نگاہیں ڈھونڈتی ہیں، وہ مجھے آج تک نہیں ملا۔ میں نے یہ سن کر کہا تھا کہ اگر یہ خدمت میرے سپرد کی جائے تو میں ایسی لڑکی لا سکتا ہوں۔ پھر میری اس لڑکی پر نظر پڑی۔ میں نے اسے اغوا کر کے آپ کے سپرد کر دیا۔"

"بدبخت..... یہ تو نے کیا کیا؟ اس کی قیمت تو ادا کرتا۔"

اس کے بعد غیاث الدین نے علما کو طلب کیا اور ان سے پوچھا کہ درباری کو تو سزا ملے گی لیکن میری کیا سزا ہو گی کہ میں اسے اپنے تصرف میں لایا؟

علما بادشاہ کے لیے کیا سزا تجویز کر سکتے تھے۔ انہوں نے اسے بری الذمہ قرار دے دیا۔

"یہ فعل آپ سے نادانستگی میں سرزد ہوا ہے اس لیے آپ نے کوئی جرم نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ اس کی قیمت ادا کر دیں۔"

بادشاہ نے چاہا کہ لڑکی کے ماں باپ کو قیمت ادا کرے لیکن اس کے ماں باپ بضد تھے کہ انہیں تو اپنی لڑکی چاہیے۔ بادشاہ کا کہنا تھا کہ جو عورت میرے حرم میں آ گئی، وہ باہر نہیں جا سکتی۔

لڑکی کے ماں باپ روتے پیٹتے چلے گئے۔ بددعائیں بھی دیتے چلے جا رہے تھے کہ خدا تجھے بادشاہ نہ رکھے۔

جس وقت یہ واقعہ پیش آ رہا تھا، اسی وقت معلوم ہوا التمش اپنا لشکر جرار لے کر پہنچ گیا ہے۔ عام لوگوں کی زبان پر یہی تھا کہ بڈھے، بڑھیا کی بددعا لگ گئی۔

غیاث الدین بھی بڑی تیاری سے نکلا۔ کچھ دیر تو گھمسان کا رن پڑا لیکن جلد ہی غیاث الدین کو اندازہ ہو گیا کہ شکست اس کے قریب کھڑی ہے۔ اس نے اپنے سالاروں سے مشورہ کیا اور اپنا وفد سلطان کے پاس صلح کی درخواست کے ساتھ بھیجا۔ التمش نے اس درخواست کو قبول کیا۔ اس کے نتیجے میں بہار اور لکھنوتی اس کی مملکت میں شامل کر دیے گئے۔ اس نے وہاں اپنا خطبہ و سکہ جاری کیا اور خلجی سردار سے اڑتیس زنجیر ہاتھی اور اسی ہزار روپیا نقد لے کر اسے آزاد کر دیا اور اپنے بڑے بیٹے کو ناصرالدین کا خطاب دے کر لکھنوتی کا حاکم مقرر کر دیا اور خود دہلی واپس آ گیا۔

☆☆☆

قاضی حمیدالدین ناگوری ہندوستان تشریف لائے ہوئے تھے اور خلق خدا کی ہدایت کا مقدس فریضہ انجام دے رہے تھے۔ قاضی صاحب فقرا کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو سماع کو پسند فرماتے تھے۔ اس لیے ان کی خانقاہ میں روزانہ محفلِ سماع منعقد ہوتی تھی۔ بعض علما ان کے اس فعل پر معترض تھے۔ ان میں ملا عمادالدین اور ملا جلال الدین پیش پیش تھے۔ ان کو التمش کے دربار میں بھی اثر رسوخ حاصل تھا۔ ایک روز انہوں نے التمش سے قاضی حمیدالدین کی شکایت کی اور سماع کے خلاف تقریر کر کے التمش کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ قاضی حمیدالدین کو سماع سے منع کر دیا جائے۔

التمش نے قاضی حمیدالدین کو دربار میں طلب کیا۔ اعزاز و اکرام کے ساتھ بٹھایا۔ ملا عمادالدین اور جلال الدین بھی وہاں موجود تھے۔ ان دونوں نے قاضی صاحب سے سوال کیا۔

"سماع حرام ہے یا حلال؟" (سماع وہ محفل ہے جس میں صوفیانہ کلام گا کر پڑھا جاتا ہے)

قاضی صاحب نے جواب دیا۔ "اہلِ قال کے لیے حرام ہے اور اہلِ حال کے لیے حلال۔" اس کے بعد آپ

نے التمش کی طرف رخ کر کے فرمایا۔

"آپ کو وہ وقت تو یاد ہوگا کہ ایک رات بغداد میں درویش اور اہلِ حال سماع میں مشغول تھے اور آپ اس وقت غلام تھے۔ رات بھر اس محفل میں شمع لیے کھڑے رہے تھے۔ درویشوں نے آپ کی اس خدمت گزاری کی وجہ سے آپ پر نظر ڈالی اور آپ ان درویشوں کی دعا کی بدولت اس سلطنت پر پہنچے۔ آپ کو تو سلطنت ہی اس محفلِ سماع کی بدولت ملی ہے۔"

قاضی صاحب کی زبان سے یہ واقعہ سن کر التمش کی آنکھوں کے سامنے وہ تمام واقعہ پھر گیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ التمش، قاضی صاحب سے بڑی مہربانی کے ساتھ پیش آیا اور انہیں بے حد تعظیم و تکریم کے ساتھ رخصت کیا۔

قاضی صاحب سے ملاقات کرنے کا یہ اثر ہوا کہ التمش نے محافلِ سماع کو ممنوع قرار نہ دیا بلکہ خود بھی قاضی صاحب کی خانقاہ میں حاضری دیتا اور سماع اور فقرا کی محبت سے لطف اندوز ہوتا۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ سے اسے بڑی عقیدت تھی۔ وہ ان کی خدمت میں پابندی سے حاضری دیتا اور دعائیں سمیٹتا تھا۔ دیکھنے والے دیکھتے تھے کہ ایک پرشوکت بادشاہ حضرت بختیار کاکیؒ کے قدموں میں کسی معمولی ملازم کی طرح بیٹھتا اور دعائیں سمیٹتا تھا۔

جب بختیار کاکیؒ کا وصال ہوا اور نمازِ جنازہ کا وقت آیا تو بختیار کاکیؒ کی وصیت دہرائی گئی۔ آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ میری نمازِ جنازہ وہ پڑھائے گا جو کبھی زنا کے قریب نہ گیا ہو اور نمازِ عصر سے پہلے کی سنتیں نہ چھوڑی ہوں۔ نماز کی صفوں سے کوئی باہر نہ نکلا جو یہ دعویٰ کرتا ہو، بالآخر سلطان التمش امامت کے لیے باہر نکلا۔

"میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا راز کسی پر ظاہر ہو لیکن حضرت نے میرا پردہ فاش کر دیا۔"

اس واقعے کی بڑی شہرت ہوئی۔ وہ لوگ جو دشمنانِ اسلام تھے اور کسی صورت نہیں چاہتے تھے کہ اسلام اور مسلمانوں کا غلبہ ہو، ان کے دلوں پر سانپ لوٹنے لگا۔ التمش ان کی آنکھوں میں کانٹا بن کر کھٹکنے لگا۔ یہ وہی لوگ تھے جن کا خاتمہ کرنے کے لیے محمود غزنوی نے ملتان پر حملہ کیا تھا اور پھر شہاب الدین غوری آیا تھا۔ ان کا زور ٹوٹ گیا تھا اور یہ منتشر ہو گئے تھے لیکن اب یہ پھر جمع ہونے لگے تھے۔ یہ "ملاحدہ" قرامطی کہلاتے تھے۔ ان کا مرکز ملتان تھا لیکن اب ان کی قوت ٹوٹ گئی تھی اور یہ اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے تھے۔

اس فرقے کی ابتدا کوفہ میں ہوئی تھی۔ ایک شخص جس کا نام یحییٰ تھا، مضافات کوفہ میں ظاہر ہوا تھا۔ وہ اپنے آپ کو قرامطہ کے نام سے موسوم کرتا تھا اور کہتا تھا کہ میں مہدی موعود کا ایلچی ہوں۔ لوگ اس کی طرف مائل ہونے لگے۔ جب اس کے مریدوں کی تعداد بڑھ گئی تو اس نے ان میں سے بعض کو اپنا نقیب مقرر کر کے مختلف علاقوں میں روانہ کیا تاکہ لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کریں۔

یہ شخص عجیب و غریب عقائد و اعمال کی تعلیم دیتا تھا۔ نماز بھی اور ہی قسم کی تھی۔ روزے بھی رمضان کے نہیں بلکہ سال کے خاص خاص مہینوں کے خاص خاص ایام میں رکھے جاتے تھے۔ شراب کو اس نے حلال کر دیا تھا۔ غسل جنابت کے لیے صرف وضو کافی تھا۔

یہ تقریباً 275ھ کا واقعہ ہے۔

اس نے اپنا نام قرامط رکھا تھا اس لیے اس کے ماننے والے قرمطی یا قرامطی کہلاتے تھے۔

کوفے کے گورنر نے ان حالات سے مطلع ہو کر قرامط کو گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا۔ چند روز کے بعد یہ شخص محافظوں سے ساز باز کر کے قید خانے سے فرار ہو گیا۔ اس کے اس طرح غائب ہونے کو اس کے مریدوں نے اس کی کرامت قرار دیا اور یہ مشہور ہو گیا کہ وہ واقعی امام مہدی کا ایلچی ہے۔

چند روز کے بعد یحییٰ یعنی قرامط پھر نمودار ہوا اور اپنے آپ کو قائم بالحق کے لقب سے موسوم کر کے لوگوں کو اپنے گرد جمع کرنے لگا۔ اس جماعت نے دمشق پر حملہ کر دیا جس میں یحییٰ قتل ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے بھائی حسین نے اس جماعت کو منظم کیا۔ یہ بھی قتل ہو گیا۔

حسین کے بھائی علی نے اس جماعت کا علم بلند رکھا۔ طبریہ اور دمشق میں لوٹ مار کا بازار گرم کرنے لگا۔ یمن کے ایک علاقے پر قبضہ کر لیا اور حجاز و شام میں لوٹ مار مچانی شروع کر دی۔

یہ جدوجہد مختلف برسوں میں مختلف ہاتھوں میں آتی رہی اور یہ گروہ دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف ہاتھوں کے ذریعے پھیلتا گیا۔ ہندوستان میں ملتان ان کا مرکز بن گیا۔

دسویں صدی عیسوی میں ملتان پر لودھی خاندان برسرِ اقتدار آیا۔ اس کے عہدِ حکومت میں قرامطیوں نے بہت زور پکڑا اور ان کے اہم پیروکار عبداللہ قرامطی نے مختلف مقامات فتح کرتے ہوئے ملتان کا رخ کیا اور لودھی سے ٹکرایا۔ لودھی زیر ہوئے۔ ان قرامطیوں کی وجہ سے ملتان میں لوٹ مار کا بازار گرم ہوا۔

اس کے بعد پہلے سلطان محمود غزنوی نے اور بعد میں شہاب الدین غوری نے ملتان کے قرامطیوں پر ضرب لگائی اور اب التمش کا زور توڑنے کے لیے کوشاں تھے۔

☆☆☆

متھرا سے جو شاہراہ جنوب مغرب کے رخ پر بھرت پور کی طرف جاتی تھی، یہاں ایک بہت بڑا مندر بنا ہوا تھا۔ یہ مندر کم قلعہ زیادہ لگتا تھا۔ اس کی مستحکم فصیل بتاتی تھی کہ اس مندر میں زبردستی داخل ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ مندر کے اندر تہ خانوں کی ایسی بھول بھلیاں بنائی گئی تھیں کہ نیا آنے والا گم ہو کر رہ جائے۔ لاتعداد محافظ تھے۔ پروہت تھے جو یہاں رہنے والی داسیوں سے مستفید ہوتے تھے، اس کے باوجود مقدس سمجھے جاتے تھے۔

اس وقت مندر کے سامنے دو اجنبی شخص کھڑے تھے۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر تھا جبکہ دوسرا نوجوان تھا۔ نہایت خوب صورت اور جاذبِ نظر۔ اس کے سنہری بال اس کے کندھوں پر جھول رہے تھے۔ آنکھوں کا رنگ بھورا اور رنگ گورا تھا۔ وہ اتنا خوب صورت تھا کہ مندر سے باہر آنے والا پنڈت بھی اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔

"تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟" پنڈت نے پوچھا۔

بوڑھا آدمی آگے بڑھا اور پنڈت کے کان میں کچھ کہا۔

"نہیں، وہ کسی سے نہیں ملتے۔ خاص طور پر اجنبیوں سے تو قطعی نہیں ملتے اور تم لوگ تو ہندو بھی نظر نہیں آتے۔"

"ہاں، ہم ہندو نہیں ہیں لیکن مسلمان بھی نہیں ہیں اور اس وقت جو بات ہم کہنے آئے ہیں، وہ تمام ہندوؤں کے فائدے کی بات ہے۔"

"تم ہندوؤں کے فائدے کی بات کیوں کرنا چاہتے ہو جبکہ تم ہندو بھی نہیں ہو؟"

"یہ بات ہم تمہیں نہیں بتا سکتے۔"

"تم لوگ ٹھہرو، میں ابھی پوچھ کر آتا ہوں۔" تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا۔

"تم خوش قسمت ہو کہ بڑے پروہت نے تمہیں بلا لیا ہے۔"

وہ پنڈت ان دونوں کو لے کر کمروں کی بھول بھلیوں سے گزرتا ہوا ایک کمرے میں پہنچ گیا جہاں مندر کا ایک بڑا پروہت بیٹھا تھا۔ مندر کی ایک داسی اس کے قریب کھڑی تھی۔ غالباً وہ پروہت کے پاؤں دبا رہی تھی اور اب

اجنبیوں کو دیکھ کر کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی نظریں اس نوجوان پر لگی ہوئی تھیں جو ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوا تھا پھر شاید پروہت نے اشارہ کیا۔ اس نے ایک دل فریب مسکراہٹ نوجوان کی طرف اچھالی اور کمرے سے نکل گئی۔

"اب تم لوگ کہو، مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہو بلکہ پہلے اپنا تعارف کرواؤ...... تم کون ہو؟"

"اس نوجوان کا نام عبیدہ ہے اور میرا عبیدی۔ ہم دونوں قرامطی ہیں اور غیر ملکی ہیں۔ ہمیں یہاں یعنی ہندوستان اس لیے بھیجا گیا ہے کہ ہم بکھرے ہوئے قرامطیوں کو یکجا کریں اور سلطان التمش کو قتل کرنے کے لیے لوگ تیار کریں۔"

"تم لوگ التمش کو کیوں قتل کرنا چاہتے ہو؟"

"آپ جانتے ہیں لیکن شاید ہمارے منہ سے کہلوانا چاہتے ہیں۔ ان حکمرانوں نے ہمیں سخت نقصان پہنچایا ہے۔ آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ملتان پر ہی نہیں، ہندوستان کے اور بہت سے علاقوں پر ہماری گرفت تھی۔ غزنی سے سلطان محمود آیا اور ہم قرامطیوں پر کاری ضرب لگائی۔ ہم اس صدمے کو جھیل گئے اور اپنی طاقت کو پھر سے بحال کرلیا۔ اس کے بعد شہاب الدین غوری نے ہم سے ہماری طاقت چھین لی لیکن ہم نے بھی اس سے خوب انتقام لیا۔ ہمارے آدمیوں نے اسے غزنی جاتے ہوئے دریائے سندھ کے کنارے قتل کردیا۔ اب ہمارا اگلا نشانہ التمش ہے کیونکہ اگر وہ رہا تو پورے ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم ہوجائے گی۔ ابھی تو وہ فتوحات میں مشغول ہے، اس کے بعد وہ اسلامی نظام بھی قائم کرے گا جس کا نقصان آپ کو بھی ہوگا۔"

"تم نے ہمارے فائدے کی بات بھی کی تھی۔" پروہت نے کہا۔

"سوچنے کی بات ہے کہ جب ہندوستان سے مسلمانوں کی حکومت ختم ہوجائے گی تو از خود ہندوؤں کا قبضہ ہوگا لیکن یہ جب ہوگا جب تم لوگ ہمارے ساتھ تعاون کرو۔"

"آپ کو کس قسم کا تعاون درکار ہے؟"

"اس وقت قرامطی نوجوان ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں۔ اس وقت ضرورت ہے کہ انہیں یکجا کیا جائے۔ میں نے مہاکالی مندر کے استحکام اور مضبوطی کے بارے میں بہت سنا ہے۔ اس کے اندر تہ خانے بھی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے تعاون سے میں ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے قرامطیوں کو یہاں جمع کروں۔ یہاں اسلحہ بھی چھپایا جاسکتا ہے اور نوجوانوں کو تربیت بھی دی جاسکتی ہے۔ جب میں مناسب سمجھوں گا تو نوجوانوں کو یہاں سے رخصت کردوں گا جو دہلی جاکر التمش کا خاتمہ کردیں گے۔ یہی نوجوان دہلی کی حکومت پر قبضہ کرکے ہندوؤں کے حوالے کردیں گے۔ کیا یہ آپ کے فائدے کی بات نہیں؟"

حکومت کا سن کر پروہت کے منہ میں پانی بھر گیا۔

"اس سے اچھی کیا بات ہوسکتی ہے کہ ہندوستان کی حکومت ہندوؤں کو مل جائے۔ ہم آپ کے ساتھ تعاون کے لیے تیار ہیں۔ تم اپنے لوگوں کو یہاں بلاسکتے ہو۔ ہم تمہاری مدد کریں گے۔"

وہ دونوں اگلے دو دن تک مندر میں قیام کیے رہے۔ مندر کی عمارت کا جائزہ لیا۔ تہ خانوں کو اچھی طرح دیکھا بھالا اور پھر رخصت ہوگئے تاکہ اپنے کام کی ابتدا کریں اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے قرامطیوں کو اس مندر میں جمع کرنے کا عمل شروع کریں۔

جس وقت یہ دونوں مندر چھوڑ رہے تھے، اچانک وہ داسی ان کے سامنے آگئی جو پہلے دن پروہت کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔

"میرا نام اوشا ہے۔ میں یہ پوچھنے آئی تھی کہ کیا تم لوگ جا رہے ہو؟"

"ہاں ہم لوگ ایک مشن پر جا رہے ہیں، عنقریب پھر آئیں گے۔"

"میں نے تمہارا نام تو پوچھا ہی نہیں؟" اوشا نے عبیدہ سے پوچھا۔

"ہمیں اجازت نہیں ہے کہ ہم اپنا نام کسی کو بتائیں۔"

"وہ تو خیر میں پروہت سے پوچھ لوں گی لیکن اگر تم خود بتا دیتے تو مجھے خوشی ہوتی۔ میں تمہارا نام لے کر تمہیں یاد کرلیتی۔"

"تم مجھے کیوں یاد کرنے لگیں؟" نوجوان نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے دیا آتی ہے (شرم آتی ہے) مگر کہنے میں کیا حرج ہے۔ تم مجھے اچھے لگے ہو۔"

"تم مجھے عبیدہ کے نام سے یاد کرسکتی ہو۔" نوجوان نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

ان دونوں قرامطیوں نے مہاکالی مندر کو مرکز بناتے ہوئے وہاں اپنی طاقت کو جمع کرنا شروع کردیا۔ کچھ دنوں بعد عبیدہ کا بوڑھا ساتھی گجرات اور مالوہ کی طرف نکل گیا اور

عبیدہ کو مہاکالی مندر جانے کا حکم دیا کہ جو قرامطی وہاں پہنچ رہے ہیں، ان کی تربیت اور دیکھ بھال کا انتظام کرے۔

وہ جب مندر پہنچا تو اوشا کی خوشی دیکھنے لائق تھی۔

"آخر میری یاد تمہیں کھینچ لائی۔"

"تمہاری یاد نہیں، میرے آقا کا حکم مجھے کھینچ کر لایا ہے۔"

"تمہارے آقا کے دل میں بھی میرے آقا ہی نے ڈالا ہوگا۔"

"چلو یوں ہے تو یونہی سہی۔"

"میں تمہارے پاس بیٹھ سکتی ہوں؟"

"مجھے بہت سے کام ہیں۔"

"اچھا، میں رات میں آؤں گی جب تمہیں کوئی کام نہیں ہوگا۔"

عبیدہ کا کیا جاتا تھا۔ وہ سن کر چپ ہوگیا۔ دل میں سوچنے بھی لگا کہ ابھی تو بلا ٹلی۔ یہ رات میں آئے گی تو کسی بہانے سے پھر ٹال دوں گا۔

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بہت دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ سوچتے سوچتے اچانک ایک بجلی سی اس کے دماغ میں کوند گئی۔ اس لڑکی سے اگر دوستی گانٹھ لی جائے تو یہ بہت کام آسکتی ہے۔ اس کو اندر کی بہت سی معلومات حاصل ہوں گی۔ اسے بہلا پھسلا کر بہت سے کام لیے جاسکتے ہیں۔

جب مندر کی روشنیاں خاموش ہوگئیں، ہر طرف خاموشی چھا گئی تو عبیدہ کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ یہ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ اس وقت کون ہوسکتا ہے۔ عبیدہ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ اوشا پورے روپ سنگار کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں شمع تھی جو اس نے عبیدہ کو دیکھتے ہی بجھا دی۔ وہ اندر آگئی تو عبیدہ نے دروازہ بند کردیا۔

"تم اتنے سندر ہو، ایسا جان جوکھوں کا کام کیوں کررہے ہو؟ اگر تم کو کچھ ہوگیا تو؟"

"فکر مت کرو، مجھے کچھ ہو بھی گیا تو میرے پیچھے رونے والا کوئی نہیں۔"

"یہ تم نے کیسے سوچ لیا؟ کیا میں نہیں ہوں تمہارے پیچھے رونے والی؟ میں نے تو ایک ہی نظر میں تمہیں اپنا سب کچھ مان لیا ہے۔"

"میرا حال بھی تم سے مختلف نہیں ہے اوشا۔"

"سچ؟"

"اور نہیں تو کیا۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ تم التمش کو کب قتل کروگے؟"

پینٹر

مشہور کروڑ پتی شاعر آکاش سرہندی اخباری نمائندے کو انٹرویو دے رہے تھے۔ دوران انٹرویو انہوں نے بتایا۔ "میں فارغ وقت میں پینٹنگ کرتا ہوں۔"

"آپ پینٹنگ کرتے ہیں۔" اخباری نمائندے نے حیرانی سے پوچھا۔

"جی ہاں میں نے اپنے بنگلے کے سارے دروازے کھڑکیاں اور گیٹ خود پینٹ کیے ہیں۔"

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

آپ بھی پوچھئے؟

○ کنوارے اور شادی شدہ کے رونے میں کیا فرق ہے؟
☆ کنوارہ تکلیف محسوس کرنے پر جبکہ شادی شدہ گناہوں کو یاد کرکے روتا ہے۔
○ سسرال اور جیل میں کیا فرق ہے؟
☆ جیل میں کام کرنے کے بعد کم از کم دال، روٹی تو ملتی ہے۔
○ شادی سے پہلے ڈھول اور شادیانے بجتے ہیں اور شادی کے بعد؟
☆ گھر کے برتن۔
○ کو ایجوکیشن کا کیا مقصد ہے؟
☆ یہی کہ نوجوان طبقہ واقعی دل لگا کر پڑھے۔
○ اچھی اور بری بیوی میں کیا فرق ہے؟
☆ کیا مطلب...... کیا بیویاں اچھی بھی ہوتی ہیں؟
○ خواتین ہمیشہ جلدی میں کیوں ہوتی ہیں؟
☆ کیونکہ ان کو ہمیشہ دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

مرسلہ: جاوید علی۔ کراچی

اظہار تاسف

ایک بوڑھی غیر شادی شدہ عورت نے اخبار پڑھتے ہوئے اپنی ہم عمر غیر شادی شدہ سہیلی کو بتایا۔ "کل لیزا کا تیسرا شوہر بھی انتقال کر گیا اور وصیت کے مطابق اس کی لاش کو نذر آتش کردیا گیا۔"

بوڑھی سہیلی نے ایک طویل آہ بھر کر کہا۔ "کیسی عجیب دنیا ہے ہم میں سے کچھ ایسی ہیں کہ جنہیں ایک شوہر بھی نصیب نہیں ہوتا اور کچھ ایسی بھی ہیں جو شوہر پر شوہر نذر آتش کرتی رہتی ہیں۔"

مرسلہ: کامران خان۔ راولپنڈی

"میں تھوڑی کروں گا۔ اسے تو میرے آدمی قتل کریں گے اور دیکھنا بہت جلد کریں گے۔ کل ہی گجرات اور مالوہ سے بہت سے لوگ آنے والے ہیں۔"

"کیا اتنی جلدی ہم بچھڑ جائیں گے؟"

"کیا مطلب؟"

"جب تمہارا کام ہو جائے گا تو تم اپنے ملک چلے جاؤ گے۔"

"وہ تو جانا ہی پڑے گا۔"

"کیا میں اتنا بھی حق نہیں رکھتی کہ تمہیں روک سکوں؟"

"حق تو رکھتی ہو لیکن تم پر میرا کیا حق۔"

"کبھی وقت آیا تو بتاؤں گی کہ میں یہاں کس اذیت میں ہوں۔ مجھے یہاں سے نکال کر لے جاؤ۔ میں اپنا مذہب چھوڑ کر قرامطی بننے کو تیار ہوں۔"

"تم مجھ سے واقعی اتنی محبت کرتی ہو؟"

"یہ کوئی کہنے کی بات ہے۔" اس نے کہا اور شرما کر اٹھ گئی۔ "اب میں چلتی ہوں کل پھر آؤں گی اور تمہیں بہت سی باتیں بتاؤں گی۔"

دوسرے دن وہ پھر آئی اور واقعی عجیب انکشاف کیے۔

"اس مندر میں بہت سی داسیاں ایسی ہیں جو اغوا کر کے یہاں لائی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک میں بھی ہوں۔ یہاں آنے سے پہلے میں مسلمان تھی۔ یہاں کئی لڑکیاں ہیں جو مسلمان ہیں۔"

"تم اتنی بیزار ہو تو یہاں سے بھاگ کیوں نہیں جاتیں؟"

"تمہیں اندازہ ہو جانا چاہیے کہ یہاں سے بھاگنا اتنا آسان نہیں۔"

"یہ لڑکیاں کیوں اغوا کی جاتی ہیں؟"

"پنڈتوں کی دل پشوری کے لیے لائی جاتی ہیں اور... اپنی دانست میں یہ لوگ مسلمانوں سے انتقام لیتے ہیں۔"

"مجھے مسلمانوں سے تو کوئی غرض نہیں لیکن تم قرامطی ہو گئی ہو اس لیے میں تمہیں یہاں سے ضرور نکال لے جاؤں گا۔"

"ایک اور بات بتاؤں؟"

"بتاؤ۔"

"یہاں ایک ایسی کوٹھری بھی ہے جو ہیرے جواہرات سے بھری ہوئی ہے۔ جب ہم یہاں سے نکلیں گے تو میں یہ دولت بھی تمہارے حوالے کر دوں گی۔"

"وہ کوٹھری تو میں نے دیکھی ہے۔ اس میں تو تالا پڑا رہتا ہے۔"

"اس کی چابی پروہت کے پاس رہتی ہے۔"

"پھر تالا کھلے گا کیسے؟"

"میں نے اب تک کوشش نہیں کی لیکن کوشش کروں تو چابی حاصل کر سکتی ہوں۔"

اس کے رخصت ہونے کے بعد عبیدہ کسی اور انداز سے سوچ رہا تھا۔ اگر اوشا سے کسی طرح چابی نکلوالی جائے تو کوٹھری کی دولت آہستہ آہستہ پار کی جا سکتی ہے۔ اگر مزید وقت ہو تو اوشا کو بھی یہاں سے لے جایا جا سکتا ہے۔ راستے میں اسے کہیں چھوڑ دیا جائے اور ساری دولت لے کر چمپت ہو جایا جائے۔

اس دن کے بعد سے وہ انہی خطوط پر عمل پیرا ہو گیا تھا۔

قرامطی نمائندوں کی تربیت جاری تھی۔ اوشا اس میں پوری دلچسپی لے رہی تھی۔ پروہت تعاون کا وعدہ کر چکا تھا اس لیے اوشا پر بھی کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔

عبیدہ نے اوشا کو پوری طرح اپنے دام میں پھنسا لیا تھا۔

تیاری پوری ہو چکی تھی۔ ایسے لوگ تیار ہو چکے تھے جنہیں دہلی پہنچنا تھا۔ التمش جمعے کی نماز ادا کرنے کے لیے جامع مسجد جاتا تھا۔ بہت دن سے اس کی نگرانی کی جا رہی تھی پھر یہ طے ہوا کہ جمعے کے دن جب التمش نماز کے لیے مسجد پہنچے تو قرامطی بھی وہاں پہنچ جائیں اور نمازیوں کو شہید کرتے ہوئے التمش تک پہنچ جائیں اور اس کا کام تمام کر دیں۔

منصوبہ بڑی مہارت سے تیار کیا گیا تھا اور کامیابی کی قوی امید تھی۔

جمعے سے بہت پہلے سیکڑوں قرامطی دہلی پہنچ گئے۔ ان سب نے مسلمانوں کے حلیے بنا لیے تھے۔ یہ سب دیکھنے میں مقامی لگتے تھے۔

جمعے کی نماز سے کچھ قبل جب التمش مسجد میں پہنچ چکا تھا، قرامطیوں کا یہ گروہ اپنے اپنے ٹھکانوں سے نکلا اور مسجد میں گھس گیا۔ بہت سے نمازیوں کو شہید و زخمی کیا اور کودتا پھلانگتا ہوا التمش تک پہنچ گیا۔ اس گروہ کی سربراہی نور نامی ایک قرامطی کر رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ یہ شخص التمش پر حملہ آور ہوتا، نمازیوں نے اپنے محبوب بادشاہ کو بچانے کے لیے ہاتھ پیروں سے ان لوگوں کو مارنا شروع کر دیا۔ بعض لوگوں کے پاس تلواریں بھی تھیں۔ اتنی دیر میں بادشاہ کے ساتھ جو محافظ تھے انہیں بھی موقع مل گیا۔ یہ لوگ خوف زدہ ہو کر بھاگے۔ لوگوں نے تعاقب کیا اور ایک ایک کر کے سب کو قتل کر دیا۔ صرف ایک قرامطی زندہ بچ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا جو کسی نہ کسی طرح مہاکالی مندر تک پہنچنے میں

کامیاب رہا۔

جس وقت یہ خبر مہاکالی مندر میں پہنچی اس وقت عبیدہ اور عبیدی دونوں بڑے پروہت کے پاس بیٹھے اپنی کامیابیوں کے قصے سنا رہے تھے۔

فرار ہونے والا قرامطی ان کے پاس پہنچ گیا تھا۔ تمام تفصیل سننے کے بعد پروہت نے ان دونوں کی طرف سوال طلب نظروں سے دیکھا۔

"تم لوگ تو کہتے تھے تمہارے آدمی بے حد تربیت یافتہ ہیں۔ سمجھو التمش کو قتل کر کے ہی چھوڑیں گے۔"

"جب سے ہماری تنظیم بنی ہے ہم نے بڑے بڑے جابر حکمرانوں کا خاتمہ کیا ہے۔ یہ پہلی ناکامی ہے کہ ہم التمش کو قتل نہ کر سکے۔ اس میں بھی جیسا کہ تم خود سن چکے ہو، ہمارے آدمیوں کی غلطی ہے۔ انہیں چاہیے تھا کہ وہ مسجد میں داخل ہوتے ہی قتل عام شروع نہ کرتے بلکہ آرام سے مسجد میں داخل ہوتے۔ التمش کے ساتھ نماز میں شریک ہوتے اور جب وہ اور تمام نمازی نیت باندھ لیتے تو انہیں آرام سے قتل کر دیتے۔ بہرحال آپ فکرمند نہ ہوں، بہت جلد ہم موقع دیکھ کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔"

"وہ وقت تو جب آئے گا، تب آئے گا۔" پروہت نے کہا۔ "اس وقت تو مجھے یہ فکر ہے کہ اس حملے کے بعد سرکاری کارندے چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ اس بات کی تفتیش ضرور ہو گی کہ حملہ آور کون تھے، کس طرف سے آئے تھے اور کس طرف گئے ہیں۔ التمش اگر کسی نتیجے پر پہنچ گیا تو وہ مہاکالی مندر کا رخ ضرور کرے گا۔ یہاں اگر تم لوگ اسے مل گئے تو وہ مندر کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ زخمی شیر پہلے سے زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔"

"اگر ہماری غیر موجودگی سے مندر بچ سکتا ہے تو ہم کچھ دنوں کے لیے غائب ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان کے مختلف شہروں اور قصبوں میں ہمارے سیکڑوں ساتھی ہیں، ہم کہیں بھی قیام کر لیں گے۔ کچھ دن گزر جائیں گے تو ہم پھر اسی مندر میں آ موجود ہوں گے۔"

عبیدہ اس گفتگو کو بڑے غور سے سن رہا تھا۔ تمام گفتگو عبیدی نے کی تھی۔ جب وہ دونوں پروہت کے کمرے سے نکلے تو عبیدہ نے عبیدی سے کہا۔

"میں چلنے سے پہلے آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ شاید ہمیں کچھ دن رکنا پڑ جائے۔"

"ہمیں ایک ایک دن بھاری ہو رہا ہے۔"

"آپ سنیں تو۔"

عبیدہ نے اسے اس تمام گفتگو سے آگاہ کیا جو اس کے اور اوشا کے درمیان ہوئی تھی اور اسے کوٹھری کی دولت سے آگاہ کیا۔ یہ سن کر عبیدی کے منہ میں بھی پانی آ گیا اور وہ رکنے پر رضامند ہو گیا۔

اس رات جب اوشا اس سے ملنے آئی تو اس نے اسے خوش خبری سنا دی۔

"ہم التمش کے قتل میں ناکام ہو چکے ہیں۔ اب مجھے واپس بلایا جا رہا ہے۔ میں ہندوستان چھوڑ رہا ہوں۔ اگر تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے تو بتاؤ۔ میں اپنی منزل پر پہنچ کر تم سے شادی کر لوں گا۔"

"مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو؟ میں نے ہی تو تمہیں یہ تجویز دی تھی۔ میں تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔"

"کوٹھری میں رکھی دولت کا کیا ہو گا؟"

"چابی تو نہیں ملی لیکن مجھے اس کوٹھری تک پہنچنے کا خفیہ راستہ معلوم ہے۔ وہاں صرف ایک محافظ ہوتا ہے جسے آسانی سے ٹھکانے لگایا جا سکتا ہے۔"

"اتنی دولت ایک ساتھ جائے گی کیسے اور پھر ہم اندر سے باہر نکلیں گے کیسے؟"

"تم گھوڑوں یا اونٹوں کا انتظام کر لو۔ مندر سے باہر نکلنے کے بھی ایک خفیہ راستے کا مجھے علم ہے۔ وہاں کوئی محافظ نہیں ہوتا۔ ہم بڑی آسانی سے نکل سکتے ہیں۔ بس تمہیں دو دن انتظار کرنا ہو گا۔ بڑا پروہت کہیں جانے والا ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں یہ کام بہت آسان ہو جائے گا۔"

ان دو دنوں میں اوشا نے نہایت راز داری سے اسے وہ خفیہ راستہ دکھا دیا جو کوٹھری تک جاتا تھا۔ ان دو دنوں میں عبیدہ نے اونٹوں کا انتظام بھی کر لیا۔

جب وہ رات آئی تو اوشا نے عبیدہ کو ساتھ لیا اور خفیہ راستے کی طرف چل دی۔ یہ ایک سرنگ نما راستہ تھا۔ اوشا اس سے کچھ فاصلے پر چل رہی تھی اور وہ اس کے پیچھے تھا۔ اوشا اس سے پہلے محافظ کے پاس پہنچ گئی اور اسے باتوں میں لگا لیا۔ اتنی دیر میں عبیدہ وہاں پہنچ گیا اور تلوار کے ایک ہی وار سے محافظ کا سر تن ... سے جدا کر دیا۔

عبیدہ کوٹھری کے اندر داخل ہوا تو اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس نے ہندوستان کے مندروں کے بارے میں سن رکھا تھا لیکن اسے یہ امید نہیں تھی کہ مہاکالی مندر میں اتنی دولت ہو گی۔

"مندر سے باہر جانے کا راستہ ایسا ہے کہ اونٹ اندر لائے جا سکتے ہیں؟" عبیدہ نے پوچھا۔

"وہ تو ایک سرنگ ہے جس سے ہم دونوں بہ مشکل گزر سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں خود محنت کرنی پڑے گی۔ تمام دولت یا جتنی ہم لے جاسکتے ہیں، خود لے جانا ہوگی۔ وہ بھی چند گھنٹوں میں کیونکہ صبح کا اجالا پھیل گیا تو یہ کام مشکل ہوجائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ تم اپنے ساتھی کو اندر بلالو۔"

"وہ باہر اونٹ لیے کھڑا ہے۔ وہ وہاں سے ہٹ گیا تو اونٹ بھاگ بھی سکتے ہیں۔"

"پھر ہم خود ہی یہ کام کرتے ہیں۔ فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔"

عبیدہ بڑے بڑے تھیلے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس نے ہیرے جواہرات بھرنے شروع کردیے۔ تھیلے اتنے بھاری ہوگئے تھے کہ اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔ چند پھیرے ہی کیے ہوں گے کہ صبح کی سپیدی کے آثار نمودار ہونے لگے لہٰذا چند تھیلوں پر قناعت کرکے وہ وہاں سے نکل گئے۔

قریب ہی ایک گھنا جنگل پڑتا تھا۔ وہاں سے گزر کر وہ اجین کی سرحد پر پہنچ گئے۔ اب کسی طرح اوشا سے پیچھا چھڑانا تھا۔

"یہ راستہ خطرناک بھی ہے اور طویل بھی۔ میں عبیدی سے کہتا ہوں، وہ دوسرے راستے سے منزل تک پہنچے۔ میں اور تم دوسرے راستے سے پہنچ جائیں گے۔ اگر کسی نے تعاقب کیا بھی تو ہم اکیلے پکڑے جائیں گے۔ مال لے جانے کے مجرم تو نہیں سمجھے جائیں گے۔"

اوشا اس کی باتوں میں آگئی۔ عبیدی دوسرے راستے پر چلا گیا، اوشا اور عبیدہ دوسری طرف مڑ گئے۔ کچھ دور جانے کے بعد عبیدہ نے اوشا سے کہا۔

"تم یہاں بیٹھ کر میرا انتظار کرو۔ میں کوئی سرائے دیکھ کر آتا ہوں۔" وہ ایک مرتبہ پھر اس کے فریب میں آگئی۔ عبیدہ اسے ایک جگہ بٹھا کر آگے بڑھ گیا اور پھر تیزی سے دور ہوتا چلا گیا۔ دور بہت دور، کبھی نہ ملنے کے لیے۔

☆☆☆

سلطان التمش کے مخبر اِدھر اُدھر پھیل گئے تھے تاکہ یہ معلوم کرسکیں کہ سلطان پر حملہ کرنے والے کون تھے اور کس طرف سے آئے تھے۔ مصیبت یہ تھی کہ سب مارے گئے تھے۔ کوئی بھی زندہ نہیں بچا تھا جو کچھ بتاتا۔ صرف ایک آدمی فرار ہونے میں کامیاب ہوسکا تھا۔ اس کے بارے میں بھی کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ کس طرف گیا۔

التمش تقریباً روزانہ ہی اجلاس کررہا تھا۔ ان اجلاسوں میں اسی موضوع پر گفتگو ہوتی تھی۔ اس وقت بھی اس کے امراء جمع تھے اور یہی موضوع چھڑا ہوا تھا کہ کسی نے آکر اطلاع دی۔

"ایک عورت اجین کی طرف سے نہایت خستہ حالت میں آئی ہے اور آپ سے ملنے کی متمنی ہے۔"

"کوئی ضرورت مند ہوگی، تم پوچھتے تو سہی۔"

"ہم نے پوچھا تھا لیکن وہ صرف آپ سے ملنے کی طلب گار ہے۔ کہتی ہے وہ کچھ اہم اطلاعات لے کر آئی ہے۔"

"اگر ایسا ہے تو اسے ہمارے پاس بھیج دو۔"

یہ اوشا تھی جو کسی نہ کسی طرح دہلی پہنچ گئی تھی اور اب التمش کے سامنے کھڑی تھی۔

"میرا نام سلطانہ جہاں ہے۔ اسی دہلی کی رہنے والی ہوں۔ مجھے مہاکالی مندر کے پجاریوں نے اغوا کرلیا تھا اور میرا نام اوشا رکھ دیا تھا۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر آئی ہوں اور یہ اطلاع لائی ہوں کہ آپ پر جو مسجد میں حملہ کیا گیا تھا، وہ قرامطیوں نے کیا تھا جنہوں نے مہاکالی مندر کو اپنا مرکز بنایا ہوا تھا۔ تمام قرامطی وہاں جمع ہوئے تھے اور وہیں آپ پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا تھا۔"

"تمہیں مجھ سے کیا ہمدردی ہے جو یہ سب کچھ بتانے آئی ہو؟"

"ان کے ایک سردار نے مجھ سے محبت کے وعدے کیے تھے۔ مجھے اپنے دام میں پھنسا کر میری آبرو سے کھیلا تھا پھر مجھ سے شادی کا وعدہ کرکے مجھے وہاں سے نکال لے گیا تھا۔ مجھے ایک جگہ تنہا چھوڑ کر اور میری دولت لے کر فرار ہوگیا۔ اب میری محبت نفرت میں تبدیل ہوگئی ہے۔ میں انصاف چاہتی ہوں۔ مجھے اس کا سر چاہیے کیونکہ وہ میری دولت بھی ہڑپ کرگیا ہے۔ ویسے بھی وہ زندہ رہا تو مسلمانوں کے لیے خطرہ ہے۔"

"تم کہتی ہو وہ تمہیں چھوڑ کر بھاگ گیا...... اب وہ کہاں ہوگا؟"

"وہ بھرت پور یا گجرات کے کسی مندر میں گیا ہوگا۔ انہی مندروں میں سے کسی میں قرامطیوں کو ڈھونڈنا ہوگا کیونکہ ان ہندوؤں کے قرامطیوں سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ لوگ رن تھنبور کے قلعے میں ہوں کیونکہ یہ قلعہ مضبوط ترین سمجھا جاتا ہے۔"

"تم جب دہلی پہنچ چکی ہو تو اپنے گھر والوں کے پاس کیوں نہیں جاتیں؟"

"میں اب ان کے لائق کہاں رہی، اب تو میں زندہ رہنا بھی نہیں چاہتی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اِدھر اُدھر

دیکھا۔ التمش کے قریب لکڑی کی ایک چھوٹی میز رکھی تھی۔ اس میز پر ایک خنجر رکھا تھا۔ اوشا نے وہ خنجر اٹھالیا۔ جتنی دیر میں کوئی اسے روکتا، اس نے وہ خنجر اپنے پیٹ میں اتارلیا۔ زہر میں بجھے ہوئے اس خنجر نے اسی وقت اس کا کام تمام کردیا۔

التمش نے بھی سوچا کہ جب وہ اپنے گھر والوں کے پاس جانا نہیں چاہتی تھی تو اس کے گھر والوں کو کیوں تلاش کیا جائے۔ وہ بے چارے صبر کرچکے ہوں گے۔ دوبارہ ان کے زخم کیوں تازہ کیے جائیں۔ اوشا کو خاموشی سے دفنا دیا گیا۔

التمش نے اوشا کے انکشاف کی روشنی میں تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ رن تھنبور کا قلعہ قرامطیوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ مسلمانوں کے خلاف اٹھنے والی ہر سازش کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ اس نے اپنے قاصدوں کو رن تھنبور کی طرف روانہ کیا اور وہاں کے حاکم کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف کسی سازش میں حصہ نہ لے۔ جو مسلمان دشمن طاقتیں قلعے کو مرکز بنائے ہوئے ہیں، انہیں نکال باہر کرے۔ بصورتِ دیگر سلطان التمش مجبور ہوجائے گا کہ رن تھنبور کو فتح کرلے۔

حاکم کی طرف سے نہایت حوصلہ شکن جواب ملا۔

"وہ ناقابلِ تسخیر قلعہ ہے جسے آج تک کوئی فتح نہ کرسکا نہ غزنوی، نہ شہاب الدین اور نہ قطب الدین ایبک۔ اگر تم یہ شوق پورا کرنا چاہتے ہو تو لے آؤ اپنے لشکر...... شکست کے سوا تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔"

التمش اس جواب پر صرف اتنا کہہ سکا۔ "ہندو خود دیکھیں گے کہ رن تھنبور کیسے فتح نہیں ہوتا۔"

التمش بڑی تیزی سے اپنی عسکری تیاریوں کو آخری شکل دے رہا تھا۔

رن تھنبور میں بھی یہ چرچے عام ہورہے تھے کہ مسلمان بادشاہ سلطان التمش ان پر حملہ آور ہونے کے لیے دہلی سے روانہ ہوچکا ہے۔ قرامطی ان سے ساز باز کیے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی پوری مدد فراہم کی۔

جب التمش رن تھنبور کے قریب پہنچا تو رن تھنبور اور قرامطیوں نے قلعے سے باہر نکل کر التمش سے ٹکرانے کا عزم کیا۔ انہیں اپنی طاقت پر اتنا ناز تھا کہ التمش کے پہنچتے ہی کسی بات چیت کے بغیر جنگ کا آغاز کردیا۔ التمش کے لشکری دہلی سے طویل سفر طے کرکے آئے تھے۔ ابھی تھکن بھی نہیں اتری تھی کہ جنگ میں جھونک دیے گئے۔ ایک جانب نرسنگے پھونکے جانے لگے دوسری جانب تکبیر کے نعرے بلند ہوئے۔ جلدی جلدی صفیں درست کیں اور جوابی حملے شروع کردیے۔ التمش کا سالار کزلک خاں حسبِ دستورِ جنگ کے عروج پر آنے کا انتظار کررہا تھا کہ جب جنگ عروج پر آجائے تو وہ اچانک دشمن پر ضرب لگانے کے لیے جنگ میں کود پڑے۔ یہ التمش کی جنگی حکمتِ عملی کا پرانا طریقہ تھا۔

اس حکمتِ عملی نے کام دکھایا۔ جب جنگ کے شعلے آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگے تو کزلک خاں نکلا اور رن تھنبور کے بائیں پہلو پر حملہ آور ہوا۔ اس افتاد سے گھبرا کر بائیں پہلو نے کھسکنا شروع کیا اور قلب کی طرف بڑھا۔ صفیں ٹوٹ گئیں۔ التمش جو قلب میں تھا، اس نے حملے تیز کردیے۔ اس کے باقی سالار بھی قلب میں گھس گئے۔ ایسی افراتفری پھیلی کہ ہندو لشکری پیچھے ہٹتے ہٹتے قلعے کے اندر محصور ہوگئے۔ اب وہ فصیلوں پر مورچے سنبھالے ہوئے تھے۔ شہر پناہ کے دروازے بند تھے۔

مسلمان فصیل کے قریب نہیں جاسکتے تھے۔ التمش کو بھی جلدی نہیں تھی لیکن جلدی اس وقت ہوگئی جب اسے یہ اطلاع ملی کہ گوالیار، اجین اور مندا ور کے لشکر رن تھنبور کو بچانے کے لیے آرہے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی چھوٹے بڑے بہت سے قلعے ہیں جن کے جنگجو ان لشکروں میں شامل ہوچکے ہیں۔ اب [illegible] کہ ان لشکروں کو رن تھنبور تک نہ پہنچنے دیا جائے۔ رن تھنبور فتح کرنے کے بعد ان قوتوں کو ان کے علاقوں میں گھس کر شکست دی جا سکتی تھی۔

التمش نے عز الدین اور کزلک خاں کو اس مہم پر روانہ کیا اور ہدایت کی کہ تیزی سے آگے بڑھیں اور آنے والے لشکروں کو راستے میں ہی روک لیں۔

دونوں سالاروں نے مسافت کو تیزی سے سمیٹا۔ آدھی رات کے قریب یہ لشکر ان کے سامنے تھے۔ انہیں گمان بھی نہیں تھا کہ التمش کا کوئی لشکری یوں اچانک ان کے سروں پر آن پہنچے گا۔ یہ لوگ کچھ دیر جم کر لڑتے رہے اور پھر بھاگنے پر مجبور ہوگئے۔

جب یہ دونوں سالار کامران و بامراد اپنے پڑاؤ میں داخل ہوئے تو سلطان التمش نے پڑاؤ سے باہر آکر ان کا استقبال کیا۔ یہ خبریں پہلے ہی پہنچ چکی تھیں کہ دونوں سالاروں نے دشمن کو مار بھگایا۔

اب کسی خطرے سے بے نیاز ہوکر صرف رن تھنبور سے نمٹنا تھا۔ رات ہونے کا انتظار کیا گیا اور رات ہوتے ہی التمش نے قلعے کے شمالی دروازے پر اپنے لشکر کو استوار کیا اور دروازہ توڑنے کی ترکیبیں کی جانے لگیں۔ کسی طرح یہ دروازہ توڑ دیا گیا۔ دروازہ ٹوٹتے ہی رن تھنبور کا لشکر باہر نکلا اور التمش کے لشکریوں پر ٹوٹ پڑا۔ التمش پہلے

ہی تیاری کر چکا تھا۔ جب اس کے لشکری غالب آنے لگے تو ہندو لشکر نے ایک مرتبہ پھر قلعے میں محصور ہونا چاہا لیکن اس مرتبہ مسلمانوں نے انہیں یہ موقع نہیں دیا اور ان کا تعاقب کرتے ہوئے شہر میں داخل ہوگئے۔

بہر حال التمش نے رن تھنبور کو فتح کر لیا۔

رن تھنبور کو فتح کرنے کے بعد التمش نے اپنے لشکر کے ساتھ مندا ور نام کے قلعے کا رخ کیا۔ یہاں بھی مسلمانوں کے خلاف سازشیں ہو رہی تھیں۔ یہاں سے ایک لشکر بھی رن تھنبور کی مدد کو پہنچا تھا۔ التمش نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ وہ ان قوتوں کے خلاف بھی قدم اٹھائے گا جو رن تھنبور کی مدد کو پہنچے تھے۔

یہاں کے ارباب اختیار بھی ان خوش خیالیوں میں مگن تھے کہ ان کے پاس عسکری قوت بہت ہے۔ اسی خوش خیالی میں وہ التمش کی طاقت کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے اور لڑنے کے لیے قلعے سے باہر نکل آئے۔ دوسری طرف التمش نے بھی عین مندور کے سامنے پڑاؤ قائم کر لیا اور صفیں درست کر کے جنگ کے لیے آمادہ ہو گیا۔

مندا ور کے لشکر نے وقت ضائع کیے بغیر جنگ کی ابتدا کر دی۔ جوابی کارروائی کے لیے سب سے پہلے التمش اور عزالدین آگے بڑھے۔ ان کے ساتھ ہی دوسرے سالاروں کو بھی حرکت ہوئی اور کچھ ہی دیر میں دونوں لشکروں کے درمیان گھمسان کا رن پڑنے لگا۔ اب ہندو راجپوتوں کو اندازہ ہوا کہ انہوں نے التمش کی طاقت کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ مندا ور کا لشکر تتر بتر ہو کر بھاگ کھڑا ہوا اور التمش فاتحانہ شان سے قلعے میں داخل ہو گیا۔ معمولی سی مزاحمت کے بعد قلعے پر سلطان کا قبضہ ہو گیا۔

☆☆☆

مہا کالی مندر سے نکلنے کے بعد عبیدہ اور عبیدی نے ایک سرائے میں قیام کیا تھا اور مندر سے لائی ہوئی دولت ایک جگہ چھپا دی تھی۔ اس دولت سے وہ اسلحہ خریدتے رہے تھے اور دولت کا لالچ دے کر مسلمانوں کو قرامطی بنانے میں مشغول تھے۔ یہ سرائے انہوں نے اس لیے منتخب کی تھی کہ یہ ایک بڑی شاہراہ کے قریب تھی جو ملتان تک جاتی تھی۔ وہاں سے آگے بڑھتی ہوئی اجمیر تک پہنچتی تھی۔ اس وقت قرامطی گجرات، سندھ اور دہلی کے اطراف میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس سرائے میں رہتے ہوئے ان سے رابطہ رکھنا بہت آسان تھا۔

اس وقت وہ دونوں سرائے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کے بھیجے ہوئے جاسوس باہر کی کچھ خبریں لے کر لوٹ آئے جو باتیں انہوں نے بتائیں، وہ پریشان کن تھیں۔

”سلطان التمش رن تھنبور، مندا ور اور بھیلسہ پر قبضہ کر چکا ہے۔ ہم دہلی کی طرف سے ہو کر آ رہے ہیں۔ وہاں یہ افواہیں اڑی ہوئی ہیں کہ عنقریب سلطان گوالیار پر حملہ آور ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ خبریں بھی گرم ہیں کہ اوشا دہلی پہنچی تھی اور اس نے التمش سے ملاقات کی تھی۔ اس نے یقیناً تم دونوں کے بارے میں بتایا ہوگا۔ التمش نے کچھ جاسوس مقرر کر دیے ہیں جو تم دونوں کا پتا لگائیں گے۔ اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ آپ لوگ یہاں ہیں تو وہ آپ کا خاتمہ کرنے کی کوشش کرے گا۔“

عبیدی نے عبیدہ کی طرف دیکھا اور پھر اس سے مخاطب ہوا۔

”تم نے اوشا کو زندہ چھوڑ کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ التمش کو زندگی بھر یہ معلوم نہ ہوتا کہ اس پر حملہ کرنے والے قرامطی تھے۔“

”اگر میں نے غلطی کی تو اس کا ازالہ بھی کروں گا۔ ہم اوشا کو ایک مرتبہ پھر اٹھا لیں گے۔ اب وہ میری محبت نہیں میری مجرم ہے کیونکہ اس نے ہمارا راز فاش کیا ہے۔“

اسی وقت مخبر بول اٹھا۔ ”اب آپ اسے کہاں سے اٹھائیں گے۔ اس نے تو خودکشی کر لی۔ التمش کے سامنے اسی کا خنجر اپنے پیٹ میں اتار لیا۔“

کچھ دیر تک سرائے کے کمرے میں سکوت طاری ہو گیا۔ کچھ دیر بعد عبیدی نے اس سکوت کو توڑا۔

”اوشا کا قصہ چھوڑو۔ اب تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جامع مسجد میں ہمارے جو لوگ قتل ہوئے ہیں، ان کا انتقام کیسے لیا جائے۔ اب ہماری تعداد میں بھی اضافہ ہو چکا ہے۔ یہ بڑی تعداد بے کار بیٹھی ہے۔ ان سے کوئی کام لینا چاہیے۔“

”التمش دہلی میں ٹک کر بیٹھتا ہی نہیں کہ اس پر حملہ کیا جائے۔ وہ اس وقت سے اب تک جنگوں میں مشغول ہے۔“ عبیدہ نے کہا۔

”اب ہمیں اسے کسی محاذ پر ہی نقصان پہنچانا ہوگا۔“

”یہ کیسے ممکن ہے؟ لشکر کی موجودگی میں اسے کیسے قتل کیا جا سکتا ہے؟“

”قتل کرنا ہی نقصان پہنچانا نہیں ہوتا۔“

”تم نے ابھی سن لیا کہ التمش گوالیار پر حملہ کرنے والا ہے؟“

”ہاں سن تو لیا۔“

”اگر ہم اس موقع پر اچانک التمش پر حملہ آور

ہو جائیں تو یقیناً التمش کو شکست ہو جائے گی۔ شکست نہ بھی ہو تو ہم اس کے ہزاروں آدمی قتل کر دیں گے۔ دوسرے یہ کہ گوالیار والے ہمارے احسان مند ہوں گے اور ہمیشہ کے لیے ہمارے حلیف بن جائیں گے۔“

عبیدہ نے اپنے ساتھی سے اختلاف کیا۔

”یہ طریقہ جنگ ہمارے طریق کار سے مختلف ہے۔ ہم اب تک خفیہ کارروائیاں کرتے رہے ہیں۔ یہی طریقہ ہمیں اب بھی اپنانا ہوگا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے آدمیوں کو تیار رہنے کا حکم دیں اور جنگ کا نتیجہ دیکھیں۔ اگر التمش کو شکست ہوتی ہے تو ہمارے آدمی ہندوستان بھر میں لوٹ مار شروع کر دیں گے اور اگر فتح ہوتی ہے تو ہم گوالیار والوں کی مالی مدد کر کے انہیں دوبارہ جنگ کے لیے تیار کر سکتے ہیں۔ اس طرح ہندوستان میں شورش برپا رہے گی اور یہی ہمارے حق میں بہتر ہوگا۔“

عبیدی کو اس کی بات ماننا پڑی اور یہ طے کیا گیا کہ جہاں جہاں قرامطی ٹھہرے ہوئے ہیں، ان کی طرف قاصد دوڑائے گئے اور خود بھی دورے پر نکل گئے۔

☆☆☆

التمش لشکر لے کر دہلی سے نکلا تاکہ گوالیار جو مسلمانوں کے قبضے سے نکل گیا تھا، دوبارہ قبضے میں لایا جائے۔ گوالیار کے راجا منگل دیو کو اپنی طاقت پر ناز تھا۔ اس لیے اس نے محصور ہونے کے بجائے باہر نکلنے کو ترجیح دی۔ صرف اتنی احتیاط کی کہ فصیل کے قریب رہیں۔ قلعے سے اتنی دور نہ چلے جائیں کہ شکست کی صورت میں قلعے میں دوبارہ داخل ہونے کی فرصت نہ ملے۔ غالباً انہوں نے بھیلسہ والوں سے سبق سیکھا تھا۔ وہ اپنے قلعے سے اتنی دور نکل گئے تھے جب انہیں شکست ہوئی تو سلطان کے لشکریوں نے انہیں شہر میں داخل نہ ہونے دیا۔

گوالیار کی فصیل کے قریب دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہوئے۔ التمش نے بھی پچھلی جنگوں سے سبق سیکھا تھا۔ اس نے گوالیار کے نواح میں اپنے مخبر دوڑا دیے تاکہ اگر کوئی لشکر آئے تو بروقت اس کی اطلاع ہو سکے۔

راجا منگل دیو نے حملے کی ابتدا کی۔ جوابی کارروائی حسب سابق التمش نے کی۔ سلطان کے بعد اس کے دوسرے سالار بھی حرکت میں آئے۔

کچھ دیر تک انتہائی ہولناک انداز میں دونوں لشکر ایک دوسرے سے ٹکراتے رہے لیکن جلد ہی گوالیار کے راجا نے محسوس کیا کہ اس کے لشکر میں بددلی کے آثار بیدار ہو گئے ہیں۔ اس نے نرسنگے بجوا دیے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پیچھے ہٹو اور شہر کے اندر محصور ہو جاؤ۔

منگل دیو کی حکمت عملی کام آئی۔ وہ فصیل سے اتنا قریب تھا کہ التمش کا لشکر شکست خوردہ لشکر کو شہر میں داخل ہونے سے نہ روک سکا۔

راجا منگل دیو اور اس کا لشکر محصور ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اب سلطان التمش کا لشکر خطرے میں تھا کیونکہ منگل دیو نے فصیلوں پر مورچے بنا لیے تھے جہاں سے تیر اور پتھر پھینکے جاتے تو التمش کے لشکریوں کو نقصان اٹھانا پڑتا۔ التمش نے یہ دیکھ کر اپنے لشکر کو پیچھے ہٹا لیا اور اتنی دور جا کر قیام کیا کہ کوئی تیر وہاں تک نہ پہنچ سکے۔

قلعے کا بندوبست دیکھ کر التمش کو اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ محاصرہ طول پکڑے گا۔

اس حالت میں چند دن گزرے تھے کہ گوالیار کے نواح میں بھیجے گئے جاسوس کچھ نئی خبروں کے ساتھ حاضر ہو گئے۔ سب سے اہم خبر یہ تھی کہ قرامطی گنگا جمنا کے دوآبہ میں جمع ہو رہے ہیں اور وہ کسی بھی وقت منگل دیو کی مدد کے لیے گوالیار پہنچ سکتے ہیں۔ التمش نے جاسوسوں کو رخصت کیا اور اسی وقت اپنے سالاروں کا اجلاس طلب کیا اور جاسوسوں کی دی ہوئی اطلاع ان تک پہنچائی۔

”میں اب محاصرے سے اکتا چکا تھا اور میرا ارادہ تھا کہ بھرپور قوت کے ساتھ گوالیار پر حملہ آور ہو جاؤں لیکن مخبروں کی اس اطلاع کے بعد میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ قرامطی جس انداز سے جمع ہونا شروع ہوئے ہیں، اس سے لگتا ہے ہمیں مصروف دیکھتے ہی وہ ہم پر حملہ آور ہو جائیں گے یا شب خون کی تیاری کر رہے ہوں گے۔ عقلمندی بھی یہی ہے کہ ہم ایک طاقت کو قلعے میں محصور رکھیں اور ہمارے لشکر کا ایک حصہ قرامطیوں کا خاتمہ کرنے کے لیے روانہ ہو جائے۔“

سب سے پہلے کزلک خاں آگے بڑھا۔

”اگر سلطانِ عالم مجھ پر بھروسا کریں تو یہ مہم میں سرانجام دینے کو تیار ہوں۔ میں اور کبیر خاں یہاں سے کوچ کریں گے۔ آدھی رات کے وقت میں اور کبیر خاں مختلف سمتوں سے قرامطیوں پر حملہ آور ہو جائیں گے۔ اگر ہم انہیں بالکل ختم نہ کر سکے تو بھی ان کی طاقت کو منتشر کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔“

سلطان التمش نے اس تجویز کو پسند کیا اور کزلک خاں

رات کے کسی حصے میں کبیر خاں اور لشکر کو ساتھ لے کر روانہ ہو گیا۔

جس وقت یہ دونوں گنگا جمنا دوآبہ کے نزدیک پہنچے دن ڈوبنے لگا تھا۔ یہ لشکر دو دن کی مسافت طے کرنے کے بعد یہاں تک پہنچا تھا اور ابھی اندھیرا ابھی دور تھا۔ وہ دور تک پھیلے ہوئے ٹیلوں کے پیچھے چھپ گئے۔ پھر اندھیرے کی چادر ان کی حفاظت کے لیے آ کر کھڑی ہو گئی۔

جب تاریکی کے رنگ گہرے ہو گئے تو کذلک خاں قرامطیوں پر ٹوٹ پڑا۔ عبیدہ نے کسی طرف سے آواز لگائی۔

”ہمارا شکار خود چل کر آ گیا ہے۔ کوئی بھی زندہ نہ جانے پائے۔“

قرامطیوں نے کذلک کے لشکر کو تلواروں پر رکھ لیا۔

کذلک خاں کو اندازہ نہیں تھا کہ اس ویرانے میں قرامطیوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوگی۔ قرامطی بڑھ چڑھ کر اس پر ضربیں لگا رہے تھے۔ عبیدہ خوش ہو رہا تھا کہ التمش کا بھیجا ہوا نامور سردار آج قرامطیوں کے ہاتھوں مارا جائے گا۔ اسی وقت ایک شور بلند ہوا۔ قرامطیوں نے گردن گھمائی تو کبیر خاں ان کی پشت پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ اب قرامطی چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس کر رہ گئے تھے۔ آگے کی جانب کذلک خاں تھا اور پیچھے کبیر خاں۔

اندھیرے کے باوجود قرامطیوں کو اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کی تعداد اب بہت کم رہ گئی ہے۔ کچھ مارے گئے ہیں، کچھ بھاگ گئے ہیں۔ عبیدہ اور عبیدی نے بھی فرار کا سوچا اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ کذلک خاں اور کبیر خاں کے سپاہیوں نے کچھ دور تک بھاگنے والوں کا تعاقب کیا۔ کچھ قتل ہوئے کچھ کو گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتار ہونے والوں میں عبیدہ بھی تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ گرفتار ہونے والا عبیدہ ہے لیکن اس کے ساتھی نے خوفزدہ ہو کر اس کی نشان دہی کر دی کہ ہم جو کچھ کرتے تھے، اپنے سردار عبیدہ کے کہنے پر کرتے تھے۔ معلوم کرنے پر اس نے بتا دیا کہ یہ جو لمبے بالوں والا شخص ہے یہی عبیدہ ہے۔

عبیدہ کو گرفتار کر کے کذلک خاں کے سامنے لایا گیا۔ اس نے بھی پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ یہی عبیدہ ہے۔ کذلک خاں نے اسے التمش کے حکم سے گوالیار کے بجائے دہلی لے جانے کا بندوبست کیا۔ اسے ابھی قتل کیے جانے کے احکام نہیں ملے تھے۔ اسے دہلی لے جا کر قید کرنا مقصود تھا تاکہ جب گوالیار فتح کر کے التمش دہلی جائے تو عبیدہ سے قرامطیوں کے بارے میں مزید معلومات لی جائیں۔ ابھی تو صرف یہ معلوم کیا گیا تھا کہ فرار ہونے والے قرامطی مہاکالی مندر پہنچے ہیں۔

کذلک خاں تھوڑے سے سپاہیوں کو ہمراہ لے کر عبیدہ کو دہلی لے کر پہنچا۔ اہلِ دہلی کو جب معلوم ہوا کہ کذلک خاں قرامطیوں کے سردار کو لے کر دہلی آ رہا ہے تو لوگ اس کے استقبال کے لیے سڑکوں پر دو رویہ کھڑے ہو گئے۔ چھتوں اور کوٹھوں پر بھی خلقت کا ہجوم تھا۔

کذلک خاں شہر میں داخل ہوا تو تکبیر کے نعروں سے شہر گونجنے لگا۔ لوگوں کا اشتیاق دیکھ کر کذلک خاں نے حکم دیا کہ قیدی کو پورے شہر کا گشت کروایا جائے تاکہ اس کی تشہیر ہو اور لوگوں کو یقین آ جائے کہ قرامطیوں کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔

یہ قافلہ جب گشت کرتا ہوا ایک محلے میں پہنچا تو دیکھنے والوں کی بھیڑ جمع ہو گئی۔ ایک بوڑھا آدمی بھیڑ کو چیرتا ہوا اس گھوڑے کے نزدیک پہنچ گیا جس پر عبیدہ کو رسیوں سے باندھ کر اوندھا لٹا دیا گیا تھا۔ محافظوں نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ میں اس... بدبخت کو قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ کسی نے یہ بھی غور نہیں کیا کہ بوڑھے نے تلوار باندھی ہوئی ہے۔ اس بوڑھے نے نہایت پھرتی سے تلوار کو بے نیام کیا اور اچک کر عبیدہ پر وار کر دیا۔ یہ وار اتنا کاری نہیں تھا لیکن اتنا ہوا کہ عبیدہ کی رسیاں کٹ گئیں۔ وہ معمولی سا زخمی بھی ہوا۔ رسیاں کھلتے ہی اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ گھوڑے سے کودا اور مجمع میں گھس گیا۔ بس پھر کیا تھا، طیش میں بھرے مجمع نے اس کی وہ تواضع کی کہ تکا بوٹی کر کے رکھ دی۔ مجمع میں کسی کے پاس خنجر بھی تھا۔ اس کے بدن پر اتنے وار کیے کہ وہ دم توڑ گیا۔ محافظوں نے مجمع پر قابو پایا تو عبیدہ کی لاش ہی انہیں مل سکی۔

جس بوڑھے نے عبیدہ پر حملہ کیا تھا، اسے گرفتار کر لیا گیا تھا۔

”تو نے یہ کیا کر دیا۔ ہمیں اس قیدی سے بہت معلومات حاصل کرنا تھیں۔ تو نے وہ حرکت کی کہ باقی لوگوں کو بھی طیش آ گیا اور وہ قرامطی مارا گیا۔“

”سردار، میں بدنصیب اوشا کا باپ ہوں۔ میری بیٹی کو قرامطیوں نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر اغوا کیا اور اس شخص نے میری بیٹی کو شادی کا جھانسا دے کر دھوکا دیا۔ اسے اس حال کو پہنچا دیا کہ وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو گئی۔ آج میں نے اپنی بیٹی کا بدلہ لے لیا۔ اب آپ چاہیں تو میری گردن اڑا دیں۔ مجھے کوئی دکھ نہ ہوگا۔“

بوڑھے کی داستان اتنی درد بھری تھی کہ کذلک خاں کو

رحم آ گیا اور اس نے اسے رہا کرنے کا حکم دے دیا۔ عبیدہ قتل کیا جا چکا تھا لیکن یہ معلوم ہو چکا تھا کہ قرامطی فرار ہونے کے بعد مہاکالی مندر کی طرف گئے ہیں۔

گوالیار کا محاصرہ طول پکڑتا جا رہا تھا۔ فصیلوں پر ایسے سخت مورچے تھے کہ التمش کا کوئی سپاہی جب بھی آگے بڑھتا تھا، اوپر سے کوئی تیر اسے نشانہ بناتا تھا۔ فصیل کو گرانے کی تدبیریں کی جا رہی تھیں لیکن کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی تھی۔

ایک سال کی مدت کم نہیں ہوتی۔ وہ دہلی سے دور تھا۔ قرامطی منتشر ہو گئے تھے، ختم نہیں ہوئے تھے۔ وہ پھر کسی جگہ جمع ہو کر دہلی پر حملہ آور ہو سکتے تھے۔ التمش جلد سے جلد گوالیار فتح کر کے واپس جانا چاہتا تھا۔ یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ گوالیار پر قبضہ کیے بغیر لوٹ جائے۔ اس نے اپنے سالاروں کا اجلاس طلب کیا۔ اس وقت تک کذلک خاں بھی دہلی سے واپس آ چکا تھا۔ التمش نے اپنے سالاروں کو حکم دیا کہ کوئی تدبیر ہو، فصیل گرائی جائے۔

یہ تدبیریں ابھی عمل میں آئی نہیں تھیں کہ منگل دیو ہمت ہار بیٹھا۔ وہ قلعے کے ایک گوشے میں چند ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور اپنے خیالات کا اظہار ان لفظوں میں کر رہا تھا۔

”محاصرے کو ایک سال ہو چکا ہے۔ التمش ہمیں شکست دے چکا ہے اس لیے میرے لشکر میں اب اتنی ہمت نہیں کہ باہر نکل کر التمش سے مقابلہ کرے۔ قلعے میں غذائی قلت کے آثار بھی نمایاں ہونے لگے ہیں۔ ہمیں کسی شرم ناک صلح کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس موقع پر میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔ میں اپنے سالاروں اور لشکر کے ایک حصے کے ساتھ خفیہ دروازے سے مہاکالی مندر چلا جاؤں۔ میری اطلاع کے مطابق مہاکالی مندر ایک مرتبہ پھر قرامطیوں کا مرکز بن گیا ہے۔ میں بھی وہاں پہنچ گیا تو ان کی طاقت میں اضافہ ہوگا پھر ہم قرامطیوں کے ساتھ مل کر التمش کے لشکر پر حملہ آور ہو سکتے ہیں۔“

وہ یہاں تک کہنے پایا تھا کہ اس کے ایک سالار نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔

”اس طرح تو ہم قلعے کو بے یار و مددگار چھوڑ دیں گے۔ التمش اس پر بہ آسانی قابض ہو جائے گا۔ لشکر کا تھوڑا سا حصہ کب تک قلعے کی حفاظت کرے گا۔“

”میری روانگی اتنی خفیہ ہوگی کہ التمش اس سے باخبر نہ ہو سکے گا۔ اگر وہ قلعے پر قابض بھی ہو گیا تو وہ خود یہاں نہیں

مہکتی کلیاں

☆ کسی کو بے وقوف نہ کہو کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم دانا ہیں نہ بے وقوف، ہم زندگی کے درخت پر سبز پتوں کی طرح ہیں۔

☆ محبت ایک نورانی قطعہ ہے جسے نورانی ہاتھوں نے نورانی کاغذ پر لکھا ہے۔

☆ تمہیں چاہیے کہ حقیقت کو سمجھو ہمیشہ لیکن ظاہر کبھی کبھی کرو۔

☆ جب تم زندگی کے اسرار کو حل کر چکو تو موت کا شوق ہوگا کیونکہ موت بھی زندگی کے رازوں میں ایک راز ہے۔

مرسلہ: ماہین بابر، گلیانہ روڈ کھاریاں

رہے گا۔ قلعہ کسی حاکم کے سپرد کر کے دہلی واپس چلا جائے گا۔ ہم کسی وقت بھی واپس آ کر قلعے کو بازیاب کروا سکتے ہیں۔“

سالار اس کے بعد کچھ نہ کہہ سکا۔ منگل دیو رات کے کسی حصے میں قلعہ گوالیار سے نکل گیا۔ اہلِ قلعہ کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ ان کا راجا انہیں چھوڑ کر فرار ہو گیا ہے تو انہوں نے قلعے کے دروازے کھول دیے۔ مسلمانوں کی فوج قلعے پر قابض ہو گئی۔

گوالیار فتح کرنے کے بعد وہ مالوہ کی طرف بڑھا اور پہلے ہی حملے میں اسے فتح کر لیا۔

ہندو تو یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ گوالیار فتح کرنے کے بعد دہلی کی طرف پلٹ جائے گا لیکن جب اس نے مالوہ پر چڑھائی کی اور اس کے بعد بھی وہ آگے بڑھنے لگا تو ہندوؤں کو اس کے عزائم کا علم ہوا۔ ہندوؤں کا نہایت متبرک شہر اجین تھا۔ اس کے قریب ہی مہاکالی کا مندر تھا۔ انہیں ان دونوں مقامات کی فکر ہوئی۔ اجین کو خطرے میں دیکھتے ہی ہندوؤں میں کھلبلی مچ گئی۔ التمش کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر مخالف قوت اجین میں جمع ہونے لگی۔ اجین کے راجا کے پاس بھی کچھ کم قوت نہیں تھی۔ مہاکالی مندر کے قرامطی بھی شامل ہو گئے۔ راجا منگل دیو بھی اپنے لشکر کے ساتھ اسی مندر میں تھا۔ غرض ایک بڑا لشکر تیار ہو گیا اور یہ طے کیا گیا کہ اجین سے باہر نکل کر التمش سے مقابلہ کیا جائے۔ انہوں نے اجین سے باہر صفیں درست کر لیں۔

یہ اتنا بڑا لشکر تھا کہ التمش اور اس کے سالاروں کو اس

سے پہلے اتنے بڑے لشکر کا کبھی سامنا نہیں ہوا ہوگا۔ لشکر کی اس کثرت کو دیکھتے ہوئے التمش نے اپنے لشکر کو تین کے بجائے پانچ حصوں میں تقسیم کیا۔ تین حصے آگے رکھے اور دو کو دائیں بائیں رکھا۔ کنذلک خاں حسب معمول پڑاؤ میں رہا کہ میدان میں اچانک کود کر افراتفری مچادے۔

جنگ شروع ہوئی تو اجین کا لشکر سلطان التمش پر غالب آنے لگا لیکن جیسے ہی کنذلک خاں میدان میں کودا اور قتلِ عام شروع کیا تو افراتفری پھیلنے لگی۔

کئی گھنٹوں کی کشمکش کے بعد دشمن کو شکست ہوئی۔

اجین کے لشکریوں نے اجین شہر میں محصور ہونا چاہا لیکن مسلمانوں نے انہیں شہر میں داخل ہونے نہیں دیا۔ اکثریت کو موت کے گھاٹ اتارا۔ جو بچ گئے انہوں نے مہاکالی مندر کو پناہ گاہ بنایا۔

التمش ضروری انتظامات کے لیے چند روز اجین میں ٹھہرا رہا۔ اس کے بعد اس نے مہاکالی مندر کا رخ کیا۔ عبادت گاہوں پر حملے کرنا اس کی عادت میں شامل نہیں تھا لیکن مہاکالی مندر محض عبادت گاہ نہیں رہی تھی۔ یہ عسکری مرکز بن گیا تھا جہاں دشمن طاقتیں جمع ہوتی تھیں اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتی تھیں۔ خاص طور پر قرامطی نہایت اسلام دشمن تھے لہٰذا ان کا قلع قمع ضروری تھا۔

مہاکالی مندر کے اندر چھپے ہوئے اسلام دشمنوں کو یقین تھا کہ التمش ... کی دیواروں سے سر ٹکرانے کے بعد واپس لوٹ جائے گا کیونکہ یہ قلعہ نما مندر نہایت مضبوط تھا۔ اس کی تعمیر میں تین سو برس صرف ہوئے تھے۔ مضبوطی کے ساتھ ساتھ اس کی دیواریں نہایت بلند بھی تھیں۔

جنگ صرف تلواروں ہی سے نہیں، تدبیر سے بھی لڑی جاتی ہے۔ التمش نے مہاکالی پہنچتے ہی اس مندر کی مضبوطی کو دیکھتے ہوئے عقل کا استعمال کیا۔ اپنے لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کر کے چاروں طرف پھیلا دیا اور انہیں دیواروں کی بنیادیں کھودنے کا حکم دیا۔

بنیادیں اتنی مضبوط تھیں کہ اس کام میں کئی دن لگ گئے۔ اس کے باوجود وہ چند فٹ سے زیادہ نہ کھود سکے۔ مندر کے محافظوں کو جب معلوم ہوا کہ بنیادیں کھودی جارہی ہیں تو انہوں نے اوپر سے تیر برسانا شروع کردیے۔ لشکر کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

سالار سر جوڑ کر بیٹھ گئے کہ اب کیا کیا جائے۔ بالآخر کئی تجاویز میں سے ایک تجویز پر سب کا اتفاق ہوگیا۔ بڑے بڑے چھکڑے تیار کیے گئے جن پر بڑے بڑے درختوں کے تنے باندھ دیے گئے۔ ان چھکڑوں کو بیل کھینچ رہے تھے۔

بیلوں کے بدن کو اس طرح ڈھانپ دیا گیا کہ تیر ان پر اثرانداز نہ ہوں۔ ان بیلوں کو چابک لگا کر چھوڑ دیا گیا۔ وہ بھاگتے ہوئے گئے اور درختوں کے تنے دیواروں سے جا کر ٹکرائے۔ یہ عمل دن بھر دہرایا جاتا رہا۔ پہلے دیواروں پر دراڑیں پڑیں اور پھر چاروں طرف کی دیواریں گر گئیں۔ بنیادیں پہلے ہی کمزور ہوچکی تھیں۔ یہ دیواریں درختوں کے تنوں کی ضربیں برداشت نہیں کرسکیں۔

چاروں طرف سے التمش کے لشکر مندر میں داخل ہوگئے۔ مندر میں محفوظ لوگوں کو توقع بھی نہیں تھی کہ دیواریں اس طرح زمین بوس ہوجائیں گی۔ اندر جو لشکر تھا، وہ تلواریں سونت کر مقابلے پر آیا ضرور لیکن زیادہ دیر مقابلہ نہ کرسکا۔ بھاگنے کی راہ نہیں تھی۔ سب کے سب وہیں قتل کر دیے گئے۔ تمام قرامطی بھی قتل ہوگئے۔

التمش نے مندر کو اس طرح مسمار کردیا جیسے یہاں کوئی عمارت تھی ہی نہیں۔

اس مندر سے التمش کو اجین کے راجا بکرماجیت کی ایک نادرالوجود تصویر ملی۔ چیتل کی چند دوسری تصویریں بھی ہاتھ لگیں۔ التمش ان تمام نوادرات کو اپنے ساتھ دہلی لے آیا اور انہیں جامع مسجد کے دروازے پر ڈال دیا تاکہ وہ آتے جاتے لوگوں کے پاؤں کے نیچے آ کر پامال ہوں۔

اجین کے سفر سے واپس آنے کے بعد التمش خلافِ معمول تھکن محسوس کررہا تھا۔ اس نے کچھ دن تو دہلی میں رہ کر آرام کیا اور پھر اسی حالت میں ملتان کی طرف چل پڑا۔ وہ راستے میں ہی بیمار پڑ گیا۔ اس بیماری نے اتنا طول کھینچا کہ سواری کے لائق بھی نہ رہا۔ اس کے امرا اسے عماری میں بٹھا کر دہلی لائے۔

دہلی پہنچ کر اس کی حالت مزید بگڑ گئی۔ اسی بیماری کی حالت میں 633ھ میں اس کا انتقال ہوگیا۔

ماخذات: تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ۔ طبقات اکبری، نظام الدین احمد۔ طبقات ناصری، قاضی منہاج سراج (ترجمہ)۔ تاریخ سندھ، اعجاز الحق قدوسی۔

خاندان

کاشف زبیر

نظر کے فریب میں مبتلا ایک خوب صورت

بندھن کا امتحان

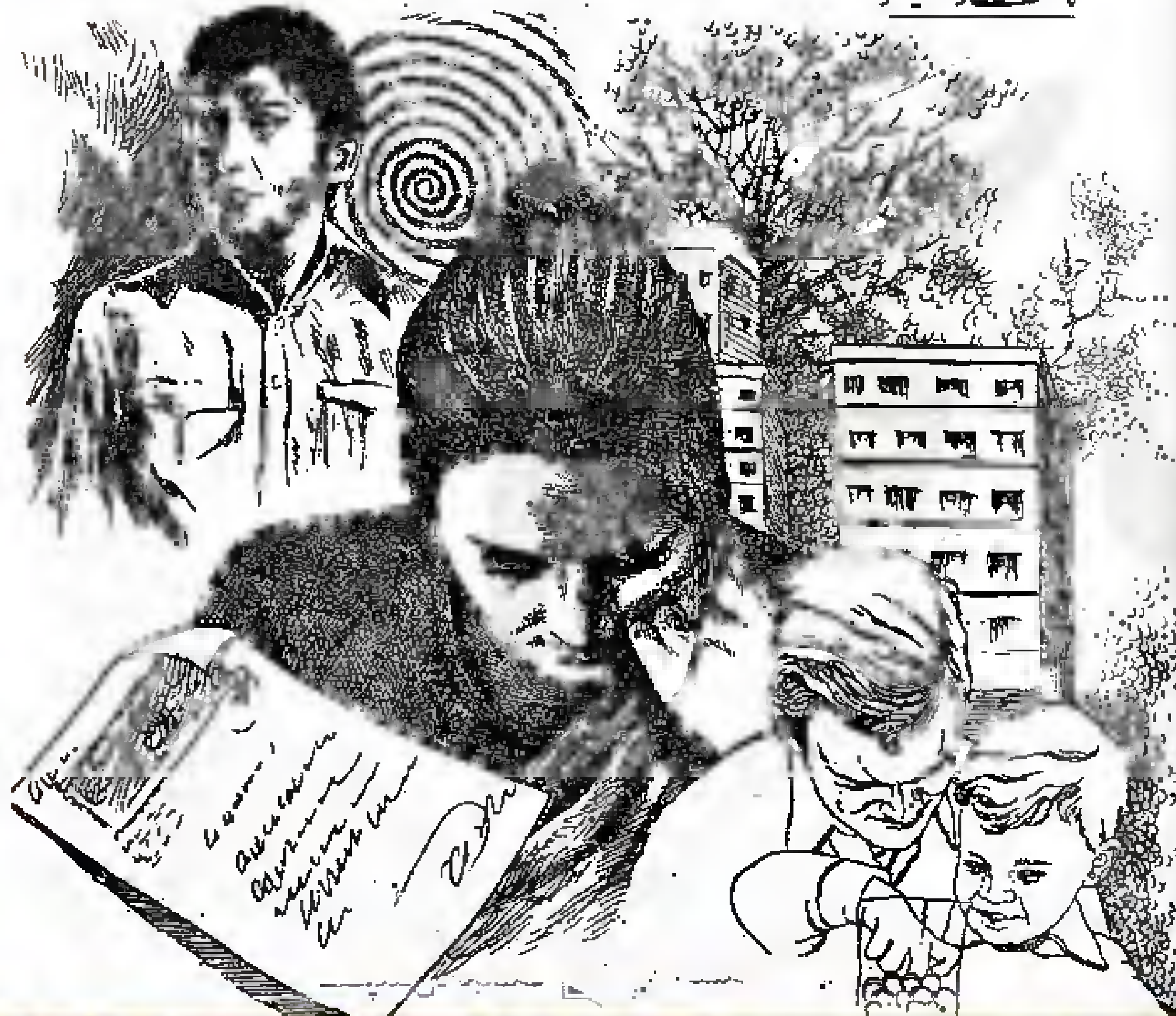
خاندان کسی فردِ واحد کا نام نہیں... بلکہ ایک سے زیادہ افراد کے مجموعہ کا مظہر ہوتا ہے یہ اور بات کہ اس مجموعے میں اتفاق کی گنجائش زیادہ ہے یا انتشار کی بے کلی... مگر اسے یہ زعم تھا کہ وہ اپنی ہی ذات میں ایک مکمل خاندان ہے اور... جب زندگی نے آزمایا تو احساس ہوا کہ کڑی آزمائشوں میں، تنہائی کی راتوں میں جب حوصلہ ساتھ چھوڑتا ہے تو ایسے میں کسی اپنے کی ضرورت پڑجاتی ہے۔ اس نے بھی جب پیچھے پلٹ کر دیکھا تو ایک سایہ اسے اپنے تعاقب میں نظر آیا جو شاید اس کا اپنا تھا۔

مچ نیلسن دوستوں کے ہمراہ بار میں تھا اور خاصی پی چکا تھا۔ آج ویک اینڈ نائٹ تھی اور مہینے میں ایک ویک اینڈ نائٹ وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ گزارتا تھا۔

بار اٹینڈر ووڈ کلین ان سے واقف تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ مقررہ حد تک پی چکے تھے، اس لیے جب میٹ نے ہاتھ لہرایا تو اس نے انکار کردیا۔ ''تم لوگ بہت پی چکے ہو اور اب گھروں کی طرف روانہ ہوجاؤ۔''

''ہم گاہک ہیں۔'' جارج چلّایا۔ ''کسٹمرز آر آل ویز رائٹ۔''

''مگر کسٹمرز اس وقت بالکل رانگ ہو چکے ہیں۔'' ووڈ کلین بولا۔ ''بہتر ہوگا تم لوگ روانگی سے پہلے ایک لیمن ڈراپ لے لو۔ میں اتنے اچھے اور مستقل گاہک کھونا نہیں چاہتا۔'' ان کو بھی اندازہ تھا کہ وہ اپنی حد کے



مطابق پی چکے تھے۔ پھر انہوں نے بل ادا کیا اور باہر نکل آئے۔ وہ سب کالج کے زمانے کے دوست تھے۔ جج کی گاڑی ذرا دور تھی اس لیے پہلے وہ تینوں رخصت ہوئے۔

یہ نئے ماڈل کی لگژری وین تھی۔ اس کا ڈارک میرون رنگ رات میں سیاہ نظر آتا تھا۔ جج نے محسوس کیا کہ نشہ اس کے ذہن پر طاری ہو رہا ہے۔ اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ مارا مگر اس میں لیمن ڈراپس نہیں تھے شاید وہ رکھنا بھول گیا تھا۔ اس نے سر جھٹکا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس نے رفتار کم رکھی تھی۔

سڑکوں کے کنارے برف کے ڈھیر تھے۔ موسم کی پیش گوئی کے مطابق اگلے چند دن میں ایک بڑا برفانی طوفان متوقع تھا۔ لوگوں کو خبردار کیا جا رہا تھا کہ وہ گھروں میں راشن اور ایمرجنسی کا سامان کر لیں۔ خاص طور سے بجلی بند ہونے کی صورت میں گھروں میں روشنی اور گرمائش کا انتظام کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا کیونکہ تیس سال بعد یہ شدید ترین سردی تھی جس میں درجۂ حرارت منفی پندرہ ڈگری سے نیچے گر گیا تھا۔

ان کا بیٹا چھوٹا تھا اور اسے سردی سے بچانا زیادہ ضروری تھا۔ خوراک اور ضروری دواؤں کا ذخیرہ بھی کرنا تھا۔

اسی سوچ میں اسے اندازہ نہیں ہوا کہ گاڑی کی رفتار بڑھ گئی ہے۔ اچانک عقب میں پولیس کار کی روشنیاں چمکیں اور سائرن سنائی دیا۔ یہ لمحاتی سائرن تھا جو پولیس خبردار کرنے کے لیے بجاتی ہے۔ جج نے رفتار فوری کم کر لی.... اسے خطرہ تھا کہ اگر پولیس نے اسے روک لیا تو انہیں شک نہ ہو جائے کہ وہ پیے ہوئے ہے۔ انہیں صرف اس کا منہ سونگھنا پڑتا اور وہ مشکل میں پڑ جاتا۔ اس نے چشم تصور سے دیکھا کہ کل صبح میڈیا کس قسم کی ہیڈ لائنز چلا رہا ہوگا۔ پیچھے آنے والی پولیس کار رہ رہ کر فلیش چمکا رہی تھی اور سائرن کی آوازیں نکال رہی تھی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ رک جائے۔ اچانک اس کے ذہن میں آیا اور اس نے گاڑی آنے والی ذیلی سڑک پر موڑ دی اور رفتار بڑھا دی۔ فوراً ہی عقب سے مستقل پولیس سائرن کی آواز سنائی دی۔

اس کا دل ڈوبنے لگا۔ پولیس یقیناً اس کے پیچھے آ رہی تھی۔ اب اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ رک جائے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ جیسے ہی پولیس کار اس سڑک پر مڑے گی وہ بریک لگا دے گا۔ اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ وہ بہرحال قانون سے نہیں بھاگ سکتا تھا۔ اس کی نظر مستقل عقبی آئینے پر جمی تھی۔ پولیس کار کی روشنیاں نمودار ہوئیں مگر وہ خلاف توقع ذیلی سڑک پر آنے کے بجائے سیدھی چلی گئی۔ جج نے اطمینان کی گہری سانس لی اگر پولیس اس کے پیچھے نہیں تھی تو اس کے ساتھ تفریح کر رہی تھی۔ ابھی اس کا سانس پوری طرح خارج بھی نہیں ہوا تھا کہ کوئی اچانک اس کی گاڑی کے سامنے آیا۔ اس نے بے ساختہ بریک لگائے مگر گاڑی رکتے رکتے بھی سامنے آنے والے کے اوپر سے گزر گئی... اور پھر کچھ دور جا کر رک گئی۔ جج دم بخود بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔

”میرے خدا۔“ اس نے زیر لب کہا اور پھر دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ جہاں گاڑی کے نیچے آنے والا شخص لیٹا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ اور جسم لہولہان تھا مگر وہ ہوش میں تھا۔ اس نے صرف ایک شرٹ اور اس کے نیچے گرم بنیان پہنی ہوئی تھی مگر یہ اس موسم کا مقابلہ کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ اسے فوری طبی امداد اور اس سے پہلے گرمائش کی ضرورت تھی۔ ورنہ زخموں سے پہلے سردی اس کی جان لے لیتی۔ جج نے جلدی سے اپنا گرم اوور کوٹ اتار کر اس پر ڈال دیا۔ وہ مضطرب انداز میں کہہ رہا تھا۔ ”آرام سے... آرام سے... تم بچ جاؤ گے... میں ابھی ایمبولینس کے لیے کال کرتا ہوں۔“

زخمی نوجوان تھا۔ اس نے بہ مشکل ہاتھ بڑھا جج کا کوٹ پکڑا اور سرگوشی میں بولا۔ ”میری مدد کرو... مجھے بچاؤ۔“

جج جانتا تھا اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ اس نے بے ساختہ اپنا سیل فون نکالا اور نائن ون ون ملانے جا رہا تھا کہ رک گیا۔ اسے خیال آیا کہ اس صورت میں وہ فوری پکڑ میں آجائے گا۔ اس کا ٹیسٹ ہوگا اور شراب پی کر ڈرائیونگ کے دوران حادثے پر نہ صرف اس کا ڈرائیونگ لائسنس کینسل ہو جائے گا بلکہ اس کا کیریئر بھی تباہ ہو جائے گا۔ اس کی بیوی تھی اور اس کا بچہ تھا۔ وہ ایسا کوئی کام نہیں کر سکتا تھا جس کا ان پر اثر پڑے۔ اس نے سیل فون رکھا تو زخمی جو اسے آس سے دیکھ رہا تھا، اس نے گڑگڑا کر کہا۔ ”پلیز... پولیس کو کال کرو۔ مجھے بچاؤ۔“

جج کو گلی میں ایک کونے میں پے فون بوتھ دکھائی دیا۔ اس نے زخمی کو تسلی دی۔ ”تم فکر مت کرو میں ابھی ایمرجنسی کو کال کرتا ہوں۔“

زخمی اسے روکتا رہ گیا اور وہ اٹھ کر فون بوتھ کی طرف آ گیا۔ اس نے رومال سے ریسیور پکڑا اور نائن ون ون ملایا۔ اس نے رومال کا کچھ حصہ ماؤتھ پیس پر رکھ لیا تھا تاکہ اس کی آواز ذرا مختلف ہو جائے۔ کال ریسیو ہوتے ہی اس نے عجلت میں کہا۔ ”ایک آدمی ٹریفک حادثے میں شدید زخمی ہے اسے فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔“

”اپنا نام بتاؤ۔“ آپریٹر نے کہا۔

”کارنیل۔“ اس نے غلط نام لیا۔ ”میش کارنیل۔“

”حادثہ کہاں ہوا ہے؟“

جج نے آس پاس دیکھا مگر اسے ایسی کوئی نشانی نظر نہیں آئی جو وہ آپریٹر کو بتا سکتا۔ وہ اس سڑک کے نام سے بھی ناواقف تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں جس بوتھ سے بات کر رہا ہوں زخمی اس سے صرف پچاس فٹ کے فاصلے پر موجود ہے۔ پلیز جلدی ایمبولینس بھیجی جائے اس سے پہلے کہ وہ مر جائے۔“ اس نے کہتے ہی ریسیور واپس رکھا۔ اسے معلوم تھا کہ نائن ون ون کے پاس اس بوتھ کی لوکیشن آ گئی ہوگی اور وہ ایمبولینس یہاں بھیج سکتے تھے۔ وہ واپس زخمی کے پاس آیا۔ جو اب اکھڑے اکھڑے سانس لے رہا تھا۔ جج نے کہا۔ ”میں نے ایمرجنسی کال کر دی ہے کچھ دیر میں ایمبولینس آ جائے گی۔“

”میری مدد کرو۔“ وہ مشکل سے بولا۔ اس کے منہ سے رہ رہ کر خون ابل رہا تھا۔ ”پلیز... مجھے... چھوڑ کر... مت جاؤ۔“

جج کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اپنا کوٹ واپس کھینچا۔ ”سوری دوست... میں مجبور ہوں... مگر تم فکر مت کرو... پانچ دس منٹ میں کوئی نہ کوئی یہاں پہنچ جائے گا۔“

مگر زخمی اس کے جانے کا سن کر انتہائی مضطرب ہو گیا۔ ”نہیں... مجھے مت چھوڑو۔“ اس نے کوٹ تھام لیا تھا۔ جج نے کھینچا تو کوٹ کی جیب سے اس کے کچھ کاغذات اور وزیٹنگ کارڈز نکل کر زخمی اور سڑک پر بکھر گئے۔ اس نے جلدی جلدی انہیں سمیٹا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے دھیان رکھا تھا کہ کوئی چیز وہاں رہنے نہ پائے جو اس کی نشان دہی کرے۔ زخمی مسلسل کچھ کہہ رہا تھا مگر اس نے اپنے کان بند کر لیے۔ کوٹ گاڑی میں پھینکا اور اندر بیٹھتے ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس کا انجن اسٹارٹ ہی تھا۔ جب وہ اس سڑک سے مڑ رہا تھا تب اس نے دور عقب میں پولیس کار کی روشنیاں نمودار ہوتی دیکھیں۔ وہ اس کی توقع سے زیادہ تیزی سے آ گئے تھے اور وہ بروقت نکلا تھا۔ اسے ذرا تاخیر ہوتی تو پولیس اسے پکڑ لیتی۔ وہ مختلف راستوں سے ہوتا شکاگو کے نواحی علاقے میں اپنے خوب صورت ڈچ ہاؤس پہنچا۔ اس دو منزلہ مکان کی اوپری منزل کے کناروں پر رنگ برنگی ایل ای ڈی لائٹس لگی تھیں۔ ان کی وجہ سے مکان اور بھی خوب صورت لگ رہا تھا۔ اس نے گاڑی میں نصب ریموٹ کا بٹن دبایا تو گیراج کا دروازہ خودکار انداز میں اوپر اٹھنے لگا۔ اس نے گاڑی اندر روکی اور بٹن دبا کر دروازہ بند کر دیا۔

نیچے اتر کر اس نے گاڑی کا معائنہ کیا۔ خوش قسمتی سے اس پر حادثے کا کوئی نشان نہیں آیا تھا کیونکہ زخمی ٹکرانے کے بجائے اس کے پہیوں تلے آیا تھا۔ اگر ٹائروں پر خون کے نشانات آئے تھے تو اتنے سفر کے بعد ٹائر بھی صاف ہو گئے تھے اور ان پر صرف کیچڑ کا نشان تھا۔ مگر اس کے اوور کوٹ پر خون لگ گیا تھا جو اس نے زخمی پر ڈالا تھا۔ اس نے عجلت میں کوٹ خالی کیا اور اسے وہیں رکھے ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ پھر اسے اپنے ہاتھ اور کوٹ کا خیال آیا۔ دونوں کو زخمی نے پکڑا تھا اور ان پر بھی خون تھا۔ اس نے کوٹ بھی اتار کر ڈسٹ بن میں ڈالا۔ اپنا ہاتھ رومال سے صاف کر کے اسے بھی ڈسٹ بن کی نذر کیا اور پھر اندر سے جیکٹ پہن آیا۔ اس نے ڈسٹ بن کا شاپر نکالا اور اسے لے جا کر مکان کے ساتھ رکھے پبلک ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ واپس آ کر اس نے ایک بار پھر باریک بینی سے ہر چیز کا جائزہ لیا اور اندر مکان میں چلا آیا۔ اوپر بیڈروم میں روز کمبل میں لپٹی سو رہی تھی اور میک بستر کے اوپر اپنے لٹکنے والے جھولے میں سو رہا تھا۔ جج نے میک کو پیار کیا اور پھر آہستہ سے کمبل ہٹایا اور روز کے ساتھ لیٹ گیا۔

صبح اس کی آنکھ جلد کھل گئی تھی۔ رات روز نے ایک بار میک کو فیڈ کرایا تھا اس لیے وہ ابھی تک سو رہی تھی۔ جج اٹھ کر نیچے کچن میں آیا۔ اس نے اپنے لیے کیتلی سے کافی نکال کر وہیں لگا ٹی وی آن کر دیا۔ چند چینل بدلنے کے بعد اسے مطلب کی خبر مل گئی اور یہ خوفناک تھی۔ رات حادثے کا شکار ہونے والا چوبیس سالہ میل بری ہلاک ہو گیا تھا۔ وہ شاک کی کیفیت میں خبر سن رہا تھا۔ نیوز کاسٹر نے بتایا کہ میل بری گاڑی سے حادثے اور تشدد کی وجہ سے مرا تھا۔ پولیس کے مطابق اسے ٹولز سے نشانہ بنایا گیا تھا اور پھر اس کے جسم پر سے گاڑی گزار دی گئی تھی۔ پولیس کی تفتیش جاری تھی اور فی الحال کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی تھی۔ جج خبر دیکھ رہا تھا کہ روز میک کو اٹھائے وہاں آ گئی۔

”تم رات دیر سے آئے تھے؟“

”اوہ... ہاں۔“ جج نے چونک کر کہا۔ ”ویک اینڈ پارٹی ذرا دیر سے ختم ہوئی تھی اور پھر میں نے پی ہوئی تھی اس لیے آہستہ ڈرائیو کی۔“

"جج اب تم خاندان والے ہو۔" روز نے فریج کھول کر ناشتے کے لیے سامان نکالتے ہوئے کہا۔ "اگر تم پی کر ڈرائیو کرتے ہوئے پکڑے گئے تو تم جانتے ہو..."

"ایسا نہیں ہوگا۔" جج نے اس کی بات کاٹ کر کہا وہ اس وقت کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ کچرا اٹھانے والی گاڑی سڑک کے کنارے رکھے ڈسٹ بن کے پاس رکی تھی اور پھر اس کے آٹومیٹک آہنی ہاتھ نے ڈسٹ بن اٹھا کر گاڑی میں خالی کر دیا تھا۔ اس کا اوورکوٹ اور خون آلود رومال اسی میں تھا۔ اس نے سکون کا سانس لیتے ہوئے روز کی طرف دیکھا۔ "میں پوری احتیاط کرتا ہوں۔ مجھے خاندان کا احساس ہے۔"

"یہ ایک خطرہ ہے جو تم خود مول لیتے ہو۔" روز نے آہستہ سے کہا وہ تقریباً چوبیس برس کی خوب صورت عورت تھی۔ ان کی شادی کو تین سال ہو چکے تھے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش تھے۔ جج کے کان خبر پر لگے ہوئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پولیس جیسے ہی کسی مشکوک فرد کو حراست میں لے گی تو اس کا مطلب ہوگا جلد یا بدیر وہ اس معاملے میں ملوث ہو جائے گا۔ ناشتا بناتے ہوئے روز نے میک کو اسے تھما دیا اور وہ اسے اوپر لے آیا۔ میک ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ جج واش روم میں ضروریات سے فارغ ہوتے اور پھر شاور لیتے ہوئے اس سے بات کرتا رہا۔ اس سے بات کی جاتی تو وہ بہت خوش ہوتا تھا۔

پھر وہ میک کو لے کر نیچے آیا اور اسے اس کی کارٹ میں ڈال دیا۔ آج چھٹی کا دن تھا اور وہ ساتھ ناشتا کرتے تھے ناشتے کے دوران وہ اس کی مصروفیات پر بات کرتی رہی... اس کا کہنا تھا کہ اس موسم میں سرکاری ملازمین کو چھٹی ملنی چاہیے جیسے نجی کمپنیوں نے اپنے ملازمین کو دی تھی۔ جج نے کہا۔ "مجبوری ہے تم جانتی ہو سرکاری ملازمین کو تنخواہ ہی اس لیے دی جاتی ہے کہ وہ ہر حال اور موسم میں اپنے فرائض انجام دیتے رہیں۔"

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ مارکیٹ جانے کے لیے گیراج میں آیا پہلے اس نے وین کی چابیوں کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر پھر اس نے نیلی ہنڈا کی چابی بورڈ سے اٹھائی۔ راستے میں وہ سوچ رہا تھا کہ میل پر تشدد کس نے کیا۔ گاڑی تو اس کی تھی۔ اس نے ذہن پر زور دیا کہ میل کس طرح اس کی گاڑی کے آگے آیا تھا۔ کیا کسی نے اسے دھکا دیا تھا یا وہ خود گرا تھا۔ مگر اسے کچھ یاد نہیں آیا۔ درحقیقت اس نے کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کی ساری توجہ عقب میں تھی اور پھر جب میل پر سے گاڑی گزری تب بھی وہ بائیں طرف متوجہ تھا۔ اس نے دائیں طرف دیکھا نہیں تھا اس لیے اگر وہاں کوئی تھا تو وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ شاپنگ کے دوران بھی اس کا ذہن الجھا ہوا تھا مگر پھر اس نے سب کچھ ذہن سے جھٹک کر خریداری پر توجہ دی اور روز سے کال کر کے پوچھا کہ کوئی چیز منگوانی ہو تو وہ بتا دے۔ روز نے بھی کچھ سامان بتایا جو اس نے خرید لیا۔ اس روز ایک تو چھٹی کا دن تھا اور پھر طوفان کی پیش گوئی تھی اس لیے خریداروں کا بے پناہ رش تھا۔ اسے سامان لے کر واپس آنے میں کئی گھنٹے لگ گئے تھے۔

اس شام وہ ڈنر کے بعد لاؤنج میں ٹی وی کے آگے بیٹھا ہوا تھا۔ روز میک کو سلانے کے لیے اوپر چلی گئی تھی۔ وہ فٹ بال میچ دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے نیوز چینل لگایا تو چونک گیا۔ میل بری کیس میں پیش رفت ہوئی تھی اور پولیس نے ایک مشکوک فرد کو گرفتار کر لیا تھا۔ فی الحال اس کا نام میڈیا کو نہیں بتایا تھا مگر اتنا اعلان کیا تھا کہ اس کے خلاف کافی شہادتیں ملی تھیں جن کی بنیاد پر یہ گرفتاری عمل میں لائی گئی تھی۔ جج گہری سانس لے کر رہ گیا اس کا مطلب تھا کہ کل اسے بہت مصروفیت ہوگی۔ اگلے روز وہ صبح اٹھا تو روز سو رہی تھی اس نے خود اپنے لیے ناشتا بنایا اور تیار ہو کر دفتر پہنچا اور اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ حسب توقع اسے شیرن نے پکارا۔ "اے جج... جیکسن تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

رائٹ جیکسن شکاگو کاؤنٹی کا اٹارنی جنرل تھا اور جج اس کا ماتحت تھا۔ وہ جیکسن کے دفتر میں داخل ہوا تو وہاں اس کا ساتھی لیو نارڈ موجود تھا۔ وہ دونوں اکثر کیسز میں ایک ٹیم کی طرح کام کرتے تھے۔ جیکسن تقریباً ساٹھ برس کا ہونے والا تھا اس کا مطلب تھا کہ اس کی ریٹائرمنٹ قریب تھی اور اگر میئر آفس میں کوئی انوکھا فیصلہ نہیں ہوتا تو امکان تھا کہ جج یا اس کے ساتھیوں میں سے کوئی اگلا اٹارنی جنرل بنتا۔ مگر جج اس لیے زیادہ پُرامید نہیں تھا کہ وہ نوجوان تھا اور اس کے لیے اسسٹنٹ اٹارنی جنرل بننا ہی بڑی بات تھی۔ اس کے پاس کل پانچ سال کا تجربہ تھا اور اتنے سے تجربے پر وہ اٹارنی جنرل نہیں بن سکتا تھا۔ مگر ایک سرکاری وکیل کے طور پر اس کا ریکارڈ شاندار تھا۔ اس نے ساٹھ فیصد سے زیادہ کیسز میں کامیابی حاصل کی اور جن ملزموں کے خلاف اسے پراسیکیوٹر مقرر کیا گیا اس نے انہیں مناسب سزائیں دلوائیں۔ صرف دس فیصد کیسز ایسے تھے جن میں وہ ملزموں کو سزا دلوانے میں ناکام رہا کیونکہ ان کے خلاف شواہد اور گواہیاں زیادہ مضبوط نہیں تھیں۔

"پولیس نے یہ ہم پر تھوپا ہے۔" جیکسن نے ایک فائل ان کے سامنے رکھ دی۔ جج ٹھہر گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ یہ فائل میل بری مرڈر کیس کی ہے۔ لیو نے سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"اس میں کیا ہے؟"

"پرسوں رات ایک شخص قتل ہوا ہے اور پولیس نے ایک مشکوک فرد کو پکڑا ہے۔ پولیس چاہتی ہے کہ اٹارنی آفس بھی اس کی تفتیش میں شامل ہو۔"

"اس کا مطلب ہے ان کے پاس شواہد مضبوط نہیں ہیں۔" لیو نے کہا۔ "ورنہ پولیس خود اس کا کریڈٹ لینے کی کوشش کرتی۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" جیکسن نے سر ہلایا۔ "مگر ہم پولیس کو انکار بھی نہیں کر سکتے... کیس تو بالآخر اٹارنی آفس نے ہی عدالت میں لڑنا ہے۔"

"کیا اس پر ہمیں کام کرنا ہے؟" جج نے پوچھا۔

"بالکل ورنہ میں تمہیں کیوں بلاتا؟"

جج سوچ رہا تھا کہ میل کو مرے چھتیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے اور پولیس نے کیس اٹارنی آفس بھجوا دیا تھا۔ اس نے سامنے پڑی فائل اٹھائی۔ اس میں قتل اور جائے واردات کی رپورٹ، ملنے والے شواہد کا ذکر اور پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ میل کی مختصر ہسٹری بھی تھی۔ یہ ہسٹری خاصی دلچسپ تھی... کیونکہ اس کے مطابق وہ تین دفعہ گرفتار ہوا تھا اور اس پر تشدد، اذیت رسانی اور کم سے کم دو عورتوں کو ریپ کرنے کا الزام تھا۔ گویا میل بری کوئی عام اور شریف آدمی نہیں تھا مگر اس سے اس کے کیس پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ انہیں بہرحال اس کے قاتل کو سزا دلوانے کی کوشش کرنا تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق موت سر کی ہڈی ٹوٹنے سے دماغ پر آنے والی ضرب سے ہوئی تھی۔ زیر حراست مشکوک فرد کے بارے میں اس فائل میں کچھ نہیں تھا اس کے بارے میں جاننے کے لیے انہیں پولیس آفس سے رابطہ کرنا پڑا تھا۔ ہومی سائیڈ ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ لیفٹیننٹ ایگن مور نے انہیں بتایا کہ زیر حراست شخص بارنی جین مشکوک ہے اور وہ پہلے ہی ایک بار تشدد کے الزام میں گرفتار ہوا تھا اور عدالت نے اسے چھ مہینے کی معطلی کی سزا سنائی تھی۔ خود بارنی کا خاندان تشدد کر کے ... [illegible] ... پھر اس واردات میں بارنی تقریباً موت کے گھاٹ اتر گیا تھا۔ گویا اس کیس میں مبینہ قاتل اور مقتول دونوں ہی گرفتار اور سزا یافتہ تھے۔

جج اور لیو پولیس اسٹیشن پہنچے۔ بارنی تفتیش کے لیے مخصوص کمرے میں بیٹھا تھا۔ جج اور لیو نے اسے اندھے شیشے کے پیچھے سے دیکھا۔ وہ تقریباً پینتالیس برس کا مضبوط جسم اور سخت چہرے والا شخص تھا۔ اس کے چہرے پر کئی زخموں کے نشانات تھے خاص طور سے دائیں کنپٹی کا نشان بہت گہرا تھا اور شاید یہی زخم تھا جس سے بچ جانے پر ڈاکٹر بھی حیران ہوئے تھے۔ اس کیس کی تفتیش کرنے والا آفیسر مائیکل ان کے ساتھ تھا۔ اس نے پہلے میل بری کے بارے میں بتایا۔ جب پولیس مذکورہ مقام پر پہنچی تو اسے میل بری سڑک کے ساتھ گلی میں اوندھے منہ پڑا ملا۔ وہ بے ہوش تھا اور جب تک ایمبولینس آئی اس نے دم توڑ دیا تھا۔ طبی عملے نے اس کی جان بچانے کی کوشش کی لیکن بہت دیر ہو گئی تھی۔ جج نے اس سے پوچھا۔ "یہ کس قسم کا آدمی ہے۔"

"بہت پرسکون اور مضبوط اعصاب کا۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے چھٹے ہوئے مجرموں کو بھی اتنا پرسکون اور مضبوط نہیں دیکھا۔"

"یہ کیا کرتا ہے؟" لیو نے پوچھا۔

"اس کا آٹو ورکشاپ ہے۔ ساؤتھ ویسٹ اسٹریٹ پر جین آٹو ورکشاپ کے نام سے۔"

"اس کے اور اس کے گھر والوں کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

اس سوال پر مائیکل نے گہرا سانس لیا۔ "بہت برا... تین سال پہلے نصف رات کے وقت نامعلوم تعداد میں نامعلوم نقاب پوش بدمعاش ان کے گھر میں داخل ہوئے۔ انہوں نے سب اہل خانہ کو قابو کیا اور بارنی کو شدید تشدد کا نشانہ بنایا۔ اسے ایسے زخم لگائے کہ وہ مرے نہیں مگر ناکارہ ہو جائے پھر انہوں نے اس کی پینتیس سالہ بیوی اور پندرہ سال کی بیٹی کو اس کے سامنے گینگ ریپ کیا اور آخر میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ البتہ وہ بارنی کو نیم مردہ حالت میں زندہ چھوڑ گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ بعد میں خود مر جائے گا۔ مگر حملہ آوروں کا خیال غلط ثابت ہوا۔ بارنی کو طبی امداد مل گئی اور وہ بچ گیا۔"

"وہ لوگ پکڑے گئے؟"

مائیکل نے گہری سانس لی۔ "بدقسمتی سے نہیں... پولیس نے کچھ مشکوک افراد سے پوچھ گچھ کی تھی مگر ان کے خلاف کوئی ثبوت سامنے نہیں آیا اس لیے پولیس کو انہیں چھوڑنا پڑا۔"

"یہ شدید دشمنی کا کیس لگ رہا ہے۔" لیو بولا۔ "کیا

بارنی نے نہیں بتایا کہ اس کی کس سے ایسی دشمنی ہوسکتی تھی؟"

"نہیں، اس کا کہنا ہے وہ حملہ آوروں کے بارے میں بالکل نہیں جانتا۔ ماضی میں اس کا کئی افراد سے جھگڑا ہوا۔ اس کا کام بھی ایسا تھا۔ مگر وہ نہیں کہہ سکتا کہ ان میں سے کس نے اس سے دشمنی نکالی یا پھر وہ لوگ صرف اذیت پسند تھے۔"

"اس کیس میں اسے کیوں گرفتار کیا گیا ہے؟"

"جس جگہ سے میل بری کی لاش ملی ہے وہاں سے بارنی کا ورکشاپ صرف سو گز کی دوری پر ہے۔ پولیس نے شبہے کی بنیاد پر اس کے ورکشاپ کی تلاشی لی تو انہیں وہاں سے دو اوزاروں پر میل بری کے خون کے آثار ملے اسی بنا پر اسے گرفتار کیا گیا ہے۔" مائیکل نے پلاسٹک کا شاپر ان کے حوالے کیا جس میں ایک جیک راڈ تھی اور ایک چھوٹی ہتھوڑی تھی۔ "جیسے ہی ان اوزاروں پر میل بری کے خون کے نمونے ملے ہم نے بارنی کو گرفتار کرلیا۔"

"میل کا جسم کسی گاڑی نے بھی کچلا گیا تھا؟" لیو نے پوچھا تو جج نے جلدی سے دوسری طرف دیکھا، اسے خطرہ تھا کہ اس کے تاثرات ان کو مشکوک نہ کردیں۔ حالانکہ یہ اس کے دل کا چور تھا۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہی نہیں تھے۔ مائیکل نے نفی میں سر ہلایا۔ "کیا وہ بارنی کی گاڑی تھی؟"

"بارنی کی گاڑی صاف پائی گئی اور اس کے ٹائر بھی اس سے بالکل مختلف ہیں۔ پھر حادثے کے بعد جس شخص نے نائن ون ون کو کال کی تھی اس کی آواز بارنی سے بالکل مختلف نکلی ہے۔"

"ممکن ہے وہ آواز بدل کر بول رہا ہو؟"

"نہیں اس کی آواز کی وائس میچنگ کی گئی ہے۔"

لیو کے خیال میں انہوں نے خاصی معلومات حاصل کرلی تھیں، اس نے جج سے کہا۔ "اب ذرا اس سے مل لیا جائے۔"

وہ کمرے میں آئے جہاں بارنی جیمن ساکت بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سخت تاثر تھا۔ لیو نے فائل اور اوزاروں والا شاپر اس کے سامنے رکھا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ بارنی نے کہا۔ "کیا مجھے گرفتار کرلیا گیا ہے؟"

"ظاہر ہے۔" لیو نے کہا۔

"کیا مجھ پر فرد جرم عائد کی گئی ہے؟"

"ابھی نہیں۔"

"پھر بھی میں اپنے وکیل کی موجودگی میں بات کروں گا۔" اس نے اصرار کیا۔ جج جو ایک طرف کھڑا تھا وہ آگے آیا اور ذرا جھک کر بولا۔

"تم زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو۔ ہم سے تعاون کرو ہم تمہیں الیکٹرک چیئر پر نہیں بٹھانا چاہتے۔"

"تب تم کیا چاہتے ہو؟"

"حقیقت تک پہنچنا۔" جج نے کہا۔ "تمہارے ٹولز پر میل بری کا خون کیسے پہنچا؟"

"میں نہیں جانتا کہ اس کا نام میل بری ہے۔"

"او کے تم اپنے ٹولز کی وضاحت کرو۔"

بارنی سوچ میں پڑ گیا... پھر اس نے کہا۔ "میں سات بجے تک ورکشاپ بند کردیتا ہوں۔ لیکن کل رات میں نے نو بجے بند کی تھی۔ پھر میں نزدیکی بار چلا گیا اور وہاں پیتا رہا۔ واپس گھر جاتے ہوئے میں ورکشاپ کے پاس سے گزرا تو مجھے اندر روشنی نظر آئی جبکہ میں ساری روشنیاں بند کرکے آیا تھا۔ میں گاڑی سے اترا اور یہ راڈ لے لی۔" بارنی نے شاپر میں موجود جیک راڈ کی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں؟"

"میرا خیال تھا اندر کوئی چور ہے۔"

"او کے تم اندر گئے تو تم نے کیا دیکھا؟"

"میں نے ایک نوجوان آدمی کو دیکھا اس نے ڈارک گرین رنگ کی شرٹ اور اس کے نیچے سیاہ جرسی پہن رکھی تھی۔ وہ میرے سامان کو کھنگال رہا تھا۔ میں نے اسے للکارا تو اس نے بھڑک کر مجھ پر حملہ کردیا۔ میں نے صرف اپنا دفاع کیا تھا۔ میں نے اسے راڈ سے مارا۔ میرے ہاتھ سے راڈ چھوٹ کر گری تو میں نے ریک سے یہ ہتھوڑی اٹھا لی۔ میں نے اس سے بھی اسے مارا لیکن وہ ورکشاپ سے نکل کر بھاگنے میں کامیاب رہا۔ اسی وجہ سے میرے اوزاروں پر اس کا خون آگیا۔ اگر میرے دل میں چور ہوتا تو میں اوزار صاف رکھتا یا کہیں چھپا دیتا۔ پولیس بغیر وارنٹ کے میرے ورکشاپ میں آئی اور مجھے گرفتار کرلیا۔"

"تم نے اس کا پیچھا نہیں کیا؟"

"بالکل نہیں، میں فکرمند تھا کہ اس نے کیش بکس میں موجود رقم نہ نکال لی ہو مگر وہ رقم نہیں نکال سکا تھا۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟"

"میں اپنے گھر چلا گیا تھا۔"

"اس نے تم پر کس چیز سے حملہ کیا تھا؟" لیو نے مداخلت کی۔

"میں نہیں جانتا شاید لکڑی کا ڈنڈا تھا۔ مگر وہ مجھے چوٹ لگانے میں کامیاب نہیں ہوا۔"

"کیونکہ تم اس سے زیادہ ماہر ہو۔"

بارنی نے اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ جج نے کہا۔ "جس جگہ میل بری کی لاش ملی وہ تمہاری ورکشاپ سے صرف سو گز کے فاصلے پر ہے۔ تم باہر نکلے تو تم نے دیکھا نہیں تھا؟"

بارنی نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے کچھ نظر نہیں آیا تھا میں اپنی گاڑی میں بیٹھا اور وہاں سے چلا گیا۔"

"وقت کیا ہوا تھا؟"

"شاید بارہ کے آس پاس کا وقت تھا۔" بارنی نے بے یقینی سے کہا۔ "سچ تو یہ ہے کہ مجھے وقت کا خیال ہی نہیں رہا تھا میں کسی قدر نشے میں اور تھکا ہوا تھا۔"

"تم نے پولیس کو رپورٹ کیوں نہیں کی؟"

اس نے شانے اچکائے۔ "میرا کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ دوسرے پولیس سے میرے خاص تعلقات بھی نہیں ہیں۔" کہتے ہوئے اس کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

لیو اور جج گھما پھرا کر اس سے سوالات کرتے رہے۔ بعض اوقات اس پر دباؤ بھی ڈالا۔ مگر مائیکل کی بات سو فیصد درست ثابت ہوئی تھی کہ وہ بہت پُرسکون اعصاب کا مالک تھا۔ وہ ذرا بھی متاثر نہیں ہوا... اسے اعتماد تھا کہ پولیس اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ٹولز پر خون ملنا ایسی بات نہیں تھی کہ اس پر قتل کا الزام لگایا جاسکتا جبکہ مقتول کسی گاڑی تلے بھی آیا تھا۔ ابھی یہ ملاقات جاری تھی کہ مائیکل نے اندر جھانک کر اشارے سے لیو کو بلایا اور آہستہ سے بولا۔ "اس کا وکیل آگیا ہے۔"

"اس سے کہو ابھی انتظار کرے۔"

"میں نے یہی کہا ہے لیکن وہ ایک حد سے زیادہ نہیں رکے گا۔ تم شارک کو جانتے ہو۔"

راڈ بوشر جو عرف عام میں شارک کے نام سے مشہور تھا نہایت چالاک اور ایک ایسا وکیل سمجھا جاتا تھا جو مجرموں کو بچانے کے لیے ہمہ وقت مستعد رہتا ہے اور عدالت میں اس کے حربوں سے مخالف وکیل خوف زدہ رہا کرتے تھے۔ وہ ججز پر دباؤ ڈالنے سے بھی باز نہیں آتا تھا۔ جج کو اس شخص سے چڑ تھی۔ جب لیو اور جج باہر نکلے تو شارک موجود تھا۔ وہ مسکرایا اور بولا۔ "تم لوگوں نے ایک بے گناہ کو پکڑا ہے۔"

"اگر وہ بے گناہ ہوتا تو تم اس کی وکالت کے لیے یہاں نہ آتے۔" جج نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ اس نے شارک کے تاثرات دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ لیو نے باہر آکر اسے داد دی۔

"تم نے بالکل ٹھیک کیا اس کے ساتھ۔"

جج نے توجہ نہیں دی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میل کو پہلے بارنی نے تشدد کا نشانہ بنایا۔ وہ وہاں سے بھاگا تو اس کی گاڑی تلے آگیا۔ اس کے بعد جب پولیس اور ایمبولینس جائے وقوع پر پہنچی تو وہ قریب المرگ تھا۔ جب تک جج نے اسے دیکھا تھا وہ ہوش میں تھا مگر حرکت کے قابل نہیں تھا۔ پھر وہ گلی میں کیسے گیا؟ جج نے سوچا کہ اسے جا کر جائے وقوع کا معائنہ کرنا چاہیے مگر آج اسے بہت کام تھا اس لیے اس نے معائنہ اگلے روز تک کے لیے ملتوی کردیا اور شام پانچ بجے دفتر سے نکل گیا۔ کیس کی تیاری کا کام اس نے لیو کے سپرد کردیا تھا۔ وہ گھر پہنچا تو پیش گوئی کے مطابق طوفان کی آمد کے آثار نمایاں ہوگئے تھے۔ اگلی صبح شدید طوفانی ہواؤں کے ساتھ بھاری برف باری کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ جج دفتر نہیں گیا۔ اس نے فون کرکے بتادیا تھا۔ اس لیے لیو نے کیس کی فائل اسے ای میل کردی اور وہ گھر پر اسے دیکھتا رہا۔

طوفان ڈھائی دن جاری رہا اس لیے وہ تین دن دفتر نہیں جاسکا پھر وہ جمعے کو دفتر گیا... طوفان کی شدت کم ہوتے ہی انتظامیہ حرکت میں آگئی تھی اور سڑکوں اور راستوں سے برف کی صفائی کا کام شروع کردیا گیا تھا، اسی لیے ہر طرف برف کے انبار نظر آرہے تھے۔ لیو نزدیک ہی رہتا تھا اس لیے وہ گزشتہ دن بھی دفتر آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے کیس فائل کردیا تھا اور آنے والے منگل تک جیوری تشکیل دے دی جائے گی۔ مگر وہ زیادہ پُرامید نظر نہیں آرہا تھا۔ دوپہر میں جج لنچ کے لیے نزدیکی ریسٹوران گیا۔ وہاں سے واپسی ہوئی تو فون آپریٹر میگی نے اسے آواز دی۔ "ہے جج، تمہارے لیے ایک کال آئی تھی۔"

"کس کی کال؟"

"کوئی جمی ہے۔" میگی بولی تو وہ ساکت رہ گیا۔ "اس نے ایک فون نمبر دیا ہے۔"

"مجھے دو۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ میگی نے حیرت سے اسے دیکھا اور کاغذ کی ایک چٹ اس کی طرف بڑھا دی۔ جج نے اپنے کمرے میں آکر نمبر ملایا اور رابطہ ہوتے ہی سرد لہجے میں بولا۔ "جمی تم نے یہاں کیوں کال کی؟"

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"میں تم سے نہیں ملنا چاہتا۔"

"پلیز...... میں دفتر آجاتا ہوں۔"

’’نہیں۔‘‘ اس بار جج کا لہجہ بدل گیا۔’’میں آرہا ہوں مجھے دریا کے کنارے ملو تم جانتے ہو نا میں کس جگہ کی بات کر رہا ہوں؟‘‘

’’ہاں سمجھ رہا ہوں۔‘‘

’’میں چار بجے آؤں گا۔‘‘ جج نے کہا اور کال کاٹ دی۔ وہ فکر مند لگ رہا تھا۔ تین بجے وہ دفتر سے اٹھا اور اس نے لیو سے کہا۔’’میں جائے وقوع دیکھنے جارہا ہوں۔‘‘

لیو نے شانے اچکائے۔’’اس کی ضرورت نہیں ہے فائل میں تصاویر سمیت سب موجود ہے۔ لیکن تمہاری مرضی۔‘‘

’’تم شارک کو بھول رہے ہو ہمیں کوئی پہلو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔‘‘ جج نے کہا اور اپنا اوورکوٹ پہن کر باہر آگیا۔ یہ بالکل ویسا اوورکوٹ تھا جیسا اس نے ڈسٹ بن میں پھینکا تھا۔ روز اگر میک میں مگن نہ ہوتی تو شاید وہ نوٹ کر لیتی کہ اس کا اوورکوٹ اور سوٹ کا کوٹ غائب ہے۔ جج جائے وقوع کے بجائے آدھے گھنٹے بعد مطلوبہ جگہ پہنچ گیا۔ کنارے پر دور تک برف جمی ہوئی تھی اور گرم کپڑوں اور ٹوپی میں لپٹا ہوا جمی اس کا منتظر تھا۔ اس نے جج کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن جج نے اس کا ہاتھ نظر انداز کر کے پوچھا۔’’تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟‘‘

’’میں تمہارا بھائی ہوں۔‘‘

’’سوتیلا بھائی۔‘‘ جج نے تصحیح کی۔’’ہماری مائیں الگ الگ ہیں۔‘‘

جمی دبلے چہرے اور کھردرے تاثرات والا شخص تھا۔ وہ نوعمری سے غلط صحبت میں پڑ کر بالآخر جرائم کی راہ پر چل نکلا تھا۔ ان کے باپ تک نیلسن نے جمی سے قطع تعلق کر لیا تھا اور جج بھی اس سے نہیں ملتا تھا۔ یہ ملاقات پانچ برس بعد ہو رہی تھی۔ جمی نے کہا۔’’اس سے فرق نہیں پڑتا۔‘‘

’’مجھے پڑتا ہے۔‘‘ جج نے دانت پیسے۔’’اب میں اٹارنی آفس میں کام کرتا ہوں۔ ہوسکتا ہے پندرہ بیس سال بعد میں اٹارنی جنرل کے عہدے پر پہنچ جاؤں لیکن اگر یہ بات کھل گئی کہ میرا سوتیلا بھائی ایک سزا یافتہ اور عادی مجرم ہے تو میرا کیریئر تباہ ہوجائے گا۔‘‘

’’تو تم کیا کرو گے؟‘‘ جمی کا لہجہ طنزیہ ہوگیا۔’’کیا تم میرے ساتھ رشتے سے انکار کرسکتے ہو؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ جج کا لہجہ دھیما ہوگیا۔’’لیکن میں اسے ممکنہ حد تک چھپا سکتا ہوں۔ سنو جمی! مجھ میں اور تم میں سوائے ایک نام نہاد رشتے کے کچھ مشترک نہیں ہے پھر تم کیوں مجھ سے ملنا چاہتے ہو جب کہ میں تم سے ملنا نہیں چاہتا۔‘‘

جمی اسے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔’’ڈر مت میرا تمہاری زندگی میں عمل دخل کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اس دنیا میں تم میرے واحد رشتے دار ہو اور میں تم سے ملنا اور تمہیں دیکھنا چاہتا تھا۔‘‘

’’تم مجھ سے مل لیے اور مجھے دیکھ لیا۔‘‘ جج نے اس کی بات کا اثر لیے بغیر کہا۔’’امید ہے تمہیں آئندہ اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور پلیز آئندہ میرے دفتر کال مت کرنا۔‘‘ جج نے کہا اور سڑک کے ساتھ کھڑی اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

کمرائے عدالت میں جج، لیو اور شارک کے علاوہ جیوری کے اراکین موجود تھے۔ جج کی آمد پر سب اپنی نشستوں سے کھڑے ہو گئے۔ جج نے بیٹھ کر لیو کی طرف دیکھا۔’’مسٹر کونسلر... کیس پیش کرو۔‘‘

لیو اٹھ کر کیس پیش کرنے لگا مگر اس کا مخاطب جج نہیں بلکہ جیوری تھی۔ جیوری کثرت رائے سے فیصلہ کرتی کہ بارنی مجرم ہے یا نہیں۔ اس کے بعد جج اس پر فرد جرم کے حساب سے فیصلہ سناتا۔ اسی اثنا میں بارنی کی آمد ہوئی وہ ہتھکڑی کے ساتھ آیا تھا اور عدالت میں بھی اس کے ہاتھوں سے ہتھکڑی نہیں کھولی گئی تھی۔ لیو نے کیس پیش کیا اس کے بعد جج نے بارنی پر جرح کی اجازت چاہی مگر شارک نے اعتراض کیا اور بولا۔’’میرے موکل کے سامنے کیس کی تمام گواہیاں اور شواہد رکھے جائیں اس کے بعد ہی اس پر جرح کی جاسکتی ہے۔‘‘

جج نے شواہد پیش کیے۔ واقعے کا کوئی گواہ نہیں تھا۔ البتہ کیس آفیسر شیلا مورگن آئی تھی۔ وہ ہوئی سائڈ میں ڈپٹی تھی اور یہ کیس وہی دیکھ رہی تھی۔ شیلا نے سب سے پہلے گواہ کے کٹہرے میں آکر بتایا کہ واقعے کی رات بارہ بج کر بارہ منٹ پر نائن ون ون کو کال ملی جو بوتھ نمبر دوسو بارہ سے کی جارہی تھی۔ بولنے والے نے بتایا کہ کار کے حادثے میں ایک شخص شدید زخمی ہے اور اسے طبی امداد کی ضرورت ہے۔ شیلا مورگن اپنا ٹیپ ساتھ لائی تھی اور اس نے کال ریکارڈنگ چلا کر سب کو سنائی۔ اگرچہ سنائی دینے والی آواز جج کی اصل آواز سے خاصی مختلف تھی اس کے باوجود وہ پریشان ہوگیا تھا۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے شیلا سے سوالات کا آغاز کیا۔’’کیا یہ آواز بارنی جینن کی ہے؟‘‘

’’نہیں، وائس میچنگ سے ثابت ہوگیا ہے کہ آواز اس کی نہیں ہے۔‘‘

’’ماہرین کا کیا اندازہ ہے بولنے والا کون ہوسکتا ہے؟‘‘

’’ممکنہ طور پر ایک سفید فام جوان مرد جو شکاگو کے آس پاس پلا بڑھا ہے لیکن لہجے میں کسی قدر دیہاتی تاثر بھی ہے۔ وہ تعلیم یافتہ لیکن بدحواس لگ رہا تھا۔ اگر یہ حادثہ اسی سے ہوا تو اس کی پریشانی اس سے میچ کر رہی ہے۔‘‘

’’تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ حادثہ اسی شخص سے ہوا؟‘‘

’’کیونکہ اس نے میل بری کو حادثے کا شکار بتایا۔‘‘

’’یہ بھی ممکن ہے وہ اس وقت وہاں سے گزر رہا ہو؟‘‘

’’اس صورت میں اسے چھپنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔‘‘

’’ممکن ہے وہ کسی وجہ سے سامنے نہیں آنا چاہتا ہو۔‘‘

’’ہوسکتا ہے لیکن میرا تاثر یہی ہے کہ حادثہ اسی کی گاڑی سے پیش آیا تھا۔‘‘

’’میل بری کی لاش گلی میں پائی گئی لیکن حادثہ یقیناً سڑک پر ہوا تھا، پولیس اس بارے میں کیا کہتی ہے؟‘‘

’’پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اس کے سینے اور ٹانگوں کی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں اور وہ بہت مشکل سے ہی اس گلی میں جاسکتا تھا مگر سوال یہ ہے اسے وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی جب کہ اسے مدد ملنے کا امکان سڑک پر تھا نہ کہ گلی میں۔‘‘

’’تمہارا مطلب ہے کہ اسے وہاں لے جایا گیا تھا؟‘‘

’’زیادہ امکان یہی ہے۔‘‘

’’یہ کام قاتل نے کیا یا اس شخص نے جس کی کار سے وہ ٹکرایا تھا؟‘‘

’’میرا خیال ہے یہ کام قاتل کا ہے۔‘‘ شیلا نے کہا تو جج نے پلٹ کر بارنی کی طرف دیکھا، اس کا اشارہ واضح تھا۔ اس کے بعد شارک نے شیلا سے سوالات کیے۔ اس کا انداز کہیں زیادہ جارحانہ تھا مگر شیلا اثر لیے بغیر جواب دیتی رہی۔ جج اس پہلی پیشی سے خوش تھا، اس نے جان بوجھ کر بارنی سے جرح نہیں کی۔ وہ یہ کام اگلی پیشی میں کرنا چاہتا تھا۔ مگر پیشی کے بعد جب اس کی شیلا سے پارکنگ میں ملاقات ہوئی تو اس نے کہا۔

’’مجھے لگ رہا ہے بارنی بچ جائے گا۔ درحقیقت ہمارے پاس مضبوط شواہد نہیں ہیں۔‘‘

’’اس کے ٹولز پر میل بری کا خون ہے۔‘‘ جج کی خوشی ماند پڑ گئی تھی۔

’’مگر اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ جان لیوا ضرب اسی نے لگائی تھی۔ ممکن ہے وہ حادثے میں لگنے والی چوٹ سے مرا ہو۔‘‘ شیلا نے کہا۔’’پھر تم بھول رہے ہو وہ خود تشدد کا شکار ہے اور اپنی فیملی گنوا چکا ہے۔ یہ بات جیوری کو متاثر کرے گی۔‘‘

شیلا کا کہنا درست ثابت ہوا۔ اگلی پیشی میں شارک نے بارنی کی زندگی کا یہ پہلو اتنے مؤثر انداز میں پیش کیا اور پولیس کی نااہلی کا ایسے ذکر کیا جیسے وہ خود اس کے خاندان پر ہونے والے تشدد میں شامل تھی۔ اس پر جیوری کے تاثرات سابقہ پیشی سے بالکل بدل گئے تھے اور اسی پیشی میں شارک نے اس کی ضمانت کی درخواست بھی دائر کردی۔ شیلا نے پھر پیش گوئی کی کہ اگلی پیشی میں بارنی کی ضمانت ہوجائے گی اور ایسا ہی ہوا تھا۔ تیسری پیشی کے بعد جب وہ کمرائے عدالت سے باہر آئے تو جج سخت مایوس تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ ضمانت اتنی آسانی سے منظور ہوجائے گی جب کہ ابھی جیوری نے فرد جرم بھی عائد نہیں کی تھی۔ برآمدے میں اس کا سامنا بارنی سے ہوا تو جج نے طنزیہ انداز میں کہا۔’’مبارک ہو تم پھر آزاد ہو۔‘‘

’’کیونکہ میں نے کچھ نہیں کیا۔‘‘ وہ بولا اور اپنی جیب سے سگریٹ نکال کر اس کا فلٹر توڑ کر نیچے پھینک دیا اور باقی سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر لائٹر سے سلگایا۔’’میں جلد رہا ہوجاؤں گا۔‘‘ اس نے کہا اور دھواں اڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ آج لیو نہیں آیا تھا۔ جج دفتر پہنچا اور اس نے کیس کی فائل اپنی میز پر پٹخ دی۔

’’کیا فائدہ ہوا اتنی محنت کا، وہ شارک کا بچہ کتنی آسانی سے ہم سے شکار چھین کر لے گیا۔‘‘

’’کیس ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔‘‘ لیو نے اسے تسلی دی۔ ’’ابھی ہمارے پاس وقت ہے ہم مزید تفتیش کرسکتے ہیں۔‘‘

’’ہاں تم نے ٹھیک کہا۔‘‘ جج چونک کر بولا۔’’میں سوچ رہا ہوں ایک بار پھر جائے واردات کا چکر لگاؤں۔‘‘

پہلے اس نے لیو سے جھوٹ بولا تھا مگر اس بار وہ سچ مچ وہاں جانا چاہتا تھا۔ وہ دوپہر کے بعد دفتر سے نکلا۔ موسم کسی قدر بہتر ہوگیا تھا اور آخری برف باری کے آثار تقریباً مٹ گئے تھے۔ وہ اس جگہ پہنچا جہاں اس کی گاڑی سے میل ٹکرایا تھا۔ یہاں سڑک برف سے صاف کردی گئی تھی۔ اس نے گاڑی ذرا آگے روکی اور اتر کر اس جگہ کا معائنہ کیا۔ میل اسی گلی سے نکلا تھا۔ فرش پر لاش کا وائٹ اسکیچ اب تک بنا ہوا تھا اور یہ جگہ سڑک سے تقریباً بیس فٹ کی دوری پر تھی۔ یہ کچرے والی گلی تھی جو دو سڑکوں کو آپس میں ملا رہی تھی اس میں جا بہ جا ڈسٹ بن اور کچرے کے ڈبے رکھے ہوئے

تھے۔اس نے ڈبوں میں جھانکا۔ڈسٹ بن تالا لگا کر بند تھا۔مگر کریدنے والوں نے اس کا ڈھکن توڑ دیا تھا۔

ہج نے اندر جھانکا تو بدبو نے اس کا استقبال کیا۔پھر وہ کچرے سے بچتا ہوا دوسری سڑک پر آیا اور بارنی ورکشاپ کا بورڈ کچھ ہی دور سڑک کے پاس دکھائی دیا۔ واقعی یہ جگہ حادثے کے مقام سے سوگز دور بھی نہیں تھی۔ہج نے چشمِ تصور سے دیکھا کہ بارنی سے پٹ کر میل ہراساں اور شدید زخمی حالت میں بھاگتا ہوا آرہا تھا اور اس نے یہ گلی کراس کی اور عجلت میں اس کی کار کے سامنے آگرا۔کار اس پر سے گزر گئی اور اسے مزید زخمی کر دیا لیکن اسے جان لیوا زخم بارنی نے ہی لگائے تھے کیونکہ کار کے پہیے اس کے سینے اور پیروں پر سے گزرے تھے اور اس کی موت سر کی چوٹ سے ہوئی تھی۔مگر یہ واضح نہیں تھا کہ موت والی چوٹ کس طرح آئی ہے۔اس صورت میں بارنی کی بچت کے امکانات تھے۔ہج سوچتے ہوئے اپنی کار کی طرف جارہا تھا کہ اسے ڈسٹ بن کے ساتھ زمین پر کچھ نظر آیا۔

اس نے جھک کر اسے اٹھایا۔یہ سگریٹ کے فلٹر کا ٹکڑا تھا جسے باقی سگریٹ سے توڑ کر الگ کیا گیا تھا۔ہج کو یاد آیا، بارنی نے اس کے سامنے سگریٹ سلگایا تھا تو اس نے بھی ایسے ہی فلٹر توڑ کر الگ کر دیا تھا۔ہج پُرجوش ہو گیا۔۔۔اس فلٹر کی یہاں موجودگی بتا رہی تھی کہ بارنی نے قطعی جھوٹ بولا تھا۔وہ میل کے پیچھے یہاں آیا تھا یا وہ اس پر اسی گلی میں تشدد کر رہا تھا جب میل اس سے بچنے کے لیے اندھا دھند بھاگا اور گلی سے نکلتے ہوئے اس کی کار کے سامنے آگرا۔بارنی یہ دیکھ کر چھپ گیا تھا مگر جب اس نے نائن ون ون کو کال کی اور میل کو چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا تو بارنی دوبارہ آیا اور میل کو کھینچ کر گلی میں لے گیا جہاں اس نے اس پر مزید وار کر کے اسے تقریباً ختم کر دیا۔اب ہج جان گیا تھا کہ میل بری بار بار کیا کہہ رہا تھا۔وہ اسے بارنی سے بچانے کو کہہ رہا تھا۔اسی لیے اس نے ایمبولینس کے بجائے پولیس کو کال کرنے کو کہا تھا۔

ہج نے محسوس کیا کہ اسے بارنی کے ماضی کے بارے میں مزید تحقیق کرنا ہوگی۔وہ گھر جانے کے بجائے واپس دفتر پہنچا اور اس نے اپنے کمپیوٹر پر بارنی کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔اس میں اس کے خاندان پر ہونے والے حملے کی معلومات بھی تھیں اور ان میں تصویریں بھی تھیں۔ہج۔۔۔بارنی اس کی بیوی اور بیٹی کی تصویریں دیکھ کر لرز اٹھا تھا۔آئے دن اس کا واسطہ مجرموں سے پڑتا تھا مگر اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ انسان اس قدر بھی درندہ ہو سکتا ہے۔بارنی کی بیٹی کو صرف ریپ نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس پر اتنا زیادہ تشدد ہوا تھا کہ بیان سے باہر تھا۔یہ سب بارنی کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔اگر ان لوگوں کی بارنی سے کوئی دشمنی نہیں تھی تو وہ شیطان کے چیلے تھے جنہوں نے صرف اپنی شیطانیت کی تسکین کے لیے یہ سب کیا تھا۔پھر ہج نے ان لوگوں کی تفصیل نکالی جنہیں پولیس نے شبے میں گرفتار کیا تھا اور وہ سب عدم ثبوت کی بنا پر رہا ہو گئے تھے۔ یہ کل چھ افراد تھے۔

ہج نے ان افراد کے بارے میں معلوم کیا تو وہ حیران ہوا۔ان میں سے چار قتل کیے جا چکے تھے اور ان کی تشدد زدہ لاشیں ویران مقامات سے ملی تھیں۔پولیس ان میں سے کسی ایک کے قاتل کو بھی گرفتار نہیں کر سکی تھی۔ پانچواں فرد جس پر تشدد کے الزام میں بارنی کو گرفتار کیا گیا تھا وہ زندہ تھا مگر اس کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی۔بارنی اس کیس میں اس لیے بچ گیا کہ اس نے ورکشاپ میں اپنی موجودگی ثابت کر دی تھی۔زخمی نے اسی پر الزام لگایا تھا۔ اسی رپورٹ میں چھٹے فرد کے بارے میں کہا گیا تھا کہ وہ غائب تھا۔ہج نے بارنی کے خاندان کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بعد کی تاریخوں میں شہر میں ہونے والے تشدد کے واقعات کی فہرست نکالی جس میں مقتول یا مضروب پر حملہ کرنے والے کا سراغ نہیں ملا تو ایسے ایک درجن واقعات سامنے آئے اور ان سب میں مشترک بات یہ تھی کہ مرنے والوں یا زخمیوں کو اوزاروں سے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا اور پولیس ان پر تشدد یا قتل کرنے والے کو تلاش نہیں کر سکی تھی۔

ہج حیران رہ گیا۔۔۔تین سال میں اتنا کچھ ہو گیا تھا اور پولیس بارنی کے خلاف کچھ کرنے میں ناکام رہی تھی۔مشکوک چھ افراد کے علاوہ کم سے پانچ افراد جو مارے گئے تھے اور چار افراد شدید زخمی تھے جن میں سے دو عمر بھر کے لیے معذور ہو گئے تھے۔ان کا بیان تھا کہ ان پر تشدد کرنے والے فرد نے صرف ان سے ایک ہی بات پوچھی تھی کہ انہوں نے کن کن لوگوں کو اپنا نشانہ بنایا ہے۔ہج ان سب کی الگ الگ پولیس ہسٹری نکال رہا تھا اور یہ بات سامنے آرہی تھی کہ وہ سب کسی نہ کسی وقت تشدد آمیز کارروائیوں میں ملوث رہے تھے اور انہوں نے عورتوں یا بوڑھے لوگوں کو اپنا نشانہ بنایا تھا۔ان میں سے بیشتر سزا یافتہ تھے۔یہ کیسز سارے شہر میں ہوئے تھے اور ان کا مشترکہ ریکارڈ نہیں تھا۔اس کا مطلب ہے کہ پولیس نے انہیں ایک کیس سمجھا ہی نہیں تھا۔یہ پولیس کی نااہلی تھی۔اس نے شیلا کو کال کی، وہ اپنے گھر پر تھی اور اسے اپنی تحقیق کے بارے میں بتایا تو وہ حیران ضرور ہوئی لیکن پھر اس نے کہا۔

”شیلا کو پولیس کا محکمہ بہت بڑا ہے اور اس میں روز سیکڑوں نئے کیسز آتے ہیں اس لیے چند کیسز کا آپس میں موازنہ ممکن نہیں ہے۔یہ تو درجن سے زیادہ مختلف پولیس آفسر کے کیسز ہیں۔“

ہج نے اصرار کیا۔”ان میں ٹولز سے تشدد مشترک ہے۔“

”صرف مشی گن میں ہر سال ٹولز سے تشدد کے پانچ ہزار واقعات ہوتے ہیں اور کم سے کم سو اموات ہوتی ہیں۔“

ہج نے محسوس کیا کہ شیلا اس معاملے میں زیادہ پُرجوش نہیں ہے اور وہ اس کی تحقیق کو اہمیت نہیں دے رہی ہے۔ یہ فطری بات تھی، پولیس اٹارنی آفس کو اپنے ماتحت سمجھتی ہے کہ وہ جو کیس دے اٹارنی آفس کو اسے ہی لڑنا چاہیے۔اگر اٹارنی کی طرف سے تحقیق ہوگی تو پولیس اسے اپنے کام میں مداخلت تصور کرتی ہے۔شیلا کا رویہ قابلِ فہم تھا۔ہج ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔اسے لگا کہ اگر اسے بارنی کو سزا دلوانی ہے تو اسے خود کوشش کرنا ہوگی۔مگر وہ کیا کر سکتا تھا؟ اس نے سوچا اور سب سے پہلے بارنی کی نگرانی کا فیصلہ کیا۔اگلے دن وہ دفتر سے نکلا اور بارنی کے ورکشاپ پہنچ گیا۔اس نے گاڑی ذرا دور پارک کی تھی اور ورکشاپ کے دروازے کی نگرانی کرنے لگا۔سورج جلدی ڈوب گیا اور تاریکی چھا گئی۔۔۔۔ سات بجے بارنی نے ورکشاپ بند کی اور اپنی سیاہ رنگ کی وین میں بیٹھ کر روانہ ہوا۔ہج اس کے پیچھے لگ گیا۔وہ تقریباً تیس چالیس فٹ پیچھے رہ کر ڈرائیو کر رہا تھا۔

دس منٹ بعد کار ایک عام سی عمارت کے باہر رکی۔ وہاں آوارہ گرد قسم کے لوگ جمع تھے۔شراب اور منشیات کا دور چل رہا تھا۔بارنی ان سے علیک سلیک کرتا ہوا عمارت کے اندر چلا گیا۔عمارت پر ہام ویلفیئر کا بورڈ لگا ہوا تھا۔کچھ دیر بعد ہج بھی گاڑی سے اتر کر عمارت تک آیا۔کسی نے اسے روکا نہیں اور وہ آرام سے اندر پہنچ گیا۔گراؤنڈ فلور پر مفلوک الحال اور بے گھر لوگوں کے لیے کھانے کا انتظام تھا۔ایک طرف لوہے کی سلاخوں کے پیچھے کچن تھا جہاں سے کھانے کی خوشبو۔۔۔آرہی تھی۔ہج نے جھانک کر دیکھا تو اسے بارنی ایپرن میں ایک دیگچی کے سامنے کھڑا چمچہ چلاتا نظر آیا۔گویا وہ یہاں باورچی کے طور پر کام کرتا تھا اور شاید رضاکارانہ کام کرتا تھا۔اسی لمحے عقب سے کوئی آیا تو ہج جلدی سے سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔مگر آنے والا اس پر توجہ دیے بغیر چلا گیا۔اس کے جاتے ہی ہج نے دوبارہ جھانکا تو بارنی کو اپنی طرف نگران پایا۔اس نے ہج کو دیکھ لیا تھا۔وہ جلدی سے پیچھے ہو گیا اور زیر لب کہا۔

”شٹ۔۔۔!“

ہج کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور وہ تیز قدموں سے باہر آیا۔راستے میں ایک شخص سے ٹکرایا اور معذرت کرتا ہوا تقریباً بھاگ کر اپنی گاڑی میں گھس گیا۔اندر بیٹھ کر اس نے چند گہرے سانس لیے اور اپنی حالت پر قابو پایا۔یہ کام اس کے بس کی بات نہیں تھی۔وہ گھر کی طرف روانہ ہوا۔اس رات وہ اپنے گھر کے لاؤنج میں ٹہل اور سوچ رہا تھا کہ شیلا کی کال آئی۔وہ اس سے اس کی تحقیق کے بارے میں پوچھ رہی تھی مگر اسی دوران ایک کلک کی آواز آئی اور ہج چونکا پھر اس نے کال کاٹ دی۔اسے لگا کہ شیلا اس کی آواز ریکارڈ کر رہی تھی۔مگر کیوں؟ اس سوال کا جواب خدشے کی طرح اس کے ذہن میں آیا کہ اسے شک ہو گیا تھا کہ میل کو ہونے والے حادثے کے بعد پے فون سے کی جانے والی کال اصل میں اس نے کی تھی۔اس نے ہج کی آواز کا نمونہ حاصل کرنے کے لیے یہ کال کی تھی ورنہ جب ہج نے اسے کال کی تھی تو اس نے کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔

کچھ پریشان ہونے کے بعد اس نے اس مسئلے کو ذہن سے جھٹک دیا۔اگر شیلا نے اس کی آواز ریکارڈ کی ہے تب بھی اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا وہ کہہ سکتا تھا کہ وہاں سے گزر رہا تھا اور اس نے زخمی میل بری کو دیکھا تھا۔اس کی گاڑی پر کوئی نشان نہیں تھا۔اسے اصل فکر بارنی کی تھی۔وہ خطرناک آدمی تھا اور جان گیا تھا کہ ہج اس کا پیچھا کر رہا ہے۔اگلے دن وہ پھر دیر تک دفتر میں رہا اور دوسرے کیس دیکھتا رہا جو بارنی سے متعلق ہو سکتے تھے۔اس نے واضح محسوس کیا کہ اگر ان کیسز کی جوائنٹ انٹروگیشن کی جائے تو بارنی کے گرد پھندا کسا جا سکتا تھا۔مگر ایسا کون کرتا؟ اس نے سوچا اور جیکسن سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔مگر وہ ان دنوں چھٹیوں پر تھا۔وہ گھر کے لیے نکلا تو رات بھیگ چکی تھی۔برف باری اور سرد ہواؤں میں کمی آئی تھی لیکن موسم اب بھی بے پناہ سرد تھا۔وہ گھر کی طرف روانہ ہوا۔اچانک اس کے سیل فون کی بیل بجی۔اس نے دیکھا ایک اجنبی نمبر تھا۔اس نے کال ریسیو کی۔دوسری طرف سے ایک کھردری آواز نے کہا۔

”مجھ سے دور رہو۔“

"بارنی۔" وہ مشکوک لہجے میں بولا۔

"ہاں، میں بات کر رہا ہوں۔ میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں میرا پیچھا مت کرو۔ اس سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔"

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے، میں جان گیا ہوں کہ تم نے میل بری کے ساتھ کیا کیا تھا۔"

"لگتا ہے تم نہیں مانو گے۔" بارنی کا لہجہ سرد ہو گیا۔ "تمہارا جو دل چاہے کرتے رہو۔"

بارنی نے کال کاٹ دی.... بچ نے یہ نمبر محفوظ کر لیا۔ بعد میں یہ بارنی کے خلاف ثبوت کے طور پر کام آ سکتا تھا بشرطیکہ یہ اسی کا نمبر ہوتا۔ گھر کے پاس اس نے ریموٹ کا بٹن دبایا اور گاڑی گیراج میں روکی یہاں سامنے دیوار پر اس کے اوزار سجے ہوئے تھے۔ اس نے دروازہ بند کیا اور اندر آیا۔ روز میک کو لے کر سو گئی تھی۔ اس رات بچ نے بہت خوفناک خواب دیکھا کہ ایک نقاب پوش اس کے گھر میں اور اس کے بیڈروم میں ہے اور وہ میک کے جھولے کے پاس کھڑا ہے۔ پھر میک کے رونے کی آواز پر اس کی آنکھ کھل گئی۔ صبح وہ تیار ہو کر جانے کے لیے گیراج میں آیا تو اس نے اوزاروں والے ریک پر ایک پرچہ لگا پایا اس پر ایک جملہ لکھا تھا۔

"میرا پیچھا چھوڑ دو ورنہ..."

تب بچ نے دیکھا کہ ریک سے ہتھوڑی غائب تھی اور گیراج کا دروازہ ایک فٹ تک کھلا ہوا تھا۔ اس کے جسم میں خوف کی سرد لہر سی دوڑ گئی... وہ اندر آیا اور اس نے روز سے کہا۔ "گیراج کے دروازے میں مسئلہ ہو گیا ہے، وہ ایک فٹ تک کھل رہا ہے۔ تم اندر والا دروازہ بند رکھنا ورنہ کوئی اندر آ سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" روز نے کہا۔ بچ نے اسے پرچے یا ہتھوڑی کی گمشدگی کے بارے میں نہیں بتایا تھا، اسے یقین تھا یہ دونوں کام بارنی کے تھے۔ جس وقت وہ اسے کال کر رہا تھا اس وقت وہ اس کا پیچھا بھی کر رہا تھا۔ جب وہ اندر چلا گیا تو اس نے زور لگا کر گیراج کا دروازہ اوپر کیا اور اندر آ کر یہ کارروائی کی تھی۔ تحریر بہت خراب تھی اور یقیناً جان بوجھ کر خراب انداز میں لکھی گئی تھی تاکہ بعد میں اس کے خلاف ثبوت نہ بن سکے۔ بچ دفتر آیا تو اس کا دماغ منتشر تھا اور وہ کام پر توجہ نہیں دے پا رہا تھا۔ اس نے لیو سے درخواست کی کہ آج کی پیشی وہ اکیلے دیکھ لے۔ آج کوئی خاص پیشی نہیں تھی۔ اس لیے لیو اکیلا ہی عدالت چلا گیا۔ بہت سوچنے کے بعد اس کے ذہن میں ایک ہی خیال آیا..

اس نے ہچکچاتے ہوئے جمی کو کال کی۔

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

جمی نے کوئی سوال نہیں کیا اور بولا۔ "ریکس بار آ جانا میں شام میں وہیں ہوتا ہوں۔"

ریکس بار شکاگو کے اس علاقے میں تھا جہاں بچ اور جمی پلے بڑھے تھے۔ وہاں سب ان کے جاننے والے تھے۔ بچ نہیں چاہتا تھا کہ ان کے سامنے جمی سے ملے۔ مگر مجبوری تھی جمی نے اسے وہیں بلایا تھا۔ وہ شام کے وقت دفتر سے نکلا اور ریکس بار پہنچا۔ جمی نے اپنے اور بچ کے لیے شاٹ کا آرڈر دیا تو بچ نے منع کیا مگر اس نے ان سنی کر کے آرڈر دہرایا۔ اور بچ کی طرف دیکھا۔ "ہاں اب بولو؟"

بچ نے اسٹول پر پہلو بدلا۔ "تم بارنی والے کیس سے واقف ہو؟"

جمی نے سر ہلایا۔ "ہاں میں اخبارات دیکھتا رہتا ہوں۔ بارنی کے بارے میں جانتا ہوں، وہ خطرناک آدمی ہے۔"

"میں چاہتا ہوں تم ایک دن کے لیے اس کی نگرانی کرو۔"

"نگرانی، مگر کیوں؟" جمی حیران ہوا۔

"مجھے یقین ہے میل بری کا قاتل وہی ہے اور میں اس کے خلاف ثبوت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ کام پولیس کا ہے۔"

"پولیس اپنا کام نہیں کر رہی ہے۔" بچ کہتے کہتے رکا کیونکہ بارٹینڈر نے ان کے سامنے چھوٹے گلاسوں میں شاٹ رکھ دیے تھے۔ جمی نے ایک ہی سانس میں اپنا گلاس خالی کر دیا مگر بچ نے دو بار میں خالی کیا تھا۔ جمی نے اپنے لیے اور گلاس منگوایا۔

"جمی، میں اس کیس میں پھنس رہا ہوں۔" بچ نے آہستہ سے کہا تو جمی چونکا۔

"تم کیسے؟"

"پولیس کو مجھ پر شبہ ہے کہ میل بری جس گاڑی [illegible] آیا وہ میری تھی۔"

"تو کیا نہیں تھی؟"

بچ نے اس کا سوال نظرانداز کر دیا۔ "اگر مجھ پر شبہ [illegible] تو یہ میرے کیریئر کے لیے فل اسٹاپ بن جائے گا جبکہ بارنی کے خلاف پولیس کے پاس ٹھوس ثبوت نہیں ہیں۔"

"تم چاہتے ہو کہ میں اس کا پیچھا کروں اور ثبوت حاصل کروں؟"

بچ نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اصل کام خود کروں گا۔"

"اصل کام کیا ہے؟" جمی نے دوسرا شاٹ بھی ایک ہی بار میں حلق میں انڈیل کر کہا۔ "دوسرے تم جانتے ہو میں مار دھاڑ والا آدمی نہیں ہوں۔ میں منشیات کے چکر میں ضرور رہا ہوں لیکن اب اس سے بھی تائب ہو گیا ہوں۔ جب میں تم سے ملنے آیا تو میں جرم کی راہ چھوڑ چکا تھا۔"

یہ سن کر بچ کو اندر سے شرمندگی ہوئی اس نے جمی سے پوچھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ "اب تم کیا کر رہے ہو؟"

"ایک پیپر کمپنی میں جاب کرتا ہوں۔" جمی نے بتایا۔ "ابھی ورکر ہوں لیکن جلد سپروائزر بن جاؤں گا۔ میں نے کورس کیا ہے اس کام کا۔"

بچ کو خوشگوار حیرت ہوئی.... "سچ...؟" اس نے کہا پھر ملتجی لہجے میں بولا۔ "پلیز میری مدد کرو۔"

جمی سوچ رہا تھا پھر اس نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے۔ مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

"بارنی شام سات کے آس پاس میں اپنا ورکشاپ بند کر دیتا ہے۔ تم اس کے بعد اس کی نگرانی کرو اور میں اس کے گھر میں گھس کر تلاشی لوں گا۔ مجھے یقین ہے وہ اس شہر میں ہونے والی بے شمار تشدد کی کارروائیوں میں ملوث ہے۔ وہ ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتا ہے جو عورتوں پر تشدد کرتے رہے ہیں اور پھر انہیں پکڑ کر ان پر تشدد کرتا ہے۔ ممکن ہے وہ جاننے کی کوشش کرتا ہو کہ وہ اس کی بیوی اور بیٹی کے قتل میں تو ملوث نہیں تھے یا پھر وہ ایسے ہی ان لوگوں کو نشانہ بناتا ہے۔"

جمی پریشان نظر آنے لگا۔ "یہ تو بہت خطرناک آدمی ہے۔"

"تمہیں اس کے پاس نہیں جانا ہے بس دور سے نگرانی کرنی ہے اور اگر وہ گھر کی طرف آئے تو تم مجھے خبردار کر دو گے۔ یہ بالکل بھی خطرناک کام نہیں ہے۔"

جمی نے کچھ سوچا اور مان گیا۔ طے ہوا کہ وہ اگلے دن اپنی گاڑی لے کر آئے گا۔ وہ پہلے بارنی کے ورکشاپ کی طرف جائیں گے۔ اس کی وہاں موجودگی کی تصدیق کے بعد جمی اسے بارنی کے گھر کے پاس چھوڑ کر واپس ورکشاپ کی طرف چلا جائے گا۔ بچ شام کے وقت بہ ظاہر دفتر سے گھر کے لیے روانہ ہوا مگر وہ راستے میں ایک جگہ رک گیا۔ پانچ بجے جمی اپنی پرانی ہائی روف میں وہاں پہنچا اور بچ اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی کار وہیں چھوڑ دی تھی۔ پہلے وہ بارنی کے ورکشاپ پہنچے۔ بارنی وہاں موجود تھا اور کام کر رہا تھا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ بارنی کے گھر تک آئے۔ یہ دو منزلہ مکان تھا جو چاروں طرف سے دوسرے مکانات سے الگ تھا۔ یہاں سارے مکانات ایسے ہی تھے اور سب کے درمیان میں تیس چالیس فٹ کا فاصلہ تھا۔ شاید اسی لیے بارنی کے گھر میں ہونے والی واردات کا اس کے پڑوسیوں کو بھی علم نہیں ہوا تھا۔ جمی نے اسے اتارتے ہوئے کہا۔ "احتیاط سے، کسی نے دیکھ لیا تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گے۔"

"میں دیکھ بھال کر کام کروں گا۔" بچ نے کہا۔ "تم اپنا موبائل آن رکھنا۔"

"یہ آن ہے۔" جمی نے کہا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد بچ نے آس پاس دیکھا اور پھر بارنی کے مکان کے پہلو میں آیا۔ اس کا پتا اس نے پولیس ریکارڈ سے لیا تھا۔ اس طرف کچن کا دروازہ تھا مگر وہ اندر سے لاک تھا۔ پھر وہ عقبی حصے میں آیا یہاں بڑے سائز کا ڈسٹ بن رکھا تھا۔ بچ اس پر چڑھا اور ایک کھڑکی کا پٹ اوپر کرنے کی کوشش کی۔ ذرا سا زور لگانے پر وہ کامیاب رہا اور کھڑکی اوپر ہو گئی۔ اس نے آس پاس دیکھا اور کسی کو موجود نہ پا کر اندر اتر گیا اس نے کھڑکی واپس بند کر دی تاکہ کوئی دیکھے تو اسے شک نہ ہو۔ مکان اندر سے تاریک تھا اور وہاں ہلکی سی بو بسی ہوئی تھی جیسے وہاں صفائی ستھرائی کا زیادہ خیال نہ رکھا جاتا ہو۔ مکان زیادہ بڑا نہیں تھا۔ نیچے ایک نشست گاہ اور ایک لاؤنج تھا، اس کے ساتھ کچن اور ڈائننگ ایریا تھا۔ یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ بچ اوپر آیا جہاں دو بیڈرومز تھے۔ اس نے بارنی کے بیڈروم کی تلاشی لی۔ وہ بہت احتیاط سے کام کر رہا تھا کہ کوئی نشان نہ رہنے پائے۔ مگر یہاں کچھ نہیں تھا۔ دوسرا بیڈروم یقیناً اس کی بیٹی کا تھا اور ابھی بچ یہاں کی تلاشی لے ہی رہا تھا کہ جمی کی کال آئی۔

"وہ ورکشاپ سے نکلا ہے۔"

بچ فکرمند ہو گیا۔ "کہاں جا رہا ہے؟"

"ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن رخ گھر کی طرف ہے۔"

"ٹھیک ہے تم اس کا پیچھا کرتے رہو اور جب پرانی اسٹیل مل کے پاس پہنچو اور بارنی پھر بھی آگے بڑھے تو مجھے خبردار کر دینا۔"

"او کے۔" جمی نے کہا اور کال [illegible] دی۔ بچ نے اس بیڈروم کی تلاشی لی اور یہاں بھی اسے کچھ نہیں ملا۔ اب آخری منزل پر ترچھی چھتوں کے درمیان دو چھتی رہ گئی تھی۔ وہاں عام طور سے کاٹھ کباڑ رکھا جاتا ہے مگر وہ جگہ کوئی چیز چھپانے کے لیے بھی بہترین تھی۔ بچ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ حسب توقع یہاں گھر کا وہ سارا کباڑ پڑا تھا جو کسی کام کا نہیں تھا اور اسے ٹھکانے لگانے کا وقت بھی نہیں تھا۔ اس لیے یہاں ڈال دیا گیا تھا۔ بچ پریشان ہو گیا، اس کباڑ

کے درمیان وہ کوئی ایسی چیز کیسے تلاش کرتا جو بارنی کے خلاف ثبوت کے طور پر استعمال ہوتی۔ وہ ایک طرف بڑھا تھا کہ اس کا پاؤں فرش کے تختے پر گیا۔ تختہ آگے سے ذرا اٹھ گیا جیسے فرش میں جزا نہ ہو۔ بچ نے جھک کر اس میں اپنی کار کی چابی پھنسائی اور اسے اٹھالیا۔ نیچے خلا تھا۔ اس خلا میں چمڑے کا چھوٹا سا بیگ تھا۔

بچ نے اسے نکالا تو اس میں تیز دھار آلات رکھے ہوئے تھے، ان میں چاقو بھی تھے اور ریزر جیسی دھار والے استرے بھی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا چری بیگ تھا اور اس میں دو عدد ہتھوڑیاں، لوہے کی چھوٹی راڈز اور ہاتھ میں پہننے والے آہنی کلپس تھے جس کی مدد سے دوسروں کا چہرہ بگاڑا جاسکتا تھا۔ بچ کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی.... بالآخر وہ بارنی کے خلاف کچھ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ یقیناً اس کے وہ اوزار تھے جن سے وہ دوسروں پر تشدد کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان اوزاروں کو کتنا ہی صاف کیوں نہ کیا گیا ہو، ان پر خون کے آثار جدید سائنسی طریقے سے معلوم کیے جاسکتے تھے۔ سب سے آخر میں ایک شاپر تھا۔ بچ نے اسے نکالا تو اس میں مختلف افراد کے ڈرائیونگ لائسنس، کریڈٹ کارڈز اور دوسرے شناختی کاغذات تھے۔ بچ انہیں جانتا تھا، ان میں سے اکثر وہ لوگ تھے جو مارے گئے تھے یا غائب ہو گئے تھے۔ ان چیزوں کی یہاں موجودگی واضح کر رہی تھی کہ ان کا قاتل بارنی ہی تھا۔ اچانک ہی موبائل کی بیل بجی تو وہ اچھل پڑا۔ اس نے جلدی سے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف جمی تھا۔

''وہ پرانی اسٹیل مل کے پاس ایک شاپنگ اسٹور میں گیا ہے۔''

''تم کہاں ہو؟'' بچ نے پوچھا۔

''میں مل کی پارکنگ میں ہوں۔'' جمی نے کہا۔

بچ بے چین ہو رہا تھا۔ ''کیا وہ ابھی تک اندر ہے؟''

''نہیں، وہ باہر آرہا ہے۔ مگر وہ اپنی گاڑی کی طرف نہیں جارہا ہے۔ وہ مل کی طرف جارہا ہے۔''

''مل میں اسے کیا کام ہوسکتا ہے؟''

''پتا نہیں، وہ اسٹور سے باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں کچھ تھا۔''

''کیا تھا؟''

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا... مجھے لگا اس کے ہاتھ میں کوئی اوزار ہے۔''

''اوزار۔'' بچ جلدی سے بولا۔ ''جمی! وہاں سے فوراً نکل جاؤ...''

''کیوں...؟''

''جمی میری بات سنو۔'' بچ چلایا، اسی لمحے اسے عجیب سی آواز آئی جیسے کسی نے لکڑی پر کوئی ہتھوڑا دے مارا ہو۔ اس کے بعد جمی کی آواز بند ہو گئی تھی مگر کال نہیں کٹی تھی۔ ''جمی کیا ہوا... تم بول کیوں نہیں رہے ہو؟''

دوسری طرف خاموشی تھی اور پھر کال کاٹ دی گئی۔ بچ کے ہاتھ سے شاپر چھوٹ گیا.... وہ تیزی سے نیچے آیا اور سامنے والے دروازے سے باہر نکلا۔ اسے پروا نہیں تھی کہ کوئی اسے دیکھ لے گا، اسے صرف جمی کا خیال تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ بارنی نے اس پر حملہ کیا ہے اور پتا نہیں وہ کس حال میں ہوگا۔ وہ دوڑتا ہوا ہائی وے تک آیا اور اسے کراس کر کے کچے میدان سے ہوتا ہوا اس پرانی متروک اسٹیل مل کی طرف جانے لگا جو بیس سال پہلے بند کر دی گئی تھی۔ اسے بھاگ دوڑ کی عادت نہیں تھی مگر وہ بھاگتا رہا۔ دوڑتے ہوئے مل کی پارکنگ میں داخل ہوا، وہاں جمی کی نیلی ہائی روف کھڑی تھی، وہ اس کے پاس آیا تو دروازے پر خون کا نشان دکھائی دیا۔ پھر فرش پر گھسیٹے جانے کے نشانات تھے جو مل کی عمارت کے اندر جارہے تھے۔ بچ ہانپ رہا تھا۔ اس نے گاڑی سے جیک راڈ نکالا اور مل کے اندر کی طرف بڑھا۔ باہر سورج ڈوبنے والا تھا اور یہاں اندھیرا ہو گیا تھا۔ اس نے چلا کر جمی کو آواز دی۔ ''جمی! تم کہاں ہو؟''

جواب میں اسے کراہ نما آواز سنائی دی۔ آواز اوپر سے آئی تھی۔ وہ لوہے کی سیڑھیوں سے اوپر چڑھنے لگا، ساتھ ہی وہ بار بار جمی کو آواز دے رہا تھا۔ جمی بھی اسے پکار رہا تھا اور اسے پتا چل رہا تھا کہ وہ کہاں ہوسکتا ہے۔ بچ کو علم نہیں تھا کہ اس کے اوپر جاتے ہی ایک طرف تاریکی سے بارنی نمودار ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں جمی کا موبائل تھا۔ وہ نائن ون ون کے آپریٹر کو کال کر رہا تھا۔ کال کر کے اس نے موبائل زمین پر پھینکا اور باہر نکل گیا۔ دوسری طرف بچ پاگلوں کی طرح سیڑھیاں چڑھ رہا تھا، یہاں فلور کی اونچائی بہت زیادہ تھی اور تیسرے فلور تک آتے آتے اس کی حالت بری ہو گئی تھی۔ جمی کی آواز اب مدھم اور کربناک ہوتی جارہی تھی۔ بالآخر بچ ایک ہال میں داخل ہوا جہاں شفاف پلاسٹک کے پردے لٹک رہے تھے اور جمی ان کے پیچھے فرش پر پڑا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک خون میں نہایا ہوا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ بارنی نے اس پر بے پناہ تشدد کیا ہو۔

''جمی میرے بھائی۔'' بچ نے اس پر جھکتے ہوئے کہا۔ اس نے جلدی سے اپنا موبائل نکالا مگر یہاں بے پناہ لوہے کی وجہ سے سگنل نہیں تھے۔ اس نے موبائل رکھا اور جمی کو دونوں بازوؤں میں اٹھا کر نیچے لانے لگا۔ جمی تکلیف سے چلا رہا تھا اور اسے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کے منہ سے خون ابل رہا تھا اس لیے اس سے بولا نہیں جارہا تھا۔ بچ بڑی مشکل سے رک رک کر اسے نچلے فلور تک لایا.... درمیان میں اسے پولیس سائرن کی آواز سنائی دی اور اسے خیال آیا تھا کہ پولیس کو کس نے مطلع کیا لیکن یہ اچھی بات تھی اب جمی کو فوری طبی امداد ملتی۔ اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ وہ نیچے آیا اور اس نے موبائل دیکھا، اس پر سگنل تھے اس نے نائن ون ون کال کر کے ایمبولینس کو پرانی اسٹیل مل بھیجنے کو کہا اور موبائل رکھا ہی تھا کہ مسلح پولیس نے اندر آکر اسے گھیر لیا اور چلا چلا کر اسے دونوں ہاتھ سر پر رکھنے کو کہا۔ اس نے تعمیل کی اور بولا۔ ''پلیز! اسے طبی امداد کی ضرورت ہے۔''

جیسے ہی بچ دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر بیٹھے ہوا دو پولیس والے اس کے عقب میں آئے اور اسے قابو کر کے ہتھکڑی پہنا دی۔ دو پولیس والے جمی کو دیکھ رہے تھے اور ساتھ ہی ایمبولینس کے لیے کہہ رہے تھے۔ بچ کو لے جا کر پولیس کار میں بٹھا دیا گیا تھا۔ ایک گھنٹے بعد وہ پولیس اسٹیشن میں پوچھ گچھ کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور شیلا اندر آئی۔ اس نے ایک فائل اٹھا رکھی تھی۔ بچ نے اس سے پوچھا۔ ''جمی کیسا ہے؟''

''وہ کومے میں ہے۔'' شیلا اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''لیکن ڈاکٹر پُرامید ہیں، وہ بچ جائے گا۔''

''یہ ضروری ہے۔''

''تم نے اس کے ساتھ یہ کیوں کیا؟ کیا اس لیے کہ وہ تمہارا سوتیلا بھائی ہے؟''

''میں نے؟'' بچ نے بے یقینی سے کہا۔ ''اگر میں نے ایسا کیا تو مجھے نائن ون ون کال کر کے ایمبولینس کے لیے کہنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''کیونکہ تم نے پولیس سائرن کی آواز سن لی تھی۔'' شیلا خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''بچ صرف یہی نہیں تمہارے خلاف اور بھی کچھ ملا ہے۔'' اس نے فائل سے ایک ٹیپ نکال کر بچ کی کال کی ریکارڈنگ چلائی جس میں وہ مل بری کے لیے ایمبولینس کے لیے کہہ رہا تھا۔ ''بچ ٹریک سے ثابت ہے کہ یہ تمہاری آواز ہے۔''

بچ کے پاس انکار کا جواز نہیں تھا۔ اس نے اعتراف کرلیا۔ ''ہاں یہ کال میں نے کی تھی۔''

''مگر اپنے بارے میں نہیں بتایا۔'' شیلا کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

''غلطی میری نہیں تھی، وہ بارنی کے تشدد سے بچنے کے لیے بھاگا اور اچانک میری گاڑی کے سامنے آگیا۔''

''تم نے پولیس کو اطلاع نہیں دی۔''

''کیونکہ میں خوفزدہ تھا۔'' وہ تیز لہجے میں بولا۔ ''لیکن خدا کے لیے میرا یقین کرو۔ بارنی قاتل ہے، اسی نے جمی کا یہ حشر کیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ پولیس کو کیسے پتا چلا؟''

''نائن ون ون کو جمی کے موبائل سے کال کی گئی تھی، وہ شدید زخمی تھا اور مدد طلب کر رہا تھا۔''

''یہ جھوٹ ہے، جمی کا موبائل اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ یقیناً بارنی نے لے لیا تھا اور اسی نے نائن ون ون کو کال کی ہوگی۔''

شیلا کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے بچ کی بات کا

اقوال زریں

☆..... توبہ روح کا غسل ہے جتنی بار کیا جائے روح میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔

☆..... اپنے گناہ کے سوا دنیا کی کسی چیز سے خوف نہ کرو اور اپنے اللہ کے سوا کسی سے کوئی امید نہ رکھو۔

☆..... اگر خوشی کا ایک در بند ہو جائے تو اللہ پاک ایک اور در کھول دیتا ہے مگر ہم وہ کھلا در دیکھ نہیں پاتے کیونکہ ہم بند دروازے کے سامنے رو رہے ہوتے ہیں۔

☆..... وہ رشتے کبھی نہیں ٹوٹتے جن کی بنیاد میں سچائی، خلوص اور پیار ہوتا ہے۔

☆..... اپنوں کو ہمیشہ اپنے ہونے کا احساس کرواؤ، ورنہ وقت آپ کے اپنوں کو آپ کے بنا جینا سکھا دے گا۔

☆..... جو شخص ہمیشہ تمہاری خوشی چاہے یاد رکھو اس کا اداس ہونا تمہارے لیے فکر کی بات ہے۔

مرسلہ: رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

قطعی یقین نہیں آیا۔ اس نے اپنا ٹیپ فائل میں رکھا۔ ”پولیس کو ہتھوڑی ملی ہے جس پر تمہاری انگلیوں کے نشانات ہیں۔ اسی سے جمی پر تشدد ہوا ہے۔“

”کیونکہ وہ میری ہے اور میرے گیراج سے چرائی گئی ہے۔“

”کس نے؟“

”بارنی نے۔“

”تم نے رپورٹ نہیں کی۔“ شیلا نے پوچھا تو مچ کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ شیلا کھڑی ہو گئی۔

”مجھے افسوس ہے مچ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکتی۔“

”پلیز میرا یقین کرو بارنی ہی اصل شخص ہے تم اسے نظرانداز کرکے اسے موقع دے رہی ہو کہ وہ مزید لوگوں کو قتل کرے۔ اس نے چالاکی سے کام لیا اور میرے بھائی کو میری ہی ہتھوڑی سے مارا۔ اس نے دستانے پہن رکھے ہوں گے اس لیے انگلیوں کے نشان میرے ہیں۔“

شیلا کمرے سے نکل گئی اور مچ سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ بارنی اس قدر چالاک ثابت ہوگا۔ پتا نہیں جمی سے غلطی ہوئی تھی یا اس نے خود بھانپ لیا تھا کہ اس کا تعاقب ہو رہا ہے۔ وہ جان بوجھ کر جمی کو پرانی اسٹیل مل کی طرف لے گیا اور پھر اسے دھوکے سے شکار کرلیا۔ جمی کی حالت کا سوچ کر مچ کا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ شاید اسے اپنے بھائی سے محبت نہیں ہے مگر اب اس کا دل تڑپ رہا تھا۔ جمی کا بچنا ضروری تھا صرف اس لیے نہیں کہ وہ اس کا بھائی تھا بلکہ اس لیے بھی کہ وہی اس کی بے گناہی کی گواہی دے سکتا تھا۔ وہ اس کی وجہ سے اس حال کو پہنچا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر وہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اچانک نگران آفیسر نے کمرے میں جھانکا اور کہا۔ ”تمہاری کال آئی ہے۔ ریسیو کرو۔“

کمرے میں ایک طرف دیوار پر فون نصب تھا۔ مچ نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تو دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”مچ۔“

مچ نے بے یقینی سے کہا۔ ”بارنی یہ تم ہو؟“

”ہاں یہ میں ہوں۔“ اس نے کہا۔

مچ کا غصے سے برا حال ہو گیا۔ ”تم نے جمی کو مارا... کیوں؟“

”کیونکہ تم لوگ میرے پیچھے پڑ گئے ہو اور اب مجھے حرکت میں آنا ہے۔“

”حرکت میں آنا ہے۔“ مچ نے اس کے الفاظ دہرائے وہ تشویش زدہ ہو گیا تھا۔ ”کیا مطلب... بارنی تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔“

”تم جانتے ہو میرے ساتھ کیا ہوا تھا اور میں نے کیا محسوس کیا تھا؟“

”میں جانتا ہوں۔“ مچ کی آواز کانپ رہی تھی۔

”اب تم وہی درد محسوس کرو گے جو میں نے کیا تھا۔“

”بارنی تم کہاں ہو؟“ مچ چلایا مگر بارنی کال کاٹ چکا تھا۔ مچ نے کریڈل پر ہاتھ مارا اور چلایا۔ ”بارنی میری بات سنو... پلیز... بارنی۔“

شور سن کر نگران آفیسر اندر آ گیا۔ مچ دروازے کی طرف بڑھا۔ ”مجھے جانے دو، وہ میرے گھر پہنچ گیا ہے۔“

”بکواس مت کرو۔“ نگران نے اس کا ہاتھ مروڑ کر اسے دیوار سے لگایا اور اس کی کمر پر ضرب لگائی۔ مگر مچ پر وحشت طاری ہو رہی تھی۔ اس نے اچانک سر پوری قوت سے پیچھے مارا... وہ آفیسر کی ناک پر لگا۔ اسے یقیناً تارے نظر آ گئے تھے۔ مچ نے دوسری بار اس کے منہ سے سر ٹکرایا تو وہ کراہ کر نیچے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ مچ نے اس کی جیب سے چابیاں نکالیں اور پھر بیلٹ سے اس کا پستول نکال کر باہر آیا۔ وہ اس جگہ سے اچھی طرح واقف تھا اس لیے سامنے سے نکلنے کے بجائے وہ باتھ روم والے حصے میں آیا اور ایک روشن دان کا شیشہ کھول کر باہر نکل آیا۔ پارکنگ میں پہنچ کر اس نے چابیوں سے منسلک ریموٹ کا بٹن دبایا تو ایک طرف کھڑی کار نے آواز نکالی۔ مچ اس کی طرف بڑھا تھا کہ سامنے سے دو پولیس والے نمودار ہوئے۔ وہ اس کی طرف آ رہے تھے۔ مچ کا دل رک گیا۔ اسے لگا کہ وہ پکڑا جائے گا مگر وہ دونوں اس کے پاس سے گزر گئے۔ وہ تیزی سے کار تک آیا اور اس کا دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ اب باہر نکلنے کا مرحلہ تھا۔ جب تک گیٹ کیپر مطمئن نہیں ہوتا وہ گیٹ نہیں کھولتا۔ وہ کار اسٹارٹ کرکے گیٹ تک لایا۔ گیٹ کیپر نے جھانک کر دیکھا اور پھر اس نے کہا۔

”گڈ نائٹ مسٹر کونسلر۔“

مچ نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”گڈ نائٹ۔“ اس نے کہا اور گیٹ کھلتے ہی گاڑی باہر نکال کر لے گیا۔ عین اسی وقت شیلا پوچھ گچھ والے کمرے کے سامنے پہنچی تو نگران ہوش میں آ رہا تھا۔ اسے زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔ شیلا نے اس کے منہ پر پانی ڈالا تو وہ مکمل طور پر ہوش میں آ گیا۔ اس نے بتایا کہ مچ کو کسی کی کال آئی تھی اور پھر وہ جیسے پاگل ہو گیا۔ اسے روکنے کی کوشش کی تو اس نے اچانک اس پر حملہ کر

اسے بے ہوش کر دیا اور اس کے کی کار کی چابیاں اور پستول لے کر فرار ہو گیا۔ شیلا فکر مند ہو گئی۔ اس نے گیٹ پر کال کی ... تو پتا چلا کہ جج چند منٹ پہلے نکلا ہے۔ شیلا نے سوچا اور آفیسر کو پیٹرول پولیس کو خبردار کرنے کا کہہ کر باہر کا رخ کیا، اسے اندازہ تھا کہ جج کہاں گیا ہوگا۔

☆☆☆

بارنی اس وقت جج کے مکان کے سامنے اپنی سیاہ وین میں موجود تھا۔ مکان اندر سے تاریک تھا کیونکہ روز باہر گئی ہوئی تھی۔ وہ اس کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے جج کو کال کرنے میں کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا تھا، اسے معلوم تھا کہ وہ چھوٹ کر آنہیں سکتا اور پولیس اس کی بات پر اعتبار نہیں کرے گی۔ بارنی کو خطرہ نہیں تھا۔ جج سے گفتگو کے تقریباً بیس منٹ بعد نیلی کار نمودار ہوئی اور گیراج کا دروازہ کھلا جیسے ہی کار اندر گئی دروازہ بند ہو گیا۔ بارنی نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر مرکزی دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے کال بیل بجائی تو روز نے آکر دروازہ کھولا۔ بارنی نے مہذب لہجے میں کہا۔ ”مسز نیلسن میں ڈیٹیکٹو کارسن جوزف ہوں' مجھے جج کے بارے میں آپ سے کچھ سوالات کرنے ہیں۔“

”کیسے سوالات؟“ روز پریشان ہو گئی۔

”مسز نیلسن کو اس کے بھائی پر قاتلانہ حملے کے شبے میں گرفتار کیا گیا ہے اور وہ اس وقت پولیس اسٹیشن میں ہے۔“

روز شاپنگ کے لیے باہر گئی تھی۔ ”میرے خدا... وہ ٹھیک تو ہے نا؟“

”یس مسز نیلسن' وہ بالکل ٹھیک ہے۔“

اسی لمحے اندر سے میک کے رونے کی آواز آئی تو روز نے کہا۔ ”ایک منٹ آفیسر میں ابھی آئی۔“

روز اندر آئی اور میک کو اس کی باسکٹ سمیت اٹھا لیا۔ وہ تنہائی محسوس کر کے رونے لگا تھا۔ وہ واپس آئی تو ساکت رہ گئی کیونکہ آفیسر لاؤنج میں کھڑا ہوا تھا۔ اس نے معذرت کی۔ ”سوری میں بغیر پوچھے اندر آ گیا۔“

الفاظ کے برعکس اس کے لہجے میں معذرت نہیں تھی۔ بلکہ روز کو اس کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت محسوس ہوئی۔ روز نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ”کوئی بات نہیں آفیسر۔“

اچانک وہ کھانسا اور بولا۔ ”کیا مجھے ایک گلاس پانی مل سکتا ہے؟“

روز چونکی۔ ”کیوں نہیں، میں ابھی لائی۔“

وہ میک کی باسکٹ سمیت چلی گئی اور اس کے جاتے ہی بارنی نے کوٹ سے تیز دھار آلات والا چرمی بیگ نکالا ا... سے کھول کر میز پر پھیلاتے ہوئے اس نے اس میں سے ایک تیز دھار لیکن چھوٹے پھل والا چاقو نکالا۔ کچن کی طرف سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی مگر جب یہ آواز کچھ زیادہ ہی دیر تک آتی رہی تو وہ دبے قدموں کچن کی طرف آیا۔ اس نے دیکھا کہ کچن میں کوئی نہیں تھا اور عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکا اور باہر نکلا تو کچن کے برابر سے اسٹور کا دروازہ کھلا اور روز باہر آ گئی۔ اس نے دوڑ کر کچن کا دروازہ بند کر دیا۔ میک کی باسکٹ اس نے اسٹور میں رکھ دی تھی اور وہ ڈر رہی تھی کہ وہ آواز نہ نکالے اس لیے وہ اسے خود سے لگائے ہوئے تھی۔ وہ واپس آئی اور بیگ سے اپنا سیل فون نکال کر نائن ون ون پر کال کرنے لگی۔ ابھی دوسری طرف سے کال ریسیو بھی نہیں ہوئی تھی کہ دھماکے سے سامنے والا دروازہ کھلا اور بارنی اندر آیا۔ روز بھول گئی تھی کہ سامنے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ چیخ مار کر کچن والے دروازے کی طرف بھاگی اور اسے کھولتے ہوئے باہر نکل گئی۔ وہ عقبی صحن سے ہوتی ہوئی سامنے والی طرف آئی تھی کہ اس کا پاؤں کپڑے لٹکانے والی رسی سے الجھا اور وہ گر گئی اور عقب سے آتے بارنی نے اسے پکڑ لیا۔ وہ تڑپ کر چلائی۔

”چھوڑو مجھے۔“

اسی لمحے سڑک پر کار کی روشنی لہرائی اور کار آ کر پاس رکی۔ اس سے جج اترا اور اس نے بارنی پر پستول تان لیا۔ اس نے فوراً روز کو ڈھال بنا لیا اور چاقو کی دھار اس کی گردن پر رکھ دی۔ جج نے چلا کر کہا۔ ”چھوڑ دو اسے۔“

”آرام سے۔“ بارنی نرمی سے بولا۔ ”تم نے گولی چلائی تو وہ اسے لگے گی اور پھر میں چاقو سے اس کی گردن بھی کاٹ دوں گا۔ تم اپنی بیوی کو زندہ دیکھنا چاہتے ہو؟“

جج کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ ”بارنی اسے چھوڑ دو۔“

”نہیں، تم پستول نیچے پھینک دو... ورنہ میں اسے مار دوں گا۔“ بارنی کا لہجہ صاف تھا۔ ”مجھے معلوم ہے اب میں نہیں بچوں گا اس لیے مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔“

جج کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے پستول نیچے رکھ دیا۔ بارنی مسکرایا اور اگلا حکم دیا۔ ”اب اسے پاؤں سے میری طرف کر دو۔“

جج نے اس حکم کی تعمیل بھی کی اور بولا۔ ”پلیز اسے جانے دو۔“

بارنی نے محتاط انداز میں پستول اٹھایا' اس دوران

میں چاقو کی نوک ایک لمحے کے لیے بھی روز کی گردن سے نہیں ہٹی تھی۔ ”میں نے بھی ان لوگوں سے کہا تھا کہ وہ میری بیوی اور بیٹی کو جانے دیں۔“

”بارنی' وہ مجرم تھے' میں اور میرے بیوی بچے بے قصور ہیں۔“

”میری بیوی اور بیٹی بھی بے قصور تھیں۔“ بارنی نے چلا کر کہا۔ ”مگر ان کے ساتھ کیا ہوا؟“

”تم بھی ان مجرموں کی صف میں شامل ہو گئے ہو۔“ جج بولا، اسے غصہ آ گیا۔ ”بارنی' درحقیقت تم ایک بزدل اور کمزور شخص ہو۔ تم اپنے سامنے اپنے گھر والوں کو مرتا دیکھتے رہے۔ سب سے پہلے تمہیں مرنا چاہیے تھا پھر ان پر آنچ آتی مگر تم بچ گئے اور وہ مر گئے۔“

”تو تم اپنے گھر والوں سے پہلے مرنا چاہتے ہو؟“ بارنی نے کہا۔

”ہاں' میں پہلے مرنا چاہتا ہوں میں اپنے سامنے انہیں اذیت میں نہیں دیکھ سکتا۔ میں ان کی موت بھی برداشت نہیں کر سکتا۔“

بارنی کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”میرا درد تم نہیں جانتے۔“

”تم بزدل پہلے مجھے مارو۔“ جج آگے آیا۔ روز رو رہی تھی اور اس کے منہ سے دبی دبی التجائیں نکل رہی تھیں۔ اچانک بارنی نے پستول سیدھا کیا اور گولی چلا دی۔ گولی جج کے بائیں شانے کے نیچے لگی اور وہ نیچے گر پڑا۔ بارنی نے اس کے پاس پستول پھینک دیا۔

”تم بہادر ہو نا... یہ پستول پڑا ہے اسے اٹھاؤ' مجھے شوٹ کر دو اور اپنی بیوی کو بچا لو۔“ روز مچل رہی تھی مگر بارنی نے اسے مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ وہ زہریلے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”بات کرنا آسان ہے... عمل کرنا مشکل ہوتا ہے... مجھے یہ موقع نہیں ملا تھا جو میں تمہیں دے رہا ہوں... پستول اٹھاؤ اور مجھے شوٹ کر دو... اپنی بیوی کو بچا لو... دیکھو میں تمہارے سامنے ہوں۔“

جج کراہتے ہوئے پستول اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کا زخم کاری تھا۔ اس سے ہاتھ ہلایا نہیں جا رہا تھا پھر بھی وہ پستول اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بارنی اسے دیکھتا رہا پھر اس نے روز کو جھٹکے سے سیدھا کیا اور چاقو والا ہاتھ اوپر کیا۔ ”تمہارے پاس آخری موقع ہے۔“

”نہیں۔“ جج نے بہ مشکل کہا۔

بارنی مسکرایا۔ ”تم بھی میری طرح نکلے۔“ کہتے ہی اس کا ہاتھ نیچے آیا تھا کہ ایک دھماکا ہوا اور بارنی نیچے آ گرا۔ روز بچ گئی تھی وہ تڑپ کر جج کے پاس آئی اور اسے سنبھالنے لگی۔ جج نے دیکھا اس کے مکان کی سیڑھیوں پر شیلا کھڑی تھی اور اسی نے بارنی کو شوٹ کیا تھا۔ اس سے بولا نہیں جا رہا تھا لیکن اس نے ہونٹ ہلا کر تھینک یو کہا تو شیلا مسکرانے لگی.... اسی لمحے فضا میں پولیس سائرن کی آواز گونجنے لگی۔

☆☆☆

سخت سرما کا موسم گزر گیا تھا اور بہار کے آثار نظر آ رہے تھے۔ جل جانے والا سبزہ پھر سے ہرا ہونے لگا تھا۔ ایک مہینے بعد جج کے مکان کے سامنے ٹیکسی رکی اور اس سے جمی اترا۔ جج برآمدے میں کھڑا ہوا تھا۔ اس کا بازو سیلنگ میں لٹکا ہوا تھا۔ گولی نے شانے کی ہڈی توڑ دی تھی مگر شریان بچ گئی تھی۔ اسی لیے وہ زندہ تھا۔ جمی اسٹک کا سہارا لے کر اوپر آیا تو جج نے اسے گلے لگا لیا۔ اسی لمحے اندر سے روز نکلی' اس نے میک کو اٹھایا ہوا تھا۔ جج نے پوچھا۔ ”کیسے ہو جمی؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے کہا اور جج کے بازو کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس کی حالت کیسی ہے؟“

”ایک مہینا اور سیلنگ استعمال کرنی ہوگی۔ مگر اب درد نہیں ہے۔“ جج نے جواب دیا اور پھر روز کی طرف مڑا۔ ”روز' یہ جمی ہے میرا بھائی اور جمی یہ روز ہے۔“

روز نے میک کو باپ کی گود میں دیا اور جمی کو گلے لگایا۔ ”کیسے ہو تم؟...... اب تم بہتر لگ رہے ہو' میں تمہیں اسپتال میں دیکھنے آئی تھی۔ اس وقت تم کومے میں تھے۔“

”میں بہتر ہوں۔“ جمی مسکرایا۔

”جمی' یہ ہے تمہارا بھتیجا... میک۔“ جج نے کہا اور اسے جمی کی طرف بڑھایا تو وہ جذباتی ہو گیا۔

”میرے خدا... اتنا پیارا سا۔“ اس نے احتیاط سے میک کو گود میں لیا' وہ جاگ رہا تھا اور ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ جمی نے اسے پیار کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”یہ میرا خاندان ہے؟“

”ہاں، ہم ایک خاندان ہیں۔“ جج بھی جذباتی ہو رہا تھا۔

روز نے کہا۔ ”میرا خیال ہے اندر چلنا چاہیے۔ ابھی سردی ہے۔“

جج نے جمی کے بازو پر ہاتھ رکھا اور وہ اندر کی طرف بڑھے' بالکل ایک خاندان کی طرح۔

ستاروں پر کمند

قسط: 2

طاہرہ جاوید مغل

اصول اور انقلاب... ہمیشہ دو مختلف طبقات کے درمیان عمل اور ردِعمل کی ایسی کُھلی جنگ کا نام جو طاقتور اور کمزور کے درمیان ازل سے جاری ہے۔ چاہتوں کو در و بام میں قید کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ انہونیاں بھی کبھی کبھی ہو جاتی ہیں... کیونکہ روزن کو کریدنے والے اپنے حوصلے سے اسے دہانہ بنا دیتے ہیں... وہ بھی عجیب دہرے نظام اور مزاج کا شکار تھا جیسے کیکر اور ٹاہلی کے گھنے درختوں کے جھنڈ میں کئی جگہ اونچے سرکنڈے بھی ہوتے ہیں ایسے ہی وہ بھی سر اٹھا کر جینے کی خواہش میں اپنی جڑیں زمین میں اتارنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ اچانک اس کے بچپن کی دیوار سے ایک کھلونا گر کر ٹوٹ گیا لیکن... اس کی امیدوں کے دیے تیز ہواؤں کے سرکش جھونکے بھی نہ بجھا سکے... دوسری جانب اس کی چاہت تھی جو سود و زیاں کی حد کھینچے بیٹھی فاصلوں کو سمٹنے ہی نہیں دے رہی تھی لیکن وہ جو ایک پل کی رفاقت میں قید تھا... ان گنت اندیشوں کے باوجود اسے انہونیوں کی امید تھی اگرچہ برسوں سے اس کے آنگن میں دشت کی ویرانی تھی لیکن دل کی گلیوں میں وہی جل تھل موسم کی کسک لیے وہ ایسی مسافت کے لیے رختِ سفر باندھے بیٹھا تھا جس میں اس کے پاس حوصلوں اور عزمِ مصمم کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ جو خوش گمانیوں میں آکر ستاروں پر کمند ڈال چکا تھا... جس کے پیر تو زمین میں دھنسے تھے مگر... آنکھیں آسمانوں کی بلندیوں میں گم تھیں ایسے میں لگنے والی ہر ٹھوکر اسے ایک نئے رمز... اور ہر دکھ اسے ایک نئی لذت سے آشنا کر رہے تھے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ستارے فلک سے زمین کی طرف نہیں آتے مگر... کمند تو زمین سے فلک کی جانب جا سکتی ہے۔ لہٰذا دور بہت دور اس کے مقدر کا ستارہ بھی اسے روشنی دکھا رہا تھا۔

رقیبوں کی زہریلی چالوں...... پیار کی مدھر تالوں اور بدلتی رُتوں کا

رومان انگیز طویل سلسلہ



سرمد صاحب نے ایک طویل سانس لی اور ذرا ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ خیمے سے باہر برفانی ہوائیں سرپٹخ رہی تھیں۔ انہوں نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔ ''ہمیں اس بات کو سمجھنے کے لیے کافی پیچھے جانا پڑے گا۔ قریباً ساڑھے چار سو سال پیچھے۔ یہ اکبرِ اعظم کے دور کی بات ہے۔ جن راستوں سے گزر کر ہم آئے ہیں، وہیں پر کہیں ایک راجپوت قبیلہ بھی آباد تھا۔ یہ کوئی ایک ہزار نفوس پر مشتمل آبادی ہوگی۔ یہ لوگ روزمرہ کی لڑائیوں سے تنگ آکر اس طرف نکل آئے تھے اور اسی ویرانے میں آباد ہوگئے تھے۔ یہ علاقہ ایک ہندو سالار وشواناتھ کے زیرِ نگرانی تھا۔ یہ سالار مقامی صوبیدار کا منہ چڑھا تھا اور اکثر من مانیاں کرتا تھا۔ وشواناتھ کو قبیلے کی ایک خوبرو لڑکی پسند آگئی تھی اور وہ اس سے بیاہ رچانے پر بضد تھا۔ قبیلے والوں نے وشواناتھ کی بھرپور مزاحمت کی لیکن ان کی ایک نہ چلی۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ وشواناتھ نے راجپوت قبیلے کو لڑائی کی دھمکی دے دی۔

''جب قبیلے والوں نے دیکھا کہ لڑائی ناگزیر ہوگئی ہے تو انہوں نے تیاری شروع کردی۔ تیاری کی ان کارروائیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ انہوں نے اپنا قیمتی سامان ایک جگہ جمع کیا اور اسے محفوظ بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس سامان میں زیادہ تر ان کی عورتوں کے زیور تھے۔ قیمتی دھاتوں والے کچھ برتن تھے۔ اس کے علاوہ کچھ خاندانی پتھر جن میں نیلم اور زمرد وغیرہ شامل تھے۔ ان لوگوں نے اس سامان کی فہرست بنائی اور جن جن لوگوں کی یہ چیزیں تھیں، ان کے نام وغیرہ لکھے پھر ان چیزوں کو دو پوٹلیوں کی شکل دے دی۔ قبیلے کے دو ماہر بندے جو مشکل چڑھائیاں چڑھنے میں تاک تھے، ان پوٹلیوں کے ساتھ اس بلند چوٹی کی طرف روانہ ہوئے جس کا ذکر میں نے ابھی تم سے کیا ہے۔ چوٹی کے عین اوپر بہت قدیم زمانے سے کسی پتھریلی عمارت کا کھنڈر موجود ہے۔ جہاں تک میں نے پڑھا ہے، کچھ لوگ اس کا ناتا سکندرِ اعظم کے دور سے جوڑتے ہیں۔ لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ جو شخص کسی مصیبت سے یا اپنے کسی دشمن سے بچنے کے لیے اس کھنڈر میں پناہ لے لیتا ہے، وہ محفوظ ہوجاتا ہے۔ ''بلندی کا دیوتا'' اس کی حفاظت کرتا ہے۔ یہ لوگ بھی اسی سینہ بہ سینہ روایت کو نظر میں رکھتے ہوئے اس چوٹی کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اس مال واسباب کو کھنڈر میں کہیں چھپا دیں گے اور وہ لٹیرے سالار سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوجائے گا۔ وہ سالار وشواناتھ کو لٹیرا سالار ہی کہتے تھے۔ ان دونوں افراد نے وہ سامان کھنڈر کے آس پاس ایک تہ خانے میں چھپایا اور ایک بڑے برفانی طوفان کی آمد سے پہلے پہلے نیچے لوٹ آئے لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ راجپوتوں کے اندازوں سے بالکل مختلف تھا۔ لڑائی فوراً شروع نہیں ہوئی۔ تین چار ماہ تک امن رہا۔ راجپوت اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے لگے کہ شاید بلا ٹل گئی ہے۔ اسی دوران میں قبیلے ہی کے ایک نوجوان سے اس لڑکی کی شادی بھی کردی گئی تھی جس کی وجہ سے یہ سارا فساد شروع ہوا تھا۔ بہ ظاہر سب ٹھیک نظر آرہا تھا لیکن حقیقت مختلف تھی۔ سالار وشواناتھ اپنی توہین بھولنے والا نہیں تھا، اس کے اندر انتقام کی آگ جل رہی تھی۔ وہ راجپوت قبیلے پر چڑھائی کے لیے تیاری کررہا تھا۔ اس کی تیاری دو طرح کی تھی۔ ایک طرف تو وہ اپنے اعلیٰ حکام کے ذہنوں میں مسلسل یہ بات بٹھا رہا تھا کہ راجپوت قبیلے کی بغاوت ایک بڑی بغاوت میں بدل سکتی ہے لہٰذا ان کو کچلنا ضروری ہے۔ دوسری طرف وہ راجپوت قبیلے کے حمایتی کھکو برادری کو توڑنے کی کوشش کررہا تھا۔ یہ پہاڑی لوگ موسم کی سختی اور اپنی تنگ دستی کے درمیان بری طرح پس رہے تھے۔ سالار نے کھکو برادری کے سرکردہ لوگوں کو تحفے تحائف دیے۔ ان کے لیے سہولتوں کا اعلان کیا۔ ان کے علاقے میں دو بڑے بڑے گودام بنوائے اور اناج سے بھر دیے۔ بڑی خاموشی اور مہارت سے اس نے ''کھکو'' برادری کو غیر جانبدار رہنے پر آمادہ کرلیا۔''

عادل بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ سرمد صاحب کھوئی کھوئی سی آواز میں بول رہے تھے۔ ساڑھے چار سو سال پہلے کے وہ سارے مناظر جیسے ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے تھرماس میں سے گرماگرم چائے دو ڈسپوزیبل کپس میں انڈیلی۔ ایک کپ عادل کے سامنے رکھا اور دوسرے میں سے خود گھونٹ لیتے ہوئے بولے۔ ''وہ بہار کا موسم تھا۔ برف پگھل رہی تھی۔ جھرنے بہہ رہے تھے اور شگوفے کھل رہے تھے۔ یہ راجپوت قبیلے کے لیے کھیتی باڑی کا موسم تھا۔ وہ روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھے۔ اچانک ان کے مخبروں نے اطلاع دی کہ سالار وشواناتھ کی طرف سے ان پر حملے کی پوری تیاری ہوچکی ہے اور کسی بھی وقت حملہ ہوسکتا ہے۔ قبیلے والوں نے اپنے گھڑسوار کھکوؤں کی طرف دوڑائے تاکہ انہیں بھی ہوشیار کیا جاسکے لیکن وہاں تو صورتِ حال بالکل بدل چکی تھی۔ وہاں سے یہ مایوس کن اطلاعات ملیں کہ کھکو ان کی مدد کے لیے میدان میں نہیں آئیں گے۔ ایک دو دن کے اندر ہی

یہ بات پوری طرح سامنے آگئی کہ اب جو کرنا ہے، راجپوتوں کو اکیلے ہی کرنا ہے۔ وہ بُری طرح پھنس چکے تھے۔ دوسری طرف یہ خبریں بھی مل رہی تھیں کہ سالار وشواناتھ کی قیادت میں حملہ آور ہونے والا لشکر توقع سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔ بستی کی طرف آنے والا راستہ ایک تنگ گھاٹی میں سے گزرتا تھا۔ اس گھاٹی نے ایک قدرتی فصیل کی سی شکل اختیار کرلی تھی۔ راجپوتوں نے اس گھاٹی کے دفاع کے لیے مورچے بنالیے اور جم کر بیٹھ گئے۔ دو دن بعد سالار وشواناتھ کا لشکر آدھمکا۔ گھاٹی پر زوردار مقابلہ ہوا تاہم راجپوت حملہ آوروں کو روکنے میں کامیاب رہے۔ تین چار دن تک تو یہ صورتِ حال برقرار رہی پھر حملہ آور لشکر کے دستے پہاڑوں میں گھس گئے اور بستی تک پہنچنے کے لیے دوسرے راستے تلاش کرنے لگے۔ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ظاہر تھا کہ انہیں زیادہ دیر بستی سے دور نہیں رکھا جاسکتا تھا۔

''جب راجپوتوں نے محسوس کیا کہ اب لڑ مرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تو انہوں نے ایک بہت مشکل لیکن اہم فیصلہ کیا۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ سالار وشواناتھ کے لشکر سے شکست کھانے کے بعد سب سے زیادہ مصیبت ان کی عورتوں پر ہی آئے گی۔ سالار وشواناتھ کے ''شرابی لشکری'' اسی طرح بستی میں گھسیں گے جس طرح بھوکے بھیڑیے بکریوں کے ریوڑ میں گھستے ہیں۔ اس طرح کی ایک دو دردناک مثالیں ماضی میں ان کے سامنے تھیں۔ انہوں نے اپنی ساری عورتوں کو مارنے کا فیصلہ کرلیا۔ بڑے سردار کے گھر کے وسیع احاطے میں ایک بہت بڑی چتا جلائی گئی۔ جواں سال بچیوں سے لے کر درمیانی عمر کی عورتوں تک سب نے اس چتا میں کودنے کی ہامی بھرلی۔ ان میں بال بچوں والی بیاہتا بھی تھیں، نوبیاہتا بھی اور کنواریاں بھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے مناظر بڑے دردناک ہوتے ہیں۔ وہ منظر بھی بڑا اذیت ناک رہا ہوگا۔ روتی سسکتی عورتوں نے اپنے مردوں کو الوداع کہا ہوگا۔ بہنیں بھائیوں سے ملی ہوں گی، بیویاں شوہروں سے۔ باپوں نے بیٹیوں کی پیشانیاں چومی ہوں گی اور انہیں آگ کے سپرد کردیا ہوگا۔ یہ سب غلط تھا یا صحیح...... یہ ایک علیحدہ بحث ہے لیکن یہ سب تھا تو دلخراش اور ایسا واقعہ جب کہیں بھی ہوتا ہے، جہاں کہیں بھی ہوتا ہے...... انسانیت کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کردیتا ہے...... تمہارا کیا خیال ہے عادل؟'' آخر میں سرمد صاحب نے پوچھا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر۔'' عادل نے جیسے چونکتے ہوئے کہا۔

انہوں نے سلیپنگ بیگ اپنے گھٹنوں پر درست کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ''دو سو کے قریب عورتیں اس چتا میں زندہ جل مریں۔ عورتوں کی جس ٹولی نے سب سے پہلے شعلوں میں چھلانگ لگائی، ان میں وہ نوبیاہتا بھی شامل تھی جس کی بدنصیبی اسے سالار کی نظروں میں لائی تھی اور جس کی وجہ سے جنگ تک نوبت پہنچی تھی۔

''ظاہر ہے کہ اپنی عورتوں کو اپنے ہاتھوں سے زندہ جلانے کے بعد اور ان کی آخری کربناک آوازیں سننے کے بعد مردوں کے سینوں میں غیظ وغضب کے شعلے پھنکارنے لگے ہوں گے۔ انہوں نے تلواریں سونت لیں اور اپنے سر ہتھیلی پر رکھ کر سالار وشواناتھ کے لشکر سے ٹکرا گئے۔ اب ان کے سامنے دو ہی راستے تھے، گھیرا توڑ کر نکل جائیں یا پھر لڑ مریں اور وہ سب کے سب لڑ مرے۔ انہوں نے بہت سوں کو مارا اور خود بھی مرگئے۔ بستی کا کوئی فرد بھی زندہ نہ بچ سکا۔''

سرمد صاحب نے کچھ دیر توقف کرکے کپ میں تازہ چائے انڈیلی اور گہری سانس لے کر بولے۔ ''خیر یہ واقعہ تو ضمنی طور پر سنانا پڑا ہے۔ ہمارا اصل موضوع یہ نہیں ہے عادل! میں تمہیں ان قیمتی اشیا کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں جن کا ذکر اس واقعے میں آیا ہے۔ موجودہ دور کے وزن کے حساب سے یہ قریباً دس بارہ کلو سونا اور سات آٹھ کلو چاندی تھی۔ قیمتی پتھر اس کے علاوہ تھے۔ موٹا حساب لگایا جائے تو ان چیزوں کی مالیت آج کل چھ سات کروڑ سے کم نہیں ہوگی۔ اور عادل! جو کچھ میں نے پڑھا ہے اور جو تحقیق میں نے کی ہے، اس کے مطابق یہ اشیا اب بھی...... ہاں اب بھی...... اس چوٹی کے کھنڈر میں کسی تہ خانے کے اندر موجود ہیں۔ اسی طرح جس طرح راجپوتوں نے مرنے سے پہلے اسے چھوڑا تھا۔ اگر کوئی ہمت سے انہیں تلاش کرسکے تو وہ مل سکتی ہیں۔ وہ جگہ اتنی بڑی نہیں ہے، چوٹی کے اوپر بس چند ٹوٹی پھوٹی دیواریں ہیں۔ یہ دیواریں مشکل سے کوئی دس مرلہ جگہ میں ہوں گی۔ اتنی سی جگہ میں ان اشیا کا کھوج لگالینا کوئی بہت دشوار کام نہیں ہوگا عادل۔ دشوار کام ایک ہی ہے اور وہ ہے چوٹی تک پہنچنا...... بلکہ......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئے۔

''آپ...... کچھ کہنے لگے تھے؟'' عادل نے کہا۔ وہ مکمل طور پر اس روداد میں جذب ہوچکا تھا۔

سرمد صاحب نے کہا۔ ''وہی بات جو میں نے پہلے بھی کہی ہے۔ چوٹی پر پہنچنا بھی کوئی بہت زیادہ کٹھن کام نہیں تھا، اگر ہم مناسب راستے سے اس پر جاسکتے۔ دشواری یہی ہے

کہ ہمیں ایک مشکل راستے سے اس پر جانا ہوگا۔ درست راستے سے جانے والوں کے لیے پاؤندے رکاوٹ بن جاتے ہیں۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ..... پاؤندے، اس قیمتی سامان کے بارے میں جانتے ہیں جو وہاں اوپر کھنڈر میں موجود ہے؟"

سرمد صاحب نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔ "نہیں، ایسا کچھ نہیں ہے۔ ان لوگوں کو پتا ہوتا تو شاید یہ بہت پہلے اس سامان کو ڈھونڈنے کی کوشش کر چکے ہوتے بلکہ یہ خبر بہت سے دوسرے مہم جوؤں تک بھی پھیل چکی ہوتی۔ یہ پاؤندے صرف اس لیے چوٹی تک جانے میں رکاوٹ بنتے ہیں کہ انہیں چڑ سی ہو چکی ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ جب کوئی کوہ پیما پارٹی ان پہاڑوں کی طرف آتی ہے تو ان کی رہائشی زندگی درہم برہم ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ بالکل الگ تھلگ اور سکون سے رہنا پسند کرتے ہیں۔ لوگوں کو چوٹی کی طرف جانے سے روکنے کے لیے ان کے کچھ بڑوں نے یہ بات گھڑلی ہوتی ہے کہ چوٹی پر موجود کھنڈر دراصل کسی عبادت گاہ کا کھنڈر ہے اور جب بھی کوئی انسانی قدم اس کھنڈر تک پہنچتا ہے، اردگرد کے علاقوں پر سخت آفت نازل ہوتی ہے۔"

عادل نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تو سر! آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم پاؤندوں کو چوکنا کیے بغیر ایک مشکل راستے سے چوٹی پر پہنچ جائیں اور اس کھنڈر میں سے وہ زیورات تلاش کریں؟"

"ہاں، اور میں نے تمہیں بتایا ہے کہ اصل مسئلہ چوٹی تک پہنچنا ہی ہے۔ مجھے یقین ہے ہمیں وہ سامان ڈھونڈ نکالنے میں کوئی خاص دشواری نہیں ہوگی۔"

اس معاملے میں عادل کی دلچسپی بڑھ چکی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ذہن میں سوال بھی پیدا ہو رہے تھے۔ وہ بولا۔ "میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی جناب کہ آپ مجھے اپنے ساتھ لے جانا اتنا ضروری کیوں سمجھ رہے ہیں؟ آپ تینوں خود اچھے کوہ پیما ہیں..... اور اگر آپ پھر بھی پُریقین نہیں ہیں تو کسی بہت اچھے کوہ پیما کو اپنے ساتھ ملا سکتے ہیں۔"

سرمد صاحب عجیب انداز میں مسکرائے اور بولے۔ "بات صرف مہارت اور تجربے کی نہیں ہے عادل۔ بات قسمت کی ہے اور بات اس خاص صلاحیت کی ہے جو مجھے صرف تم میں نظر آرہی ہے۔"

"کیسی صلاحیت جناب؟"

"بلندی کی طرف جانے کی صلاحیت۔ امید کرتا ہوں کہ اب تم مزید سوالات نہیں پوچھو گے۔ اگر تم مزید کچھ جاننا چاہتے ہو تو میں وقت آنے پر بتا دوں گا۔"

دونوں کے درمیان قریباً ایک منٹ تک خاموشی رہی۔ وہ دونوں جیسے اپنی اپنی سوچ میں گم تھے۔ آخر عادل نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ "آپ جانتے ہیں مجھے صرف درختوں پر چڑھنا آتا ہے۔ ہائکنگ اور کوہ پیمائی وغیرہ کا مجھے کوئی تجربہ نہیں۔"

"تجربہ ہو جائے گا۔" سرمد صاحب نے اعتماد سے کہا۔ "اسی لیے تو ہم وقت سے پہلے یہاں پہنچ گئے ہیں۔ ہمارے پاس ابھی کئی ہفتے ہیں۔ اگر تم آمادہ ہو جاتے ہو تو ہم پرسوں سے اپنی ٹریننگ شروع کر دیں گے۔ مجھے یقین ہے، تم خداداد صلاحیت رکھتے ہو۔ ایک ڈیڑھ ماہ کے اندر ہی تم بہت کچھ جان جاؤ گے اور بہت کچھ کر بھی لو گے۔ شرط صرف محنت ہے..... انتھک محنت اور مصمم ارادہ۔"

عادل نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "میں آپ کی باتیں پوری طرح سمجھ تو نہیں پا رہا لیکن پھر بھی آپ پر یقین کرنے کو دل چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سوال بھی ذہن میں اٹھتے ہیں..... آپ کو کتنے فیصد یقین ہے کہ ساڑھے چار سو سال پہلے کے واقعات کے بارے میں آپ نے جو معلومات حاصل کی ہیں، وہ درست ہیں اور ہم چوٹی کے کھنڈر میں سے اپنی مطلوبہ چیزیں ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟ دراصل..... مجھے یہ سب کچھ..... ایک کہانی کی طرح لگ رہا ہے۔ مہم جو لوگ دور دراز سفر کرتے ہیں اور دفن شدہ قیمتی چیزیں ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر یہ کہانیاں سچی ہوں تو اکثر ان میں ناکامی ہی حصے میں آتی ہے۔"

"یہاں ناکامی حصے میں نہیں آئے گی۔ شرط یہی ہے کہ ہم پاؤندوں کو خبردار کیے بغیر چوٹی تک پہنچ جائیں۔"

"میں پھر پوچھوں گا، آپ کو کتنے فیصد یقین ہے؟"

"قریباً نائنٹی نائن پرسنٹ!" انہوں نے عجیب لہجے میں کہا۔ "اور جہاں تک اوپر پہنچ جانے کا تعلق ہے، اس سلسلے میں بھی میں بہت زیادہ پُرامید ہوں اور اس کی وجہ! قدرتی صلاحیت ہی ہے جو مجھے تم میں نظر آئی ہے۔"

"میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا سر؟"

انہوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی میں انگلیاں چلائیں اور بولے۔ "میں نے تمہیں بتایا تھا نا عادل کہ اگر ہم اپنے خدا کی بخشی ہوئی عقل کا بہت تھوڑا سا حصہ بھی ٹھیک طرح سے استعمال کرنے کے قابل ہو جائیں تو پیشین گوئیاں کر سکتے ہیں۔"

"ہاں آپ نے کہا تھا۔"

وہ پھر مسکرائے۔ "تو سمجھو کہ یہ میری پیشین گوئی ہی ہے کہ تم کامیابی سے اس راستے پر سفر کر سکتے ہو اور تمہارے پیچھے ہم بھی کر سکتے ہیں۔"

اس یخ بستہ رات میں، اس پھڑ پھڑاتے خیمے میں، اس عظیم الشان کے ٹو کے دامن میں عادل اور سر سرمد کے درمیان کافی طویل گفتگو ہوئی۔ بے شک اب بھی عادل کے ذہن میں کئی سوال موجود رہے لیکن وہ ذہنی طور پر سرمد صاحب کی بات ماننے کو تیار ہو گیا۔ اس کے اندر ایک یقین سا بیٹھتا چلا جا رہا تھا کہ جو کچھ سرمد صاحب کہہ رہے ہیں، وہ کر دکھائیں گے۔ ان کی معلومات بہت وسیع تھیں اور ان کا ارادہ اس سے بھی وسیع اور پختہ محسوس ہوتا تھا۔ عادل نے خیمے کے روزن سے کپڑا ہٹا کر دور شمال مغرب کی سمت دیکھا۔ برفیلی چوٹیوں پر چاندنی کا پڑاؤ تھا۔ ہوا کچھ ساکن سی محسوس ہوتی تھی اور پہاڑوں کی خاموشی میں ان گنت دلفریب نغمے تھے۔ انہی پہاڑوں میں سے کسی ایک پہاڑ پر وہ چند ٹوٹی پھوٹی دیواریں موجود تھیں اور ان دیواروں کے درمیان کہیں وہ نادر قیمتی سامان بھی موجود تھا جو پچھلے ساڑھے چار سو سال سے شاید سر سرمد جیسے ہی کسی مہم جو کا انتظار کر رہا تھا۔

سر سرمد نے یقیناً بڑی ذہانت دکھائی تھی۔ اگر وہ یہ ساری باتیں لاہور کے کسی ریسٹورنٹ میں عادل کو بتاتے تو شاید وہ اس طرح ان کا اثر قبول نہ کرتا۔ اب یہ سارا جادوئی ماحول اس پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ وہ چوٹی بھی اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی جو اس ساری روداد میں مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ اس چوٹی نے جیسے عادل کو اپنی طرف بلانا شروع کر دیا تھا۔ شہزادی کا ملیح چہرہ عادل کی نگاہوں میں آگیا۔ وہ جیسے بڑی خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور کہہ رہی تھی..... مجھے بھول نہ جانا عادل! میں انتظار کر رہی ہوں۔

☆☆☆

یہ عجیب دن تھے اور عجیب تر راتیں تھیں۔ عادل کو ایک نئی زندگی کا تجربہ ہو رہا تھا۔ نہایت کٹھن اور مشقت سے بھرپور زندگی۔ چند دن تک تو عادل کو ایسا لگا جیسے سرمد صاحب، کرسٹل اور ہمایوں گوشت پوست کے نہیں لوہے کے انسان ہیں۔ ان پر موسم کی بے رحمی اثر انداز ہوتی تھی اور نہ جان توڑ بھاگ دوڑ۔ لگتا تھا کہ سرمد صاحب کے ساتھ رہ رہ کر کرسٹل اور ہمایوں نے بھی خود کو ایک مختلف سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ دھیرے دھیرے عادل خود بھی اس بے پناہ مشقت کا عادی ہونے لگا۔ وہ لوگ صبح سویرے اٹھتے، بلند و بالا پہاڑوں کے دامن میں ترائی کے ساتھ ساتھ چار پانچ میل کی دوڑ لگاتے۔ شروع میں برفانی ہوا ان کے جسم کے کھلے حصوں پر برچھیاں چلاتی لیکن پھر پورا جسم گرم ہو جاتا اور ٹھنڈ کی مار بے اثر ہو جاتی۔ ان کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگتی۔ بلندی کی وجہ سے غالباً آکسیجن کی کمی بھی متاثر کرتی تھی۔ ٹن پیک اشیا سے ناشتے کے بعد چڑھائی کی تربیت شروع ہوتی۔ ایک بلند و بالا چٹان جس کی صرف بالائی سطح پر برف تھی، مشق کے لیے چنی گئی تھی۔ یہ چٹان کہیں کہیں سے عمودی تھی، کہیں کہیں سے ستر اسی درجے کا زاویہ بناتی تھی۔ قریباً ایک ہزار فٹ بلند اس چٹان پر رسوں کے ذریعے چڑھنا شروع میں تو عادل کو نہایت خطرناک لگا۔ لیکن جب اس نے اس کام کو سمجھنا شروع کیا تو اسے اندازہ ہوا کہ اگر کوہ پیمائی اور کلائمبنگ کے لوازمات پورے ہوں تو یہ کام خطرناک نہیں رہتا۔ ان لوازمات میں سب سے اہم چیز مضبوط رسے تھے۔ اس کے بعد ہتھوڑی اور میخوں یعنی بولٹس کی باری آتی تھی۔ پھر وہ آہنی کڑے تھے جنہیں... کاربینرز اور کیبز کہا جاتا تھا۔ خطرناک بلندی کی طرف جانے والا، پتھر میں ڈرل کر کے سوراخ کرتا تھا اور ان میں بولٹس کستا تھا یا پھر میخوں کی طرح انہیں ہتھوڑی سے ٹھونکتا تھا۔ وہ ناکلون کے مضبوط رسے کو بولٹس کے حلقوں میں سے اس طرح گزارتا چلا جاتا تھا کہ گرنے کی صورت میں وہ رسوں کے ساتھ جھول جائے۔ کوہ پیما خود کو رسیوں اور بیلٹس کے دو حلقوں میں سے گزارتا تھا اور یہ حلقے اس کی رانوں کے بالائی حصے کو اپنی گرفت میں رکھتے تھے۔ اس گرفت کو "ہارنیس" کا نام دیا جاتا تھا۔

نویں دسویں دن کی بات ہے جب عادل بغیر کسی مدد کے از خود ایک ہزار فٹ اونچی چٹان پر پہنچا۔ بلندی پر کھڑے ہو کر اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور اسے عجیب سے فخر کا احساس ہوا۔ سرمد صاحب نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ "تم نے میرے اندازے سے دو تین دن پہلے یہ کامیابی حاصل کر لی ہے۔ لیکن ابھی صرف شروعات ہے۔ ابھی اس سے کہیں مشکل چڑھائیاں آئیں گی۔"

"آپ کا مطلب ہے، اب کسی اور جگہ مشق ہوگی؟"

"ہاں..... وہ دیکھو..... وہ دائیں طرف۔ کل ہم اس چڑھائی پر کام کریں گے۔"

"لیکن سر! وہ تو بالکل سیدھی ہے کسی دیوار کی طرح۔ دیکھ کر ہی خوف آرہا ہے۔"

"جہاں چڑھ کر بیٹھے ہوئے ہو، شروع میں اسے دیکھ کر بھی تو خوف آیا تھا۔" وہ مسکرائے۔

وہ چپ رہا۔ کرسٹل نے کہا۔ "یہ "راکس" دور سے زیادہ ڈینجرس نظر آتا۔ جب ہام ان پر چڑھنا شروع کرتا تو یہ ایک دم دوست کی طرح لگتا۔ بالکل اپنا اپنا سا۔"

سرمد صاحب نے کہا۔ "زندگی کی ہر دشواری چٹان کی طرح ہی ہوتی ہے۔ دور سے بہت دشوار لیکن جب اس پر کمند پھینکتے ہیں اور لمبی سانس لے کر چڑھنے کا پختہ ارادہ کر لیتے ہیں تو وہ قدموں کے نیچے بچھنا شروع ہو جاتی ہے۔"

اچانک کرسٹل کی نظر عادل کی بائیں کہنی پر پڑی۔ وہ بولی۔ "توم کو تو یہاں چوٹ لگا۔ تم نے میڈیسن کیوں نا ئیں لگایا؟"

عادل نے کہا۔ "پرسوں ہمایوں بھائی کو چوٹ لگی تھی، انہوں نے بھی تو کچھ نہیں لگایا تھا۔"

"بھئی! ہم تو عادی ہو چکے ہیں۔ تمہیں زیادہ احتیاط کرنی چاہیے۔" اس نے اپنے فرسٹ ایڈ پاؤچ کی زپ کھولنی چاہی مگر عادل نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

"نہیں ہمایوں بھائی! وہ کیا کہتے ہیں، ہمہ یاراں دوزخ...... ہمہ یاراں جنت۔ مجھے بھی ایسے ہی چلنے دیں۔"

"اچھی سوچ ہے۔" سرمد صاحب نے تائید کی۔

"طبی امداد ہمیں کبھی کبھی سہل پسند بھی بناتی ہے۔ ہم جتنا زیادہ نیچر کے قریب رہیں، اتنا ہی سخت جان ہوتے ہیں۔ میں کئی ایسے مشہور کھلاڑیوں کو جانتا ہوں جنہوں نے کبھی اپنی کسی تکلیف کے لیے پین کلر نہیں کھائی اور اگر کبھی کسی زخم پر ٹانکوں کی ضرورت پڑی تو انہوں نے بغیر سن کرنے والے انجکشن کے ٹانکے لگوائے۔ شاید تمہیں یہ عجیب لگے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں مارشل آرٹ کے ایک ایسے کھلاڑی کو جانتا ہوں جس نے اپنے بازو کی ہڈی کا آپریشن بغیر بے ہوش ہوئے یا لوکل انستھیسیا لیے کرایا۔ ساری تکلیف جھیلی اور پورے ہوش و حواس میں جھیلی۔ ایسی چیزیں برداشت اور حوصلہ تعمیر کرتی ہیں اور یہی برداشت اور حوصلہ آگے چل کر بڑی بڑی کامیابیوں کا سبب بنتا ہے۔"

قریباً ایک ہزار فٹ اونچی اس چٹان پر تند و تیز برفانی ہوا میں کھڑے ہو کر سرمد صاحب نے جو باتیں کہیں، وہ عادل کو دل میں اترتی محسوس ہوئیں۔

اگلے روز معمولات سے فارغ ہونے کے بعد وہ لوگ اپنے ساز و سامان کے ساتھ اس دوسری اونچائی کی طرف روانہ ہوئے جو دو تین سو فٹ تک تو مناسب تھی، اس کے بعد قریباً آٹھ نو سو فٹ تک بالکل عمودی دیوار کی طرح چلی گئی تھی۔ یہاں وہ دراڑیں اور ابھار بھی بہت کم تھے جو کوہ پیما کو ہاتھ پاؤں جمانے اور آگے بڑھنے میں مدد دیتے ہیں۔

"پہلے کون جائے گا؟" سرمد صاحب نے پوچھا۔

"میں جاؤں گا۔" خاموش طبع ہمایوں نے اعتماد سے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ سامان سے پوری طرح لیس ہو کر مخصوص میخیں ٹھونکتا ہوا اور رسّا جھلاتا ہوا اوپر جا رہا تھا۔

سرمد صاحب نے عادل کو اشارہ کیا کہ وہ ہمایوں کے پیچھے پیچھے جائے۔ عادل نے دیکھ لیا تھا کہ پیچھے جانے والوں کے لیے کام کافی آسان ہو جاتا ہے۔ انہیں بولنگ نہیں کرنا پڑتی تھی اور رسے کی سپورٹ پہلے سے موجود ہوتی تھی۔ عادل کے پیچھے کرسٹل نے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ سرمد صاحب نیچے رہے اور ان تینوں کو مختلف ہدایات دیتے رہے۔ انہیں اگر کسی بولٹ کی مضبوطی پر شک ہوتا تو اسے مزید مضبوط کرواتے۔ ان کی ہدایات عادل کے لیے بھی بہت حوصلہ افزا ثابت ہو رہی تھیں۔ وہ قریباً چھ سو فٹ کی بلندی پر پہنچ چکے تھے جب اچانک عادل کا پاؤں پھسلا۔ جھٹکا لگنے سے رستے پر سے اس کے ہاتھ کی گرفت بھی ختم ہو گئی۔ وہ تیزی سے نیچے آیا۔ حفاظتی رسّا اس کی کمر سے پرویا ہوا تھا ورنہ وہ چند سیکنڈ کے اندر نچلی چٹانوں پر گر کر راہیِ عدم ہو جاتا۔ پھر بھی گرنے کا احساس بڑا دل دہلا دینے والا تھا۔ وہ نیچے نہ بھی گرتا تو شدید زخمی ہو سکتا تھا۔ اچانک اس نے خود کو ایک نرم گداز لمس کے گھیرے میں پایا۔ یہ کرسٹل تھی جو آٹھ دس فٹ نیچے آ رہی تھی۔ اس نے بڑی مہارت سے عادل کو مزید نیچے پھسلنے سے روک لیا۔ اب وہ اس کی بانہوں میں تھا۔ وہ عقب سے اسے سہارا دیے ہوئے تھی۔

"اوکے...... یو آر اوکے۔ کوئی پرابلم نا ئیں۔" اس نے ہانپتی ہوئی آواز میں عادل کو تسلی دی۔ ساتھ ساتھ وہ یہ کوشش بھی کر رہی تھی کہ عادل دوبارہ رسے پر گرفت مضبوط کر سکے۔ ان پریشان کن لمحوں میں بھی عادل کو احساس ہوا کہ کرسٹل کی نرم گرم سانسیں اس کے چہرے سے ٹکرا رہی ہیں اور وہ پوری طرح اس کی بانہوں میں ہے۔ چند سیکنڈ بعد وہ دوبارہ درست پوزیشن میں آ گیا۔ وہ ہنسی۔ "تھوڑی دیر... سانس لینے کا یہ اچھا بہانا ڈھونڈا ہے توم نے۔"

"تمہارا مطلب ہے، میں جان بوجھ کر گرا ہوں؟"

وہ بولی۔ "یہ تو ٹھیک سے پتا نا ئیں مگر توم گرتے آ چھے ہو۔ گڈ فالنگ۔"

وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں عادل کو بتا رہی تھی کہ اس کا

یوں گرنا اور اس کی بانہوں میں آنا اسے اچھا لگا ہے۔

عادل کا اسٹیمنا اتنا زیادہ نہیں تھا۔ اسے راستے میں تین بار سانس لینا پڑی۔ بالآخر وہ منزل پر پہنچ گئے۔ تیز ہواؤں نے ان کا استقبال کیا۔ کرسٹل نے اپنا ہیلمٹ اتار دیا۔ اس کے بال دیوانہ وار لہرانے لگے۔ پھر اس نے سن گلاسز بھی اتار دیے۔ اس کی آنکھوں میں شوق تھا اور خوشی کی چمک تھی۔ نہ جانے کیوں عادل کو ہوٹل کی وہ رات یاد آ گئی جب لیوپیڈ نامی نوجوان نے اسے کمرے میں گھیرا تھا اور بدتمیزی کی تھی۔ اس وقت وہ ایک مجبور بے کس لڑکی کی طرح نظر آئی تھی۔ اس لڑکی سے بہت مختلف جواب ہوا میں اپنے بازو لہرا رہی تھی اور منہ کھول کر تازہ سانسیں اپنے سینے میں بھر رہی تھی۔ ہمایوں ہمیشہ کی طرح گم صم تھا اور قدرتی نظاروں میں کھویا ہوا تھا۔ عادل نے اس سے پوچھا۔ "کیا دیکھ رہے ہو ہمایوں بھائی؟"

وہ بولا۔ "یہاں سے ایک بہت اہم جگہ کافی صاف نظر آ رہی ہے۔"

"کون سی جگہ؟"

اس نے انگلی سے شمال مغرب کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ ہے وہ چوٹی جس پر ہمیں جانا ہے۔" وہ بولا۔

عادل کی اوپر کی سانس جیسے اوپر ہی رہ گئی۔ وہ حیرت سے دیکھنے لگا۔ یہ چوٹی کئی دوسری چوٹیوں کی طرح عظیم الشان کے ٹو کے پہلو میں واقع تھی۔ یہ نیچے سے تو شاید کچھ ڈھلوان تھی لیکن جوں جوں بلند ہوتی تھی، سیدھی ہوتی چلی جاتی تھی۔ اس کا بالائی حصہ بالکل ایک سیدھی دیوار کی طرح تھا بلکہ کہیں کہیں تو یہ لگتا تھا کہ یہ سفید دیوار زمین کے ساتھ نوّے درجے سے بھی زیادہ کا زاویہ بناتی ہے یعنی باہر کی طرف جھکاؤ رکھتی ہے۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" ہمایوں نے اپنی بھاری آواز میں پوچھا۔

"بہت مشکل پہاڑ ہے یہ، لیکن...... اس پر پاؤندوں کے آثار تو کہیں نظر نہیں آتے۔"

"پاؤندے پہاڑ کی دوسری طرف ہیں۔ سمجھو، ان کی بستیاں پہاڑ کے دامن میں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس طرف آنا پڑا ہے۔"

چٹان پر کھڑا عادل اس فلک بوس چوٹی کو دیکھ رہا تھا۔ قدرت کی اس عظیم الشان و ہیبت ناک تخلیق کے مقابلے میں اس نے خود کو بہت چھوٹا اور ناچیز محسوس کیا۔ کرسٹل اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "توم پریشان کیوں ہوتا۔ کیا توم کو سرمد کا بات یاد نا ئیں۔ یہ ہائٹس دور سے زیادہ ڈینجرس لگتا۔ جب ہام اپنے ارادے کو اسٹرانگ کرے گا تو یہ سب کچھ ایزی ہو جائے گا۔ آپ کی زبان میں بالکل حلاوے کی طرح۔"

"حلاوا؟ یہ کیا ہوتا ہے؟" عادل نے پوچھا۔

ہمایوں بولا۔ "یہ حلوا کہہ رہی ہے۔ یعنی حلوے کی طرح آسان۔" وہ مسکرائی اور اثبات میں سر ہلایا۔

حلوے کے ذکر نے عادل کو ایک دم کہیں دور پہنچا دیا۔ ان برفانی خیالوں سے بہت آگے، پنجاب کے میدانوں میں اور پھر بہاولپور کی چلچلاتی دھوپ میں...... جہاں لالی کے کھیتوں میں کسان اپنا پسینا بو رہے تھے۔ اسے اپنے گاؤں لالی کی پچھلی عید یاد آئی۔ ریحانہ تایا فراست کی حویلی میں کام کر کے واپس آئی تو سیدھی عادل کے پاس چھت پر آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی سی تھی۔ "یہ کیا ہے؟" اس نے پوچھا تھا۔

"حلوا...... تمہارے لیے کسی نے بھیجا ہے۔"

اس نے پوٹلی کھولی تو شیشے کی خوب صورت پیالی نما پلیٹ میں سوجی اور انڈے کا حلوا تھا۔ اس پر اوپر سے کشمش تھی اور باداموں کا چورا ڈالا گیا تھا۔ یہ اس کے لیے شہزادی نے بھیجا تھا۔ عادل نے حلوا لینا چاہا تو ریحانہ چہک کر بولی۔ "یہ سارا تمہارا نہیں عادے بھائی۔ آدھا کسی اور کا ہے اور واپس جائے گا۔" وہ سمجھ گیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ وہ بے سے چھوٹا چمچ لایا اور کچھ حلوا کھا کر باقی ریحانہ کو واپس کر دیا۔

وہ بولی۔ "نہیں عادے بھائی۔ یہ چمچ بھی یہیں رکھو جس سے حلوا کھایا ہے۔ مجھے یہی آرڈر ہے۔"

عادل نے مسکراتے ہوئے چمچ بھی پلیٹ میں رکھ دیا۔ وہ دن ایسی ہی چھوٹی چھوٹی شوخیوں سے لبریز تھے۔ اس وقت ان دونوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ حالات اتنی جلدی بدلیں گے اور جدائی کا موڑ یوں اچانک سامنے آ جائے گا۔

"عادل! توم کس سوچ میں کھو گیا؟" کرسٹل نے ادا سے کہا۔

"کچھ نہیں، ویسے ہی کچھ یاد آ گیا تھا۔"

"شاید حلاوا یاد آ گیا ہو ئیں گا۔" وہ بولی اور خود ہی ہنس دی۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دلکش پیکر بھی ہنستا ہوا محسوس ہوا۔ وہ اکثر پاکستان آتی رہتی تھی اور اس نے بڑی دلچسپی سے اردو سیکھی تھی۔

وہ نیچے اتر آئے اور پھر دیگر مشقوں میں معروف

ہوگئے۔ عادل کبھی کبھی سرمد صاحب کی سخت جانی دیکھ کر حیران رہ جاتا تھا۔ اتنی عمر میں ان سے ایسی جفاکشی کی توقع اسے ہرگز نہیں تھی۔ وہ کچھ کھائے پیے بغیر گھنٹوں ان کے ساتھ ٹریننگ میں مصروف رہتے اور کبھی کبھی بس دودھ کا ایک ٹن پی کر سوجاتے۔ وہ زندگی کی بہت سی لذتوں سے دور تھے۔ میٹھا وہ نہیں کھاتے تھے، نمک نہ ہونے کے برابر...... آرام کم، کام زیادہ...... اور جہاں تک ازدواجی خوشیوں کی بات تھی، وہ بھی ان کے کچھ زیادہ قریب نہیں تھیں۔ لگتا تھا کہ انہوں نے کڑی مشقت کو محبوبہ بنا رکھا ہے اور مشکلات ان کے بچے ہیں جنہیں وہ بڑے پیار سے گلے لگاتے ہیں اور ان کی آمد پر پریشان ہونے کے بجائے اپنا سینہ ان کے لیے کھول دیتے ہیں۔ وہ دوسروں سے بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ مشکلات اور تکلیفوں سے بھاگنے کے بجائے ان کے پیچھے بھاگیں۔ انہیں گود میں اٹھائیں، ان سے کھیلیں۔ ان کے اندر سے زندگی کا پیار کشید کریں۔

وہ رات بھی عادل نے پہاڑی ڈھلوان پر لگے ہوئے جدید انگلش کیمپ میں گزاری۔ یہ تین آدمیوں کے لیے کافی تھا تاہم اس میں ہمایوں اور عادل ہی ہوتے تھے۔ ایسی جگہوں پر ایوالانچ (برفانی ریلے) کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ بہرحال اپنے تجربے کی بنیاد پر سرمد صاحب نے یہ خیمے بڑی مناسب جگہ پر لگوائے تھے۔ رات میں عادل دیر تک جاگتا رہا۔ شہزادی کا تصور بار بار ذہن میں آتا رہا۔ وہاں کیا ہورہا ہوگا؟ کیسے ہو رہا ہوگا؟ اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ وہ بس دعا ہی کرسکتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اب اس کے دل میں یہ امنگ بھی پیدا ہورہی تھی کہ یہاں جو کچھ ہونا ہے، جلد سے جلد ہوجائے۔ اگر اس مہم جوئی کے سلسلے میں واقعی ان کے ہاتھ میں ایک بڑی رقم آنے والی ہے تو پھر یہ رقم جلد سے جلد اس تک پہنچے۔ اس نے تہیہ کیا کہ وہ ٹریننگ میں پہلے سے زیادہ جان مارے گا اور سرمد صاحب کو بھی حیران کردے گا۔

اگلے روز عادل بہت چاق و چوبند تھا۔ صبح سب سے پہلے تین چار کلومیٹر کی دوڑ ہوئی تھی۔ اس کے بعد فزیکل فٹنس کی ورزش اور ناشتا۔ ناشتے کے فوراً بعد وہ لوگ کلائمبنگ کے ساز و سامان کے ساتھ کل والی چٹان کے دامن میں پہنچ گئے۔ سرمد صاحب کے ہاتھ میں اسٹاپ واچ تھی۔ انہوں نے ان تینوں کو ایک بار پھر چڑھائی کا حکم دیا۔ آج کام اس لحاظ سے نسبتاً آسان تھا کہ میخیں پہلے سے گڑی ہوئی تھیں اور طویل رسّا بھی جھول رہا تھا۔ انہوں نے آغاز کیا۔ آج کرسٹل سب سے آگے تھی۔ اس کے پیچھے عادل اور آخر میں ہمایوں۔ وہ قریباً ایک ہزار فٹ کی بلندی پر تھے جب کرسٹل نے کہا۔ "عاڈل! کل ہام نے توم کو سنبھالا، اگر آج ہام پھسلا تو توم ہام کو سنبھالے گا۔"

"تم نہ ہی پھسلو تو اچھا ہے۔" عادل نے کہا۔

"ہام صرف فرض کر رہا ہے۔"

عادل نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے تو لگتا ہے کہ پھر ہم دونوں کو ہمایوں بھائی ہی سنبھالے گا۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ آج کہیں سانس لینے کا موقع بھی نہیں تھا۔ وہ مسلسل چڑھ رہا تھا۔ دو تین بار کرسٹل نے اور ایک بار ہمایوں نے بھی اس سے کہا کہ وہ سانس لینا چاہتا ہے تو لے لے لیکن اس نے انکار کردیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر کرسٹل لڑکی ہوکر وقفہ نہیں لے رہی تو وہ کیوں لے۔ ایک جاں گسل کوشش کے بعد وہ لوگ بغیر کہیں رکے چٹان کی بلندی پر پہنچ گئے۔ سخت سردی کے باوجود وہ لباس کے اندر پسینے سے شرابور تھے اور ان کے بازو جیسے شل ہوچکے تھے۔ سرمد صاحب کا آرڈر تھا کہ چوٹی پر تین منٹ سے زیادہ نہیں رکنا۔

انہوں نے اس ہدایت پر عمل کیا اور ایک بار پھر ہانپتے ہوئے نیچے اترنے لگے۔ اترتے ہوئے بھی عادل نے کہیں وقفہ نہیں لیا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اور بازو سن ہوتے جارہے تھے۔ بہرحال وہ کافی تیزی سے نیچے اترنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے داد طلب نظروں سے سرمد صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ مطمئن تو نظر آئے لیکن ایسی کوئی داد ان کی آنکھوں میں دکھائی نہیں دی۔ چند سیکنڈ بعد انہوں نے جو فقرہ کہا، وہ بجلی بن کر عادل کی سماعت سے ٹکرایا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "پانچ منٹ کا وقفہ کرکے دوسری بار چڑھائی شروع کریں گے۔"

"دوسری چڑھائی۔" عادل نے دل ہی دل میں دہرایا اور اس کا کلیجا منہ کو آنے لگا۔

"کیا تم تیار ہو عادل؟" سرمد صاحب نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"جج...... جی...... آپ کہتے ہیں تو تیار ہوں۔" وہ مری مری آواز میں بولا۔

"شاید...... تم زیادہ تھک گئے ہو۔" انہوں نے کہا۔ "چلو ٹھیک ہے، دوسری چڑھائی کینسل کرتے ہیں...... یا پھر...... ایسے کرتے ہیں کہ جو جانا چاہے چلا جائے۔ جو رکنا چاہے رک جائے۔"

کرسٹل فوراً ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "ہام جائے گا سر! ابھی

جائے گا۔ جسٹ ناؤ۔" اس نے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر ہی دوڑتی ہوئی واپس چٹان کی طرف چلی گئی۔

سرمد صاحب نے مسکراتے ہوئے ہمایوں کو مخاطب کیا اور بولے۔ "چلو ہمایوں! تم ذرا عادل کو ایکسرسائز وغیرہ کراؤ۔"

ہمایوں، عادل کی طرف متوجہ ہوگیا۔ کرسٹل نے رسوں کے ذریعے اوپر چڑھنا شروع کردیا تھا۔ پندرہ بیس منٹ میں ہی وہ کافی اوپر چلی گئی۔ چٹان کے ساتھ چپکی ہوئی وہ بالکل چھوٹی سی نظر آنے لگی۔ اس کا سرخ ہیلمٹ جیسے ایک نکتے کی طرح تھا۔ وہ لڑکی ہوکر عادل سے کہیں زیادہ برداشت اور اسٹیمنا کا مظاہرہ کررہی تھی۔ عادل جو شاہ نوانہ کے میلے میں خود کو چڑھائی کا چیمپئن سمجھتا تھا، ایک دم خود کو خجل محسوس کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے سرمد صاحب پر تھوڑا سا غصہ بھی آرہا تھا۔

اس روز اس نے پکا تہیہ کیا کہ وہ اپنے اسٹیمنا کو بہتر کرے گا اور کم از کم اس معاملے میں تو کرسٹل اور ہمایوں کو نیچا دکھائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ اگلے روز جب وہ صبح سویرے ترائی کے ساتھ ساتھ ہموار ٹریک پر جاگنگ کے لیے نکلے تو واپسی کے بعد عادل دوسرا راؤنڈ لگانے کے لیے نکل گیا۔ قریباً چار کلومیٹر کی دوڑ تو وہ پہلے ہی لگا چکے تھے۔ اب اگر وہ یہ دوسرا راؤنڈ بھی مکمل کرتا تو یہ آٹھ کلومیٹر سے زائد ہوجاتا۔ وہ دوڑتا رہا اور ہانپتا رہا۔ اس پر کچھ ایسی ہی کیفیت طاری تھی جو کبھی کبھی گاؤں میں ہوجاتی تھی۔ ایسے ہی موڈ کے زیر اثر وہ نوری نت کے پتلے پر پل پڑتا تھا۔ مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیتا تھا۔ برف سے گھرے ہوئے اس ٹریک پر اندھا دھند بھاگتے ہوئے بھی اسے یہی لگا جیسے ایک نوری نت اس کے قریب ہے۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا ہے۔ اسے نیچا دکھانا چاہتا ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر یہ نوری نت کیوں اس کے سامنے آجاتا تھا...... کیوں آجاتا تھا؟ اس نے اپنی رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ اس کی ٹانگیں شل ہونے لگیں۔ کبھی کبھی لگتا کہ وہ بس گرنے ہی والا ہے لیکن وہ بھاگتا رہا...... اور دوسرا راؤنڈ بھی مکمل کرلیا۔ اسے کرسٹل کی آنکھوں میں تھوڑی سی حیرت نظر آئی۔ اس حیرت نے اسے محظوظ کیا لیکن رات تک عادل کو بخار ہوگیا۔ کھانے کے دوران میں اس کا تمتمایا ہوا چہرہ دیکھ کر کرسٹل نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور بولی۔ "او گاڈ! توم کو تو بخارا ہے۔"

"بخارا نہیں بخار ہوتا ہے۔" سرمد صاحب نے کہا اور عادل کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ پھر بولے۔ "واقعی بھئی! تم کو تو بخار ہی ہے۔ کافی زیادہ لگتا ہے۔" وہ کچھ دیر چپ رہ کر کہنے لگے۔ "میرا خیال ہے کہ تم کوئی دوا لے لو۔"

"نہیں سر...... میں دوا نہیں لوں گا۔ آپ نے ہی تو کہا تھا کہ دوا کے بغیر تکلیف کا سامنا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

سرمد صاحب نے اصرار نہیں کیا اور خاموش ہوگئے۔ عادل بھی خاموش ہوگیا۔

رات دس بجے تک بخار تیز ہوگیا۔ عادل اپنے خیمے میں آکر لیٹ گیا۔ اس کے منہ میں کڑواہٹ گھلی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی سرمد صاحب کا رویہ عجیب لگتا تھا۔ اگر وہ اصرار کرتے تو وہ دوا لے لیتا لیکن انہوں نے تو دوسری بار کہنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ اب بھی وہ اطمینان سے باہر ہمایوں اور کرسٹل کے ساتھ بیٹھے تھے۔ الاؤ دہک رہا تھا اور وہ اپنے طاقتور ٹرانزسٹر ریڈیو پر کوئی پروگرام سننے کی کوشش کررہے تھے۔ اسی دوران میں کرسٹل اندر چلی آئی۔ اس نے اپنا ٹھنڈا ہاتھ عادل کے تپتے ہاتھ پر رکھا۔ "عادل! توم نے اپنے ساتھ خود زیادتی کیا۔ ایکسرسائز کو اسٹیپ بائی اسٹیپ آہستہ آہستہ بڑھایا جاتا۔ توم نے ایک دم چار میل کے بجائے آٹھ میل کا راؤنڈ لگایا اور توم کو بخارا ہوا۔ سر سرمد نے توم کو کہا بھی تھا کہ ہوا بہت "کول" چل رہا ہے۔"

"ہمدردی کا شکریہ۔ تھینک یو...... صبح تک ٹھیک ہوجاؤں گا۔" اس نے کہا اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

اس کا خیال تھا کہ کرسٹل چلی جائے گی لیکن وہ وہیں بیٹھی رہی۔ "تمہارے شولڈر دباؤں؟ اس سے پوری باڈی کا پین کم ہوتا۔" اس نے کہا۔

"نو تھینکس!"

وہ پھر بھی بیٹھی رہی اور اس کے کندھے دبانے لگی۔ وہ فزیوتھراپسٹ تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو ایسے انداز سے حرکت دی کہ واقعی عادل کی گردن اور کمر کا درد کم ہونے لگا لیکن اسے یہ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ "رہنے دو کرسٹل! میں ٹھیک ہوں۔" اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر کرسٹل نے اپنے ہاتھ کے دباؤ سے اسے لیٹے رہنے پر مجبور کردیا۔ "دیکھو عاڈل! توم ناشکری کرتا۔ برمنگھم کی سب سے اچھی فزیوتھراپسٹ تمہارا ٹریٹمنٹ کرتا اور توم انکار کرتا۔"

اس نے عادل کو اوندھا لیٹنے پر مجبور کیا اور اس کی ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ ساتھ مخصوص پٹھوں پر دباؤ ڈالنے لگی۔ واقعی وہ اپنے ہاتھوں میں ایک طرح کا جادو رکھتی تھی۔ اس کا لمس، اس کی سانسوں کی سرسراہٹ، عادل اپنے بالکل قریب محسوس کررہا تھا۔ پچھلے کئی روز سے اسے لگ رہا تھا کہ کرسٹل اشاروں کنایوں میں اس کی حوصلہ

افزائی کر رہی ہے۔ آج یہ اشارے مزید واضح ہو گئے تھے۔ ''توم نے کسی سے پیار کیا؟'' اس نے مساج کرتے کرتے اچانک عادل سے پوچھا۔

وہ گڑبڑا گیا پھر سنبھل کر بولا۔ ''نہیں۔''

''اور سیکس؟'' اس نے بڑی روانی سے پوچھا۔

یہ سوال عادل کے لیے دھماکا خیز ثابت ہوا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ قدرے بیزاری سے بولا۔ ''یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟''

''ہام نے کون سا ایسا غلط بات کیا؟'' وہ اپنی نیلگوں آنکھیں جھپک کر بولی۔

''جو تم کہہ رہی ہو، یہ ہمارے لیے غلط ہی ہے بلکہ بہت غلط ہے۔''

''سوری، اگر ایسا ہے تو ہام معافی مانگتا، ایک دم معافی مانگتا...... ویسے یہ سب تو نیچر ہے اور......''

''پلیز، اپنی یہ نیچر اپنے پاس رکھو۔ میں اس سلسلے میں بات کرنا نہیں چاہتا۔''

''اوکے، ٹھیک ہے۔ ہام نا ئیں بات کریں گا۔ لیکن توم لیٹ جاؤ۔ ام تمہارا اور ٹریٹ منٹ کریں گا۔''

''نہیں، اتنا کافی ہے۔ میں اب سونا چاہتا ہوں۔'' عادل نے ذرا دھیمے لہجے میں کہا۔

''یو آر سو نائس اینڈ ہینڈسم۔ ہام توم کو لائیک کرتا۔ اگر کسی بھی طرح ہام کا ضرورت ہو تو ہام حاضر۔''

''اوکے۔ تھینک یو۔'' عادل نے کہا۔

وہ نیچی چھت والے خیمے میں جھک کر کھڑی ہو گئی اور پھر اسے لگاوٹ کی نظروں سے دیکھتی ہوئی باہر چلی گئی۔

عادل اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ وہ سرتاپا شعلہ تھی۔ اس کا آتشیں بدن کھنچی ہوئی کمان کی طرح تھا اور نگاہیں تیر کی طرح دل و دماغ میں گھسنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ پتا نہیں کہ سرمد صاحب نے یہ کیا چیز پال رکھی تھی؟ اور کیوں؟ وہ تو بالکل اور طرح کے بندے تھے۔

عادل پیار کی ایک ناقابلِ شکست زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید وہ خود کو اس آتشیں لڑکی کی لپیٹ میں محسوس کرتا۔ اس کا معنی خیز فقرہ اب بھی عادل کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ ''اگر کسی بھی طرح ہام کا ضرورت ہو تو ہام حاضر۔''

اس نے اپنے بے ہودہ خیالات کی یورش سے دھیان ہٹانے کے لیے اپنے ذہن میں شہزادی کا تصور بسایا اور اپنے تصور سے باتیں کرتے کرتے سو گیا۔

اگلے روز بھی عادل کا بخار موجود تھا۔ اسے یقین تھا کہ آج سرمد صاحب اسے ٹریننگ سے چھٹی دیں گے۔ لیکن یہ جان کر اسے سخت حیرانی ہوئی کہ وہ اسے باہر بلا رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''ہم دوڑ کے لیے جا رہے ہیں، آج تم دوڑ نہیں لگاؤ گے...... لیکن چڑھائی کی مشق تمہیں کرنا ہو گی۔ اگر کوئی دوا وغیرہ کھانی ہے تو کھا لو...... پیراسٹامول ٹائپ کی۔''

''نہیں سر! دوا کی ضرورت نہیں۔'' عادل نے بہ ظاہر عام لہجے میں کہا لیکن لہجے کے نیچے کہیں ہلکی سی تلخی بھی موجود تھی۔

ناشتے کے نام پر عادل نے پاؤڈر ملک سے بنایا گیا تھوڑا سا دودھ پیا اور ایک انرجی بار کھائی۔ اس کے بعد گروپ کے ساتھ چٹان کی طرف روانہ ہو گیا۔ بخار سے بدن دکھ رہا تھا اور سراپا میں نقاہت سی بھری ہوئی تھی۔ آج پھر انہوں نے نائلون کے طویل رسوں کی مدد سے قریباً ڈیڑھ ہزار فٹ اونچی چٹان پر چڑھنا تھا اور پھر رسوں کے ہی ذریعے پھسلتے ہوئے نیچے اترنا تھا۔ اگلے قریباً دو گھنٹے عادل کے لیے سخت اذیت ناک ثابت ہوئے۔ بخار کی حالت میں ایسی سخت مشقت اس کا انجر پنجر ہلانے کے لیے کافی تھی لیکن اسے کسی نہ کسی طور گزارہ کرنا تھا۔ اسے اکسانے میں کرسٹل کی اس بات نے بھی اہم کردار ادا کیا کہ پچھلی مرتبہ سرمد صاحب نے بھی تیز بخار کی حالت میں قریباً تین ہزار فٹ تک کلائمبنگ کی تھی اور غیر ملکیوں کی ایک ٹیم کو حیران کر دیا تھا۔

مشق ختم ہوئی تو عادل کا جسم پسینے میں شرابور تھا اور بخار بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے صبح کے مقابلے میں خود کو کافی چاق و چوبند محسوس کیا۔ رات تک وہ تقریباً ٹھیک ہو چکا تھا۔ وہ بستر پر لیٹا تو یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اگر وہ دوا کھا لیتا اور لیٹ جاتا تو شاید اس وقت بھی خود کو بیمار ہی تصور کر رہا ہوتا۔

اگلے روز سرمد صاحب نے عادل کو چھٹی دی بلکہ عادل کے ساتھ ساتھ کرسٹل اور ہمایوں کو بھی چھٹی سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیا۔ صبح سویرے کی طویل دوڑ کے بجائے وہ لوگ مزے سے اپنے کیمپ میں چائے وغیرہ پیتے رہے اور گپ شپ کرتے رہے۔ سرمد صاحب کی باتیں بھی کبھی سمجھ سے بالاتر ہوتی تھیں۔ اسے چھٹی کی ضرورت کل تھی لیکن یہ اسے آج ملی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ سرمد صاحب کو آج اپنے کیمپ کے آس پاس رہنا ہی اچھا لگ رہا تھا۔ اس دن سب نے خوب انجوائے کیا۔ دھوپ بھی چمک رہی تھی اور کے ٹو سمیت اردگرد کی سب چوٹیوں نے سنہری تاج پہن رکھے تھے۔ سرمد صاحب نے عادل کو ایک طویل لیکچر بھی

دیا۔ ایک طرح سے یہ کلائمبنگ کا ٹیچنگ کورس تھا۔ اس طرح کے دو تین لیکچر وہ پہلے بھی بڑی خوبی سے عادل کو دے چکے تھے۔ پتا نہیں کیوں اس لیکچر کے دوران میں بھی سرمد صاحب، عادل کو کچھ پریشان نظر آئے یا شاید یہ صرف اس کا وہم تھا۔

اگلے روز چھٹی تو نہیں تھی لیکن صبح سویرے کی طویل دوڑ سرمد صاحب نے ''معاف'' کر دی۔ کرسٹل نے کہا۔ ''سر! کیا کوئی پرابلم؟''

''نہیں، پرابلم تو نہیں، لیکن ابھی مجھے نکلنا کچھ مناسب نہیں لگ رہا۔ شاید کل سے پھر شروع کریں گے۔''

ناشتے کے بعد وہ کلائمبنگ کے سارے ساز و سامان کے ساتھ ایک بار پھر چٹان پر چڑھائی کے لیے تیار ہو گئے۔ آج سر سرمد بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس عمر میں ان کی ہمت اور توانائی کی داد دینے کو دل چاہتا تھا۔ ان کا اسٹیمنا بھی قابلِ داد تھا۔ واپسی سے پہلے انہوں نے ان تینوں کو اور خاص طور سے عادل کو سمجھایا۔ ''چڑھائی کو مشکل سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت میں چڑھائی سے زیادہ اترائی مشکل ہوتی ہے۔ زیادہ تر حادثات بھی اترائی کے دوران میں ہی پیش آتے ہیں۔ اترتے ہوئے کوہ پیما کو بے حد صبر اور سوجھ بوجھ سے کام لینا چاہیے۔''

اترتے ہوئے انہوں نے عادل کو اپنے بالکل ساتھ رکھا اور ہر مرحلے میں ہدایات دیتے رہے۔ کارابینرز کی ترتیب، رسے پر گرفت کو ڈھیلا اور مضبوط کرنا، پاؤں کا درست استعمال، وہ جیسے عادل کو انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ چلا رہے تھے۔ نیچے اترنے کے بعد انہوں نے چند گہری سانسیں لیں۔ اپنا ہیلمٹ اتارا۔ آنکھوں سے سن گلاسز ہٹائے اور عادل سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''آج کیسا محسوس ہوا؟''

''آج تو بہت اچھا لگا اور بہت سہل بھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ آج آپ دوسری بار چڑھنے کا کہیں گے تو شاید وہ بھی آسانی سے ہو جائے گا۔''

''ایسا کیوں محسوس کیا تم نے؟''

''شاید اس لیے کہ آپ ساتھ تھے۔''

''نہیں، اس کی وجہ اور ہے۔ کل تم نے زیادہ ہمت اور برداشت کا مظاہرہ کیا۔ بخار اور نقاہت کے باوجود اپنی ٹریننگ مکمل کی۔ آج تمہاری طبیعت بہتر تھی اس لیے تمہیں ہر چیز آسان لگی۔ ہم اپنی برداشت کی حد کو جوں جوں بڑھاتے ہیں، ہمیں مشکل کام آسان محسوس ہونے لگتے ہیں۔ ایک شخص جو غیر فعال ہے اور زیادہ وقت گھر میں ہی بیٹھا رہتا ہے، اس کو بجلی کا ایک بل ہی ٹھیک کرانا پڑ جائے تو اسے ایک معرکے کی طرح لگتا ہے لیکن ایک شخص جو ایک بڑی فرم کو سنبھالے ہوئے ہے اور اس کے مسائل کو بھگت رہا ہے، اس کے لیے عدالت میں پیشی بھی کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ یہی مثال ہم کئی جگہ لاگو کر سکتے ہیں عادل...... ہمارا حوصلہ بڑھتا ہے تو ہمارے مسائل چھوٹے ہونے لگتے ہیں۔''

سرمد صاحب کی باتیں اکثر عادل کے دل پر اثر کرتی تھیں۔ اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ کل اسے سرمد صاحب کی سختی پر جو تھوڑا سا غصہ آیا تھا، وہ بے معنی محسوس ہوا۔

لنچ کے بعد وہ سب لوگ آرام کرتے تھے۔ قریباً دو ڈھائی گھنٹے سوتے تھے۔ سخت ورزش کے بعد یہ آرام انہیں ایک دم چاق و چوبند کر دیتا تھا لیکن اس روز عادل کا دل لیٹنے کو نہیں چاہا۔ اس کا دل ذرا گھومنے پھرنے کو چاہ رہا تھا۔ وہ جوگرز کے تسمے باندھ رہا تھا جب کرسٹل نے اسے دیکھ لیا۔ ''ویئر آر یو گوئنگ؟'' اس نے پوچھا۔

''یونہی تھوڑی سی جاگنگ کروں گا۔ کچھ کمی سی محسوس ہو رہی ہے۔''

''سر سرمد سے پرمیشن لیا؟''

''ہوں۔'' عادل نے گول مول جواب دیا۔

''کہاں تک جائیں گا؟''

''زیادہ دور نہیں۔''

''تو ٹھیک...... ہام بھی توم کو جوائن کریں گا۔''

اس نے بھی فٹافٹ جوگرز پہن لیے۔ سورج کی تیز شعاعیں برفیلی ڈھلوانوں پر منعکس ہو کر اور بھی چکاچوند پیدا کر رہی تھیں۔ رات کو منفی سے کہیں نیچے چلا جانے والا درجۂ حرارت اب اوپر محسوس ہو رہا تھا۔ تاہم دور بلند چوٹیوں پر گہرا پن دکھائی دیتا تھا۔ کرسٹل نے چست نیکر پہن رکھی تھی۔ ہاں بالائی جسم پر کوہ پیمائی کا پرتوں والا لباس تھا۔ وہ ڈھلوان کے ساتھ ساتھ ہموار راستے پر دوڑتے رہے اور ساتھ ساتھ ہلکی پھلکی باتیں بھی کرتے رہے۔ سورج اچانک ہی غائب ہو گیا تھا اور چوٹیوں سے کالے بادلوں کے قافلے تیزی سے نیچے اترنے لگے تھے۔

''ہام کا خیال ہے موسم خراب ہو جائیں گا۔ ناؤ وی ہیو ٹو گو بیک۔''

''بادلوں سے ڈر رہی ہو؟''

''تھوڑا تھوڑا۔ یہاں موسم ایک دم چینج ہوتا۔ توم کو مالوم۔ فرائی ڈے کو سر نے کیا لیکچر دیا تھا۔ کلائمبر کو اتنی ہی دور جانا چاہیے جہاں سے...... جہاں سے۔'' اس کی اردو

جواب دینے لگی۔

عادل نے اس کا فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ”جہاں سے وہ موسم خراب ہونے سے پہلے واپس آسکے۔“

”ہاں، ہام یہی کہنا مانگتا۔“

”چلو، بس دس پندرہ منٹ اور۔“ عادل نے کہا۔

وہ قریباً ڈیڑھ کلومیٹر مزید آگے گئے پھر واپسی کا سفر شروع کیا لیکن بہ مشکل آدھ کلومیٹر ہی طے کیا ہوگا کہ نہایت تیز برفانی ہوا نے انہیں آلیا۔ یہ بالکل Twister جیسے بگولے تھے۔ انہیں لگا کہ اگر وہ کہیں رکے نہیں تو یہ بگولے انہیں اٹھا کر گہرائی میں پھینک دیں گے۔ ایک دم ہی تاریکی سی چھا گئی تھی۔ کرسٹل، عادل کو ایک ابھری ہوئی چٹان کی اوٹ میں لے آئی۔ یہاں چاروں طرف برف ہی برف تھی۔ وہ اپنے کیمپ سے قریباً پانچ کلومیٹر آگے نکل آئے تھے۔

”ہام کو اتنی دور نائیں آنا چاہیے تھا۔ ہام کو تو یہ ”سنو اسٹرام“ لگتا۔“

واقعی یہ سب کچھ ایک طوفان کی طرح تھا اور اس نے انہیں آناً فاناً ہی آدبوچا تھا۔ اس کی شدت گھٹنے کے بجائے دم بدم بڑھتی جارہی تھی۔ پھر ایک عجیب سی گونج سنائی دی۔ جیسے ایک گرج سی ہو۔ عادل کو اپنے پاؤں کے نیچے تھرتھراہٹ محسوس ہوئی۔ ”او مائی گاڈ!“ کرسٹل کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

”کیا ہوا؟“

”ہام کو تو یہ...... ایوالانچ لگتا۔“ کرسٹل نے کہا۔

ایوالانچ کا لفظ اب عادل کے لیے نیا نہیں تھا۔ اسے اردو میں برفانی ریلا کہا جاسکتا ہے جو بلندیوں سے نیچے کی طرف آتا ہے اور جوں جوں نیچے آتا ہے، اپنا حجم اور اپنی تباہ کاری بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ گرج دم بہ دم بڑھتی چلی گئی۔ پھر انہوں نے برفیلی چٹان کی اوٹ سے اس ریلے کو آتے دیکھا۔ یہ ایک خوفناک منظر تھا۔ برف کی کوئی تیس چالیس فٹ اونچی دیوار سی تھی جو گونج پیدا کرتی اور دھند اڑاتی ان کی طرف جھپٹ رہی تھی۔ کرسٹل نے اسے کھینچا اور خود بھی چٹان کی دیوار کے ساتھ چپک گئی۔ ”ہیڈ ڈاؤن...... ہیڈ ڈاؤن!“ وہ چلائی۔

عادل نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور لیٹ کر اپنا چہرہ اپنے دونوں بازوؤں میں چھپا کر سر جھکالیا۔ قرب و جوار تھرّا گئے۔ ایوالانچ ان تک پہنچی اور انہیں روندتی ہوئی چلی گئی۔ ہزاروں لاکھوں ٹن برف تھی جو آٹھ دس سیکنڈ کے اندر ان کے اوپر سے گزر گئی۔ اگر وہ اس مضبوط چٹان کی اوٹ میں نہ ہوتے تو نہ جانے برف کے اس سیلاب میں بہہ کر کہاں کے کہاں پہنچ چکے ہوتے اور برف کا کتنا بڑا انبار انہیں اپنے نیچے زندہ دفن کرچکا ہوتا۔

سردی میں ایک دم ہی بے پناہ اضافہ ہوگیا تھا۔ چٹان کی اوٹ میں ہونے کے باوجود عادل اور کرسٹل اپنے کندھوں تک برف میں دھنس گئے تھے۔ برف کی حرکت رک گئی تو وہ دونوں زور لگا کر باہر نکل آئے۔ اردگرد کے منظر نے عادل کو دنگ کردیا، اسے لگا کہ یہ وہ جگہ ہی نہیں ہے جہاں وہ موجود تھے۔ پورا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ جس تنگ گھاٹی میں بھاگتے ہوئے وہ آئے تھے اور اب واپس جارہے تھے، وہ برف گرنے سے مکمل طور پر بند ہوگئی تھی۔ لگتا تھا کہ یہاں کبھی کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ اب ان کی دونوں جانب بلند چٹانی دیواریں تھیں اور سامنے راستہ مسدود تھا۔ کوہ پیمائی کے مکمل سامان کے بغیر ان دیواروں پر چڑھ کر دوسری طرف جانا تقریباً ناممکن تھا۔

”اب کیا ہوگا؟“ عادل نے کپڑوں سے برف جھاڑتے ہوئے پوچھا۔

”اندھیرا ہوتا جارہا ہے۔ چڑھ کر اوپر جانے میں بہت بڑا رسک ہوئیں گا۔ ہام کو بیک جانا ہوئیں گا اور ایک چکر کاٹنا ہوئیں گا۔“

”تمہارا مطلب ہے چکر یعنی راؤنڈ؟“

”یس...... یس راؤنڈ۔“ اس نے کہا اور اپنی جیکٹ کی بیک پاکٹ میں سے ایک نقشہ نکال لیا۔ اس کے بیک پاکٹ میں کچھ دیگر اشیا کے علاوہ پنسل ٹارچ بھی موجود تھی۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں کانپتے ہاتھوں کے ساتھ نقشے کا جائزہ لیا۔ چند سیکنڈ بعد بولی۔ ”یس، ہام کو واپس جانا ہوئیں گا۔“

ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر وہ واپس مڑے۔ یہ وہی راستہ تھا جہاں سے وہ بھاگتے ہوئے آئے تھے۔ اس طرف ایوالانچ نے کوئی تبدیلی رونما نہیں کی تھی۔ وہ کبھی چلتے اور کبھی بھاگتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ انہیں معلوم تھا کہ کیمپ میں سرمد صاحب پریشانی کی انتہا کو چھو رہے ہوں گے۔ وہ قریباً دو کلومیٹر تک اس رخ پر چلتے رہے۔ اب انہیں یہاں سے گھومتے ہوئے واپس اپنے کیمپ کی طرف جانا تھا۔ یعنی ایک طرح کا یوٹرن لینا تھا لیکن عادل کو اندازہ ہوا کہ کرسٹل کچھ بھول رہی ہے۔ وہ ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں پارہی تھی کہ کہاں سے ٹرن لینا ہے اور اپنا رخ پھر سے کیمپ کی طرف کرنا ہے۔

موسم بہ دستور ابر آلود تھا اور تیز برفانی ہوا ابھی چل رہی تھی۔ ابھی شام نہیں ہوئی تھی لیکن تاریکی شام والی ہی تھی۔

کرسٹل نے ایک بار پھر نقشہ نکالا۔ عادل نے ٹارچ پکڑی۔ وہ دونوں اس جگہ کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ ”آئی تھنک...... تھوڑا سا اور آگے جانا ہوئیں گا۔“ کرسٹل نے اپنی گلابی اردو میں کہا۔

مطلوبہ موڑ ڈھونڈنے کے لیے وہ ایک بار پھر چل دیے۔ عادل نے کہا۔ ”لگتا ہے کہ ہمارے پاس ٹائم کم ہے۔ اندھیرا زیادہ ہوگیا تو راستہ ڈھونڈنا بھی مشکل ہوجائے گا۔ ٹارچ کی بیٹری بھی ڈاؤن ہورہی ہے۔“

کرسٹل نے پھر سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس کی ساری توجہ مطلوبہ موڑ ڈھونڈنے پر لگی ہوئی تھی۔ ایک جگہ وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ ”کیا ہوا؟“ عادل نے پوچھا۔

”ہام کافی آگے نکل آیا۔ اٹ از ڈینجرس۔“

”کیا مطلب؟“

کرسٹل نے پریشان کن انداز میں دور ایک چوٹی کی طرف اشارہ کیا۔ غالباً یہ وہی چوٹی تھی جس پر چڑھنے کا وہ ارادہ رکھتے تھے۔ اب یہ عظیم الشان پہاڑ ذرا مختلف زاویے سے نظر آرہا تھا۔ کرسٹل نے کہا۔ ”عاڈل! ہام کو اتنا دور نائیں آنا چاہیے۔ پاؤنڈوں کا ٹیرے ٹوری (علاقہ) یہاں سے زیادہ دور نائیں ہوئیں گا۔“

”تو پھر؟ تمہیں تو وہ جگہ نظر نہیں آرہی جہاں سے مڑنا ہے۔“

”ہام...... انداز سے سے...... ٹرن لے لیتا۔ یہ آگے بڑھنے سے زیادہ اچھا۔“

وہ بائیں طرف مڑ گئے۔ یہاں برف تھی اور راستہ دشوار تھا۔ انہوں نے چونکہ برف پر چلنے والے بوٹس نہیں پہن رکھے تھے، اس لیے دشواری ہورہی تھی۔ ایک دم کرسٹل دوبارہ چونکی۔ اس نے ٹارچ کی مدھم روشنی راستے کی برف پر مرکوز کر رکھی تھی۔ اس بار عادل کو بھی چونکنا پڑا۔ برف پر ان کے سامنے انسانی قدموں کے مدھم نشان موجود تھے۔ یہ تازہ نشان تھے۔ ”او مائی گاڈ...... یہاں کوئی ہے۔“ کرسٹل نے کہا اور اس کے ساتھ ہی ٹارچ بجھادی۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر حتی الامکان تیزی سے قدم اٹھانے لگے...... دفعتاً عادل کو ایک عجیب سا احساس ہوا اور اس کے ساتھ ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اسے لگا کہ نشیب میں کوئی ان کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے بلکہ وہ ایک سے زیادہ لوگ لگتے تھے۔ ان کے قدموں کی ”شپ شپ“ واضح سنائی دیتی تھی۔ یہ آواز یقیناً کرسٹل نے بھی سن لی تھی۔ اس کے قدموں میں کچھ اور تیزی آگئی۔ پھر اس نے ایک دم بھاگنا شروع کردیا۔ عادل نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ یہی وقت تھا جب نشیب سے تین چار سائے برآمد ہوئے اور ان کے پیچھے بھاگے۔ ”رک جاؤ...... رک جاؤ۔“ کسی نے بھاری آواز میں پکارا۔

”رن عاڈل...... رن۔“ کرسٹل چلائی۔

ان دونوں نے رفتار کچھ اور تیز کردی۔ پیچھے والے بھی اندھا دھند دوڑے۔ اچانک کرسٹل کا پاؤں پھسلا اور وہ اوندھے منہ گری۔ عادل آٹھ دس قدم تو بھاگتا چلا گیا پھر رکا۔ تب تک سائے کرسٹل تک پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے اسے دبوچا۔ وہ بری طرح چلا رہی تھی، پھر یکایک اس نے خود کو چھڑایا...... اور دوبارہ بھاگنا چاہا۔ ایک دراز قد شخص نے اسے دھکا دے کر گرا دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے دوبارہ دبوچتا، عادل اس کے اور کرسٹل کے درمیان آگیا۔

”رک جاؤ۔“ اس نے دراز قد شخص کو روکنا چاہا۔ پھر یکایک ایک ٹکر اس کے سینے پر ماری۔ وہ ایسی جگہ کھڑا تھا کہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑھکتا ہوا نشیب میں چلا گیا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر دراز قد شخص کے ساتھی عادل پر پل پڑے۔ ایک نے اس کے سر پر لاٹھی کی ضرب لگانا چاہی۔ عادل نے جھک کر خود کو اس کاری وار سے بچایا اور ایک طوفانی گھونسے سے اس کا جبڑا ہلا دیا۔ دوسرے کے سینے پر عادل کی ٹانگ کی شدید ضرب لگی اور وہ برف پہ دور تک پھسل گیا لیکن اس سے ایک نقصان بھی ہوا، یہ شخص کرسٹل کے بالکل قریب گرا تھا۔ کرسٹل جو اب اٹھ کر ایک بار پھر بھاگنے کا سوچ رہی تھی، اس شخص کی پکڑ میں آگئی۔ اس نے پہلے کرسٹل کو ٹانگوں سے پکڑ کر گرایا، پھر اس کے اوپر چڑھ بیٹھا۔ وہ مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ اگلے پانچ دس سیکنڈ میں عادل نے اپنے دونوں حریفوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ گاؤں میں درختوں کے جھنڈ کے اندر وہ نوری نت کے تھپکے کے ساتھ جو اندھا دھند مار اماری کیا کرتا تھا، اس نے اسے لڑائی بھڑائی میں کافی تاک کردیا تھا۔

چند سیکنڈ کے لیے تو یہی محسوس ہوا کہ شاید وہ اپنے حریفوں پر غالب آنے میں کامیاب ہوجائے گا لیکن پھر اچانک بازی پلٹ گئی۔ نشیب میں لڑھک جانے والا دراز قد شخص، نشیب سے برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹے دستے کی کلہاڑی تھی۔ اس نے کلہاڑی کی زوردار ضرب عادل کے سر کے پچھلے حصے پر لگائی۔ یہ الٹی کلہاڑی کی ضرب تھی۔ اس نے عادل کے سر پر زخم تو نہیں لگایا مگر چوٹ اتنی سخت تھی کہ عادل کی آنکھوں کے سامنے ان گنت رنگ برنگے ستارے ناچ گئے۔ اس کے ذہن میں آخری احساس

یہ تھا کہ وہ اور کرسٹل ایک بڑی مصیبت میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ اس کے سر کے پیچھے ایک شدید ضرب لگی ہے اور وہ منہ کے بل سخت برف پر گر رہا ہے۔

☆☆☆

عادل کے حواس دوبارہ بحال ہوئے تو اس نے خود کو کسی نرم اور نیم گرم جگہ پر پایا۔ سب سے پہلے اس کی نظر ایک لالٹین پر پڑی جو چھت سے جھول رہی تھی۔ یہ مخروطی چھت یقیناً کسی خیمے کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے کانوں میں باتوں کی مدھم آواز آئی اور نتھنوں نے بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو محسوس کی۔ ایک دم اسے یاد آیا کہ اس کے سر پر کسی وزنی شے کی ضرب لگی تھی اور جس وقت وہ منہ کے بل گر رہا تھا، کرسٹل چلا رہی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس طرح بیٹھنے سے اس کے سر کے پچھلے حصے میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھیں۔ اس نے دیکھا، وہ ایک جدید لیکن خستہ حال خیمے میں ہے۔ خیمے میں تین افراد موجود تھے اور ان میں وہ دراز قد شخص بھی شامل تھا جس کے سینے پر ٹکر مار کر عادل نے نشیب میں گرایا تھا۔ اس کی ایک کنپٹی اور کہنی پر چوٹیں آئی تھیں جہاں پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ کرخت نقوش والا ایک تیس پینتیس سالہ شخص تھا اور کینہ توز نظروں سے عادل کو گھور رہا تھا۔ عادل کو پاؤندوں کے لباس اور حلیے کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا تھا، ان کے مطابق یہ شخص یقیناً پاؤندہ ہی تھا۔ اس کے ساتھیوں کا حلیہ بھی یہی تھا۔

ایک چپٹی ناک والا شخص جس کی کمر سے چھوٹے دستے والی کلہاڑی بندھی ہوئی تھی، عادل کو شاید تھپڑ رسید کرنے کے لیے اس کی طرف جھپٹا لیکن دراز قد شخص نے اسے ہاتھ سے روک دیا۔ ”نہیں...... داخون...... ابھی نہیں۔“ وہ بھاری آواز میں بولا۔

تب عادل کو اچانک احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ پشت پر کسی کپڑے وغیرہ سے بندھے ہوئے ہیں۔ بندش بہت مضبوط تھی۔ ہاتھ سن ہو رہے تھے۔ وہ ٹھیک سے اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا کہ کتنی دیر بے ہوش رہا ہے۔ لگتا تھا کہ زیادہ ٹائم نہیں گزرا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ تب اس کو اندازہ ہوا کہ خیمے میں اس کی طرح ایک اور قیدی بھی موجود ہے۔ یہ بھی کوئی پاؤندہ ہی تھا۔ دوسروں کی طرح اس کے جسم پر بھی بھاری گرم لباس تھا۔ سر پر اونی ٹوپی تھی جس نے آنکھوں اور ناک کے سوا اس کے چہرے کو بھی ڈھانپا ہوا تھا۔ اس شخص کی عمر پچیس سال کے قریب ہوگی۔ اس کی ناک سے خون رس رہا تھا اور اونی صدری بھی کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ عادل کی طرح اس کے ہاتھ بھی پشت پر بندھے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے پاؤں کو بھی رسی سے باندھا گیا تھا۔ وہ ایک گٹھری کی طرح خیمے کے ایک کونے میں پڑا تھا۔ کرسٹل اس خیمے میں کہیں نہیں تھی۔

”وہ کہاں ہے؟“ عادل دراز قد شخص سے مخاطب ہو کر پھنکارا۔

”یہیں ہے وہ فرنگن اور بڑے آرام سے ہے۔“ دراز قد نے زہر خند لہجے میں کہا۔

عادل کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ گرج کر بولا۔ ”اسے کہاں رکھا ہے تم نے؟ اسے یہاں لاؤ۔ اگر اسے کچھ ہوا تو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا تمہیں۔“

”لگتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ گرمی ہے تمہارے اندر۔ ام تمہارا یہ گرمی بڑی اچھی طرح ٹھنڈا کرے گا، ایک دم چشمے کے پانی کے ماتق ہو جاؤ گے۔“

ایک غیرت مند جوان کی ساری تپش عادل کے اندر بیدار ہو چکی تھی۔ وہ چنگھاڑا۔ ”میں پوچھتا ہوں کہاں ہے وہ؟“ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی۔

چپٹی ناک والے داخون نے اسے دھکا دے کر پھر پشت کے بل گرا دیا۔ شاید وہ عادل پر چڑھ ہی دوڑتا لیکن دراز قد والے نے ایک بار پھر ہاتھ کے دھکے سے اسے روکا۔ وہ چند لمحے تک عادل کو جلتی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ ”یہیں پر ہے تمہارا وہ ہمشیرہ۔ امارا بیوی اس کے پاس ہے۔ جب تک تم ٹھیک رہو گے اس کو کچھ نہیں ہوگا۔“ اس نے خیمے کی زپ کھینچ کر خیمے کا در کھولا...... پھر اس کی جالی ہٹائی۔ یخ بستہ ہوا کا جھونکا اندر آیا۔

عادل نے دیکھا، خیمے سے آٹھ دس قدم کے فاصلے پر ایک دوسرا خیمہ لگا تھا۔ یہ بھی جدید لیکن پرانا خیمہ تھا۔ اس کو تین چار جگہ سے مرمت کیا گیا تھا۔ عادل نے سوچا شاید ان پاؤندوں نے یہ خیمے، چوٹی کی طرف جانے والے کوہ پیماؤں سے چھینے ہوں گے۔ بعد ازاں اس کا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ اس خیمے کے عین سامنے برف پر پتھروں سے ایک کیاری سی بنائی گئی تھی۔ اس کیاری میں الاؤ روشن تھا۔ الاؤ کے قریب کرسٹل سر جھکائے بیٹھی تھی۔ شعلے اس کے سرخ و سپید چہرے پر اپنا عکس ڈال رہے تھے۔ کرسٹل کے قریب ہی ایک اور عورت بیٹھی آگ تاپ رہی تھی۔ یہ درمیانی عمر کی مقامی عورت تھی۔ یقیناً یہی دراز قد شخص کی بیوی تھی۔

اگلے پانچ دس منٹ میں خیمے کے اندر عادل اور دیگر

افراد میں جو گفتگو ہوئی، اس سے پتا چلا کہ دراز قد شخص کا نام رابے خاں ہے۔ رابے خاں اور اس کے ساتھی اپنے کسی دشمن کا پیچھا کرتے ہوئے اس علاقے میں پہنچے ہیں...... اور یہ دشمن وہی تھا جو بندھا ہوا خیمے کے ایک کونے میں پڑا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، اس کا ایک ساتھی بھی تھا جو ابھی تک مفرور تھا۔ اب یہ اتفاق کی بات تھی کہ رابے خاں اور اس کے ساتھیوں کی نظر عادل اور کرسٹل پر پڑ گئی اور انہوں نے انہیں دھر لیا۔

رابے خاں نے عادل کو قہرناک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا باقی ساتھی کدھر ہے؟“

”ہم دونوں ہی ہیں۔“

”یہ بکواس تم نے پہلے بھی کیا ہے لیکن یہ ماننے والا بکواس نہیں ہے۔ سچ بتاؤ گے تو تمہارا خانہ خراب نہیں ہوگا۔ ورنہ ڈھونڈ تو ام نے ان کو ویسے بھی لینا ہے۔“

”ہم لوگ گروپ کی شکل میں آئے تھے لیکن باقی لوگ کافی پیچھے ہی ہمت ہار گئے تھے۔ شگر کے آس پاس کہیں رک گئے تھے۔ ہم دونوں ہی یہاں تک آئے۔“ عادل نے جواب تراشا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی غلطی کا خمیازہ سرمد اور ہمایوں وغیرہ کو بھی بھگتنا پڑے۔

”تمہارا کیمپ کدھر ہے؟“ چپٹی ناک والے داخون نے نفرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”کیمپ نہیں ہے، کیمپ تو تب ہوتا جب ہم نے یہاں کسی چوٹی پر چڑھنا ہوتا۔ ہم تو بس یونہی گھومتے گھومتے آگے نکل آئے اور پھر راستہ بھول گئے۔ ہمارا باقی سامان جنگلوٹ میں ایک مقامی پورٹر کے ڈیرے پر پڑا ہے۔“

”اور تم کیا سمجھتا ہے؟ ام تمہاری اس ہزار داستان پر یقین کرے گا...... اور تمہارا ماتھا چوم کر تمہیں چھوڑ دے گا۔ کیا ام تم کو ایسا ہی گدھا نظر آتا ہے۔ ام تمہارے سامنے تمہاری اس فرنگن سہیلی کا چمڑی ادھیڑ دے گا اور ساتھ میں تمہارا بھی۔“

”تم غیر قانونی کام کرو گے اور اس کے نتیجے میں بچ نہیں سکو گے۔ اس لڑکی کی تلاش بڑے زور شور سے شروع ہو جائے گی۔ تم لوگ تو...... پھنسو گے ہی، تمہارے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ پھنسیں گے۔“

دراز قد شخص نے ایک ہاتھ گھما کر عادل کے چہرے پر مارا۔ اس زوردار گھونسے نے عادل کا سر گھما کر رکھ دیا اور اس کے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھل گیا۔ وہ پہلو کے بل گر گیا تھا...... دراز قد رابے خاں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”ام کو دھمکاتا ہے۔ قانون سے ڈراتا ہے۔ تم بہت دور نکل آیا ہے بچے! یہاں ام خود ہی قانون ہے۔ یہاں وہی ہوتا ہے جو ام چاہتا ہے۔ تمہارے جیسے دس لوگوں کو یہیں پر خلاص کر کے برف میں گاڑ دے تو کوئی ام کو پوچھنے والا نہیں۔ اور اگر تم نے کوئی اڑی مڑی کیا تو ام یہی کرے گا۔“

”لیکن کیوں؟ کیا جرم کیا ہے ہم نے؟“

”تمہارا جرم بہت بڑا ہے اور تم اسے اچھی طرح جانتا بھی ہے۔ تم چوری چھپے بانگری کی چوٹی کی طرف جانا چاہتا ہے۔ تم کو مالوم ہوگا کہ سامنے والے راستے سے تم کو چڑھنے نہیں دیا جائے گا۔ اس لیے تم پیچھے کی طرف آیا ہے۔ ام سب جانتا ہے۔ ام گدھے کا بچہ نہیں ہے۔“

ایک دم چلانے کی آواز سنائی دی۔ یہ کرسٹل ہی تھی۔ عادل نے چونک کر خیمے سے باہر دیکھا۔ پاؤندہ عورت نے غالباً غصے میں کرسٹل کے بال نوچے تھے۔ وہ اسے کچھ کھانے کے لیے کہہ رہی تھی مگر وہ انکار کر رہی تھی۔ وہ مسلسل انگلش بول رہی تھی۔ ایک طرح سے اس نے اچھا ہی کیا تھا۔ اس نے ان لوگوں پر یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ انگلش کے علاوہ کچھ نہیں جانتی۔

داخون نے عادل کا جبڑا اپنے ہاتھ میں دبوچا اور پھنکارا۔ ”دیکھ بیٹا! ام نے تمہارے ساتھیوں کو ڈھونڈ تو ویسے بھی لینا ہے، بس تھوڑا سا ٹائم لگے گا ام کو...... لیکن اگر تم خود بتا دے گا تو ام بھی تم سے تھوڑا نرمی کرے گا، ورنہ......“

”ورنہ تیری اس فرنگن کا مزہ تو ام ابھی چکھ لے گا تیرے سامنے۔“ رابے خاں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ وہ ان لمحوں میں بالکل بے رحم نظر آنے لگا تھا۔

یہ بات تو اب عادل کی سمجھ میں آ رہی تھی کہ وہ ان لوگوں کو سرمد اور ہمایوں سے زیادہ دیر تک دور نہیں رکھ سکتا۔ اب دوسرا راستہ یہی تھا کہ وہ ان سے ایک دو یقین دہانیاں لے کر انہیں کیمپ تک لے جائے۔ عین ممکن تھا کہ سرمد اس صورتِ حال سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ وہ کسی طرح کوئی راستہ نکال لیں۔

اب عادل کے ذہن میں رہ رہ کر پچھلے دو دن کی صورتِ حال بھی آ رہی تھی۔ اس نے سرمد صاحب کو کچھ پریشان اور الجھا ہوا پایا تھا۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ کیمپ کے آس پاس ہی رہا جائے، زیادہ دور نہ جایا جائے۔ شاید ان کی چھٹی حس جو بہت تیز بھی تھی، انہیں خطرے سے خبردار کر رہی تھی اور یہ خطرہ اب ٹھوس حقیقت کی صورت میں ان کے سامنے تھا۔ وہ پاؤندوں کے ہتھے چڑھ چکے تھے۔

اچانک کرسٹل ایک بار پھر چلّائی۔ عادل نے روزن میں سے دیکھا۔ چپٹی ناک والا داخون کرسٹل کو کھینچتا ہوا خیمے کی طرف لا رہا تھا۔ کرسٹل نے جیسے مدد کے لیے رابے خاں کی بیوی کو پکارا۔ اس نے کرسٹل کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ کرسٹل نے داخون کے پیٹ میں لات رسید کی اور زور لگا کر خود کو چھڑانا چاہا۔ عقب سے ایک دوسرا شخص آیا۔ اس نے کرسٹل کو عقب سے دبوچا اور اٹھا کر برف پر پٹخ دیا۔ کھینچا تانی میں کرسٹل کی شرٹ کا گریبان پھٹ گیا تھا اور وہ نیم عریاں ہونے لگی تھی۔ داخون وحشی انداز میں اس پر جھپٹا۔ اندر خیمے میں دراز قد رابے نے اپنی موٹی صدری کے نیچے سے پستول نکال لیا تھا اور عادل کے بال مٹھی میں جکڑ لیے تھے۔ کرسٹل کی وہی حالت ہونے والی تھی جو عقاب کے پنجوں میں چڑیا کی ہوتی ہے۔ عادل زور سے چلّایا۔ ''رک جاؤ...... رک جاؤ۔ میں بتاتا ہوں۔''

رابے خاں نے ہاتھ کے اشارے سے داخون کو روک دیا۔ دونوں افراد نے نیم عریاں کرسٹل کو پکڑا اور کھینچتے ہوئے خیمے میں لے آئے۔ کرسٹل کی نیکر برف سے لتھڑی ہوئی تھی اور گرنے سے ایک گھٹنے پر تازہ خراشیں آئی تھیں۔ کھینچا تانی میں اس کا ایک جوگر بھی اتر گیا تھا جو ایک پاؤندے نے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ عادل کو دیکھ کر کرسٹل کو ذرا حوصلہ ہوا۔ وہ اشک بار لہجے میں بولی۔ ''عاڈل! توم......'' لیکن پھر ٹھٹک کر چپ ہو گئی۔ وہ یہاں اردو بولنے کی غلطی نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے انگریزی میں ہی ایک دو فقرے بولے۔ جو مفہوم عادل کی سمجھ میں آیا، وہ یہی تھا کہ یہ بہت برے لوگ ہیں۔ ان کو سرسرمد کے بارے میں بتا دینا چاہیے۔ شاید وہ ان سے کوئی ڈیل کر سکیں۔

وہ رات جیسے تیسے گزر گئی۔ داخون نے تھوڑی دیر کے لیے عادل کے ہاتھ کھول دیے اور اسے کھانا کھلایا۔ یہ گوشت اور چاول پر مشتمل تھا۔ ساتھ میں الائچی والا قہوہ تھا۔ عادل کے کہنے پر کرسٹل نے بھی چاولوں کے دو چار لقمے لیے۔ رابے کی بیوی کا نام سونہ معلوم ہوا۔ اس نے خیمے میں آ کر کرسٹل کے گھٹنے اور کہنیوں کی تھوڑی سی مرہم پٹی کی۔ یہ مرہم پٹی اسی سامان سے کی گئی جو کرسٹل کے ''بیک پیک'' سے برآمد ہوا تھا۔ سرخ ریگزین کے اس ''بیک پیک'' میں کچھ دیگر سامان بھی موجود تھا۔ عادل کو اس نقشے کا خیال آیا جو کرسٹل اپنی نیکر کی پچھلی پاکٹ میں اڑسے پھرتی تھی۔ اس نقشے میں کیمپ کی جگہ کی نشاندہی بڑی وضاحت سے کی گئی تھی۔ اگر وہ نقشہ ان پاؤندوں کے ہاتھ لگتا تو انہیں کیمپ کے بارے میں ان دونوں سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ یقیناً وہ پاؤندوں کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ شاید کرسٹل نے اسے کہیں چھپا دیا تھا۔ جیسا کہ عادل کو بعد میں معلوم ہوا جب وہ یہاں سے قریباً ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر پکڑے گئے تھے تو کرسٹل نے ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ نقشہ پاکٹ سے نکال کر اندھیرے میں پھینک دیا تھا۔

رات گزر گئی۔ ابھی اجالا پوری طرح پھیلا نہیں تھا کہ رابے خاں اور اس کے دو ساتھی عادل اور کرسٹل کو لے کر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ رابے خاں کے تیسرے ساتھی اور رابے کی بیوی کو اس بندے کے پاس ہی رہنا تھا جسے باندھ کر خیمے کے گوشے میں ڈالا گیا تھا۔ وہ لوگ پیدل روانہ ہوئے۔ عادل کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ہاں کرسٹل کو باندھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ داخون کے پاس چھوٹی نال کی بھری ہوئی رائفل موجود تھی۔ یہ آٹومیٹک رائفل اس نے کندھے سے لٹکا رکھی تھی تاہم اپنا ہاتھ ٹریگر کے آس پاس ہی رکھا ہوا تھا۔

قریباً آدھ پون گھنٹے بعد وہ اس ہزاروں ٹن برف کے پاس سے گزرے جو کل سہ پہر ایوالانچ نے بلندیوں سے لا کر دامن میں بکھیری تھی۔ اس برف کی وجہ سے عادل اور کرسٹل کا راستہ بند ہوا تھا اور انہیں کیمپ کی مخالف سمت میں سفر کرنا پڑا تھا۔ عادل کا دل اب بے طرح دھڑک رہا تھا۔ کیمپ پر جا کر نہ جانے کیا صورتِ حال پیش آنا تھی۔ وہاں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ پاؤندوں کے پاس اسلحہ موجود تھا اور جہاں تک عادل کا اندازہ تھا، ہمایوں کے سامان میں بھی ایک لائسنس یافتہ پستول موجود تھا۔ یہ پستول یقیناً ذاتی دفاع کے لیے ہی تھا۔ اگر وہاں کوئی خطرناک سچویشن پیدا ہوتی تو سب سے زیادہ رسک کرسٹل اور خود عادل کے لیے ہی تھا۔

کیمپ سے قریباً ایک کلومیٹر پہلے ہی ان کو سرسرمد اور ہمایوں کی جھلک نظر آ گئی۔ جونہی رابے اور عادل ایک تنگ گھاٹی کے سرے سے باہر نکلے، دور نیچے نشیب میں سرسرمد اور ہمایوں کے ہیولے نظر آئے۔ یقیناً وہ ان دونوں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ وہ چونکہ نشیب میں تھے اس لیے رابے خاں اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ رابے خاں کے ساتھی نے رائفل اب کندھے سے اتار کر اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس کا سیفٹی کیچ ہٹا لیا۔ برف پوش چٹانوں کے درمیان بڑی احتیاط سے آگے بڑھتے وہ لوگ سرسرمد اور ہمایوں کے کافی قریب پہنچ گئے۔ عادل نے رابے کے

پوچھنے پر اسے بتایا تھا کہ اس کے دونوں ساتھیوں کے پاس آتشیں اسلحہ نہیں ہے پھر بھی رابے ''ایزی'' ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے عادل کو مجبور کیا کہ وہ اوٹ سے نکل کر بلندی پر کھڑا ہو اور اپنے ساتھیوں کو آواز دے۔ عادل کے لیے یہ بڑا مشکل اور دل گرفتہ کر دینے والا مرحلہ تھا۔ رابے نے مزید تاکید کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی چالاکی مالاکی نہ دکھانا ورنہ ام گولی چلانے میں دیر نہیں کرے گا۔''

عادل نشیب سے نکل کر بلندی پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے آواز دینے سے پہلے ہی سرمد صاحب نے اسے دیکھ لیا۔ سرمد صاحب اور ہمایوں دونوں بُری طرح چونک گئے۔

شاید انہیں ٹھیک سے نظر نہیں آرہا تھا۔ ''کون ہے؟'' انہوں نے تصدیق کے لیے بلند آواز میں پوچھا۔

''میں ہوں سر...... عادل۔'' عادل نے بھی پکار کر جواب دیا۔

وہ دونوں تقریباً دوڑنے والے انداز میں عادل کی طرف آئے۔ یکا یک سرمد صاحب رک گئے۔ شاید انہیں کسی گڑبڑ کا احساس ہوا تھا لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ وہ دونوں داخون کی رائفل کی رینج میں تھے۔ رابے خان اور اس کے ساتھی ایک ساتھ نشیب سے نکلے اور سامنے آ گئے۔

''خبردار! کوئی حرکت کیا تو ام گولی چلا دے گا۔'' داخون نے گرج کر کہا۔

سرمد صاحب اور ہمایوں ہکا بکا کھڑے تھے۔ ان کی ساری خوشی چند سیکنڈوں کے اندر شدید پریشانی میں ڈھل گئی تھی۔ عادل کے سینے میں مایوسی کی لہر دوڑ رہی تھی۔

پاؤندوں نے انہیں گھیرے میں لے لیا اور انہیں ہاتھ کھڑے کرنے کے لیے کہا۔ بڑی احتیاط سے ان کی تلاشی لی گئی۔ سرمد صاحب کے لباس میں سے ایک واکی ٹاکی کے علاوہ ایک نقشہ اور چند سو روپے کی کرنسی نکلی۔ ایک واکی ٹاکی ہمایوں کے لباس میں سے بھی نکلا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک کولٹ پستول بھی برآمد ہوا۔ پستول کی برآمدگی کے بعد رابے خان نے کھا جانے والی نظروں سے عادل کو گھورا۔

عادل ہی کی طرح سرمد صاحب اور ہمایوں کے ہاتھ بھی پشت پر باندھ دیے گئے۔ اس کام کے لیے نائلون کی رسیاں پہلے سے ان لوگوں کے پاس موجود تھیں۔ وہ لوگ انہیں چلا کر کیمپ میں لے آئے۔ عادل نے دیکھا، سرمد صاحب کا چہرہ یوں تو پُرسکون تھا لیکن آنکھوں میں گہری پریشانی منجمد تھی۔ عادل خود کو بہت خجل محسوس کر رہا تھا۔ درحقیقت یہ جو کچھ بھی ہوا، اسی کی وجہ سے ہوا تھا۔

اگلے دس پندرہ منٹ بڑے تکلیف دہ تھے۔ ان لوگوں نے کرسٹل اور سرمد صاحب سمیت ان چاروں کو ایک طرف زمین پر بٹھا دیا۔ داخون رائفل بدست ان کے سر پر کھڑا ہو گیا۔ باقی افراد ندیدوں کی طرح ان کے کیمپ میں گھس گئے۔ جس کے ہاتھ جو آیا اس نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کھانے پینے والی چیزوں پر بھی ہاتھ صاف کر رہے تھے۔ کھاتے جا رہے تھے اور ساتھ ساتھ تھیلوں میں بھی ٹھونس رہے تھے۔ ٹن فوڈ اور چاکلیٹس ان کے لیے زیادہ کشش کی چیز تھے۔ تیسری اہم چیز کرنسی تھی۔ پھر رابے خان کے ہاتھ میں ایک نقشہ آ گیا۔ وہ دھیان سے اسے دیکھنے لگا۔ اس نقشے پر ہمایوں نے مختلف نشانات لگا رکھے تھے۔ ان نشانات سے یہ واضح ہوتا تھا کہ وہ کس راستے سے کس چوٹی پر جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یعنی وہی ''بانگری'' نامی چوٹی۔

رابے خان نے نقشہ عادل کی آنکھوں کے سامنے لہرایا اور زہرخند لہجے میں بولا۔ ''کیا تم اب بھی یہی کہے گا کہ صرف سیر سپاٹے کے لیے یہاں گھوم رہا تھا؟''

عادل بولا۔ ''یہ نقشہ ویسے ہی ہمارے سامان میں پڑا ہے۔ ہم اس طرف جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔''

''چور اپنی چوری کبھی نہیں مانتا۔ تم بھی نہیں مانے گا لیکن ام کو اس سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں۔ امارے لیے خوشی کا بات ہے کہ تمہارے ساتھ امارا ملاقات ہو گیا۔''

''یہ کیسی خوشی کی بات ہے کہ اس کے لیے تمہیں ہم پر رائفل تاننے کی ضرورت پڑی ہوئی ہے۔'' سرمد صاحب نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا۔

رابے خان نے داخون کو ہاتھ کا اشارہ کیا اور بولا۔ ''رائفل نیچے کر لو۔ یہ ٹھیک کہہ رہا ہے، یہ امارا مہمان ہے...... بلکہ پکا مہمان ہے۔''

رابے خان نے ''پکا مہمان'' عجیب سے انداز میں کہا تھا۔ عادل چونک گیا اور اس نے ہمایوں کو بھی چونکا ہوا محسوس کیا۔ داخون نے رعونیہ انداز میں مسکراتے ہوئے رائفل نیچے کر لی۔ اس سے کوئی ایسا فرق بھی پڑنے والا نہیں تھا۔ ان کے ہاتھ تو بندھے ہوئے تھے۔

اب یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ یہ لوگ ان کو پکڑ کر پہاڑ کی دوسری طرف اپنی پاؤندہ بستی میں لے جانا چاہتے ہیں۔ یقیناً ان لوگوں کی ہمتیں اب بہت بڑھ چکی تھیں۔ پہلے وہ چوٹی کی طرف جانے والوں کو صرف روکتے

ہوں گے، اب پکڑنے کی ہمت بھی رکھتے تھے۔ کرسٹل نے دبے لفظوں اور دھیمی آواز میں سرمد صاحب کو بتا دیا تھا کہ کس طرح کل سہ پہر وہ جاگنگ کرتے ہوئے ذرا آگے نکل گئے اور کیسے ایوالانچ کی وجہ سے انہیں راستہ بدلنا پڑا جس کا نتیجہ پاؤندوں سے مڈبھیڑ کی صورت میں نکل آیا۔

سرمد صاحب جس طرح جسمانی تکلیف برداشت کرنے کا بے پناہ حوصلہ رکھتے تھے، اسی طرح غالباً ذہنی دباؤ اور پریشانی کو بھی جھیل لیتے تھے۔ ان کا چہرہ بہ دستور پُرسکون رہا۔ ہاں، آنکھوں میں اب بھی تفکر کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ وہ جیسے تیزی سے کچھ سوچ رہے تھے۔

انہوں نے بلند آواز میں رابے خان کو مخاطب کیا اور بولے۔ ''میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''یہاں کوئی پردہ نہیں ہے برادر! تم سب کے سامنے اپنی الف لیلہ کہہ سکتا ہے۔'' وہ سخت تمسخر کے لہجے میں بولا۔

''میرے خیال میں اکیلے میں بات کرنا زیادہ اچھا رہے گا۔''

ساڑھے چھ فٹ قد کا رابے خان کچھ دیر گہری نظروں سے سرمد صاحب کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے بھاڑ جیسے منہ میں خشک گوشت کا نوالہ تھا۔ نوالے کو اپنے منہ میں گھماتے ہوئے بولا۔ ''اچھا اگر ایسا ہے تو کرلو اکیلے میں بات۔ آجاؤ۔''

سرمد صاحب کے ہاتھ بہ دستور پشت پر بندھے تھے۔ وہ اٹھ کر خیمے میں چلے گئے۔ رابے خان بھی ان کے ساتھ گیا۔ وہ وہاں قریباً ایک گھنٹا معروفِ گفتگو رہے۔ اس دوران میں ایک دو بار رابے خان باہر بھی آیا اور اس نے داخون سے سرگوشیوں میں کوئی مشورہ بھی کیا۔ پھر ایک بار انہوں نے خیمے کے اندر نقشہ بھی منگوایا۔ رابے خان کے تاثرات بھی اب کچھ بدلے ہوئے نظر آتے تھے۔ بہرحال داخون مسلسل ان کے سروں پر رائفل بدست موجود تھا۔ وہ گاہے بگاہے کرسٹل کو بھی حریص نظروں سے گھور لیتا تھا۔ کرسٹل بدستور رات والے لباس میں تھی۔ چمکیلی دھوپ میں اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور یوں لگتا تھا کہ ابھی رخساروں سے خون ٹپک پڑے گا۔ عادل کو اندازہ ہوا کہ خیمے کے اندر رابے خان نے سرمد صاحب کے ہاتھ کھول دیے ہیں اور وہ زیادہ بے تکلفی کے ماحول میں گفتگو کر رہے ہیں۔

دوپہر کوئی گیارہ بجے کے قریب رابے خان اور سرمد صاحب کی گفتگو اختتام کو پہنچی۔ عادل نے دیکھا کہ اس کے فوراً بعد رابے خان کہیں جانے کے لیے تیار نظر آنے لگا۔ اس کے باقی دونوں ساتھی جن میں سے ایک داخون تھا، وہیں پر رہے۔

عادل نے سرمد صاحب سے کہا۔ ''یہ رابے خان کہاں گیا ہے؟''

''اپنے کسی کام سے۔ ایک دو گھنٹے میں واپس آجائے گا۔''

عادل نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''سر! مجھے اس داخون کی طرف سے خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں کمینگی ہے۔ کہیں یہ...... کرسٹل کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے۔''

''نہیں، ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ رابے خان سے ساری بات ہو گئی ہے۔''

کرسٹل نے پوچھا۔ ''کیا یہ ہم کو جانے دیں گا؟''

کرسٹل کو بولتے دیکھ کر داخون بھڑک اٹھا۔ گرج کر بولا۔ ''او میم! اپنا آواز بند کرو۔ سب چپ ہو جاؤ۔ ورنہ امارا میٹر گھوم جائے گا۔''

وہ سب چپ ہو گئے۔

رابے خان کی واپسی کافی تاخیر سے ہوئی۔ وہ قریباً چار بجے واپس آیا۔ اس کے ساتھ اس کی جواں سال بیوی بھی تھی...... جس کا نام سونہ معلوم ہوا تھا۔ وہ اور رابے خان اپنے ساتھ دونوں خیمے بھی لے آئے تھے۔ یہ خیمے پیک ہونے کے بعد بالکل مختصر سے ہو جاتے تھے۔ عادل کو اندازہ ہوا کہ وہاں خیمے میں موجود بندھے ہوئے شخص کو بستی کی طرف روانہ کر دیا گیا ہے اور رابے بیوی کو لے کر یہاں آ گیا ہے۔

شام تک خیمے لگا دیے گئے۔ موسم اتنا اچھا نہیں تھا اس لیے کھانا کھانے کے فوراً بعد وہ لوگ خیموں میں چلے گئے۔ جانے سے پہلے رابے خان نے سرمد صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''یہ انگریز چھوکری امارے ساتھ رہے گا، امارا بیوی کے پاس۔ امارے پاس کوئی ضمانت تو ہونا چاہیے نا۔''

سرمد صاحب بولے۔ ''میرے خیال میں اس کی کوئی ضرورت نہیں لیکن اگر تم سمجھتے ہو کہ ضرورت ہے تو پھر ہم میں سے کوئی تمہارے خیمے میں چلا جاتا ہے۔''

تھوڑی سی گفت و شنید کے بعد ہمایوں ان کے ساتھ چلا گیا۔ خیمے میں اب سرمد صاحب، کرسٹل اور عادل رہ گئے۔ سرمد صاحب اور کرسٹل کے ہاتھ تو پہلے ہی کھلے ہوئے تھے، اب عادل کے بھی کھول دیے گئے۔ رابے خان نے اچھی طرح تسلی کر لی تھی کہ خیمے میں کوئی ایسی شے موجود نہیں

تھی جسے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔ اس ساری احتیاط کے باوجود ایک مسلح شخص خیمے سے باہر پہرے پر موجود تھا۔

وہ سب بہت تھکے ہوئے تھے۔ نو دس بجے کے قریب ہی سونے کے لیے لیٹ گئے۔ باہر برفانی ہوا کا زور تھا اور خیمے ہوا کے بہاؤ سے ہلتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ کرسٹل، عادل اور سرمد صاحب بہت دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مسلح پہرے دار خیمے کے بالکل قریب موجود ہے اور ان کی آواز سن سکتا ہے۔

سب سے پہلے تو عادل نے اپنی غلطی پر سرمد صاحب سے معافی مانگی، وہ بولا۔ ''سر! میں بہت زیادہ شرمندہ ہوں۔ میں نے سب کو مصیبت میں ڈالا ہے۔''

''جو ہونا ہوتا ہے، وہ ہو کر رہتا ہے عادل۔ تمہیں احساس ہوگیا، یہی بڑی بات ہے۔ اب ہمیں یہ سب بھول کر آگے کا سوچنا ہے۔''

''لیکن سر! میری وجہ سے سب پر اتنی بڑی مصیبت تو آئی نا۔''

''مصیبتیں اور مشکلات تو زندگی کا حصہ ہوتی ہیں بلکہ میرا تو خیال ہے کہ راحتوں اور خوشیوں کی طرح یہ بھی زندگی کا حسن ہیں۔ ان مشکلات کے اندر سے ہی تو خوشی کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ دکھ نہیں تو سکھ نہیں۔ بس اوپر والے سے دکھ جھیلنے کا حوصلہ مانگنا چاہیے۔ اور ایک بات یاد رکھو، کوئی مصیبت چھوٹی یا بڑی نہیں ہوتی، بس انسان کا حوصلہ چھوٹا یا بڑا ہوتا ہے۔ بڑا حوصلہ ہر مصیبت کو چھوٹا کر دیتا ہے اور چھوٹا، ہر مصیبت کو بڑا۔'' وہ فلسفیانہ انداز میں بولتے تھے اور ان کی بات دل پر اثر کرتی تھی۔

کرسٹل نے ایک ''رک سیک'' سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ مدھم آواز میں بولی۔ ''سر! آپ کچھ بتانا لائیک کریں گے۔ اس رابے خاں سے کیا ڈیل ہوا؟ یہ تو ہام سب کو ادھر اپنے ویلیج میں لے جانا مانگتا تھا۔''

''نہیں، اب اس نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔'' سرمد صاحب نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''اب یہ لوگ ہمارے ساتھ جائیں گے، دانگری چوٹی پر۔''

عادل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے سر آپ نے انہیں کھنڈر کے تہ خانے کے بارے میں اور زیورات کے بارے میں بتا دیا ہے؟''

''ہاں، کچھ کچھ...... اگر سارا بتا دیتے تو پھر تو ہم شاید کسی کام کے ہی نہ رہتے۔ وہ خود ہی چوٹی کا رخ کر لیتے۔''

''لیکن سر! بعد کی بھی کیا گارنٹی ہے...... اگر وہ زیورات مل جاتے ہیں تو پھر کیا ہوگا؟''

''ایسے معاملوں میں رسک تو پھر لینا ہی پڑتا ہے عادل...... بہرحال رابے خاں سے کچھ باتیں طے ہوئی ہیں اور ان کے مطابق وہ ہمیں تمام اشیا میں سے معقول حصہ دیں گے...... ہمارا سامان بھی واپس کریں گے اور ہمیں محفوظ علاقے تک چھوڑ کر بھی آئیں گے۔ اس کے بدلے میں انہیں اس خاص مقام تک پہنچاؤں گا جہاں زیورات اور برتن محفوظ کیے گئے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے سر آپ نے انہیں چوٹی کا تو بتایا ہے لیکن تہ خانے وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟''

''ہاں، ایسا ہی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ہم اب آسان راستے سے چوٹی کی طرف جائیں گے؟'' عادل نے دریافت کیا۔

''نہیں، راستہ تو یہی رہے گا۔ رابے خاں اور اس کے ساتھیوں نے یہ سارا معاملہ بس اپنے تک ہی رکھا ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ پاؤندہ بستی کے باقی لوگوں کو کچھ نہیں بتایا گیا؟''

''نہیں، ایک طرح سے رابے خاں نے اپنے لوگوں سے دغا کیا ہے لیکن ہمارے لیے تو یہ فائدہ مند ہی ہے۔ اگر ہمیں بستی میں پہنچا دیا جاتا تو کچھ بھی ہوسکتا تھا۔''

''کیا ایسا ہوسکتا ہے سر کہ ہم موقع دیکھ کر ان سے اسلحہ چھیننے کی کوشش کریں...... یہ چار لوگ ہیں اور چار ہی ہم ہیں۔''

''میرے خیال میں یہ خطرناک ہوگا۔ یہ لوگ لڑائی بھڑائی کے ماہر ہوتے ہیں اور بڑی حد تک خونخوار بھی ہیں۔ اس کے علاوہ میرا اندازہ ہے کہ یہ تعداد میں بھی چار نہیں رہیں گے۔ ابھی کچھ دیر میں یا صبح تک ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی شامل ہوجائیں گے۔ یہ نئے آنے والے بھی رابے خاں کے قریبی ساتھیوں میں سے ہیں...... قریبی بھی اور ہمراز بھی۔''

باہر سے داخون کی کرخت آواز ابھری۔ ''اوئے خدائی خوار! یہ تم نے کیا بھڑ بھڑ لگا رکھا ہے۔ یہاں تمہاری والدہ کا مہندی نہیں ہے۔ سو جاؤ چپ کر کے۔''

عادل کا خون کھول کر رہ گیا۔ اس کا جی چاہا ہر اندیشے کو بالائے طاق رکھ کر خیمے سے نکلے اور چپٹی ناک والے اس داخون کی ناک کو بالکل ہی برابر کر ڈالے۔ یہ بندہ اسے زہر لگنے لگا تھا۔ خاص طور سے اس نے جس طرح سب کے سامنے کرسٹل کے کپڑے پھاڑنے کی کوشش کی تھی، عادل کے دل میں گرہ سی بیٹھ گئی تھی۔

سرمد صاحب نے ان دونوں کو اشارہ کیا کہ وہ خاموش ہوجائیں اور لیٹ جائیں۔ سرمد صاحب نے خیمے کی چھت سے لٹکی ہوئی ''ٹینٹ لالٹین'' کی روشنی بہت دھیمی کردی۔ سرمد صاحب بائیں جانب لیٹے تھے، کرسٹل دائیں جانب۔ عادل ایسے لیٹا تھا کہ اس کا سر سرمد صاحب کے پاؤں کی طرف تھا اور پاؤں کرسٹل کی طرف۔

سرمد صاحب جلد ہی سو گئے مگر عادل جاگ رہا تھا۔ کرسٹل نے کروٹ بدلی اور اپنے ریشمی بالوں کو اس طرح جھٹکا کہ وہ عادل کے پاؤں پر پھیل گئے۔ شاید وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہی تھی۔ عادل نے اپنے پاؤں کچھ سمیٹ لیے اور انہیں کرسٹل کے سنہری مائل بالوں سے کچھ دور ہٹا لیا۔ کچھ دیر بعد کرسٹل نے اپنا ہاتھ اس کی پنڈلی پر رکھ دیا اور آہستہ آہستہ اس پر انگلی چلانے لگی۔ وہ اپنی دلچسپی اور لگاؤ کے واضح اشارے دے رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ نیم تاریکی میں ایک بھرپور انگڑائی لی پھر اپنی پاکٹ میں سے چیونگم نکال کر چبانے لگی۔ ''عادل! اگر تم کہے تو ہام تمہارا لوتھیں دبا سکتا ہیں۔'' وہ سرگوشی میں بولی۔

''لوتھیں؟ یہ کیا ہوتا ہے؟'' عادل سٹپٹایا۔

''Legs'' اس نے ٹانگوں کی طرف اشارہ کیا۔

وہ اپنی طرف سے لاتیں کہہ رہی تھی۔ ''نو تھینک یو۔'' عادل نے بُرا سا منہ بنا کر سرگوشی کی۔ ''ہم لوگ عورتوں سے خدمت نہیں کراتے۔''

''لیکن عادل! تم نے بھی تو ہام کے لیے اتنا کچھ کیا۔ ہام کی انسلٹ پر تم نے رابے خاں کے لوگوں پر اٹیک کیا۔ ان کو حیران کیا۔ یو آر اے بریو مین۔''

عادل نے کن انکھیوں سے سرمد صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ سو رہے تھے لیکن کسی بھی وقت جاگ سکتے تھے۔ عادل نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کرسٹل کے سامنے ہاتھ جوڑے اور سرگوشی کی۔ ''فار گاڈ سیک۔ مجھے معاف کردو۔ آئندہ میں ایسی حرکت نہیں کروں گا۔''

''آئی نو ویل، تم ضرور کریں گا۔ تم بہادر پاکستانی...... ہام کا فادر بتاتا تم نے 65ء کی وار میں انڈیا کو مارا۔ اس کا حلوا بنا دیا۔''

اس کی بات پر عادل نے سوچا اور اس کے بعد ہمارے سیاستدانوں نے ہمارا ''حلوا'' بنا دیا لیکن وہ یہ بات کرسٹل سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس نے تو بہ شکن نظروں سے عادل کو دیکھا۔ ''ہام بہت اچھا فزیوتھراپسٹ۔ تم کو جب بھی امارا ضرورت ہو ہام کو ضرور بتاؤ۔''

''ٹھیک ہے۔'' عادل نے کہا اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

پتا نہیں کیا بات تھی جب بھی کرسٹل کوئی ایسی ویسی بات کرتی تھی، عادل کے ذہن میں فوراً شہزادی کا خیال آجاتا تھا۔ شہزادی جیسے اپنے بازو پھیلا کر اس انگلش لڑکی اور عادل کے درمیان کھڑی ہوجاتی تھی اور وہ اکیلی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ لالی گاؤں کے سارے سنہرے کھیت آتے تھے، سارے جانے پہچانے درخت، ساری پگڈنڈیاں، پرندوں کی ساری چہکاریں، نیم گرم ہواؤں کی ساری مہکار۔ آج بھی عادل نے اپنی آنکھیں بند کیں تو وہ اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی...... مجھے بھول تو نہیں گئے عادل۔ میں دن رات تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ تمہاری کامیابیوں کے لیے دعائیں مانگ رہی ہوں۔ یاد رکھنا، میری نگاہیں آخری دم تک تمہارا راستہ دیکھیں گی...... اور اگر...... مجھے چودھری ناصر یا کسی اور کی ڈولی میں بیٹھنا پڑ گیا تو میں تمہارا نام لے کر موت کو گلے لگا لوں گی۔ وہ خیالوں میں بولا۔ ''نہیں شہزادی! ایسا نہیں ہوگا۔ میں اپنی جان پر کھیل کر بھی اپنا وعدہ نبھاؤں گا۔ اگر کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ تم کو پیسے میں تولا جائے، تو میں تمہیں پیسے میں تول کر اپنا بنا لوں گا۔ میں غریب ضرور ہوں لیکن تمہاری محبت نے میرے بازوؤں میں وہ توانائی بھر دی ہے جو پتھروں کا سینہ چیر کر ان میں سے دودھ کی نہر نکالتی ہے اور میں یہ کر کے دکھاؤں گا۔ بس تم ہمت نہ ہارنا۔ میرا انتظار کرنا...... ہاں میرا انتظار کرنا...... اور میری ماں کو بھی حوصلہ دینا۔'' لیٹے لیٹے جب کافی دیر تک عادل کو نیند نہیں آئی تو اس نے باہر کی آوازوں کی سن گن لینی شروع کردی۔ اس الاؤ کی لکڑیاں ابھی تک چٹخ رہی تھیں جس کے قریب داخون رائفل بدست بیٹھا ہوا تھا۔ دوسرے خیموں سے کوئی آواز برآمد نہیں ہو رہی تھی۔ یقیناً تھکے ماندے افراد سو گئے تھے۔ عادل کے اپنے خیمے میں بھی کرسٹل اور سرمد صاحب دونوں سوئے ہوئے تھے۔ عادل نے یونہی خیمے کی زپ تھوڑی سی نیچے گرائی۔ دو انچ کے خلا میں وہ داخون کو دیکھنے کے قابل ہوگیا۔ الاؤ کی روشنی میں اس کا بس ایک پہلو نظر آرہا تھا۔ وہ بڑے خیمے کے بالکل پہلو میں تھا اس لیے ہوا کی کاٹ سے بالکل محفوظ تھا۔ اس کے قریب ہی عادل کو وسکی کی کوارٹر بوتل نظر آئی۔ کوئی انگلش برانڈ تھا۔ غالباً یہ شراب بھی لوٹ مار کی ان اشیا میں سے تھی جو یہ لوگ کوہ پیما پارٹیوں کے ساتھ

کرتے رہتے تھے۔

عادل کے دل میں ایک عجیب سا خیال آیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ ابھی سرمد صاحب نے بتایا تھا کہ رابے خاں کے کچھ اور ساتھی بھی یہاں پہنچنے والے ہیں۔ وہ آج رات یا کل صبح کسی بھی وقت قدم رنجہ فرما سکتے تھے۔ اگر وہ پہنچ جاتے تو پھر عادل اور اس کے ساتھیوں نے مزید "بے دست و پا" ہوجانا تھا۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا تھا کہ ان کے پہنچنے سے پہلے پہلے وہ رابے خاں وغیرہ سے چھٹکارے کی ایک کوشش کریں؟ یہ بڑا مناسب موقع تھا اور اگر واقعی وہ کچھ کرنا چاہتے تھے تو پھر شاید اس سے بہتر چانس بعد میں نہیں مل سکتا تھا۔

داخون اس سے قریباً پچیس فٹ کے فاصلے پر موجود تھا۔ یقیناً اس نے زیادہ نہیں پی تھی لیکن جتنی بھی پی تھی، اس نے اسے تھوڑا سا غنودہ کر رکھا تھا۔ اگر عادل خیمے سے باہر رینگ جاتا اور تاریکی میں خاموشی سے آگے بڑھ کر اور آخری آٹھ دس قدم کا فاصلہ بھاگ کر طے کرتا ہوا داخون پر جا پڑتا تو اسے رائفل چھیننے میں ایک سیکنڈ بھی نہ لگتا۔ داخون کی ٹانگ وغیرہ پر گولی مار کر وہ اس خیمے کی طرف لپک سکتا تھا جہاں رابے اور اس کی بیوی وغیرہ موجود تھے۔ ان کے اٹھنے سے پہلے ان پر رائفل تان کر بے بس کرنا زیادہ مشکل ثابت نہ ہوتا۔ یقیناً انہیں جاگتے جاگتے بھی آٹھ دس سیکنڈ تو لگ ہی جانا تھے۔

عادل نے سارا حساب کتاب لگایا اور اس کے جسم میں میٹھا میٹھا جوش لہر لینے لگا۔ وہ حالات سے گھبرانے والا نہیں تھا اور اس داخون کے لیے تو وہ خاص طور سے نفرت محسوس کر رہا تھا۔

عادل جانتا تھا کہ اگر اس نے سرمد صاحب سے اس کارروائی کی اجازت لینے کی کوشش کی تو وہ ہرگز نہیں دیں گے۔ اگر اسے کچھ کرنا تھا تو اپنے طور پر ہی کرنا تھا لیکن اگر خدانخواستہ وہ کسی وجہ سے ناکام ہوجاتا تو پھر؟ ایسی صورت میں مصیبت تو سب پر ہی آئی تھی اور یہ پہلی مصیبت نہ ہوتی بلکہ دوسری ہوتی۔ اس سے پہلے بھی جو صورتِ حال تھی، وہ عادل کی ہی تو پیدا کی ہوئی تھی۔

اس نے ایک بار پھر سارا حساب کتاب جوڑا۔ تاریکی کو دیکھا۔ فاصلے کو بھانپا، اپنے اندر کی توانائی کو جانچا اور اس کے دل نے گواہی دی کہ وہ یہ کرسکتا ہے..... رسک تو بے شک تھا لیکن ابھی کچھ دیر پہلے سرمد صاحب نے خود ہی تو کہا تھا کہ رسک کبھی کبھی لینا پڑتا ہے اور یہی رسک کامیابی کا دروازہ بنتا ہے۔

قریباً پانچ منٹ بعد عادل نے آہستہ سے خیمے کی ڈبل زِپ کھولی اور پھر باہر کی یخ بستہ سردی میں رینگ گیا۔ اس کا دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اپنی ذمے داری پر ایک بہت بڑا کام کرنے جارہا ہے۔ وہ برفیلی زمین پر اوندھا لیٹا دھیرے دھیرے آگے کھسکنے لگا۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتا گیا، اس کا حوصلہ بھی بڑھتا گیا۔ داخون اسی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ شعلے اس کے تمتمائے چہرے پر منعکس ہورہے تھے۔ گوشت کی بچی ہوئی ہڈیاں اس کے آس پاس پڑی تھیں۔ بالآخر عادل اس فاصلے تک پہنچ گیا جہاں سے وہ بھاگ کر داخون پر حملہ آور ہوسکتا تھا۔ ان لمحوں میں وہ اسے "نوری نت" ہی لگا اور اس نے اپنے اندر وہی توانائی محسوس کی جو نوری نت جیسے لوگوں کو زیر کرنے کے لیے درکار ہوتی ہے..... وہ اٹھا اور کسی شکاری جانور کی طرح داخون پر جا پڑا۔ اس نے سب سے پہلے داخون کی رائفل پر ہی گرفت بنائی۔

داخون اس کے نیچے تھا۔ "اوئے خنزیر کی اولاد!" داخون پھنکارا اور عادل کو ٹانگوں سے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی۔

عادل نے دو تباہ کن ٹکریں داخون کے چہرے پر لگائیں اور ایک جھٹکا دے کر رائفل اس کے ہاتھ سے نکال لی۔ رائفل نوّے فیصد تک اس کے ہاتھ سے نکل گئی لیکن دستے پر داخون کی تھوڑی سی گرفت موجود رہی۔ اس سے پہلے کہ عادل دوسرا جھٹکا دے کر رائفل آزاد کرا لیتا، داخون کا ڈار چل گیا۔ اس نے عادل کی ٹانگوں کے درمیان اپنے بوٹ کی ضرب لگائی اور تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ عادل سراپا قہر بن گیا تھا۔ اس نے گھٹنے کی ایک شدید ضرب داخون کی ناف میں رسید کی اور پھر ایک برق پاش گھونسے سے اسے پیچھے الٹا دیا۔

اب رائفل اس کے ہاتھ سے نکل جانی چاہیے تھی لیکن اس منحوس نے پھر بھی کسی نہ کسی طرح رائفل پر گرفت بنائے رکھی۔ عادل نے اسے دیوانہ وار جھٹکے دیے اور اسے رائفل سمیت گھسیٹتا ہوا کئی قدم آگے لے گیا۔ شدید ترین ضربیں کھانے کے باوجود وہ بدبخت جیسے رائفل سے چپک کر رہ گیا تھا۔ عادل کو اس کی امید ہرگز نہیں تھی۔ ساری ٹائمنگ خراب ہوچکی تھی۔ عادل نے دیکھا رابے خاں کے خیمے میں ہلچل ہوئی۔ پھر دیوہیکل رابے خاں کسی بگولے کی طرح باہر آیا۔

"کون ہے..... خبردار۔" وہ چنگھاڑا۔

عادل والے خیمے سے بھی کوئی باہر نکل آیا تھا۔ عادل

کو پہچاننے کے بعد رابے خاں نے بے دریغ اس پر پسٹل کا فائر کیا۔ گولی عادل کے سر پر سے گزرتی ہوئی عقب میں سرمد صاحب کو لگی۔ وہ لڑکھڑا کر پہلو کے بل گرے۔ اس کے ساتھ ہی کرسٹل کے چلانے کی دل دوز آواز آئی۔ رابے دوسری گولی چلاتا تو وہ یقیناً عادل کو لگتی لیکن اس نے دوسرا فائر نہیں کیا اور ویسے ہی عادل پر جھپٹا۔ اس کے ایک ساتھی نے دائیں سے عادل پر حملہ کیا۔ عادل نے اس کے سینے پر ٹانگ رسید کرکے اسے دور پھینک دیا۔ تاہم اسی دوران میں رابے خاں نے پستول کا آہنی دستہ گھما کر عادل کے سر کے پچھلے حصے پر مارا۔ یہ چوٹ تقریباً وہیں لگی تھی جہاں کل شام الٹی کلابازی کی چوٹ آئی تھی۔ عادل گھٹنوں کے بل گرا، داخون کی رائفل پر عادل کی گرفت اب بھی موجود تھی مگر اب اس گرفت میں زیادہ دم خم نہیں رہا تھا۔ تین افراد عادل سے لپٹ گئے اور اسے بری طرح پیٹنے لگے۔ عادل نے خود کو بے رحم ٹھوکروں اور گھونسوں کی زد میں پایا۔ تب عادل نے رابے کی بیوی سمونہ کو دیکھا۔ وہ کسی چڑیل کی طرح چلاتی ہوئی کرسٹل پر جھپٹی اور اسے مارنے لگی۔ کرسٹل بھی کوئی چھوئی موئی نہیں تھی۔ اس نے سمونہ کی مزاحمت کی۔ مگر جب پاؤں پھسل جانے کی وجہ سے کرسٹل کا سر ایک پتھر میں لگا تو سمونہ اس پر غالب آگئی۔ وہ چنگھاڑ رہی تھی۔ "زندہ نہیں چھوڑوں گی..... حرامزادی..... فرنگن......"

عادل کو اپنی چوٹیں تقریباً بھول گئی تھیں۔ ٹھوکروں اور گھونسوں کی برسات کے دوران بھی وہ سرمد صاحب ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ الاؤ کے بالکل قریب گرے تھے اور ان کے جسم سے بہنے والا خون سفید برف پر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ گالیاں بکتے ہوئے پاؤندوں نے عادل کو الٹا کیا اور اس کے ہاتھ بے رحمی سے پشت پر باندھ دیے۔ عادل کے سینے میں آگ سی بھڑک رہی تھی۔ وہ پاؤندوں کے ہاتھوں میں مچل مچل جا رہا تھا اور دہاڑ رہا تھا: "میں جان لے لوں گا۔ میں مار دوں گا۔ سرمد صاحب..... سرمد صاحب۔" وہ بے قرار ہوکر پکارنے لگا۔

تب اسے اندازہ ہوا کہ گولی سرمد صاحب کے سینے پر نہیں بلکہ بائیں کندھے کے قریب لگی ہے۔ وہ اٹھ بیٹھے تھے اور انہوں نے دائیں ہاتھ سے بایاں کندھا دبا رکھا تھا اور یہی وقت تھا جب عادل کو یہ بھی پتا چلا کہ وہ پوری کوشش کے باوجود داخون سے رائفل کیوں نہیں چھین سکا۔ ٹارچوں کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ خبیث نے چمڑے کے ایک چوڑے تسمے کے ساتھ رائفل کے دستے کو اپنی کلائی سے باندھ رکھا ہے، ہتھیار کی حفاظت کے لیے اس طرح کا انتظام عادل نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ حیران رہ گیا۔

دو افراد نے عادل کو اٹھا کر خیمے میں پٹخ دیا۔ رابے خاں نے اب کرسٹل اور سمونہ کو بھی ایک دوسرے سے علیحدہ کردیا تھا۔ کرسٹل کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور نچلا ہونٹ بھی پھٹ گیا تھا۔ سمونہ اسے آتشیں نظروں سے دیکھ رہی تھی اور مسلسل گالیاں دے رہی تھی۔

اعشاریہ... تین آٹھ کے پستول کی گولی سرمد صاحب کے کندھے سے ذرا نیچے بازو کے گوشت میں گھسی تھی اور اندر ہی تھی۔ ان کے چہرے پر تکلیف کے آثار تو تھے لیکن اس سے زیادہ پریشانی کے آثار تھے۔ عادل اپنے آپ کو بے حد شرمندہ اور قصوروار محسوس کررہا تھا اور واقعی ایسا ہی تھا۔ یہ دوسری بار تھا کہ عادل کی وجہ سے اس کے ساتھی سخت مصیبت میں پڑے تھے۔ بے شک اس نے ابھی جو کیا پوری نیک نیتی سے کیا اور سمجھ بوجھ و حوصلے کا ثبوت بھی دیا مگر جو نتیجہ نکلا، وہ بالکل مختلف تھا۔

ہمایوں ابھی تک دوسرے خیمے میں تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ اسے باہر کی صورتِ حال کی پوری خبر نہیں۔ بہرحال گولی چلنے کی آواز تو یقیناً اس نے بھی سن لی تھی۔ اب سب سے اہم مسئلہ سرمد صاحب کے زخمی بازو کا تھا۔ خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ رابے خان نے شکاری چاقو کی مدد سے ان کی قمیص کندھے پر سے پھاڑ دی۔ یقیناً سرمد صاحب سخت تکلیف میں تھے۔ ان کی پیشانی پر پسینا چمکنے لگا تھا۔ اس کے باوجود ان کے چہرے پر اذیت کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ نہ ہی عادل نے ان کی کراہ سنی تھی۔

"تمہارا گولی نکالنا بہت ضروری ہے۔ کیا تمہارے پاس کوئی اس طرح کا سامان ہے؟" رابے خاں نے سرمد صاحب سے پوچھا۔

سرمد صاحب نے کرسٹل کو اشارہ کیا۔ سمونہ سے مارا ماری کے دوران میں کرسٹل کے منہ سے خون رسنے لگا تھا اور ایک کہنی بھی بری طرح چھل گئی تھی۔ وہ اٹھی اور خیمے کے گوشے میں پہنچی۔ ان کے سامان کا بیشتر حصہ تو پاؤندوں کے قبضے میں جاچکا تھا۔ تاہم کچھ چیزیں انہوں نے بے قیمت جان کر چھوڑ دی تھیں۔ ان میں سے ہی ایک نیلے بیگ میں فرسٹ ایڈ کا سامان موجود تھا۔ اس کے علاوہ میڈیسنز، چھوٹی موٹی جراحی میں استعمال ہونے والی اشیا اور آکسیجن کے چھوٹے چھوٹے سلنڈر بھی تھے۔

اندازہ ہورہا تھا کہ کرسٹل فزیوتھراپسٹ ہونے کے

ساتھ ساتھ میڈیکل کی بھی تھوڑی بہت سمجھ بوجھ رکھتی ہے۔ اس نے باقی سامان میں سے چند اوزار علیحدہ کیے۔ سرمد صاحب سے مشورے کے بعد پہلے ایک انجکشن ان کے بازو میں لگایا۔ یہ ''سن'' کرنے والا انجکشن تھا لیکن یہ بات عادل بھی جانتا تھا کہ ایسے انجکشن جسم کو عام طور پر گہرائی تک سن نہیں کرتے۔ اگر ''ڈیپ سرجری'' ہو تو مریض کو شدید تکلیف جھیلنا پڑتی ہے اور عادل دیکھ رہا تھا کہ سرمد صاحب یہ تکلیف جھیلنے کے لیے تیار تھے۔

کرسٹل نے رابے خاں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ہام کو گولی نکالنے کے لیے اپنے ساتھی عادل کا تھوڑا ہیلپ چاہیے۔''

داخون زہر خند لہجے میں بولا۔ ''فرنگن تو بہت بڑا فراڈن بھی ہے۔ پہلے تو تجھے انگریزی کے سوا کچھ آتا ہی نہیں تھا۔ اب تیرے منہ میں یہ اردو کس نے گھسا دیا۔''

''ہام تھوڑا تھوڑا سمجھتا۔''

''تم تھوڑا تھوڑا سمجھتا لیکن ام وہ سارا سمجھتا جو تمہارے کھوپڑے میں ہے۔ ام اس خبیث کے ہاتھ نہیں کھول سکتا۔ اب ام اس کو اسی طرح مرغی کے ماتق باندھ کر رکھے گا۔'' داخون کا اشارہ عادل کی طرف تھا۔

''چلو ام تمہارا مدد کرتا ہے۔'' رابے خاں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

اگلے پندرہ بیس منٹ عادل کے لیے دل ہلا دینے والے تھے۔ اس نے کبھی اس طرح کا براہِ راست آپریشن نہیں دیکھا تھا۔ کرسٹل کی ہمت اور مہارت کی بھی داد دینا پڑتی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، اس نے اس سلسلے میں کچھ کورس بھی کر رکھے تھے۔ ان میں فریکچر ہو جانے والی ہڈیوں کو بغیر آپریشن کے ٹریٹ کرنے کا کورس بھی تھا۔ کرسٹل کے ہاتھ خون میں لت پت ہو گئے۔ اسے کٹ لگاتے ہوئے سرمد صاحب کے بازو کی گہرائی تک جانا پڑا۔ گولی کندھے کے سخت پٹھوں کے اندر پھنسی ہوئی تھی۔ سرمد صاحب کی بے مثال قوتِ برداشت کا ایک اور مظاہرہ سامنے آ رہا تھا۔ وہ لیٹے ہوئے تھے اور انہوں نے اپنا بازو موڑ کر آنکھوں پر رکھا ہوا تھا۔ ان کے چہرے سے ٹپ ٹپ پسینا گرتا رہا لیکن کرب و بے قراری کا کوئی اظہار ان کی طرف سے نہیں ہوا۔ اور تو اور سخت جان پاؤندے بھی سرمد صاحب کی ہمت اور برداشت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔

آخر گولی نکل آئی اور کرسٹل نے زخم میں چند اسٹیچز لگا کر بینڈیج کر دی۔ عادل کی شرمندگی عروج پر تھی۔ سرمد صاحب کو یہ ساری تکلیف اسی کی وجہ سے سہنا پڑی تھی۔

مزید پریشانی کے جو حالات پیدا ہو رہے تھے، ان کا سبب بھی وہ ہی تھا۔ پاؤندے جو کل شام تک کافی حد تک دوستانہ موڈ میں نظر آتے تھے، اب ایک بار پھر برہم دکھائی دے رہے تھے۔ خاص طور سے داخون اور سونہ کی آنکھوں میں تو خون کی سرخی تھی۔ اس دوران میں چند لمحوں کے لیے تو عادل کو یوں لگا تھا کہ داخون ایک بار پھر اس کو پیٹنا شروع کر دے گا مگر رابے خاں جو نسبتاً ٹھنڈا اور گہرا شخص تھا، آڑے آیا اور اس نے داخون کو روک دیا۔ اس سارے عمل میں کافی وقت لگا تھا۔ اب صبح کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ رابے خاں نے عادل کے سامنے بیٹھ کر اس کی طرف انگلی اٹھائی اور خطرناک لہجے میں بولا۔ ''دیکھو، یہ ام تم کو آخری موقع دے رہا ہے۔ اس کے بعد نہیں دے گا۔ یہ سب لوگ گواہ ہے اگر اب تم نے کوئی حرامزدگی دکھایا تو ام سیدھا تمہارے دل پر گولی مارے گا اور یہاں برف کی قبر میں دفن کر دے گا۔''

سرمد صاحب کی قوتِ برداشت نے عادل کو بے حد متاثر کیا۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ زبان سے کہے گئے الفاظ کے بجائے عملی نمونہ دل پر کہیں زیادہ اثر کرتا ہے۔ آپریشن کے دورانیے کا وہ قریباً ایک گھنٹا سرمد صاحب نے جس طرح سے گزارا تھا، وہ عادل کے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ سب کچھ آگے چل کر اس کے بہت کام آیا۔

اگلے روز دوپہر سے پہلے ہی رابے خاں کے پانچ اور ساتھی بھی موقع پر پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک نوجوان تھا، باقی درمیانی عمر کے لوگ تھے۔ ان کے ساتھ کھانے پینے کا سامان تھا اور خیمے وغیرہ تھے۔ عادل نے اندازہ لگایا کہ نئے آنے والوں کے پاس کم از کم دو رائفلیں موجود ہیں۔ دو افراد چھوٹے دستے کی کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔ یہ لوگ رابے خاں کو صرف ''خاناں'' کہہ کر بلاتے تھے اور اس کی بات بڑی توجہ سے سنتے تھے۔ یہ سب کے سب اپنے چہرے بشرے سے خطرناک لوگ دکھائی دیتے تھے۔

اگلے دو تین روز میں عادل کو اندازہ ہو گیا کہ ان پاؤندوں کے ساتھ سرمد صاحب نے کچھ معاملات طے کر لیے ہیں اور اب آئندہ جو کچھ ہو گا، طے شدہ شرائط کے مطابق ہو گا۔ سرمد صاحب کی ہدایت کے مطابق روزمرہ کے معمولات دوبارہ شروع ہو گئے۔ یہ معمولات شروع کرنے کے لیے ضروری تھا کہ سب سے پہلے تو عادل کے ہاتھ کھولے جاتے اور ہمایوں کو بھی آزاد کیا جاتا۔ یہ دونوں کام اب رابے خاں کے لیے یقیناً آسان ہو گئے تھے۔

مزید مسلح ساتھی آنے کے بعد اس کے اعتماد میں اضافہ ہوا تھا۔ اس نے ایک دو شرائط کے ساتھ عادل کے ہاتھ کھلوا دیے اور ہمایوں کو بھی ایک مخصوص ایریا میں گھومنے پھرنے کی اجازت دے دی۔ بہرحال کم از کم دو مسلح گن مین ہر وقت ان سے کچھ فاصلے پر موجود رہتے تھے اور ان کی نگرانی کرتے تھے...... رابے خاں نے عادل اور ہمایوں کو باور کرا دیا تھا کہ ان کے یہ ساتھی بہترین نشانے باز ہیں اور ٹھیک پیشانی پر گولی مارتے ہیں۔

سرمد صاحب کی ہدایت کے مطابق تیسرے روز ہمایوں نے ایک بار پھر عادل کے ساتھ چٹان پر کلائمبنگ شروع کر دی۔ کسی وقت کرسٹل بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتی تھی۔ ویسے اب وہ زیادہ وقت خیمے میں ہی سرمد صاحب کے پاس گزارتی تھی۔ وہ اگر گھومتی پھرتی تھی تو پاؤندوں کی چبھتی ہوئی نظریں اس کا تعاقب کرتی تھیں اور وہ گندی ہنسی ہنستے ہوئے سرگوشیاں کرتے تھے۔ یہ مناظر کرسٹل کو بے چین کر دیتے تھے۔ ویسے بھی خیمے میں سرمد صاحب کو ایک تیماردار کی ضرورت تھی۔ ابھی زخم کچا تھا اور وہ کسی وقت سخت درد محسوس کرنے لگتے تھے۔

ایک دو بار عادل کے ذہن میں آیا کہ وہ کرسٹل سے ہوٹل والی رات کے بارے میں یہ پوچھے جب ایک انگلش لڑکا دندناتا ہوا اس کے کمرے میں گھس آیا تھا اور اس سے بدتمیزی کی تھی لیکن یہ بات اس کی زبان پر آتے آتے رہ گئی۔ یقیناً ہر شخص کے ذاتی معاملات ہوتے ہیں اور یہ بھی کوئی ایسا ہی معاملہ تھا۔ پتا نہیں کیوں کبھی کبھی عادل کو ایسا لگتا کہ کرسٹل کی یہاں ان برف زاروں میں موجودگی اور اس لڑکے کی آمد میں بھی کوئی تعلق ہے۔ بہرحال اس تعلق کی نوعیت کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

چٹان پر کلائمبنگ کرنے میں عادل کو شروع میں تو کچھ دشواری پیش آئی تھی لیکن اب اسے کام کی سمجھ آ گئی تھی اور اس نے تیز رفتاری سے سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ کسی وقت اسے ہمایوں کی آنکھوں میں حیرت بھی دکھائی دیتی تھی۔ ہمایوں کئی سال سے کوہ پیمائی کر رہا تھا اور اچھا کلائمبر تھا، اس کے باوجود پچھلے دو تین ہفتوں میں ہی عادل اس سے آگے نکلتا ہوا محسوس ہوتا تھا...... ایک دن جب وہ چٹان کی سب سے مشکل سائڈ سے چڑھ کر چٹان کی چوٹی پر پہنچے تو ہمایوں نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم بہت اچھے جا رہے ہو عادل۔ امید ہے کہ سر سرمد نے تم سے جو توقعات لگائی ہیں، وہ پوری ہوں گی۔''

''اور وہ توقعات کیا ہیں؟ یہ سوال میرے لیے ابھی تک الجھن کا سبب ہے۔'' عادل نے کہا۔

''سر سرمد نے تم کو بتایا تو ہے، وہاں بانگری پہاڑ کی چوٹی تک چند سو میٹر کی کلائمبنگ ایسی ہے، جو ان کے خیال میں صرف تم ہی کر سکتے ہو۔''

''لیکن ہمایوں بھائی! یہ بات میری کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ کوئی الہ دین کا چراغ تو نہیں ہے جسے صرف میں ہی غار میں گھس کر نکال سکتا ہوں۔ وہ چڑھائی مشکل ہو گی لیکن تجربہ کار کوہ پیما مشکل سے مشکل کلائمبنگ کر لیتے ہیں۔ پھر میرا چناؤ ہی کیوں کیا گیا ہے؟''

''سر سرمد کی کئی باتوں کو سمجھنا کافی مشکل ہوتا ہے عادل۔ شاید وہ کوئی ایسی دشواری دیکھ رہے ہیں جو ہمیں نظر نہیں آ رہی اور اسی دشواری کو سامنے رکھتے ہوئے وہ تم جیسے نیچرل کلائمبر کو ٹرینڈ کر رہے ہیں۔''

''نیچرل کلائمبر...... اس کا مطلب بھی پوری طرح میری سمجھ دانی میں نہیں آتا۔'' عادل نے کہا۔

''کچھ لوگ کسی خاص کام کے لیے خاص طور سے بنائے گئے ہوتے ہیں۔ ان کو ''گاڈ گفٹڈ'' کہا جاتا ہے۔ ایسے لوگ اگر اپنی خداداد صلاحیتوں پر تھوڑی سی بھی محنت کریں تو بہت تیزی سے بہت آگے نکل جاتے ہیں اور اس کا ثبوت تمہارے سلسلے میں مل بھی رہا ہے۔ تم بے انتہا تیزی سے سیکھ رہے ہو، ممکن ہے کہ...... تمہارے سامنے سر سرمد نے تمہاری تعریف نہ کی ہو لیکن میں جانتا ہوں وہ تمہاری طرف سے بہت مطمئن ہیں۔''

عادل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے ہمایوں بھائی! کیا بانگری کی چوٹی پر واقعی کچھ موجود ہو گا اور کیا ان کمینے پاؤندوں کی موجودگی میں ہم واقعی اس میں سے کچھ حاصل کر سکیں گے؟''

''اس کا پتا تو سر سرمد کو ہی ہو گا عادل...... اور میرا تم کو ایک برادرانہ مشورہ ہے۔ سر سرمد کی باتوں پر زیادہ مت سوچا کرو۔ میرا ذاتی تجربہ تو یہی ہے کہ سر کی باتوں پر آنکھیں بند کر کے یقین کرنے اور عمل کرنے میں فائدہ رہتا ہے۔''

عادل نے پھر موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''ہمایوں بھائی! کیا تم اور کرسٹل صرف کوہ پیمائی کے لیے سر کے ساتھ ہو یا اس کا کوئی اور بھی مقصد ہے؟''

''ہمارا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ ہمیں سر کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع مل جائے۔ انہیں جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ ایک سورج کی طرح ہیں اور ان سے

اردگرد کی ہر شے کو روشنی ملتی ہے۔ پاکستان میں ہی نہیں، پاکستان سے باہر بھی ان کے بہت سے چاہنے والے ہیں۔ ان میں کئی مشہور کھلاڑی اور نامور لوگ شامل ہیں۔ تم نے بارونداجیکی کا نام سنا ہوا ہے؟"

عادل نے ذہن پر زور دیا۔ اسے نام کچھ سنا سنا سا لگا۔ "کوئی پہلوان ہے شاید؟" عادل نے کہا۔

"پہلوان نہیں، مارشل آرٹ کا زبردست کھلاڑی ہے۔ اس کا تعلق نیپال سے ہے۔ اپنے میدان میں اس نے حیران کن تیزی سے ترقی کی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اپنے بہت سے ہم عصروں کو پچھاڑ دیا ہے۔ اب سے تین چار سال پہلے وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ بس فلموں میں چھوٹے موٹے رول کیا کرتا تھا۔ پھر جس طرح سرمد صاحب کی نظر تم پر پڑی تھی، اسی طرح ایک دن اس پر بھی پڑ گئی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا۔ ابھی وہ اور بہت آگے جائے گا۔"

"ہمایوں بھائی! تمہارا مطلب ہے کہ سرمد صاحب کوہ پیمائی کی طرح مارشل آرٹ بھی جانتے ہیں؟"

"نہیں...... وہ نہیں جانتے...... اور بہت سے ایسے شعبے ہیں جن کے بارے میں وہ کچھ خاص مہارت نہیں رکھتے لیکن ان شعبوں میں بھی انہوں نے بہت سے نوجوانوں کی بے مثال مدد کی ہے اور انہیں کامیابیاں دلائی ہیں۔ دراصل سرمد صاحب کا اصل ہتھیار ان کے سوچنے کا انداز..... اور ان کا فلسفہ ہے۔ وہ اپنے نظریے کی طاقت سے بندے میں ایسی توانائی بھر دیتے ہیں کہ اس کے لیے کسی بھی میدان میں آگے بڑھنا سہل ہو جاتا ہے۔"

ہمایوں کی باتیں کچھ ایسی غلط نہیں تھیں۔ یقیناً یہ سرمد صاحب کی کرشماتی شخصیت ہی تھی جو اسے لاہور میں کباڑ خانے کے کام سے اٹھا کر یہاں کے ٹو کی فلک بوس چوٹی کے دامن میں لے آئی تھی اور وہ واقعی خود کو بڑی تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔

مگر اگلے ہی روز کچھ ایسا ہوا جس نے عادل کے تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے قدم روک دیے اور اس نے خود کو مایوسی کے ریلے میں بہتا ہوا پایا۔ جب چند روز پہلے کیمپ کے چند کلومیٹر کے فاصلے پر پاؤندوں نے اسے اور کرسٹل کو پکڑا تھا تو عادل کے سر کے عقبی حصے پر زوردار چوٹ لگائی گئی تھی۔ بعدازاں جب یہاں کیمپ میں آنے کے بعد عادل نے رات کے وقت داخون سے رائفل چھیننے کی ناکام کوشش کی تو تب بھی اس کے سر کے پچھلے حصے پر شدید ضرب آئی۔ اب اس بات کو بھی پانچ دن گزر چکے تھے اور ان چوٹوں کے حوالے سے عادل خود کو کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔ مگر آج اچانک سر کے پچھلے حصے اور گردن میں شدید ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ اس وقت عادل اور ہمایوں "مشق والی چٹان" پر چڑھنے کے بعد واپس آئے تھے اور عادل، ہمایوں سے قریباً پانچ منٹ پہلے اترنے میں کامیاب ہوا تھا۔ عادل کی اس کامیابی پر کرسٹل کا چہرہ خوشی سے سرخ نظر آنے لگا۔ ہمایوں نے بھی عادل کی غیر معمولی کارکردگی کی تعریف کی۔ سرمد صاحب عموماً تعریف میں احتیاط سے کام لیتے تھے پھر بھی انہوں نے عادل کی ستائش میں چند فقرے بولے اور کہا۔ "میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہم شیڈول سے ایک ہفتہ پہلے ہی چوٹی کی طرف روانہ ہو سکیں گے۔ تمہاری پرفارمنس اطمینان بخش ہے عادل۔"

ان کلمات پر عادل یقیناً بہت خوش ہوتا لیکن اس کے اندر تو کچھ اور ہی طرح کی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ اس کی گردن میں شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور سر گھمانا مشکل ہو رہا تھا۔ شاید ہمایوں پر اپنی برتری بڑھانے کے لیے وہ کچھ زیادہ ہی زور لگا بیٹھا تھا۔ وہ بات چیت مختصر کرتا ہوا دوسرے خیمے میں چلا گیا اور لیٹ گیا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ شاید کل پریکٹس میں حصہ نہیں لے سکے گا...... بلکہ ہو سکتا ہے کہ اگلے کئی روز تک چڑھائی نہ کر سکے۔ یہ مایوس کن صورتِ حال تھی۔ باہر سر سرمد، رابے خاں سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کے اڑتے اڑتے ہوئے سے فقرے عادل کے کانوں تک بھی پہنچ رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "عادل بہت ٹھیک جا رہا ہے، تم نے خود بھی دیکھا ہوگا۔ ہم دو چار دن پہلے ہی یہاں سے روانہ ہو سکتے ہیں۔"

رابے بولا۔ "خوکڑ کے میں کرنٹ تو بہت نظر آتا ہے۔ اللہ کرے یہ کرنٹ ایسا ہی رہے۔"

"داخون کی سمجھ میں بھی کوئی بات آئی ہے یا نہیں؟" سر سرمد نے پوچھا۔

"ہاں، اب وہ زیادہ بولتا تو نہیں۔ اس کو دماغ ٹھنڈا رکھنے کا ضرورت ہے۔ تم بھی اپنی میم صاحب کو بولو کہ وہ اس کے ساتھ منہ ماری نہ کیا کرے۔"

ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں اور خیمے میں عادل پریشانی کے ریلے میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ سر سرمد اور کرسٹل، ہمایوں سمیت سب کو مایوس کرنے والا ہے۔ یہ لوگ اس سے کچھ زیادہ ہی توقعات لگا بیٹھے تھے اور یہاں وہ شاید اپنے اضافی جوش کی وجہ سے مشکل میں گرفتار ہو چکا تھا۔

کرسٹل اکثر بہانے بہانے سے روزانہ ایک آدھ چکر عادل کے خیمے کا لگا لیتی تھی۔ خاص طور سے جب ہمایوں خیمے میں موجود نہیں ہوتا تھا۔ آج بھی وہ چلی آئی اور حسبِ معمول پوچھا۔ "ہیلو عادل! ہام کے لائق کوئی سروس۔ ہام کا مطلب ہے کوئی خدمت۔"

عموماً عادل نفی میں سر ہلا دیا کرتا تھا لیکن آج اس نے ایسا نہیں کیا۔ "اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو گردن کے پچھلے حصے پر تھوڑا سا آئل مل دو۔" اس نے کہا۔

وہ تو جیسے پہلے ہی کسی ایسی درخواست کی منتظر تھی۔ فوراً زیتون کا امپورٹڈ تیل لیے ہوئے عادل کے پاس آن بیٹھی۔ عادل نے اس پر اپنی اصل تکلیف اور تکلیف کی شدت ظاہر نہیں ہونے دی لیکن جب اس نے مساج کرتے ہوئے عادل کے سر اور گردن پر دباؤ بڑھانا شروع کیا تو عادل کے لیے کراہیں روکنا مشکل ہو گئیں۔ وہ بھی ایک کائیاں تھی اور یقیناً اپنے کام میں اس کو غیر معمولی مہارت بھی تھی۔ بولی۔ "ہام کو لگتا عادل کہ تمہارے ہیڈ کی انجری کی وجہ سے تمہاری گردن میں بھی پین آ گیا۔ تو م نے آج زور بھی تو بہت زیادہ لگایا ہا کیں۔"

عادل ہونٹ بھینچ کر چپ رہا اور اوندھا پڑا رہا۔ وہ بولی۔ "کہیں تو م کا پریکٹس تو خراب نا ئیں ہو جائیں گا؟"

"نہیں...... نہیں، اب اتنا بھی مسئلہ نہیں۔" اس نے کہا لیکن دل میں وہ سوچ رہا تھا کہ مسئلہ اس سے کہیں زیادہ خراب ہے۔

کرسٹل نے قریباً آدھ گھنٹے تک عادل کو تیل ملا اور اس کو کسی حد تک بہتر کر دیا۔ اس دوران میں ایک بار ہمایوں نے بھی خیمے میں جھانکا اور خاموشی سے واپس چلا گیا۔ ہمایوں بہت خاموش طبع تھا لیکن نہ جانے کیوں کبھی کبھی عادل کو لگتا تھا کہ وہ کرسٹل میں دلچسپی رکھتا ہے مگر کرسٹل کی طرف سے ایسی کوئی صورتِ حال نظر نہیں آتی تھی۔

کرسٹل اس کے مساج کے لیے قمیص اور ٹراؤزر بھی اتروانا چاہ رہی تھی مگر عادل اسے کسی بھی طرح کا بڑھاوا دینا نہیں چاہتا تھا اور اس وقت تو ویسے بھی درد کے شکنجے میں تھا۔ کرسٹل نے اپنے نرم گرم ہاتھوں اور کلائیوں کے زور سے عادل کے درد میں کچھ کمی تو کر دی تھی مگر مکمل چھٹکارا نہیں ملا تھا۔ اس نے شرارت سے اس کے کان میں انگلی گھمائی اور اٹھ کر چلی گئی۔

صرف آدھ پون گھنٹے بعد درد پھر شروع ہو گیا۔ رات کو بھی وہ دیر تک جاگتا رہا۔ اس نے ساتھیوں سے اس صورتِ حال کو چھپائے رکھا۔ اسے کچھ شرمندگی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے فالتو جوش کا مظاہرہ کیا تھا اور "ان فٹ" ہو گیا تھا۔ اب پتا نہیں کہ اسے سنبھلنے میں کتنی دیر درکار تھی۔ سرمد صاحب کے جفاکش فلسفے کے مطابق وہ درد کو بخوشی جھیلنے اور اس پر غالب آنے کی کوشش کرتا رہا تاہم اسے لگا کہ کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ رات کوئی ڈھائی تین بجے کا عمل ہوگا۔ سب سو رہے تھے، ایک خیمے میں عادل اور ہمایوں تھے۔ دوسرے میں سرمد صاحب اور کرسٹل۔ اس سے اگلا خیمہ رابے خاں کا تھا۔ تین خیمے اور بھی تھے جن میں رابے خاں کے ساتھی تھے۔ آج شاید ان پاؤندوں کا کوئی خاص دن تھا۔ انہوں نے جی بھر کر کھانا کھایا تھا...... اس ضیافت میں بہت سا ٹن پیک کھانا ان کے معدوں میں اتر گیا تھا۔ بھیڑ کے خشک گوشت سے کوئی پلاؤ قسم کی چیز بھی تیار کی گئی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے مقامی طور پر تیار کردہ شراب بھی پی تھی۔ وہ دو پہرے دار جو آج رات ڈیوٹی پر تھے، بہت سست نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو جلد ہی سو گیا، دوسرا بھی اونگھتا ہوا محسوس ہوا۔

اچانک عادل کے دل میں عجیب خیال سر اٹھانے لگا۔ اس نے سوچا، کیوں نہ وہ اس ساری صورتِ حال پر لعنت بھیج کر خاموشی کے ساتھ یہاں سے نکل جائے۔ ایک تو اس کا دھیان ہر وقت شہزادی کی طرف لگا رہتا تھا۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ خیال اٹھتا تھا کہ شہزادی سے دوری اور اس کے حالات سے مکمل بے خبری کہیں اس کے لیے کسی ناقابلِ تلافی نقصان کا باعث نہ بن جائے۔ اگر اس کی غیر موجودگی میں اسے کسی طرح شادی پر مجبور کر دیا جاتا تو پھر...... باقی کیا رہ جانا تھا اور وہ یہ جانتا تھا کہ چودھری مختار اور اس کا بیٹا ناصر اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہر ہتھکنڈا آزمائیں گے۔ عادل کی اس سوچ کی دوسری وجہ آج سہ پہر پیدا ہوئی تھی۔ یعنی اس کے سر اور گردن کا درد...... پتا نہیں کیوں اسے لگ رہا تھا کہ اس درد کی وجہ سے وہ سرمد صاحب کو بہت مایوس کرے گا اور کرسٹل، ہمایوں وغیرہ بھی مایوس ہوں گے اور اگر اس نے اپنی ہمت سے زیادہ جان مار کر پریکٹس جاری رکھنے کی کوشش کی تو ہو سکتا ہے کہ جسمانی طور پر زیادہ نقصان اٹھائے۔ اگر وہ کسی طرح خاموشی کے ساتھ یہاں سے نکل جاتا تو اس ساری صورتِ حال سے بچا جا سکتا تھا۔

سرہانے کی طرف ایک بیگ پڑا تھا۔ اس میں کھانے پینے کی اشیا موجود تھیں۔ باہر کی پاکٹ میں ایک چھوٹا نقشہ

بھی موجود تھا۔ عادل نے مکمل گرم لباس پہن رکھا تھا، باہر موسم بھی ٹھیک تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ہمایوں کروٹ بدلے سو رہا تھا۔ خیمے میں اس کی بھاری سانسیں گونج رہی تھیں۔ عادل نے خاموشی سے جوتے پہنے اور اونی ٹوپی سر پر اوڑھ لی جو سر کے ساتھ ساتھ چہرے کو بھی چھپا لیتی تھی۔ وہ جانے کے لیے تیار تھا۔ اس نے بہت آہستگی سے خیمے کے دروازے کی زپ کھولی۔ اس کے بعد باہر والے ''کور'' کی زپ تھی۔ دوسری زپ کھلتے ہی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آئے۔ صبح ابھی دور تھی مگر ہلکی ہوا چلنا شروع ہوگئی تھی۔

باہر نکلنے سے پہلے اس نے ایک بار پھر سوچا۔ جیسے اس کے اندر سے آواز آئی...... ''عادل! ایک بار اچھی طرح سوچ لو۔ یہاں سے نکل جاؤ گے تو پھر کیا کرو گے؟ پھر تمہیں اسی گالی کا سامنا ہوگا جو تمہارے تایا فراست نے تم پر چڑھا رکھی ہے۔ کہاں سے لاؤ گے اتنا روپیا؟ کیسے کماؤ گے؟''

''کچھ نہ کچھ ہوجائے گا۔'' اس نے جیسے اپنے آپ کو سمجھایا۔

''موقعے بار بار نہیں ملتے عادل!'' اندر کی آواز نے کہا۔ ''تم کباڑ بیچ بیچ کر کہاں تک جمع کرو گے؟ ڈھائی کروڑ کی رقم معمولی نہیں ہوتی۔ اگر تمہیں ایک سنہری موقع مل رہا ہے تو اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ سرمد صاحب کی زبان پر بھروسا رکھو۔ اگر وہ کہہ رہے ہیں کہ کچھ ہوگا...... تو پھر کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔''

''لیکن یہ سختی مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی۔ اس مشقت نے مجھے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ اور اب یہ درد...... اس درد نے رہی سہی کسر بھی نکال دی ہے۔ اس درد کی وجہ سے مجھے بہت شرمندگی کا سامنا ہونے والا ہے۔'' مخالف آواز نے کہا۔

''اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ مشق کے دوران میں کھلاڑی ان فٹ ہوتے ہی ہیں اور پھر سے ٹھیک بھی ہوجاتے ہیں۔ سرمد صاحب کے پاس کافی طبی سہولتیں موجود ہیں اور پھر کرسٹل جیسی فزیوتھراپسٹ ہے۔ بہت جلد سب اچھا ہوجائے گا۔ اور ایک بات تمہیں اور یاد رکھنی چاہیے۔ تمہاری وجہ سے تمہارے ساتھیوں کو پہلے بھی دوبار سخت مصیبت اٹھانا پڑی ہے۔ اب اگر پھر کچھ ایسا ہوگیا تو کیا ہوگا۔''

وہ وہیں دروازے کے قریب بیٹھا کتنی ہی دیر تک متضاد سوچوں کے درمیان گھرا رہا۔ سب سے اہم بات یہی تھی کہ اگر وہ یہاں سے نکلنے اور شگریا اسکردو وغیرہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو بھی جاتا ہے تو پھر کیا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ گاؤں جا کر وہ شہزادی کی ایک جھلک دیکھ لے گا اور وہاں کے حالات سے آگاہی حاصل کرلے گا۔ اس کے بعد تو پھر وہی سوال منہ پھاڑ کر کھڑے ہوجائیں گے جن کا جواب ڈھونڈنے کے لیے اس نے کمر ہمت باندھی تھی اور لاہور کا رخ کیا تھا۔

وہ دروازے کے سامنے بیٹھا تھا اور یہ دروازہ ایک دوراہے کے سامنے کھل رہا تھا۔ آخر وہ فیصلے پر پہنچ گیا۔ اس نے اپنی کمر پر سے بیگ اتار کر ایک طرف رکھ دیا اور گہری سانسیں لے کر جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔

کچھ دیر بعد جب وہ خیمے کے باہر والے غلاف کی ''زپ'' بند کر رہا تھا' اس کی نگاہ کچھ فاصلے پر ایک ہیولے پر پڑی۔ ملگجی تاریکی میں یہ ہیولا التحیات کے انداز میں خاموش و ساکت بیٹھا تھا۔ پہرے داروں کا سائبان اس سے دس پندرہ قدم کی دوری پر تھا۔ یہ کون ہے جو اتنی سردی میں کھلے آسمان کے نیچے ایسے بے حرکت بیٹھا ہے؟ بالکل پتھر یا برف کے مجسمے کی طرح۔ آخری پہر کی ہوائیں جیسے اسے چھوئے بغیر گزر رہی تھیں۔ وہ اسے پہچان نہیں پا رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد عادل کی مشکل خودبخود آسان ہوگئی۔ ایک پاؤنڈہ پہرے دار نے معمول کے مطابق اپنی ٹارچ کا روشن دائرہ دائیں بائیں گھمایا۔ یہ دائرہ ایک دو سیکنڈ کے لیے ہیولے پر رکا۔ عادل ششدر رہ گیا۔ یہ سرمد صاحب تھے۔ وہ ہڈیوں میں گودا جما دینے والی سردی میں کھلے آسمان تلے بیٹھے تھے۔ ان کے بالائی جسم پر کپڑے کا ایک تار نہیں تھا۔ ان کی جینز کی نیلی پتلون پر برف کی دھول سی جمی ہوئی تھی۔ زخمی کندھے کی سفید بینڈیج ٹارچ کی روشنی میں نمایاں نظر آئی۔

عادل کو معلوم تھا کہ سرمد صاحب جوانی عمری سے شدید ترین مشقت کے عادی رہے ہیں اور اکثر نفس کشی کی مشقیں بھی کرتے ہیں۔ ہر موسم میں صبح منہ اندھیرے اٹھ کر میلوں کی دوڑ لگانا بھی تو نفس کشی کے زمرے میں ہی آتا تھا...... مگر اس وقت وہ جو کچھ کر رہے تھے وہ تو ششدر کر دینے والا تھا...... بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیا یہ کسی قسم کا کوئی چلہ تھا یا پھر قوتِ برداشت بڑھانے کے لیے کسی طرح کی کوئی مشق تھی، یا کوئی اور معاملہ۔ چند لمحے کے لیے عادل کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ وہ باہر نکلے اور سرمد صاحب کو اس عمل سے روکے لیکن وہ اس پوزیشن میں نہیں تھا اور نہ ہی اس کی یہ حیثیت تھی۔

اس نے ہولے سے غلاف کی زپ بند کردی پھر اندرونی زپ بھی بند کی اور جوتے اتار کر سلیپنگ بیگ میں گھس گیا۔ ملنے جلنے سے ہلکا ہلکا درد پھر شروع ہوگیا تھا۔ سلیپنگ بیگ

میں منہ گھسا کر وہ سوچنے لگا، اگر وہ واقعی باہر نکل جاتا تو کیا ہوتا؟ پہرے دار کا رخ تو ذرا دوسری طرف تھا لیکن سرمد صاحب تو اسے یقیناً دیکھ لیتے۔ وہ اسے روکتے، اور وہ سب کے نزدیک بھگوڑا ٹھہرتا۔ وہ اتنی جلدی کیوں اٹھے ہوئے تھے؟ وہ تو صبح ساڑھے چار، پانچ بجے کے قریب بیدار ہوتے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ انہوں نے اس کے ارادے کو پہلے سے بھانپ لیا ہو۔ وہ زبردست قسم کے قیافہ شناس تھے اور شاید چہرہ شناس بھی.....

اگلے روز مشق کی چھٹی تھی۔ ایک طرح سے یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا۔ شاید عادل کو اپنی جسمانی صورتِ حال بہتر کرنے میں مدد ملتی۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں اس کے سر اور گردن کا درد کم ہوسکتا تھا۔

بہرحال اگلے چوبیس گھنٹے بھی گزر گئے۔ عادل پر وہ مثال صادق آرہی تھی کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ گیارہ بجے کے لگ بھگ سرمد صاحب کا نادر شاہی حکم آگیا کہ وہ اور کرسٹل چٹان پر چڑھائی کریں گے۔ ہمایوں کو آج فلو تھا اس لیے وہ ان کے ساتھ نہیں جا رہا تھا۔ چار و ناچار عادل کو سرمد صاحب کی ہدایت کے مطابق عمل کرنا پڑا۔ وہ دونوں معمول کے مطابق روانہ ہوئے۔ کرسٹل اب نیکر کے بجائے شارٹس پہنتی تھی۔ اس کے باوجود پاؤنڈوں کی نگاہیں اس کا تعاقب کرتی رہتی تھیں۔ کرسٹل آگے تھی، عادل اس کے پیچھے پیچھے چڑھ رہا تھا۔ شروع میں عادل کو کافی دقت ہوئی لیکن جب جسم گرم ہوگیا تو وہ نسبتاً آسانی محسوس کرنے لگا۔ پروگرام کے مطابق انہوں نے ایک دو جگہ ''اینکر'' کے ذریعے چڑھائی کی پریکٹس بھی کی۔ اینکر کوہ پیمائی کے سامان کا حصہ تھا۔ یہ ایک طرح کی کمند تھی۔ اسٹین لیس اسٹیل کا بنا ہوا یہ کوئی نو مربع انچ کا آلہ تھا۔ اس میں کئی طرح کے اسپرنگ اور کمانیاں سی لگی ہوئی تھیں۔ یہ آلہ چٹان کی دراڑوں میں اس طرح سے پھنس جاتا تھا کہ ایک مضبوط کمند کی صورت بن جاتی تھی۔ اس پر جتنا بوجھ پڑتا تھا، یہ چٹان کی دراڑ میں اپنی پکڑ اتنی ہی مضبوط کرتا جاتا تھا۔ اس میں ایک ایسا جدید سسٹم بھی موجود تھا جو خطرے کی صورت میں زوردار الارم دیتا تھا۔ یعنی اگر کمند کی پکڑ پتھروں کے اندر کمزور پڑ رہی ہو تو وہ مختلف الارمز کی صورت میں اس کا اعلان کرتا تھا۔ یہ اینکر کی ایک جدید ترین شکل تھی۔

محنت شاقہ کے بعد عادل اور کرسٹل چٹان کی بلندی تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ آج عادل کی ٹائمنگ کافی خراب رہی تھی تاہم یہ بھی غنیمت تھا کہ اس نے چڑھائی مکمل کرلی تھی۔ اس کے لیے اسے خود پر خاصا جبر کرنا پڑا تھا۔ کرسٹل گاہے بگاہے بہ غور اس کا چہرہ دیکھتی رہی تھی اور اندازہ لگانے کی کوشش کرتی رہی تھی کہ اس کی تکلیف کی صورتِ حال کیا ہے۔

چٹان کی بلندی پر بھی انہوں نے اپنا تھوڑا بہت سامان رکھا ہوا تھا۔ یہ سامان ایک چھوٹے سے خیمے میں تھا۔ اس سامان میں ایک شاندار تھری ڈی کیمرا بھی تھا۔ آج موسم بالکل صاف تھا۔ اس لیے سرمد صاحب نے انہیں ہدایت کی تھی کہ وہ بانگری چوٹی کی کچھ تصویریں اتاریں۔ خاص طور سے اس راستے کی جہاں سے وہ بانگری چوٹی پر چڑھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ کرسٹل طاقتور لینس والا کیمرا نکال لائی۔ انہوں نے تصویر کشی شروع کردی۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ سورج کی ترچھی شعاعیں برفیلی چوٹیوں اور ڈھلوانوں کو منور کر رہی تھیں۔ یہ مبہوت کر دینے والے مناظر تھے۔ دور پیچھے راکاپوشی اور براڈپیک کی فلک بوس بلندیاں دکھائی دیتی تھیں۔

ایک تصویر لیتے لیتے کرسٹل تھوڑا سا پیچھے ہٹی۔ ''اوہ گاڈ!'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس کے ساتھ ہی کھڑکھڑاہٹ کی تیز آواز ابھری۔

''کیا ہوا؟'' عادل نے چونک کر پوچھا۔

وہ اپنے پاؤں کے قریب موجود ایک دراڑ کو دیکھ رہی تھی۔

''وہ اندر گر گیا۔'' وہ بوکھلائی ہوئی آواز میں بولی۔

''کیا گر گیا؟'' عادل نے پریشان ہوکر پوچھا۔

اچانک بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ جہاں تھوڑی دیر پہلے ان کا اینکر پڑا تھا، وہ جگہ اب خالی تھی۔ عادل بھی سر تھام کر رہ گیا۔ پیچھے ہٹتے ہوئے کرسٹل کے پاؤں کی ٹھوکر اینکر کو لگی تھی اور وہ دراڑ میں گر گیا تھا۔

تصویر کشی بھول کر وہ دونوں گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور دراڑ میں جھانکنا شروع کردیا۔ یہ دراڑ بہ مشکل نو دس انچ چوڑی ہوگی، نیچے جا کر یہ شاید اور تنگ ہوگئی تھی۔ اندر بالکل اندھیرا تھا۔ کرسٹل خیمے میں سے بڑی ٹارچ لے آئی۔ انہوں نے ٹارچ کی روشنی دراڑ میں پھینکی۔ جلد ہی انہیں اپنا ڈیجیٹل اینکر نظر آگیا۔ وہ ترچھے رخ پر آٹھ دس میٹر نیچے پڑا تھا۔ انہیں کسی قدر اطمینان ہوا۔ یہ قیمتی آلہ ہزاروں فٹ نیچے بھی جاسکتا تھا۔ ویسے ان کے سامان میں دو تین اینکرز اور بھی تھے لیکن جدید ڈیجیٹل اینکر یہ ایک ہی تھا۔

''اسے نکالنا ہوگا۔ ورنہ سر سرمد ہام کا حلوا بنا دیں گا۔'' کرسٹل بولی۔

وہ دونوں رسے کی مدد سے اینکر کو نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ انہیں ایک آہنی ہک کی ضرورت تھی۔ ہک ان کے پاس

نہیں تھا۔ انہوں نے ایک کار بینر کو ہی ہتھوڑی سے ٹیڑھا کر کے ہک کی شکل دی اور رسے کی مدد سے اس ہک کو اینکر میں پھنسانے کی کوشش کرنے لگے۔ حسبِ توقع جلد ہی واکی ٹاکی جاگ اٹھا۔ کرسٹل نے اپنی بیلٹ میں سے واکی ٹاکی نکال کر کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سرمد صاحب ہی تھے۔

''کیا بات ہے، واپسی میں دیر کیوں کر رہے ہو؟'' انہوں نے انگلش میں کرسٹل سے پوچھا۔

''بس جناب نکل رہے ہیں۔'' کرسٹل نے بھی انگلش میں جواب دیا۔

''دیکھو، مجھے لگ رہا ہے کہ موسم خراب ہونے والا ہے۔ جلدی واپس آجاؤ۔''

''اوکے سر۔'' کرسٹل نے کہا۔

وہ دونوں مزید تندہی سے اینکر نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ عادل نے ٹارچ تھام رکھی تھی، کرسٹل رسے کی مدد سے کوشش کر رہی تھی۔ ایک دو بار اینکر گرفت میں آتے آتے رہ گیا۔

اسی دوران میں سرمد صاحب کی کال پھر آگئی۔ اس مرتبہ ان کی آواز میں نمایاں جھلاہٹ تھی۔ ''کیا بات ہے کرسٹل...... کیا کر رہے ہو تم؟''

''وہ سر...... وہ ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔ اینکر نیچے ایک دراڑ میں چلا گیا ہے۔ اسے نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' کرسٹل نے شستہ انگلش میں کہا۔

سرمد صاحب کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ یقیناً یہ ان کے لیے ایک گمبھیر مسئلہ تھا۔ انہوں نے تیز لہجے میں کرسٹل سے تفصیل پوچھی۔ پھر جھلائے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''جلدی کرو۔ پانچ دس منٹ کے اندر اسے نکالو۔ تم دیکھ رہے ہو، موسم کتنا بگڑ گیا ہے۔''

''اوکے سر۔'' کرسٹل کے لہجے میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔

عادل نے اطراف میں نگاہ دوڑائی۔ نہایت شاندار موسم، نہایت تیزی سے تبدیل ہوا تھا۔ شمال کے کسی نشیب سے اچانک ہی سیاہ بادلوں کے مرغولے برآمد ہوئے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے قرب وجوار کو ڈھانپ لیا تھا۔ کے ٹو کی عظیم الشان بلندیوں کی طرف سے نہایت تند و تیز ہوائیں سیاہ گھٹاؤں کو دھکیل دھکیل کر نشیب میں پہنچا رہی تھیں اور دن میں ہی رات کا سماں پیدا ہونے لگا تھا۔ یہ موسم چٹان سے اترنے کے لیے ہرگز موزوں نہیں رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک شور کے ساتھ واکی ٹاکی پھر جاگا۔ اس کے ساتھ ہی بارش کے زوردار تریڑے پڑنے لگے۔ عادل اور کرسٹل بھاگ کر مختصر خیمے میں چلے گئے۔ واکی ٹاکی پر سرمد صاحب کی آواز ابھری۔ اب آواز میں قدرے ٹھہراؤ تھا۔

''کہاں ہو تم؟'' انہوں نے انگلش میں پوچھا۔

''ابھی اوپر ہی ہیں سر!'' کرسٹل نے جواب دیا۔

''اب ادھر ہی رکو۔ نیچے آنے کی کوشش نہیں کرنا۔ یہ خطرناک ہوگا۔''

''اوکے سر! ہم خیمے میں ہیں۔ موسم ٹھیک ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔'' کرسٹل بولی۔

''اب یہ جلدی ٹھیک ہوتا نظر نہیں آتا۔ بہرحال جب تک میں نہ کہوں، اب تم خیمے میں ہی رہو۔''

موسم بگڑا تو پھر ایسا بگڑا کہ اس نے ٹھیک ہونے کا نام نہیں لیا۔ چنگھاڑتی ہواؤں کا شور تھا اور تیز بارش ہو رہی تھی۔ وہ دونوں جس خیمے میں تھے، وہ خاصا مختصر تھا۔ دو افراد ہی اس میں سما سکتے تھے۔ تھوڑا بہت سامان بھی تھا جس نے جگہ گھیری ہوئی تھی۔ بہرحال عادل اور کرسٹل کو اس بات کی تسلی تھی کہ بیرونی غلاف کی میخیں نہایت مضبوطی سے پتھریلی زمین میں گڑی ہوئی ہیں اور وہ اس طوفانی موسم میں بھی خیمے کو سنبھالے رکھیں گی۔

انسانی عقل نے کیا کیا تخلیق نہیں کیا؟ عادل نے سوچا۔ اگر اس خیمے پر ہی غور کیا جائے تو دماغ چکرا جاتا ہے۔ منفی پچاس درجہ حرارت اور ہزاروں میٹر کی بلندی پر نہایت سخت موسم میں بھی ایسے خیمے اپنے مکینوں کو اطمینان بخش ٹمپریچر فراہم کرتے ہیں اور ہر قسم کی موسمی یلغار سے محفوظ رکھتے ہیں۔

باہر موسم دہاڑ رہا تھا۔ دیوہیکل چوٹیوں کے درمیان وہ قریباً ڈیڑھ ہزار فٹ اونچی ایک خطرناک چٹان پر موجود تھے۔ ایک چھوٹا سا خیمہ جو اس وسیع و عریض بیکراں منظر میں ایک ذرّے کی طرح حقیر نظر آتا تھا۔ بجلیاں کوند رہی تھیں، بادل گرج رہے تھے اور طوفانی بارش جیسے سب کچھ بہا لے جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ انہوں نے ٹارچ روشن کر کے خیمے کی چھت سے آویزاں کی اور موسم کے تیور دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔ جو کچھ بھی تھا لیکن اس چٹان کے اوپر وہ ایولانچ سے محفوظ تھے اور ایولانچ کے برفانی بہاؤ کے سوا اس خیمے کو اور کسی آفت سے خطرہ بھی نہیں تھا۔

شام کے بعد طوفان نے مزید شدت پکڑ لی۔ انہوں نے ٹن پیک فوڈ استعمال کیا۔ فوڈ کو بیٹری کے ذریعے گرم کرنے کا سسٹم بھی ان کے پاس موجود تھا۔ اس برفانی ویرانے میں اس شدید موسم کے اندر انہیں گھر جیسا کھانا ملا۔ گرم چکن قورما جیسے ابھی ہانڈی سے نکلا ہو اور چاول۔ یہ

سب جدید ایجادات کے ثمرات ہی تو تھے۔ ٹن پیک کا طریقہ کار 'جادو' کی طرح کام کرتا تھا۔

نہایت خراب موسم کی وجہ سے واکی ٹاکی بھی ٹھیک سے کام نہیں کر رہا تھا۔ شور زیادہ تھا، آواز کم سنائی دیتی تھی۔ سرمد صاحب نے کرسٹل اور عادل کو رات گزارنے کے حوالے سے کچھ ضروری ہدایات دیں۔ ان میں سب سے اہم ہدایت خیمے کی آہنی میخوں کی پڑتال کے متعلق ہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ سلیپنگ بیگز میں گھس کر لیٹ گئے۔

''توم کو زیادہ پین تو نا ئیں؟'' کرسٹل نے شیریں لہجے میں پوچھا۔

''نہیں، زیادہ تو نہیں۔''

''مطلب یہ کہ کچھ نہ کچھ ہے، چلو ہام تمہارا ٹریٹ منٹ کرتا۔''

عادل نے انکار کیا لیکن وہ اصرار کرتی رہی اور سلیپنگ بیگ میں سے نکل کر اس کے کندھے دبانے لگی۔ اس کے ہاتھوں میں واقعی جادو سا تھا۔ وہ جہاں جہاں ہاتھ رکھتی تھی درد جیسے نچوڑ کر نکال لیتی تھی۔ عادل کو راحت محسوس ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ بولا۔ ''بس اب رہنے دو۔ تم تھک گئی ہو گی۔''

''توم بھول رہا کہ ہام پروفیشنل ہے۔ یہ ہام کے کام کا حصہ، ہام نا ئیں تھکتا۔''

عادل کو اس کی قربت خطرناک لگ رہی تھی۔ اس کا لمس عادل کے جسم میں سنسناہٹ سی جگا رہا تھا۔ ہزاروں فٹ اونچی اس چٹان پر اس تنگ خیمے میں وہ بالکل تنہا تھے اور باہر طوفانی موسم رنگ دکھا رہا تھا۔ درد سے چھٹکارا محسوس ہوا تو عادل کو اونگھ آنے لگی۔ اسے لگا کہ وہ ایک بہت بڑے آسمانی جھولے میں ہلکورے لے رہا ہے۔ شہزادی اس کے بالکل قریب ہے، اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی ہے لیکن نہیں...... یہ شہزادی تو نہیں تھی، یہ تو کرسٹل تھی۔ وہ اپنی نرم پوروں کو اس کے بالوں میں حرکت دے رہی تھی، پھر اس نے اپنے ہونٹوں کو اس کے کان کے بالکل قریب لا کر سرگوشی کی۔ ''عادل! توم سو گئے؟''

''ہوں۔'' عادل نے غنودگی میں جواب دیا۔

کچھ دیر بعد عادل کو لگا کہ وہ اپنی انگلی اس کے کان میں گھما رہی ہے۔ پھر اس نے اپنے گرم ہونٹوں سے اس کے کان کو چھوا۔ ''نہ کرو کرسٹل......'' عادل نے کروٹ بدلی۔ وہ عقب سے پوری کی پوری اس کے ساتھ پیوست ہو گئی۔ عادل نے اسے دور ہٹانے کی کوشش کی۔ وہ ذرا فاصلے پر چلی گئی لیکن کچھ دیر بعد پھر قریب آگئی۔ اس کے انداز میں عجیب سی شوخی اور حرارت تھی۔ عادل کے اندر ایک آگ سی سلگنے لگی اور اس آگ سے اسے اندیشے محسوس ہونے لگے۔ اسے لگا کہ یہ تنہائی، یہ موسم اور یہ منہ زور قربت اسے کمزور کر رہی ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ خیمے سے نکلے اور باہر کے یخ بستہ موسم میں جا کھڑا ہو۔ کرسٹل کی پیش قدمی اب اور واضح ہو گئی تھی۔ وہ مغربی تہذیب کی پروردہ تھی۔ مرد و زن کی قربت اس کے لیے ایک کھیل سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتی تھی لیکن عادل کے لیے اس کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔ کسی کو کھونے یا پانے کا سوال تھا۔ زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ اس نے سوچا، تو کیا آج وہ ہار جائے گا؟ یہاں اس جگہ شہزادی کی محبت کو ہار جائے گا؟

عادل کے اندر کمزوری محسوس کرنے کے بعد کرسٹل کا حوصلہ اب بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ چت لیٹا تھا۔ اس نے اسے باقاعدہ بانہوں میں لے لیا اور اپنے ہونٹوں کو اس کے چہرے سے ہم کلام کرنے لگی۔ اچانک ایک نیا خیال عادل کے ذہن میں آیا۔ اس نے کرسٹل کو ذرا دھکیل کر خود سے پیچھے ہٹایا۔ ٹینٹ لیمپ کی مدھم روشنی میں اس کے تمتمائے چہرے کو دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ''کرسٹل! مجھے ایک بات سچ بتانا۔ جھوٹ نہ بولنا۔''

''کیسا بات؟''

''اینکر اتفاقاً دراڑ میں گرا تھا...... یا تم نے جان بوجھ کر......'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''توم ہام پر شک کرتا؟''

''تم نے شک کرنے کی ٹھوس وجہ سامنے رکھ دی ہے۔ ایسا کیوں کر رہی ہو تم؟ اگر یہاں ایسا کچھ ہوا تو یہ میرے لیے...... بہت برا ہوگا...... بہت زیادہ۔''

اس نے تیزی سے ایک بار پھر عادل کے رخسار کو چوما اور بولی۔ ''توم کا مطلب اگر ہام دونوں ''ٹو نائٹ'' ایک دوسرے کے کلوز آجاتا تو یہ توم کے لیے ہارم فل ہوئیں گا۔''

''بالکل۔'' عادل نے بہ مشکل اس کے آتشیں بدن سے نظر چراتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟ ایسا کیوں ہوئیں گا؟''

''اس لیے کہ میں ایک لڑکی سے پیار کرتا ہوں۔ دل و جان سے اس کو چاہتا ہوں۔''

''تو اس سے کیا فرق پڑتا؟'' وہ آنکھیں جھپک کر بولی۔

''تم لوگوں کے لیے شاید نہ ہو لیکن ہمارے لیے یہ

بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ ہم جب...... کسی سے پیار کرتے ہیں تو خود کو اس کی امانت سمجھتے ہیں اور وہ بھی خود کو ہماری امانت سمجھتا ہے۔ ایک دوسرے کا خیال دل میں بسائے اپنی منزل کو پانے کی خواہش دل میں پالتے ہیں۔ دوری سہتے ہیں، دکھ جھیلتے ہیں، اندر ہی اندر ٹوٹتے بکھرتے ہیں لیکن ایک امید کے سہارے چلتے رہتے ہیں۔ اور یہ امید...... اور یہ طاقت کہاں سے پیدا ہوتی ہے؟ یہ اس احساس سے پیدا ہوتی ہے کہ ہم وفا کررہے ہیں۔ ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کی آرزو کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔"

وہ غور سے عادل کا چہرہ دیکھتی رہی پھر بولی۔ "پلیز ڈونٹ مائنڈ...... اس کے باوجود بھی اکثر آپ لوگ ناکام ہی ہوتے ہیں۔"

"ہم اس ناکامی کو بھی کامیابی ہی کی طرح گلے سے لگاتے ہیں کرسٹل۔ بس ہم ایسے ہی ہیں، ہمیشہ سے ایسے ہی ہیں۔"

وہ انگریزی میں بولی۔ "زندگی بس آہیں بھرنے کا نام ہی تو نہیں عادل۔ زندگی تو وہی ہے بس...... جو ہم جی لیتے ہیں۔ خوشیاں وہی ہوتی ہیں جو حقیقی زندگی میں ہمیں مل جائیں۔ باقی تو سب وہی ہے نا جسے ہندی میں "سندر سپنا" کہا جاتا ہے...... اور اردو میں شاید ایسا ہی کوئی اور لفظ ہے۔"

"مشرق اور مغرب میں یہ فرق تو ہمیشہ ہی رہے گا۔"

وہ اس سے بغل گیر ہوگئی اور اس کا رخسار چوم کر بولی۔ "ہام کا خیال توم کے خیال سے بہت مختلف ہائیں۔ لیکن ہام توم پر زبردستی کچھ ناہیں ٹھونسے گا۔ ہاں توم کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرتا رہیں گا۔"

باہر بارش مسلسل جاری تھی۔ وادیوں اور چوٹیوں پر بادل دھاڑ رہے تھے، ان کی چمک خیمے کے اندر تک آتی تھی۔ عادل کا خیال تھا کہ شاید وہ شہزادی کے بارے میں اور کچھ پوچھے گی لیکن اس نے یہ موضوع نہیں چھیڑا۔ وہ پہلو بہ پہلو لیٹے رہے اور موسم کی جولانیاں دیکھتے رہے۔ کرسٹل جیسی شعلہ صفت اور آزاد خیال لڑکی کے اتنا قریب رہ کر اس سے دور رہنا کافی صبر آزما بلکہ تکلیف دہ تھا لیکن عادل یہ تکلیف جھیلتا رہا۔ بہر حال یہ سنسنی خیز رات گزر گئی اور صبح ہوگئی۔

بارش ختم ہوچکی تھی لیکن دور گہری وادیوں میں ابھی تک بادلوں کے لشکر خیمہ زن تھے جیسے رات بھر کے معرکے کے بعد اب ستا رہے ہوں۔ عادل نے خیمے سے باہر نکل کر دیکھا۔ نیچے اپنا پڑاؤ اسے نظر نہیں آرہا تھا۔ پڑاؤ دیکھنے کے لیے اسے تھوڑا آگے جانا پڑا۔ نیچے گہرائی میں خیمے دکھائی دے رہے تھے مگر بہت واضح نہیں تھے۔ بادلوں کے پرے خیموں کے اردگرد موجود تھے۔ اسے لگا کہ جیسے سرمد صاحب خیمے سے باہر ہیں اور چٹان کی چوٹی کی طرف ہی دیکھ رہے ہیں۔ یہاں سامان میں ٹیلی اسکوپ موجود نہیں تھی۔ عادل نے اندازاً ہی ان کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ چند سیکنڈ بعد ہیولا، جو یقیناً سرمد صاحب کا ہی تھا، دھند لا بادلوں میں چھپ گیا۔ کرسٹل نے واکی ٹاکی پر سرمد صاحب سے رابطہ کیا۔ "سر! ہام نیچے آنے کے لیے ریڈی ہے لیکن پہلے ہام اینکر باہر نکالنے کا ٹرائی کریں گا۔"

"ٹھیک ہے...... کوشش کرو کہ وہ کسی طرح نکل آئے۔"

"او کے سر۔" کرسٹل نے ادب سے کہا۔

ان دونوں نے قریباً ایک گھنٹا مزید کوشش کی۔ ایک بار تو اینکر آہنی کنڈے میں پھنس بھی گیا لیکن دس پندرہ فٹ اوپر آکر دوبارہ پھسل گیا۔ تھک ہار کر گیارہ بجے کے لگ بھگ کرسٹل اور عادل طے شدہ طریقے کے مطابق نیچے اتر آئے۔ کاربینرز کے اندر نائلون کے مخصوص رسے پھسلتے چلے گئے اور وہ چھوٹی چھوٹی جستوں کے ذریعے نیچے اترتے گئے۔ اس سے پہلے عادل یہ عمل اندازاً دس منٹ میں مکمل کر رہا تھا لیکن کندھوں اور گردن کی تکلیف کے سبب اس نے کرسٹل جتنا وقت ہی لیا۔ یعنی قریباً پندرہ منٹ۔

پاؤنڈوں نے ایک بار پھر کرسٹل کو دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ ان کا انداز بڑا تاؤ دلانے والا ہوتا تھا۔ ہمایوں کو انفلوئنزا تھا اور وہ شدید بخار بھی محسوس کررہا تھا۔ تاہم سرمد صاحب کی روایت پر چلتے ہوئے اس نے بھی کوئی دوا نہیں کھائی تھی اور روزمرہ کے چھوٹے موٹے کام بھی انجام دے رہا تھا۔ پاؤنڈے اپنے ساتھ تین بڑے بڑے خچر بھی لائے تھے۔ ان میں سے ایک خچر پر بہت سی خشک لکڑیاں لدی ہوئی تھیں۔ رات کے وقت پہرے دار کبھی کبھی آگ بھی روشن کرلیتے تھے۔ سرمد صاحب کو مکمل رپورٹ دینے کے بعد عادل اپنے خیمے میں چلا گیا۔ وہ ایک بار پھر درد محسوس کرنے لگا تھا۔ خیمہ خالی تھا۔ انفلوئنزا کی وجہ سے ہمایوں کو سرمد صاحب نے علیحدہ خیمہ دیا ہوا تھا۔ اپنے درد سے لڑتے لڑتے عادل جلد ہی اونگھنے لگا اور پھر سو گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو رات ہوچکی تھی۔ کرسٹل اس کے خیمے میں موجود تھی۔ آج اس نے بال سنوارے ہوئے تھے اور خوب نکھری ہوئی نظر آتی تھی۔ وہ اس کے سر اور گردن کا مساج کرنا چاہتی تھی لیکن اب عادل کو اس عمل میں شدید خطرات نظر آتے تھے۔ وہ آناً فاناً جذبات کی ہر حد تک چلی جانے والی لڑکی تھی۔ آج عادل نے اس کو خود سے دور

ہی رکھا۔ کرسٹل نے اپنے سامنے عادل کو کھانا کھلایا۔ اپنی شوخیِ حسن اور اداؤں سے عادل کے دفاع کی پتھریلی دیوار میں شگاف ڈالنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر باقی کا کام شاید آئندہ پر چھوڑ کر چلی گئی۔

رات کو پھر تیز بارش ہوتی رہی۔ صبح بارش تو رک گئی لیکن بادلوں کے پرے قرب وجوار میں منڈلاتے رہے۔ سے نوکی فنک یوس چوٹی بھی سیاہی مائل بادلوں میں چھپی ہوئی تھی۔ ناشتے کے فوراً بعد سرمد صاحب، عادل کے خیمے میں داخل ہوئے۔ ان کا زخمی کندھا ابھی تک پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا۔ "عادل! رات بھر بارش ہوتی رہی ہے اور لگتا ہے کہ آج پھر دوپہر کے بعد یہ سلسلہ شروع ہوجائے گا۔ اگر وہ اینکر وہیں اوپر بارش میں پڑا رہا تو خراب ہوجائے گا۔ اس میں "ڈیجیٹل سینسر" لگے ہوئے ہیں جو زیادہ دیر پانی میں رہنے سے ڈسٹرب ہوجائیں گے۔ یہ کافی قیمتی آلہ ہے۔ سب سے اہم یہ کہ یہ آگے چل کر ہمیں کام دینے والا ہے۔ ہمیں آج کوشش کرکے اسے اتار لینا چاہیے۔"

"جج...... جی سر۔"

"ہمایوں تو ابھی تک بخار میں پڑا ہے۔ تمہیں اور کرسٹل کو ہی تھوڑی سی ہمت کرنا پڑے گی۔ میں نے تین چار طرح کی ہکس تیار کردی ہیں، ان میں ایک مقناطیسی ہک بھی ہے۔ مجھے امید ہے تم لوگوں کو رسی کے ذریعے اینکر نکالنے میں زیادہ دقت نہیں ہوگی۔"

عادل کو دل ہی دل میں کچھ جھلاہٹ محسوس ہوئی لیکن اس نے اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اس کے سر اور گردن کے درد میں تھوڑا سا افاقہ ہوا تھا۔ اگر آج پھر وہ مشقت کرتا تو بات دوبارہ وہیں پر آجاتی۔

"تم چپ ہوگئے ہو!" سرمد صاحب نے استفسار کیا۔

"نن...... نہیں...... جیسے آپ کہتے ہیں۔" عادل نے کہا۔

اسے اندازہ ہوا کہ سرمد صاحب نے شاید اس کی اندرونی کیفیت کو محسوس کرلیا ہے۔ اس دوران میں راب خان کے گرجنے برسنے کی آواز آنے لگی۔ وہ اپنی بیوی سومنہ سے کسی بات پر جھگڑ رہا تھا۔ وہ بھی بلند آواز میں بول رہی تھی۔ راب خان نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ برف پر جا گری۔ داخون ان کے درمیان بیچ بچاؤ کی کوشش کرنے لگا۔ سرمد صاحب بھی باہر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد یہ معاملہ ٹھنڈا ہوگیا...... اور سومنہ کی چنگھاڑتی ہوئی آواز دھیرے دھیرے ایک بھنبھناہٹ میں بدل گئی۔

عادل خیمے میں گم صم لیٹا تھا۔ کسی وقت سرمد صاحب کا رویّہ اسے پریشان کردیتا تھا۔ وہ جانتے بھی تھے کہ وہ پوری طرح فٹ نہیں ہے اس کے باوجود اسے ریسٹ نہیں دے رہے تھے۔ حوصلے اور برداشت کا مظاہرہ دوسری بات ہے، اپنی ہمت سے بڑھ کر تکلیف جھیلنا اور خود کو بیمار کرلینا دوسری بات۔ وہ دیر تک اپنے آپ میں الجھا رہا۔ وہ خود تو سرمد صاحب سے کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ کرسٹل کے ذریعے اپنے دل کی بات سرمد صاحب تک پہنچا دے۔ مگر کچھ دیر بعد اس نے ایک منظر دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ خیمے کے روزن میں سے اسے دور وہی مشق والی بلند وبالا چٹان نظر آئی جو ایک مستطیل بلاک کی طرح ڈیڑھ دو ہزار فٹ کی بلندی تک چلی گئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ کرسٹل اس پر چڑھائی کررہی ہے اور اس کے ساتھ خود سرمد صاحب ہیں...... ہاں، وہ سرمد صاحب ہی تھے۔ ان کے کندھے کا زخم ابھی کچا تھا۔ اس میں ٹانکے لگے ہوئے تھے۔ بازو ہلانے جلانے میں بھی انہیں دقت ہوتی تھی لیکن وہ رسوں کے ذریعے کلائمبنگ کررہے تھے۔ یہ تو دیوانہ پن تھا۔ عادل بے تاب ہوکر خیمے سے نکل آیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ دوڑ کر جائے اور آواز دے کر سرمد صاحب کو اوپر جانے سے روک لے لیکن وہ اب کافی بلندی پر جاچکے تھے۔ تین چار سو فٹ کی کلائمبنگ ہوچکی تھی۔ وہ "صم بکم" وہیں کھڑا رہا۔

اسے خود پر افسوس ہونے لگا۔ اس نے سرمد صاحب کے سامنے تذبذب کا رویّہ کیوں دکھایا۔ اسے کرسٹل پر بھی افسوس ہوا کہ اس نے اسے بے خبر رکھا۔ بہر حال اب کیا ہوسکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

سرمد صاحب اور کرسٹل کی واپسی قریباً دو گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ اینکر واپس لانے میں کامیاب رہے تھے۔ عادل نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ سرمد صاحب کے کندھے کی ڈریسنگ خون آلود ہورہی تھی۔ مگر ان کا چہرہ...... اس پر کرب یا کسی طرح کی ناراضگی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ بالکل نارمل انداز میں عادل کی طرف آئے اور مسکراتے لہجے میں بولے۔ "بہت اچھا ہوا کہ میں خود چلا گیا، ورنہ تم دونوں کو شاید دقت ہوتی۔"

عادل دل گرفتہ انداز میں بولا۔ "لیکن سر! آپ کو اپنے زخم کا خیال کرنا چاہیے تھا۔ دیکھیں ساری پٹی بھیگ رہی ہے۔"

"نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ابھی دوسری ڈریسنگ کرلیتا ہوں۔" انہوں نے کہا اور عادل کا کندھا تھپکتے ہوئے اپنے ٹینٹ کی طرف چلے گئے۔

عادل نے کرسٹل کو گھورا۔ ''بہت افسوس ہے کرسٹل...... تمہیں سر کو روکنا چاہیے تھا۔''
''وہ جب کوئی فیصلہ کرتا تو پھر نا ہیں رکتا۔ ان کے لیے یہ سب کچھ نارمل...... تو م ان کو آچھی طرح نا ہیں جانتا، مگر ہام جانتا۔''
سرمد صاحب کے زخم کے دو تین ٹانکے ٹوٹ گئے تھے۔ کافی بلیڈنگ بھی ہوئی تھی۔ کرسٹل کے مطابق ٹانکے دوبارہ لگانا مناسب نہیں تھا۔ بہرحال اس نے اچھی طرح ڈریسنگ کردی۔ اس نے بہت اصرار کرکے سرمد صاحب کو اینٹی بایوٹک ڈوز بھی دی۔ وہ حسبِ معمول خوش دلی کے ساتھ کرسٹل اور عادل سے باتیں کرتے رہے۔
سچ کہتے ہیں کہ کسی اچھی بات کی زبانی تلقین کے بجائے اس کا عملی مظاہرہ زیادہ اثر رکھتا ہے۔ سرمد صاحب نے جو کچھ کیا تھا، وہ عادل کے ذہن میں جیسے بہت گہرائی تک اتر گیا تھا۔ وہ دیر تک اس بارے میں سوچتا رہا۔ شام کو اس نے سرمد صاحب کو بالکل خوش و خرم پایا۔ وہ اپنے بازو کو بھی معمول کے مطابق حرکت دے رہے تھے۔ کچھ دیر بعد جب وہ خیمے میں اکیلے تھے، عادل ان کے پاس جا بیٹھا۔ ''سر! میں اپنے صبح والے رویے پر بہت شرمندہ ہوں۔ میری سستی کی وجہ سے آپ کو زخمی حالت میں کرسٹل کے ساتھ جانا پڑا۔''
''نہیں تم نے تو ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی۔ مجھے خود ہی لگا تھا کہ مجھے خود کو تھوڑا سا ایکٹیو کرنا چاہیے۔ اور دیکھو، اس کا نتیجہ اچھا ہی نکلا ہے۔ زخم میں جو تھوڑا بہت ''پس'' تھا، وہ بھی نکل گیا ہے اور میں خود کو ہلکا محسوس کررہا ہوں۔''
''لیکن سر! آپ نے بہت تکلیف تو برداشت کی نا۔''
''تکلیف تو ہوتی ہی برداشت کرنے کے لیے ہے اور اسی کے اندر سے تو خوشی پھوٹتی ہے۔'' انہوں نے اتنے یقین سے کہا جیسے ''تکلیف'' کسی ٹھوس شے کا نام ہو اور وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اس میں سے خوشی کو پھوٹتے دیکھ رہے ہوں۔
عادل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''سر! آپ نے یہ تکلیف اور برداشت والی بات پہلے بھی ایک دو دفعہ کی ہے۔ مجھے معاف کیجیے گا، سننے میں تو یہ باتیں اچھی لگتی ہیں لیکن جب ہم واقعی شدید تکلیف کا سامنا کرتے ہیں تو پھر ہمت جواب دینے لگتی ہے۔''
وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''میرا خیال ہے تم جسمانی تکلیف کی بات کررہے ہو...... جسمانی تکلیف دراصل اتنی ہوتی نہیں جتنی ہم اسے محسوس کرتے ہیں۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کا پیٹ تیز دھار آلے سے چیر دیا جائے اور انتڑیاں وغیرہ نکال کر باہر رکھ دی جائیں تو اس کی حقیقی تکلیف بس کٹ لگنے کی ایک ٹیس ہوتی ہے۔ جو آسانی سے برداشت کی جاسکتی ہے لیکن اگر مریض ہوش و حواس میں ہو اور یہ سارا عمل اپنی آنکھوں سے دیکھے تو درد کی وجہ سے بدحال ہوجائے۔ تو یہ سارا درد دراصل ہماری اپنی سوچ اور پچھلے تجربات کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اٹلی کے ایک ایسے ڈاکٹر کو دیکھا ہے جس کے بازو کی ہڈی کار ایکسیڈنٹ میں بری طرح ٹوٹ گئی تھی۔ اسے بے ہوش کرنا مناسب نہیں تھا۔ سرجن نے اس کے سامنے اس کی ہڈی ''مشینی آری'' سے کاٹی اور وہ سکون سے بیٹھا دیکھتا رہا۔ اسے پتا تھا کہ ہڈی میں اعصاب نہیں ہوتے لہٰذا اس میں درد بھی نہیں ہوتا۔ کوئی اور شخص ہوتا تو وہ شاید بے پناہ درد محسوس کرتا۔ دراصل جب ہم اپنے درد میں ڈوب جائیں اور اس کی اصل شدت کو جانچیں تو وہ اپنی ظاہری شدت سے کہیں کم نکلتی ہے۔''
''اور جناب جو ذہنی اذیت یا پریشانیاں ہیں ان کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟''
''سب سے اہم بات تو یہی ہے جو آج کل نفسیات دان اور سوشیالوجسٹ پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں اور وہ یہ کہ ہمارے زیادہ تر فکر اور اندیشے دراصل فکر اور اندیشے ہی ہوتے ہیں۔ قریباً نوّے فیصد اندیشے کبھی بھی حقیقت کا روپ نہیں دھارتے۔ اس لیے مستقبل کے بارے میں پریشان ہونے کے بجائے ہمیں حال پر نظر رکھنی چاہیے اور حال کے مسئلوں کو حل کرنا چاہیے۔ لیکن یہ ایک طویل موضوع ہے پھر کبھی سہی۔ اس وقت میں تم سے ایک اہم سوال پوچھنا چاہ رہا ہوں۔''
''جی پوچھیں۔'' عادل نے ادب سے کہا۔
''کیا تم شہزادی کو واقعی بہت زیادہ چاہتے ہو؟''
وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''اس میں کوئی شک نہیں جناب۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے میں سر دھڑ کی بازی لگا سکتا ہوں۔''
''تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم اسے حاصل کرلو گے۔ جب بندہ کسی منزل کو اپنے ذہن میں رکھ کر شدید جسمانی اور ذہنی تکلیف جھیلتا ہے اور اپنے قدم روکتا نہیں تو وہ ضرور منزل پر پہنچتا ہے...... اور مجھے لگتا ہے کہ تم ایسا کر رہے ہو۔ شرط صرف ایک ہی ہے، مایوس ہو کر اپنے قدموں

کو روکنا نہیں۔“

”سر! کسی وقت میں بہت پریشان ہوجاتا ہوں، سوچتا ہوں کہ میں تو اپنے گاؤں سے اتنی دور یہاں ان برفوں میں نکل آیا ہوں۔ وہاں پتا نہیں کیا ہو رہا ہوگا۔“

”کچھ نہیں ہوگا انشاء اللہ۔ تم نے جو کچھ مجھے بتایا ہے، اس سے یہی پتا چلتا ہے کہ تمہارے تایا جان اپنا وعدہ نبھائیں گے۔ انہوں نے یہی کہا ہے نا کہ اگر تم نے کچھ کرنا ہے تو ڈھائی تین سال کے اندر کرکے دکھاؤ۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کے دل کا حال بھی بہت حد تک جانتے ہیں۔“

”لیکن...... سر! میں اپنے دل کا کیا کروں؟ یہ ہر وقت اسی طرف لگا رہتا ہے۔“

”یہی تو وہ ذہنی کوفت ہے جس کا میں نے تمہیں ابھی بتایا ہے۔ ہم جس منزل کے لیے جسم کو دکھ دیتے ہیں اور اپنے دل و دماغ کو دکھ دیتے ہیں، وہ ہمارے قریب آنا شروع ہوجاتی ہے۔ شرط صرف اور صرف ایک ہی ہے، ہم حوصلہ نہ ہاریں۔“

عادل بولا۔ ”آپ نے ذہنی کوفت کی بات کی ہے اور یہ کوفت تو میں محسوس کرتا ہوں سر! اور کئی طرح سے کرتا ہوں۔ پتا نہیں کہ مجھے آپ کو بتانا چاہیے یا نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ کبھی کبھی یہ کرسٹل بھی میرے لیے بہت بڑی کوفت بن جاتی ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے یہ امتحان لے رہی ہے میرا۔“

سرمد صاحب گہری نظروں سے عادل کی طرف دیکھنے لگے۔ بالکل خاموش اور کھوئے ہوئے سے۔ پھر ان کے ہونٹوں پر مدھم سا تبسم ابھرا اور بولے۔ ”میرا خیال ہے کہ جو تم کہنا چاہتے ہو، میں وہ سمجھ رہا ہوں۔ یہ کرسٹل فطری طور پر بری لڑکی نہیں ہے لیکن اس کا پرابلم یہ ہے کہ یہ ایک آزاد معاشرے میں پلی بڑھی ہے۔ ان لوگوں کے نیکی بدی کے اپنے پیمانے ہیں۔ مجھے کئی دن پہلے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ تمہاری طرف جھکاؤ رکھتی ہے۔ اگر میں اسے منع کرتا تو یہ منع ہوجاتی لیکن پتا نہیں کیوں، میں نے اس حوالے سے اس کے ساتھ کوئی بات نہیں کی۔“

”آپ کے ذہن میں کیا تھا سر؟“

”اگر اب میں تمہیں بتاؤں گا تو شاید تم یقین نہ کرو یا میرا مذاق اڑانے لگو لیکن میرے کچھ اپنے خیالات ہیں اور ان خیالات پر مجھے بے پناہ یقین ہے۔ عام لوگ شاید ان کو بے وقوفی سمجھیں اور...... شاید تم بھی یہی سمجھو۔“

”نہیں سر! مجھے تو لگتا ہے کہ آپ عام لوگوں سے آگے سوچ لیتے ہیں۔ مجھے اپنی سوچ آپ کے سامنے کبھی کبھی بہت چھوٹی محسوس ہونے لگتی ہے۔“

وہ طویل سانس لے کر بولے۔ ”یہ بات پھر وہیں پر آتی ہے عادل! کسی کے لیے جسمانی اور ذہنی تکلیف سہنا۔ یہ جو کسی کی خاطر اپنے آپ کو دنیاوی لذتوں اور برائیوں سے بچانا ہوتا ہے، یہ بھی ذہنی تکلیف کی ایک قسم ہی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ تم یہ تکلیف جھیل رہے ہو۔ میرا مطلب ہے کہ کرسٹل کی قربت سے خود کو بچایا ہے تم نے۔ اس بات پر پورا بھروسا رکھو عادل! تکلیفیں کبھی رائگاں نہیں جاتیں۔ یہ ہماری منزلوں کو ہمارے قدموں کی طرف کھینچتی ہیں۔ اس عمل میں دیر تو ہوسکتی ہے، اندھیر نہیں۔“

وہ سرمد صاحب کی بات کی گہرائی میں اترنے کی کوشش کرنے لگا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ جب وہ کرسٹل کی پیش قدمی کو رد کرتا تھا اور کامیاب ہوتا تھا تو اس کے اندر ایک عجیب سا یقین ابھرنے لگتا تھا۔ اس کے رگ و پے میں ایک اضافی توانائی پیدا ہوتی تھی اور یہ توانائی کہتی تھی، تم وفا کر رہے ہو اور وفا رائگاں نہیں جاتی۔

اگلے روز عادل نے نہ صرف ہمایوں کے ساتھ مل کر ڈیڑھ دو ہزار فٹ تک کلائمبنگ کی بلکہ زبردست رزلٹ بھی دیا۔ زابے خاں اور اس کے ساتھی بھی عادل کی کارکردگی پر حیران ہوئے۔ وہ منجھے ہوئے کوہ پیماؤں کی طرح پرفارمنس دے رہا تھا بلکہ کہیں کہیں تو چونکا دینے والی تیزی دکھا جاتا تھا۔ یہ سب اس توانائی کا کرشمہ تھا جو کل سرمد صاحب کی برداشت اور ہمت نے اس کے اندر پیدا کی تھی۔ عادل کی اس دلیرانہ جدوجہد کا نتیجہ اچھا ہی نکلا۔ ایک تو اس کا یہ وہم دور ہوا کہ وہ مشقت کرے گا تو اس کی گردن اور کندھوں کا درد بڑھ جائے گا۔ دوسرے سہ پہر تک اس نے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنا شروع کردیا۔ اس کے سر کا درد تو تقریباً معدوم ہی ہوچکا تھا۔ کھل کر پسینا آیا تھا اور اس نے پٹھوں کو رواں دواں کردیا تھا۔

تیسرے روز وہ لوگ ٹریکنگ کے لیے بانگری پہاڑی کی طرف نکلے۔ اب چوٹی پر چڑھائی کے دن قریب آرہے تھے اور ضروری تھا کہ وہ اس پہاڑ اور اس کے راستوں کو نسبتاً قریب سے دیکھیں۔ ہمایوں اب بالکل ٹھیک تھا مگر سرمد صاحب انفلوئنزا میں مبتلا ہوگئے تھے۔ وہ اس حالت میں بھی ”بانگری“ کی طرف جانے کو بہ خوشی تیار تھے لیکن کرسٹل اور ہمایوں نے اصرار کرکے انہیں آرام کرنے کے لیے کہا۔ کرسٹل، ہمایوں اور عادل کے ساتھ زابے خاں کے دو ساتھی بھی تھے۔ ان میں سے ایک کا نام رمزی خاں تھا۔ رمزی خاں علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا اور باؤنڈہ بستی میں اسے ”راستوں کا کیڑا“ کہا جاتا تھا۔ چوٹی کے اردگرد کے

تمام معروف اور غیر معروف راستے اسے ازبر تھے۔ یہ لوگ صبح سات بجے کے لگ بھگ ناشتے کے فوراً بعد روانہ ہوئے۔ ایسی ٹریکنگ میں کسی برف پوش دراڑ میں گرنے کا خطرہ موجود رہتا ہے، اس لیے ان سب نے خود کو ایک رسے سے منسلک کر رکھا تھا۔ سروں پر ہیلمٹ تھے۔ رمزی خاں کے پاس پستول موجود تھا۔ اس کے مونچھیل ساتھی کے پاس بیون ایم ایم رائفل تھی اور یہ اس نے کندھے پر لٹکانے کے بجائے ہاتھ میں لے رکھی تھی۔ یہ مونچھیل بہت چوکس شخص تھا اور کیمپ میں بھی ہر وقت سرمد صاحب اور ان کے ساتھیوں پر عقابی نظر رکھتا تھا۔

موسم ٹھیک تھا۔ برفیلی چوٹیاں روپہلی کرنوں میں چمک رہی تھیں۔ ان سب نے کانٹے دار جوتے (Crampons) پہن رکھے تھے۔ اپنی واکنگ اسٹکس کے سہارے وہ برف پوش راستوں پر چلتے آگے بڑھتے رہے۔ یوں تو بانگری چوٹی کیمپ سے قریب ہی نظر آتی تھی لیکن جب انہوں نے چلنا شروع کیا تو وہ جیسے دور ہٹتی گئی۔ عادل نے کہا۔ ”ہمایوں بھائی! تمہارا کہا درست ہی تھا۔ پہاڑ کے دامن تک کم از کم سات آٹھ کلومیٹر کا سفر تو ہے۔“

ہمایوں نے حسب معمول اثبات میں سر ہلا کر ”ہاں“ میں جواب دیا۔ دوپہر بارہ بجے تک چلنے کے باوجود وہ پہاڑ کے دامن سے تین چار کلومیٹر دور تھے۔ پہاڑ اب بہت واضح طور پر نظر آرہا تھا۔ یقیناً اس جانب سے چڑھائی کے لیے یہ ایک ہیبت ناک پہاڑ تھا۔ لگتا تھا کہ آٹھ دس ہزار فٹ اوپر جانے کے بعد چڑھائی کا کچھ پورشن بہت دشوار ہوجائے گا۔ شاید یہی وہ مشکل پورشن تھا جس کے لیے سرمد صاحب کو عادل کی خصوصی مہارت کی ضرورت تھی۔

رمزی نے کہا۔ ”اب کیا چاہتا ہے تم لوگ...... اور آگے جایا جائے یا واپس چلیں؟“

ہمایوں نے کہا۔ ”اب اتنی دور آگئے ہیں تو کچھ اور پاس چلے جاتے ہیں۔“

”خو تو پھر جلدی کرو۔ ام کو شام سے پہلے کیمپ میں واپس بھی پہنچنا ہے۔“

کرسٹل اردگرد کے منظر سے لطف اندوز ہورہی تھی۔ یہ جگہ اسے بہت اچھی لگی تھی۔ یہاں ہر طرف برف تھی...... اور ایک چھوٹا سا گلیشیر دھوپ کی تمازت سے ڈھلوان پر سرک سرک کر نیچے گر رہا تھا۔ وقفے وقفے سے پُرشور گونج پیدا ہوتی تھی۔ برف نے پگھل پگھل کر عجیب و غریب مجسموں کی شکلیں دھار رکھی تھیں۔ کرسٹل کا دل فوٹو گرافی کو چاہ رہا تھا۔ اس کے اپنے گال بھی دھوپ اور مشقت سے سرخ شہابی ہو رہے تھے۔ وہ بولی۔ ”ام یہاں بیٹھتا ہے ہمایوں۔ تو م لوگ آگے کا راؤنڈ لگا آؤ۔“

”کیا آپ تھک گئی ہیں؟“ ہمایوں نے پوچھا۔

”نا ئیں، ایسا بات نا ئیں۔ بس ہام کو یہاں بیٹھنا آچھا لگ رہا۔“

”ٹھیک ہے، ہم ایک گھنٹے کے اندر واپس آجاتے ہیں۔ آپ نے یہیں پر رہنا ہے۔“ ہمایوں نے کہا۔

”او کے!“ وہ بولی اور اپنا کیمرا درست کرنے میں مصروف ہوگئی۔

وہ لوگ آگے روانہ ہوگئے۔ آگے راستہ نسبتاً آسان تھا۔ بہرحال برف اور نیلے آسمان کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بانگری کے کافی نزدیک پہنچ کر انہوں نے تصویریں کھینچیں اور ایک ویڈیو بھی بنائی۔ رمزی اور ہمایوں کلائمبنگ کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ عادل اردگرد کے ہوشربا مناظر میں کھویا رہا۔

جلد ہی وہ لوگ واپس روانہ ہوگئے۔ جب وہ ”سرکتے ہوئے گلیشیر“ کے پاس پہنچے تو ایک حیرت ان کی منتظر تھی۔ کرسٹل کہیں نظر نہیں آئی۔ عادل نے سمجھا شاید وہ کسی نشیب میں اتری ہوئی ہے۔ ہمایوں اور عادل نے کرسٹل کو آوازیں دیں لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ اچانک عادل کی نگاہ ایک چیز پر پڑی اور اس کو اپنا سارا خون سر کو چڑھتا محسوس ہوا۔ ”وہ دیکھو ہمایوں بھائی!“ عادل نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

ہمایوں نے بھی گھوم کر دیکھا۔ کرسٹل کے کیمرے کا اسٹینڈ برف پر پڑا تھا اور پاس ہی کیمرے کا ڈھکن بھی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دونوں دوڑ کر وہاں پہنچے۔ یہاں ایک نشیب تھا۔ ذہن میں آیا کہ شاید وہ پھسل کر نیچے گر گئی ہے لیکن وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ اب رمزی خاں اور اس کا ساتھی بھی فکرمند نظر آرہے تھے۔ رمزی خاں نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ دیکھو۔“

وہ چند قدم آگے گئے۔ یہاں قدرے نرم برف پر گھسیٹے جانے کے نشان صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ان نشانوں کے اردگرد کرسٹل کے قدموں کے نشان تھے اور اس کے علاوہ کسی اور کے قدموں کے نشان بھی تھے۔ یہ کسی مرد کے قدم تھے۔ ہمایوں نے عادل سے مخاطب ہوکر تیز سرگوشی میں کہا۔ ”مجھے لگتا ہے یہ کسی پاؤنڈے کے قدم ہیں۔ شاید...... کرسٹل کو زبردستی یہاں سے لے جایا گیا ہے۔“

ایک دم عادل کے ذہن میں داخون کا منحوس چہرہ گھوم گیا۔ ویسے تو تقریباً سارے پاؤندے ہی کرسٹل کو جلتی نظروں سے دیکھتے تھے مگر داخون کی ہوس ناک نظریں سب سے جدا تھیں۔ وہ تو شاید اسی دن کرسٹل کے ساتھ کچھ کر گزرتا جس دن عادل نے رابے خان وغیرہ کے سوالوں کا جواب دینے سے انکار کیا تھا اور اپنے ساتھیوں کی یہاں موجودگی کے بارے میں چھپایا تھا۔

”کہیں ایسا تو نہیں...... ہمایوں بھائی کہ...... داخون یا کوئی دوسرا ہمارے پیچھے پیچھے یہاں آیا ہو؟“

”کیا کہا جاسکتا ہے۔“ ہمایوں کی آواز پریشانی کی شدت سے ٹوٹ رہی تھی۔

انہوں نے ایک بار پھر کرسٹل کو پکارنا شروع کیا۔ ویران برفستان میں جیسے ان کی صدائیں بس ہواؤں میں ہی گونج کر رہ جاتی تھیں۔ ”واکی ٹاکی پر سرمد صاحب سے رابطہ کرو ہمایوں بھائی۔“ عادل نے مشورہ دیا۔

ہمایوں نے واکی ٹاکی آن کیا مگر سگنل ٹھیک نہیں آرہے تھے۔ شور کے سوا کچھ سنائی نہیں دیا۔ ہمایوں کافی دیر تک ”سر...... سر“ پکارتا رہا لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ واکی ٹاکی بند کر کے وہ مختلف اطراف میں پھیل گئے اور کرسٹل کو تلاش کرنے لگے۔ کوئی چالیس پچاس میٹر آگے عادل کو برف پر ایک براؤن سی چیز دکھائی دی۔ یہ کرسٹل کی ٹوپی تھی۔ یہاں بھی قدموں کے نشان موجود تھے مگر صرف ایک شخص کے۔ یوں لگتا تھا کہ کرسٹل کے ساتھ زبردستی کرنے والے نے اسے اٹھالیا ہے...... شاید بے ہوش کر کے یا پھر ویسے ہی۔ صورتِ حال اب بالکل واضح ہوتی جارہی تھی۔ کرسٹل کے ساتھ کچھ ہوچکا تھا۔ زمینی شہادتیں صاف نظر آرہی تھیں۔ وہ لوگ ان شہادتوں کا پیچھا کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ موچھیل پاؤندے نے تو اپنی رائفل پہلے ہی ہاتھ میں تھامی ہوئی تھی، رمزی خان نے بھی اپنا پستول نکال لیا۔ وہ سب کرسٹل کی طرف سے شدید خطرہ محسوس کررہے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں اپنی طرف سے بھی خطرہ تھا۔ کوئی شخص کسی اوٹ میں موجود ہوسکتا تھا اور ان پر فائر کرسکتا تھا۔ ایک سنگین واقعہ رونما ہوگیا تھا اور اس کے نتیجے میں مزید سنگینیاں رونما ہوسکتی تھیں۔

”کرسٹل کے پاس تو شاید واکی ٹاکی بھی نہیں ہے؟“ عادل نے ہمایوں سے پوچھا۔ ہمایوں نے نفی میں سر ہلایا۔

”ہم سے غلطی ہوئی، ہمیں اسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ میرا دل تو یہی کہتا ہے کہ ان پاؤندوں میں سے کسی نے اس کا پیچھا کیا ہے اور تنہا دیکھ کر پکڑلیا ہے۔“

اب سہ پہر ہورہی تھی۔ سورج کی کرنوں کا زاویہ بدل رہا تھا۔ انہیں قدموں کے نشان مسلسل نظر آرہے تھے اور وہ چوکنے انداز میں ان نشانوں کا پیچھا کر رہے تھے۔ کہیں کہیں وہ رک کر کرسٹل کو آواز بھی دے لیتے تھے۔

”یہ دیکھو ہمایوں بھائی۔ یہ ادھر کیسے نشان ہیں؟“ عادل نے ایک طرف اشارہ کیا۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ یہاں برف پر دھینگا مشتی ہوئی ہے۔ شاید یہاں پہنچ کر کرسٹل ہوش میں آگئی تھی یا وہ پہلے ہی ہوش میں تھی اور یہاں آکر اس نے مزاحمت کا فیصلہ کیا تھا۔ یہاں ایک جگہ برف پر تھوڑا سا خون بھی دکھائی دیا۔ عادل کی آنکھوں میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ اس کا دل چاہا کہ وہ شخص سامنے ہو اور وہ نتائج سے بے پروا ہو کر اس کا بھرتا بنا ڈالے۔

”لگتا ہے کہ یہاں کرسٹل کے ہاتھ پاؤں باندھے گئے ہیں۔“ ہمایوں نے رسی کے دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ ان ٹکڑوں کے پاس ہی کرسٹل کے سن گلاسز کا ٹوٹا ہوا ٹکڑا بھی ملا۔ یہ ثبوت دیکھنے کے بعد وہ لوگ مزید تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ اسی دوران میں ہمایوں نے ایک بار پھر سرمد صاحب سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ رمزی خان اور اس کا ساتھی اس صورتِ حال کے حوالے سے کوئی واضح تبصرہ نہیں کررہے تھے۔ آخر عادل نے تپے ہوئے لہجے میں رمزی خان سے پوچھا۔ ”تمہیں کچھ نہ کچھ تو اندازہ ہو رہا ہوگا کہ یہ تمہارے ساتھیوں میں سے کس کا کام ہے؟“

”ام کو الہام نہیں ہوتا۔ پیروں کے نشان دیکھ کر کون خدائی خوار بتا سکتا ہے کہ یہ کس کے ہیں۔ اس چھوکری کو یہاں رکنا ہی نہیں چاہیے تھا لیکن یہ فرنگی لوگ اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے۔“ رمزی نے جلے بھنے لہجے میں جواب دیا۔

عادل سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ اگر کرسٹل اور اسے اٹھا کر لے جانے والا مل بھی جاتے ہیں تو معلوم نہیں کہ رمزی اور اس کے ساتھی کا رویہ کیا ہوگا۔ کیا وہ اسے چھڑائیں گے یا اپنے ساتھی کے ساتھ ہی مل جائیں گے۔ عادل اور ہمایوں بالکل خالی ہاتھ تھے۔ یہ لوگ مسلح تھے۔ انسان کو انسان سے جانور بنتے ہوئے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ عادل نے سوچنا شروع کردیا کہ اگر کوئی اس طرح کی صورتِ حال پیدا ہوئی تو وہ کیا کردار ادا کرسکے گا۔ پھر اس کا دھیان کئی سو سال پہلے کے اس واقعے کی طرف چلا گیا جو سرمد نے اسے سنایا تھا۔ راجپوت عورتوں کی ہلاکت کا واقعہ۔ وہ سوچنے لگا ہر طرح کے تنازعات میں آخر عورت ہی کیوں ظلم کا نشانہ بنتی ہے۔ دشمنی کسی بھی طرح کی ہو پامال عورت ہی ہوتی ہے۔

وہ ہلکے سے خم دار راستے پر چلتے جارہے تھے۔ عادل

نے ہمایوں کے کان کے پاس سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”کہیں ہم زیادہ دور نہ نکل جائیں، میرا مطلب ہے کہ پاؤندہ بستی کے پاس پہنچ جائیں۔“

”ہاں، رخ تو اسی طرف ہے لیکن اپنی بستی میں تو رمزی وغیرہ بھی جانا نہیں چاہیں گے۔ بستی والوں کو بالکل معلوم نہیں کہ یہ لوگ آج کل ہمارے ساتھ رہ رہے ہیں۔ رابے خان نے یہ سب کچھ بستی والوں سے چھپا رکھا ہے۔“

وہ تقریباً نصف کلومیٹر مزید آگے گئے ہوں گے جب ایک مدھم آواز نے انہیں بری طرح چونکا دیا۔ یہ آواز انہیں بائیں جانب ذرا نشیب سے آئی تھی۔ جیسے کسی کا منہ بند ہو اور وہ چلانے کی کوشش کر رہا ہو۔ آواز دوسری بار ابھری اور اس مرتبہ یہ کافی واضح تھی۔ صاف طور پر یہ نسوانی آواز تھی۔ رمزی اور اس کا موچھیل ساتھی ایک دم چوکس ہوگئے...... رمزی نے تیز سرگوشی میں ان سب سے کہا۔ ”تم یہیں رکو، ام آگے جاتا ہے۔“

اس نے اپنا پستول موچھیل کو دے دیا اور خود اس کی رائفل لیتا ہوا آگے بڑھا۔ چھوٹے چھوٹے برفیلے تودوں سے گزرتا ہوا وہ نشیب کی طرف آگے بڑھ گیا۔ اب وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ عادل کے ذہن میں پھر وہی اندیشے سر اٹھانے لگے۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا کہ ان پاؤندوں کا آئندہ رویہ کیا ہوگا۔ کچھ دیر بعد تودوں کے عقب سے بلند آوازیں سنائی دینے لگیں۔ رمزی خان اور کسی دوسرے شخص میں جملوں کا تبادلہ ہورہا تھا۔ وہ تینوں تھوڑا سا آگے آگئے۔ آوازیں مزید واضح ہوگئیں۔ عادل اور ہمایوں کے اندیشے بالکل درست نکلے تھے۔ جو دوسری آواز ابھر رہی تھی، وہ جانی پہچانی تھی۔ یہ داخون کی بھرائی ہوئی سی آواز تھی۔ وہ دونوں مقامی زبان میں بول رہے تھے لیکن کہیں کہیں الفاظ سمجھ میں آرہے تھے اور مفہوم سمجھنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ داخون کچھ اس طرح کی بات کہہ رہا تھا کہ کوئی اس کے قریب نہ آئے ورنہ وہ فرنگن یعنی کرسٹل کو گولی سے اڑا دے گا۔

داخون کے لہجے سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ شراب کے نشے میں ہے۔

جواب میں رمزی نے بھی کرخت لہجے میں بات کی۔ اس کے جملے میں ”رابے خان“ کا نام آیا۔ غالباً وہ داخون کو بتا رہا تھا کہ وہ جو کچھ کررہا ہے، اس کے نتائج بہت برے نکلیں گے۔ رابے خان اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔

دو تین منٹ تند و تیز جملوں کا تبادلہ ہوا۔ اس دوران میں کرسٹل کی گھٹی گھٹی آوازیں بھی سنائی دیتی رہیں۔ سو فیصد یہ کرسٹل ہی تھی۔ رمزی کے موچھیل ساتھی نے سرگوشی میں عادل کو بتایا۔ ”رمزی خان اسے باہر آنے کو بول رہا ہے۔ اس کے دماغ کو لال پری چڑھا ہوا ہے۔ وہ باہر نہیں آرہا، کہتا ہے کہ چھوکری کو گولی ماردے گا۔“

صورتِ حال تشویش ناک تھی۔ بہرحال عادل کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا تھا کہ شاید رمزی خان منفی رویہ اپنائے گا۔ داخون اس کا قریبی ساتھی تھا لیکن فی الوقت رمزی خان اسے صرف ایک اغوا کار کی حیثیت سے دیکھ رہا تھا اور اسے کرسٹل کو چھوڑنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

یکایک گولی چلنے کی آواز آئی۔ ٹھیک سے پتا نہیں چلا کہ یہ فائر کس کی طرف سے ہوا تھا اور آیا یہ صرف ہوائی فائر تھا یا کسی کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ عادل تیزی سے چند قدم اوپر گیا اور اس نے نشیب میں جھانکا۔ اسے رمزی نظر آیا۔ وہ اپنے ایک کندھے کو دبا کر گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا اور دور سے سفید برف پر خون کے چھینٹے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اسے گولی لگ گئی تھی۔

عادل جلدی سے واپس پلٹا۔ اس نے موچھیل سے کہا۔ ”تمہارے ساتھی کو گولی لگ گئی ہے۔ وہ زخمی ہے۔ اگر تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے تو مجھے دو۔ میں آگے جاکر دیکھتا ہوں۔“

”نہیں، امارے پاس اور ہتھیار نہیں ہے۔“ موچھیل نے جھوٹ بولا اور اپنی سیون ایم ایم رائفل پر گرفت اور مضبوط کرلی۔ عادل جانتا تھا کہ اس کے پاس ایک چھوٹا پسٹل اور بھی موجود ہے، مگر وہ دینے کو تیار نہیں تھا۔

عادل خالی ہاتھ ہی بائیں جانب لپکا۔ ہمایوں بھی اس کے پیچھے آنا چاہتا تھا مگر موچھیل نے گرج کر اسے روک لیا۔ شاید وہ عادل کو بھی روکتا لیکن تب تک عادل کافی آگے نکل چکا تھا۔ وہ نیم دائرے کی شکل میں دوڑتا ہوا ایک کلاوا کاٹ کر اس مقام کے عقب میں پہنچ گیا جہاں سے داخون کی شرابی آواز ابھر رہی تھی۔ یہ دو برفیلے تودوں کے درمیان ایک رخنہ سا تھا، جیسے ایک بغیر چھت کا چھوٹا سا غار ہو۔ ڈھلتی ہوئی شام میں عادل نے بلندی سے جو منظر دیکھا، اس نے اسے سرتاپا ہلا دیا۔ رگوں میں خون کی جگہ سیال آگ سی بہہ نکلی۔ اسے سب سے پہلے کرسٹل ہی نظر آئی۔ وہ پہلو کے بل برف پر پڑی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے تھے، یقیناً پاؤں بھی بندھے تھے لیکن عادل کو دکھائی نہیں دیے۔ اس کے سر پر ٹوپی نہیں تھی اور سنہری مائل بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے بالائی لباس کو اس طرح پھاڑا گیا تھا کہ وہ اس کے جسم پر بس دھجیوں کی صورت باقی تھا۔ بدن پر نوچنے کھسوٹنے کے نشان فاصلے سے بھی دیکھے جاسکتے تھے۔ داخون کا رخ دوسری طرف تھا اور وہ رائفل سونتے کھڑا تھا۔ کرسٹل چونکہ لیٹی تھی اس لیے اس کی نظر

سیدھی عادل پر پڑی۔ عادل نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا...... اور تب اسے یہ بھی پتا چلا کہ کرسٹل کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس کی آواز بند کی گئی ہے۔

عادل کو اپنے سامنے وہی نوری نت نظر آیا جو تشدد اور بے رحمی کی علامت تھا۔ جس نے ہر جگہ اور ہر روپ میں انسانیت کے سینے میں جبر کا خنجر گھونپ رکھا تھا اور عادل کو نفرت تھی اس سے اور اس جیسے سارے تاریک کرداروں سے۔

سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ عادل نے ڈھلوان برف پر اسی طرح سلائڈ لی جیسے بچے چلڈرن پارک میں سلائڈ پر پھسلتے ہیں۔ وہ تیزی سے نیچے آیا۔ اس کا نشانہ داخون تھا۔ عادل اور داخون کے درمیان شاید سیکنڈ کا چوتھائی فاصلہ باقی تھا، جب داخون کو خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے پلٹنا چاہا مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ عادل توپ سے نکلے گولے کی طرح داخون کے کندھوں سے ٹکرایا۔ اس کے دونوں پاؤں نے بڑی قوت کے ساتھ داخون کو ضرب لگائی۔ بھاری بھر کم ہونے کے باوجود داخون کسی ہلکی پھلکی شے کی طرح کئی قلابازیاں کھا گیا۔ تاہم اس ساری ہلچل کے باوجود غیر متوقع طور پر رائفل اس کم بخت کے ہاتھوں میں ہی رہی۔ یہاں پھر وہی صورت حال تھی۔ چمڑی تسمے کی مدد سے رائفل کو کلائی کے ساتھ اٹیچ کرلیا گیا تھا۔ اب یہ بڑی نازک سچویشن تھی۔ رائفل داخون کے ہاتھوں میں تھی اور وہ کسی بھی وقت عادل کی جانب فائر کرسکتا تھا۔ داخون اور عادل کے درمیان کم و بیش چالیس فٹ کی دوری تھی۔ عادل کے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ نتائج سے بے پروا ہو کر داخون کی طرف لپکا۔ داخون نے بے دریغ فائر کیا۔ گولی سنسناتی ہوئی عادل کے کان کے پاس سے گزری۔ عادل کو موت اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آئی۔ پھر دوسرا فائر ہوا اور یہ گولی عین نشانے پر لگی۔ یعنی سینے میں دل کے مقام پر مگر یہ دل عادل کا نہیں تھا، داخون کا تھا۔ یہ فائر سامنے سے رمزی خاں نے کیا تھا اور داخون کے سینے پر لگا تھا۔ وہ رائفل سمیت مردہ چھپکلی کی طرح پشت سے برف پر گرا۔ عادل بھاگتا ہوا اس کے سر پر پہنچا اور رائفل اس سے دور ہٹا دی۔ رمزی خاں بھی موقع پر پہنچ گیا۔ اس کی آنکھیں طیش سے انگارہ ہو رہی تھیں۔ پہلے اس نے داخون پر ایک اور فائر کرنے کا سوچا لیکن پھر جب دیکھا کہ وہ آخری سانس لے رہا ہے تو رک گیا۔

موچھیل اور ہمایوں بھی موقع پر پہنچ گئے تھے۔ ہمایوں دوڑ کر کرسٹل کی طرف گیا اور اس کے منہ سے کپڑا نکالا۔ عادل نے اس کے ہاتھ کھولے، ہمایوں نے پاؤں آزاد کرائے۔ رمزی خاں نے ایک چادر اس کے بالائی جسم پر ڈال دی تاکہ وہ اپنی برہنگی چھپا سکے۔ ایک دوسری چادر داخون پر ڈال دی گئی۔ وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس کے کردار کی طرح اس کا خون بھی سیاہی مائل تھا اور سفید برف پر دور تک پھیلا ہوا تھا۔ کرسٹل سسکنے لگی۔ داخون نے کرسٹل کو بری طرح نوچا کھسوٹا تھا۔ وہ مسلسل شراب بھی پی رہا تھا۔ یقیناً وہ آخری حد تک چلا جاتا لیکن اس سے پہلے ہی وہ لوگ یہاں پہنچ گئے تھے۔ کرسٹل کی کنپٹی پر ایک گومڑ سا تھا اور یہاں سے خون رس رہا تھا۔ یہی خون تھا جو پیچھے راستے میں ایک جگہ ان کو نظر آیا تھا۔

عادل کے پوچھنے پر کرسٹل نے کہا۔ ”وہ ایک دم پیچھے سے آیا۔ اس نے ہام کو گن پوائنٹ پر اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی۔ ہام نے Resist کیا تو اس نے ہام کو رائفل کے بٹ سے یہاں سر پر ہٹ کیا۔ ہام کچھ دیر کے لیے سینس لیس ہو گیا تھا۔ بعد میں جب ہام کو ہوش ہوا تو اس نے ہام کا ہاتھ پاؤں باندھ دیا اور یہاں لے آیا۔ یہ ہام کو ریپ کرنا مانگتا لیکن تھینکس گاڈ آپ لوگ......“ اس کی آواز بھرا گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کرسکی۔

جب وہ یہ سب کچھ کہہ رہی تھی، عادل نے دیکھا کہ موچھیل شخص رمزی خاں کے کان میں سرگوشیاں کر رہا ہے۔ ان سرگوشیوں کے بعد رمزی کے چہرے پر تفکر کے سائے پھیل گئے تھے۔ اس نے دائیں ہاتھ سے اپنا زخمی کندھا بھی دبایا ہوا تھا۔ گولی غالباً اس کے گوشت کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔

”کیا بات ہے رمزی؟“ ہمایوں نے پوچھا۔

جواب دینے کے بجائے رمزی اطراف میں دیکھ رہا تھا۔

”کیا کوئی اور بھی ہے یہاں؟“ اس بار عادل نے پوچھا۔

رمزی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں...... اور ہم کو فوراً اسے دیکھنا پڑے گا۔ ورنہ سارا معاملہ گڑبڑی میں جاسکتا ہے۔ خراب ہوسکتا ہے۔“

عادل نے بھی کچھ محسوس کیا تھا۔ جب رمزی خاں نے داخون کے سینے پر گولی چلائی اور وہ پشت کے بل گرا تو عین اس وقت دائیں جانب برف کے تودوں کے پیچھے عادل کو کوئی حرکت سی نظر آئی تھی، جیسے کوئی وہاں سے ایک دم نکل کر بھاگا ہو۔ یہاں کسی جانور کا امکان تو ہرگز موجود نہیں تھا۔ یقیناً یہ کوئی انسان ہی تھا۔ رمزی خاں اور اس کے ساتھی کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ اس معاملے کو کچھ کچھ سمجھ رہے ہوں...... ان ویران برفوں میں ان کے علاوہ بھی کوئی موجود تھا۔

> **زندگی کے دشوار گزار رستوں پر لمحہ بہ لمحہ طوفان و باد و باراں سے نبرد آزما اس داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ...**

استفادہ

جاوید مرتضیٰ

جب چوریوں کو مور پڑتے ہیں تو جانے کتنی آنکھیں ہنستی ہیں اور کتنے دل روتے ہیں... ان لمحات کے دکھ کا کوئی حساب ہی نہیں ہوتا مگر... اس کے پاس ایک ایک پل کا حساب رقم تھا کیونکہ جب جان پر بن جائے تو ایسے میں وہی مہربان کہلاتا ہے جو جی جان سے فدا ہوتا ہے... چاہے وہ جان کا دشمن ہی کیوں نہ ہو... کیونکہ وقت کا پہیا پلٹتے دیر نہیں لگتی۔

کٹھن لمحات میں مقدر کی مہربانی اور حسینہ کی بے نیازی کے نرالے انداز......



جمعہ کی شب...... دس بجے مشہور فلم اسٹار مس کیرول کی عالی شان کوٹھی میں بالکل سکوت طاری تھا۔ اس کی کوٹھی میں کل چالیس کمرے اور دو پیراکی کے تالاب تھے، ایک ٹھنڈے اور دوسرا گرم پانی کا۔ مس کیرول اس روز سہ پہر کو ایک فلم کے آخری سین کی شوٹنگ سے فارغ ہو کر واپس آئی تھی اور یہ کہتے ہوئے خواب گاہ میں چلی گئی تھی کہ کوئی بھی اسے جگانے کی کوشش نہ کرے۔ میں نے پوری کوٹھی کا ایک چکر لگایا۔ تمام دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں

اور برقی حفاظتی الارم کو چیک کیا کہ وہ صحیح کام کر رہا ہے۔ کھڑکیاں بند ہونے کے بعد اگر کوئی شخص زبردستی مکان میں ...... داخل ہونے کی کوشش کرے تو حفاظتی الارم مجھے فوراً اس کی اطلاع کر دیتا ہے۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں اپنے کمرے میں آیا جو بیرونی دروازے کے بالکل قریب تھا اور لباس تبدیل کر کے سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ بٹلر نے زور سے دروازے پر دستک دی۔

"مس کیرول نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا ہے۔" بٹلر نے اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ "وہ ہفتہ وار تعطیل ایگوا کلائنٹ میں گزارنا چاہتی ہیں۔ دس منٹ میں تیار ہو جاؤ۔"

ایگوا کلائنٹ ایک قمار خانے کا نام جو میکسیکو...... میں کیلی فورنیا کی سرحد سے بالکل قریب واقع تھا۔ یہ ایک شاندار ہوٹل کی عمارت کا ایک حصہ تھا جہاں اعلیٰ پیمانے پر جوا کھلایا جاتا تھا۔ مجھ سے ساتھ چلنے کی درخواست نہیں کی گئی تھی بلکہ یہ اطلاع دی گئی کہ مجھے مس کیرول کے ساتھ ایگوا کلائنٹ جانا ہے کیونکہ میں مس کیرول کا باڈی گارڈ تھا۔ میرا کام مس کیرول کے خوب صورت وجود کی حفاظت کرنا تھا جس کی مجھے بہت عمدہ تنخواہ ملتی تھی۔ عام طور پر مس کیرول کو فلموں میں ایسی ہیروئن کا کردار دیا جاتا جو مردمار قسم کی ہوتی ہے۔ غنڈوں بدمعاشوں سے بالکل نہیں گھبراتی یا اس کے حصے میں کسی تجربہ کار نوجوان طوائف کا کردار آتا تھا اور کبھی کبھی اسے جرائم پیشہ لوگوں کا ساتھی بنا دیا جاتا۔ جبکہ نجی زندگی میں مس کیرول بالکل مختلف تھی۔ وہ شراب بالکل نہیں پیتی، سگریٹ نوشی سے اسے کوئی دلچسپی نہیں، وہ تقریبات میں شرکت نہیں کرتی حد یہ ہے کہ کسی نائٹ کلب میں بھی نہیں جاتی، اس لیے میرا کام کوٹھی سے اسٹوڈیو تک محدود تھا گاڑی میں اس کے ساتھ شوٹنگ پر جانا اور گاڑی میں واپس گھر آ جانا۔ اس کے علاوہ میں ہر قسم کے سفری سیلز مینوں اور اخباری نمائندوں کو دروازے سے دور رکھتا تھا۔

اس کی تمام خوبیاں اپنی جگہ بہت خوب لیکن اس میں ایک بہت بڑی کمزوری بھی تھی...... قمار بازی۔

وہ پاگل ہونے کی حد تک جوا کھیلنے کی شوقین اور اپنی زندگی میں ایک بار بھی نہیں جیتی، ہمیشہ ہارتی رہی لیکن جوئے میں مسلسل ہار اسے مزید جوا کھیلنے سے باز نہیں رکھتی۔ اس کے ہارنے پر مجھے ہمیشہ افسوس ہوتا۔ لیکن میں کیا کر سکتا تھا، وہ میری رقم سے تو جوا نہیں کھیلتی اس کے علاوہ نہ میں اس کا سرپرست تھا، نہ دوست، اس لیے میں اس کے مشاغل میں دخل اندازی بھی نہیں کر سکتا، کوئی مشورہ بھی نہیں دے سکتا تھا۔

آخری مرتبہ جب وہ ایگوا کلائنٹ سے واپس آئی تو قمار بازی میں بہت لمبی رقم ہار بیٹھی تھی۔ اس لیے بہت دنوں تک اس نے ایگوا کلائنٹ کا رخ نہیں کیا لیکن جس فلم کی شوٹنگ سے وہ اس روز فارغ ہوئی تھی، اس نے مس کیرول کو بری طرح تھکا دیا تھا۔ تھکن اتارنے کے لیے ایگوا کلائنٹ جانا چاہتی تھی۔ قمار بازی کے علاوہ اسے اور کوئی شوق نہیں، کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ میں نے بڑی افسردگی سے اس نیند کے بارے میں سوچا جس سے میں محروم ہونے والا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مس کیرول کو ہوائی سفر سے نفرت تھی اور وہ گاڑی میں اتنا طویل سفر کرتی تھی، تمام رات سفر کرنے کے بعد ہم صبح سرحد تک پہنچے جس کا دروازہ آمد و رفت کے لیے نو بجے کھولا جاتا۔ میں نے لباس تبدیل کیا، بغلی ہولسٹر پہنا، ریوالور میں گولیاں موجود ہونے کی تصدیق کی اور ایک سفری بیگ میں چند جوڑے کپڑے ڈال کر باہر دروازے پر آ گیا جہاں ڈرائیور پہلے ہی تیار کھڑا تھا۔

مس کیرول جب اندر سے برآمد ہوئی تو تنہا تھی، اس کا مطلب یہ تھا کہ صرف تین افراد اس سفر پر جا رہے تھے۔ میں، ڈرائیور اور مس کیرول۔ اور غالباً ڈگلس کو اس کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ ڈگلس مس کیرول کا کاروباری منیجر تھا اور یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ وہ اپنے کام میں مہارت رکھتا تھا۔ پچھلی مرتبہ وہ مس کیرول کے ساتھ ایگوا کلائنٹ گیا تھا اور اتنی بڑی رقم ہارنے پر اس نے بہت شور مچایا تھا اور مس کیرول کو مفلس بڑھاپے کا واسطہ دے کر قمار بازی سے توبہ کرنے کی نصیحت کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس روز ڈگلس ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ اسے ایگوا کلائنٹ بالکل پسند نہیں تھا اور اس کا خیال تھا کہ مس کیرول کو اتنی بڑی رقمیں لے کر وہاں نہیں جانا چاہیے، وہ جگہ قطعی محفوظ نہیں ہے۔ وہ سچے دل سے مس کیرول کا خیر خواہ تھا اور ہر قیمت پر اسے تباہی بربادی سے بچانا چاہتا تھا جو قمار باز کا مقدر ہوتی ہے۔

میں نے کہا۔ "آپ پچھلے دنوں بڑی محنت سے کام کرتی رہی ہیں، عمدہ قسم کی چھٹی ضروری ہو گئی تھی۔"

اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ "میرا خیال ہے کہ ڈگلس کو اگر اس کا پتا نہ چلے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں نے بٹلر سے کہہ دیا ہے کہ اگر اس کا فون آئے تو کہہ دے کہ میرے سر میں شدید درد ہے اور میں کسی سے بات کرنا نہیں چاہتی۔ ہم پیر تک واپس آ جائیں گے۔"

ڈگلس کو لاعلم رکھنے کا یہ منصوبہ مجھے احمقانہ نظر آیا کیونکہ وہ کیرول کی صحت کی طرف سے بہت فکرمند رہتا تھا ٹیلی فون پر بیماری کا ذکر سن کر وہ فوراً دو بہترین ڈاکٹروں کے ساتھ کیرول کی کوٹھی پر آ جائے گا۔ چونکہ مس کیرول نے مجھ سے مشورہ طلب نہیں کیا تھا اس لیے میں نے یہ خیالات اپنے تک محدود رکھے۔

"اس مرتبہ میں ہار نہیں سکتی۔" اس نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "واپس آ کر میں ڈگلس کو بتاؤں گی کہ میں کتنی احمق ہوں۔ میں گزشتہ ہاری ہوئی ساری رقم وصول کروں گی کیونکہ اس مرتبہ ہارنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ آج میں نے ایک ستارہ شناس سے مشورہ کیا تھا۔ اس نے مجھے بڑے پتے کی بات بتائی۔ میں فوراً وہ ترکیب استعمال کرنا چاہتی ہوں۔"

میں سمجھ گیا کہ معمول کے مطابق اس مرتبہ پھر مس کیرول نے جوئے میں جیتنے کا کوئی نیا طریقہ دریافت کیا ہے۔ کوئی ایسا طریقہ جو مشینوں کو شکست دیدے۔ ہر جواری اپنے طریقوں کو سوچتا اور آزماتا رہتا ہے۔ لیکن کسی کو آج تک کامیابی نہیں ہوئی۔ میرے ساتھ بالکل الٹا معاملہ تھا مجھے جوا کھیلنے کا بالکل شوق نہیں تھا، نہ میں قسمت کے کھیل پر یقین رکھتا تھا۔ اس کے باوجود میں جوئے کی میز پر کبھی نہیں ہارا محض وقت گزاری کے لیے میں کسی میز پر ایک ڈالر رکھ دیتا تھا اور وہ ڈالر میز پر رکھی ہوئی تمام رقم سمیٹ لاتا تھا۔ میں اپنا ایک ڈالر نکال کر جیت کی تمام رقم کسی ایسے جواری کے حوالے کر دیتا تھا جو سب کچھ ہار کر رنجیدہ بیٹھا ہو۔ وہ جواری مجھ سے رقم پا کر فوراً ہی اسے داؤ پر لگا دیتا اور فوراً ہار جاتا۔ مس کیرول مجھے جو تنخواہ دیتی تھی وہ میرے لیے کافی تھی۔

ہم تمام رات سفر کرتے رہے اور صبح سات بجے سان ڈیگو سے گزرتے ہوئے نو بجے میکسیکو کی سرحد پر پہنچ گئے۔ سرحدی چوکی کے محافظ مس کیرول کی صورت سے اچھی طرح آشنا تھے، ہمیں دوسروں کی مانند گاڑی روک کر شناختی کاغذات نہیں دکھانے پڑتے تھے، مس کیرول کھڑکی سے باہر چہرہ نکالتی تو دروازہ فوراً کھل جاتا پھر ہمیں عقب میں سیٹیوں کی آوازیں سنائی دیتیں اور کیرول انہیں سن کر مسکرانے لگتی تھی۔ سرحدی چوکی عبور کرنے کے بعد ریگستان کا سفر شروع ہوتا تھا میلوں ریت ہی ریت نظر آتی جس میں کیکٹس کی بے شمار جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ پھر پھول اور فوارے نظر آتے ہیں۔ اور ایگوا کلائنٹ پر گاڑی رک جاتی ہے۔ مس کیرول کسی فرضی نام سے ہوٹل میں قیام کرتی تھیں تا کہ کوئی بھولا بھٹکا اخباری نمائندہ نام سن کر پیچھے نہ لگ جائے۔

"تم مسلح ہو اس لیے رات کے لیے یہ اپنے پاس رکھ لو۔" اس نے مجھے سیاہ رنگ کا میک اپ بکس تھما دیا جس پر اس کے نام کے مخفف طلائی حروف چھپے ہوئے تھے۔ "میں غائب دماغ ہوں، اسے کہیں رکھ کر بھول سکتی ہوں اور پھر ضرورت پڑنے پر ہر جگہ تلاش کرتی پھروں گی۔"

میک اپ بکس خاصا بڑا اور غیر مقفل تھا۔ میں نے ڈھکن کھول کر اندر دیکھا۔

"اس میں پندرہ ہزار ڈالرز، آج رات کے لیے یہ رقم کافی رہے گی، میں زیادہ اس لیے نہیں لائی کی اس مرتبہ ضرورت نہیں پڑے گی، جیت کی رقم اتنی ہو گی کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔"

"لیکن مس۔" میرے حلق سے آواز نکلی۔ "اس طرح نقد رقم لیے پھرنا کہاں کی......"

"میں چالاک ہوں نا؟" اس نے بڑے بھول پن سے کہا۔ "بھلا کون سوچ سکتا ہے کہ میک اپ بکس میں میک اپ کے سامان کے بجائے کرنسی نوٹ رکھے ہوں گے۔ کوئی چور اسے کھول کر دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کرے گا۔" پھر اس نے کہا۔ "اچھا اب بعد میں ملاقات ہو گی۔" اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

میں ہمیشہ اس کے برابر والے کمرے میں قیام کرتا تھا اور ایسے کمروں کا انتخاب کیا جاتا جن کے درمیان ایک دروازہ ہوتا کہ ہنگامی حالات کی صورت میں، میں اس دروازے کو استعمال کرتے ہوئے فوراً مس کیرول کے کمرے میں پہنچ جاؤں۔ مس کیرول اسی دروازے سے میرے کمرے میں آئی تھی اور رقم والا بکس میرے حوالے کر کے واپس اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس بکس میں تالا بھی نہیں تھا کہ اسے مقفل کیا جا سکے، میں نے فیصلہ کیا کہ اس کا میرے کمرے میں رہنا مناسب نہیں۔ کیرول نے رقم گننے کی بھی زحمت نہیں کی تھی، بینک والوں نے لفافے میں بند کر کے جس طرح رقم دی تھی، وہ اسی طرح بند رکھی تھی، میں نے لفافے کو سربمہر کیا اور اس پر مس کیرول کا نام اور کمرا نمبر لکھ کر ہوٹل کے منیجر کے پاس لے گیا۔

"اس لفافے میں پندرہ ہزار ڈالرز ہیں۔" میں نے منیجر سے کہا۔ "آپ اسے اپنی تجوری میں بطور امانت رکھ لیں۔ آج رات اس کی ضرورت پڑے گی، یہ لفافہ آپ

مجھے یا مس کیرول کے علاوہ کسی کو نہیں دیں گے۔“

”بہت بہتر۔“ منیجر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ مس کیرول کو یہ لفافہ ہماری تجوری سے نکلوانے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ رقم فوراً ہی ہمارے پاس آجائے گی۔“ منیجر نے کیرول کے مسلسل ہارنے پر بڑا خوب صورت تبصرہ کیا تھا۔

میں ہوٹل کی لابی میں بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگا۔ کچھ دیر بعد کیرول نیچے آئی۔ اس نے تاریک شیشوں کا بہت بڑا چشمہ لگا رکھا تھا تاکہ کوئی اسے پہچان نہ سکے اور وہ آزادی سے نقل و حرکت کر سکے۔ اس ہوٹل کے بیشتر مہمانوں نے اسی قسم کے چشمے لگا رکھے تھے۔ پوری سہ پہر ہم نے ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے گزاری۔ وہ چھوٹی موٹی خریداری کرتی رہی اور میں سائے کی طرح اس کے ساتھ تھا۔ شام پانچ بجے وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تاکہ کچھ آرام کر کے رات کے سفر کے لیے تازہ دم ہو جائے۔ اس نے مجھے ہدایت کر دی تھی کہ میں کمرائے طعام میں کھانا کھا سکتا ہوں کیونکہ وہ خود اپنے کمرے میں تنہا کھانا کھائے گی۔

یہاں سے میری پہلی غلطی کا آغاز ہوتا ہے۔ سائے کی طرح اس کے ساتھ چپکے رہنا میرا فرض تھا۔ خواہ مجھے اس کے کمرے کے دروازے کے باہر راہداری میں کھانا زہر مار کرنا پڑتا لیکن میں بہت مطمئن تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنی کوٹھی کی نسبت اس بھرے پرے ہوٹل میں زیادہ محفوظ ہے اور پھر میرا ارادہ سیڑھیوں کے پاس بیٹھے رہنے کا تھا تاکہ اگر اسے ضرورت پڑے تو مجھے بلا سکے یا وہ جب تیار ہو کر نیچے آئے گی تو میں سیڑھیوں کے پاس ہی اس کا منتظر ہوں گا۔

سیڑھیوں کے بالکل قریب طعام گاہ کا بہت بڑا دروازہ تھا جو شیشے کا بنا ہوا تھا۔ میں دروازے کے قریب ایک میز پر اس طرح بیٹھ گیا کہ سیڑھیاں میری نظروں کے سامنے رہیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں سگریٹ نوشی کرتا رہا۔ سورج غروب ہوتے ہی تارے چمکنے لگے اور ایگوا کلائنٹ کا قمار خانہ کھول دیا گیا۔ طعام گاہ تیزی سے خالی ہونے لگی اور جوئے کے شوقین مہمان قمار خانے پر قسمتیں آزمانے لگے لیکن کیرول کسی طرح اپنے کمرے میں رکی ہوئی تھی کیونکہ سیڑھیاں میری نظروں کے سامنے تھیں اور میری نظروں میں آئے بغیر اس کا کہیں جانا ایک ناممکن امر تھا۔ میں نے سگریٹ راکھ دان میں مسلی اور اوپر جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

میں بالکل ٹھیک وقت پر اپنی نشست سے اٹھا تھا۔ اگر مجھے ایک منٹ کی تاخیر ہو جاتی یا ایک منٹ پہلے اٹھ جاتا تو وہ کچھ نہیں دیکھ پاتا جس کا میں نے اس وقت مشاہدہ کیا تھا۔

جیسے ہی میں سیڑھیاں طے کر کے راہداری میں اس جانب مڑا جس طرف ہمارے کمرے تھے، میں نے ایک اجنبی عورت کو اپنے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ پنجوں کے بل دروازہ بند کرتے ہوئے کمرے سے باہر آ رہی تھی، انداز چوروں جیسا تھا، اس لیے میں یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ وہ غلطی سے میرے مقفل کمرے میں چلی گئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ ہوٹل کی ایک بدکردار ملازمہ ہے۔ وہ آہستگی سے دروازہ بند کرنے میں مشغول تھی اس لیے اس کا چہرہ میری طرف نہیں تھا۔ میں جلدی سے پلٹا اور سیڑھیوں کے چبوترے پر کھڑا ہو کر اس طرح نیچے جھانکنے لگا جیسے میں نیچے ہونے والی گہما گہمی سے لطف اندوز ہو رہا ہوں، میں چاہتا تو اسی وقت اس عورت کی کلائی پکڑ سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ اس قسم کی عورتیں عام طور پر تنہا کام نہیں کرتیں اور میں اس کا تعاقب کر کے اس کے دوسرے ساتھی یا ساتھیوں پر بھی ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا، دروازہ بند کر کے وہ تیز قدموں سے سیڑھیوں کی طرف آنے لگی۔ میں نے سر گھما کر سرسری نظروں سے اس کی طرف دیکھا، اس کے بال سیاہ رنگ کے تھے اور چہرے پر میک اپ کی اتنی موٹی تہ جمی ہوئی تھی کہ اسے چمچے کی مدد سے اکھاڑا جا سکتا تھا۔ چہرے سے وہ چالاک اور سخت جان نظر آتی تھی، اس وقت وہ رقص کا لباس پہنے ہوئے تھی، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس حلیے کی عورت آخر کس طرح ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں گھسنے میں کامیاب ہوئی اور اس کے ایک ہاتھ میں مس کیرول کا میک اپ بکس لٹک رہا تھا۔ مخفف طلائی حروف چمک رہے تھے۔

یہ میک اپ بکس میرے کمرے میں رکھا تھا جس میں سے پندرہ ہزار ڈالرز کے نوٹ نکال کر میں ہوٹل کی تجوری میں پہلے ہی رکھوا چکا تھا۔ اس عورت نے بکس کھول کر اندر نہیں دیکھا تھا ورنہ وہ خالی بکس چرانے کی کبھی زحمت نہ کرتی۔ مس کیرول برابر والے کمرے میں موجود تھی، ممکن ہے اس ڈر سے کہ وہ کمرے میں نہ آ جائے، اس عورت نے بکس اٹھا کر فوراً رفوچکر ہونے میں عافیت سمجھی ہو۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جس وقت کیرول مجھے میک اپ بکس اور اس کے اندر موجود رقم کے بارے میں بتا رہی تھی، یہ ملازمہ میرے کمرے کے دروازے سے کان لگائے کھڑی تھی، وہ میرے قریب سے گزرتی ہوئی سیڑھیاں اترنے لگی، میں

نے اسے روکنے یا پکڑنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ میں اس کے ذریعے اس کے ساتھی یا ساتھیوں پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ نیچے اترنے لگی تو میں دو سیڑھیوں کا فاصلہ دے کر اس کے پیچھے چل دیا، اس نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی، اس کے برعکس اس نے رفتار ہلکی کر دی جیسے وہ ہوٹل میں ٹھہری ہوئی کوئی مہمان ہو، میں سمجھ رہا تھا، وہ سکون اور اعتماد کا نقاب اوڑھ کر ہوٹل سے فرار ہونا چاہتی تھی اور عجلت ظاہر کر کے کسی کو شک کرنے کا موقع فراہم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سیڑھیوں سے اتر کر وہ بڑے مطمئن انداز میں لابی عبور کرنے لگی جس کے دوسری طرف قمار خانے کا دروازہ تھا۔ ایک مہمان کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہونٹوں میں دبی ہوئی سگریٹ کھینچ لی اور کش لیتے ہوئے آگے بڑھتی رہی۔ نہ تو اس نے شکریہ ادا کرنے کی زحمت گوارا کی، نہ ایک بار پلٹ کر اپنی حرکت کا ردعمل دیکھنے کی کوشش کی، وہ بڑے اعتماد سے چلتی ہوئی قمار خانے میں داخل ہو گئی۔

”اس عورت کے اعصاب فولاد سے زیادہ مضبوط ہیں۔“ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ اپنی دانست میں وہ میرے کمرے سے پندرہ ہزار ڈالرز چرا کر نکلی تھی اور جائے وقوع سے فرار ہونے کے بجائے چوری کی ہوئی رقم سے قمار خانے میں قسمت آزمانا چاہتی تھی۔ وہ تو پھر عورت تھی، ایسے فولادی اعصاب کے مرد بھی دنیا میں گنتی کے چند ہی ہوں گے، جب وہ میک اپ بکس کھولے گی اور اندر سے وہ بالکل خالی نکلے گا، اس وقت اس عورت کی شکل دیکھنے کے قابل ہوگی، میں نے سوچا اور میں ہر قیمت پر وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔

میں اس کے پیچھے قمار خانے میں داخل ہو گیا اور وہاں پر طائرانہ نظر ڈالی، مجھے کلب کا ایک ہٹا کٹا ملازم نظر آیا جو دنگا فساد کرنے والے افراد کو باہر پھینکنے کی خدمت انجام دیتا تھا، میں نے انگلی سے اس کے کندھے پر دستک دے کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ”وہ جو سرخ شرٹ اور کالی پیلی چیک والی اسکرٹ پہنے ہوئے ہے، وہ اس میز کے پاس جو لوگوں کو چیرتی ہوئی اندر گھس رہی ہے جس کے ہاتھ میں میک اپ بکس ہے، اس لڑکی پر نظر رکھنا، اسے پولیس کے حوالے کرنا ہے۔“ اور میں نے اسے پوری کہانی سنائی۔ اس نے ایک ملازم کو منیجر کی طرف بھیجا اور دوسرے کو پولیس بلانے کا حکم دیا اور پھر ہم دونوں اس میز کی طرف چلے گئے جس کے گرد جواریوں کا ہجوم لگا ہوا تھا اور وہ لڑکی اسی ہجوم میں گھس کر نظروں سے اوجھل ہوئی تھی۔ اس نے اندر گھسنے کے لیے دونوں کہنیاں، دونوں کولھے اور ٹھوڑی استعمال کی تھی، ہم یہ حرکت نہیں کر سکتے تھے اس لیے پیچھے جا کر کھڑے ہو گئے ہمیں اس لڑکی کی پشت نظر آ رہی تھی۔ وہ میز کے بالکل قریب کھڑی تھی۔

”ابھی کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔“ اس نے کلب کے دونوں آدمیوں کو منع کر دیا۔ ”اس کے پاس جوا کھیلنے کے لیے رقم تو ہے نہیں اس لیے جلد ہی باہر نکل آئے گی۔“

جوا کھلانے والے ڈیلر کی آواز سنائی دی۔ ”داؤ لگانے والے میز پر رقمیں رکھ دیں۔“ پھر اس کی آواز آئی۔ ”وقت ختم ہو گیا۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے مشین کا پہیہ گھمایا اور میز کے گرد کھڑے تماش بینوں پر سکوت طاری ہو گیا پھر ایک منٹ بعد داؤ پر رقم لگانے والے جواریوں کے منہ سے تاسف بھری ”اوہ“ کی آواز نکلی۔

”وہ لڑکی اپنی جگہ سے نہیں ہلی، اس نے اب تک بکس کھول کر نہیں دیکھا، معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اب تک کسی بازی پر داؤ نہیں لگایا۔“ میں نے کہا۔

دوبارہ ڈیلر کی آواز سنائی دی، وہی عمل دہرایا گیا اور پھر وہی تاسف بھری ”اوہ“ کی آوازیں۔ ہوٹل کا منیجر آ گیا، میں نے اسے پوری روداد سنائی۔ ”میں نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے اور تعاقب کرتا ہوا یہاں تک آیا ہوں اب تک اس نے بکس کھول کر نہیں دیکھا ورنہ اسے پتا چل جاتا کہ اس کی ساری محنت اکارت ہو گئی ہے۔“

”تو تمہارا خیال ہے کہ بکس میں رقم نہیں ہے؟“ منیجر نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس میں شک ہے کیونکہ پندرہ منٹ پہلے ٹیلی فون پر ایک عورت نے مس کیرول کے نام سے اپنی شناخت کراتے ہوئے مجھ سے رقم کا لفافہ کمرے میں لانے کی درخواست کی تھی اور میں خود لفافہ اوپر پہنچا کر آیا تھا۔“

”تم نے رقم دیتے ہوئے مس کیرول کی شکل دیکھی تھی؟“ میرے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

”نہیں اور یہی وجہ ہے کہ اب مجھے کسی گڑبڑ کا اندیشہ ہو رہا ہے۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے ایک نسوانی ہاتھ باہر نکلا جس نے مجھ سے یہ کہتے ہوئے لفافہ لے لیا کہ وہ اس وقت لباس تبدیل کر رہی ہے۔“

”اوہ میرے خدا!“ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”تم نے پندرہ ہزار ڈالرز کی رقم اس طرح اٹھا کر اس کے......“

”لیکن تم نے خود مجھ سے کہا تھا کہ لفافہ مس کیرول یا

تمہیں دیا جائے، ٹیلی فون کمرا نمبر دوسو دس سے کیا گیا تھا۔ میں نے آپریٹر سے معلوم کیا تھا کہ فون کس کمرے سے آیا ہے اور وہ مس کیرول کے کمرے کا نمبر ہے۔''

''دوسو دس میرے کمرے کا نمبر ہے مس کیرول کا دوسو گیارہ نمبر ہے اور وہ میرے کمرے سے باہر نکلی تھی، اوہ میرے خدا ہم بہت وقت ضائع کر چکے، پتا نہیں وہ اب تک کتنی رقم ہار چکی ہوگی، جلدی کرو مسٹر۔''

اس وقفے میں دو پولیس آفیسر بھی آگئے تھے، منیجر اور کلب کے ملازمین میز کے گرد کھڑے ہوئے لوگوں کو بڑی خاموشی سے ہٹانے لگے یہاں تک کہ وہ لڑکی میز کے پاس تنہا رہ گئی۔ وہ خیالوں میں اس قدر گم تھی کہ اسے اپنے پاس سے دوسروں کے ہٹنے کا احساس نہیں ہوا۔ اس کے پاس رقم تو پوری تھی، کم از کم جس وقت اس نے داؤ لگانا شروع کیا تھا اس وقت اس کے پاس پورے پندرہ ہزار ڈالرز تھے لیکن اب اس کے سامنے نوٹوں کا بہت بڑا ڈھیر پڑا تھا جو کسی بھی طرح چالیس پچاس ہزار ڈالرز سے کم نہیں تھا اور وہ نیا داؤ لگا رہی تھی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے سو ڈالرز کے بہت سارے نوٹ دونوں ہاتھوں میں اٹھائے اور میز کی طرف جھکتے ہوئے پھونک مار کر انہیں اڑا دیا۔ نوٹ اڑتے ہوئے میز کے مختلف نمبروں والے خانوں پر گر گئے۔ یہ تھا وہ طریقہ جس پر عمل کرتے ہوئے اس نے چند منٹ کے دوران پندرہ ہزار ڈالرز چالیس پچاس ہزار ڈالروں میں تبدیل کر لیے تھے۔ ادھر جوا کھلانے والے ڈیلر کا چہرہ سپید پڑا ہوا تھا لیکن وہ کسی کو بھی داؤ لگانے سے نہیں روک سکتا تھا۔

''خاتون، آپ خود کو زیرِ حراست تصور کریں۔'' منیجر نے لڑکی کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ دونوں پولیس آفیسر آگے بڑھ کر دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔

''جاؤ، جاؤ دفع ہو جاؤ، دیکھتے نہیں ہو میں کتنی مصروف ہوں؟'' لڑکی نے منیجر کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔

میں نے جھک کر میک اپ بکس اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ ''یہ بکس مس کیرول کا ہے، میں نے تمہیں اپنے کمرے سے یہ بکس چرا کر باہر نکلتے ہوئے دیکھا تھا، اب تم سیدھی طرح چلتی ہو یا تمہیں گھسیٹ کر لے جایا جائے۔''

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور اس طرح مجھے دیکھنے لگی جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو، پھر اس نے میز پر جیتی ہوئی رقم کا ڈھیر دیکھا اور سختی سے منہ سے بند کر لیا۔ اس کے اس انداز سے مجھے شک ہوا کہ کہیں یہ لڑکی مس کیرول تو نہیں ہے جو سیاہ بالوں کی وگ لگا کر اور میک اپ کیے ہوئے ہو مجھے تقریباً یقین ہو گیا تھا کہ وہ لڑکی مس کیرول ہے لیکن اسی وقت میری نظر دروازے کی طرف اٹھی تو کیرول خوب صورت لباس میں کسی شہزادی کی طرح ہال میں داخل ہو رہی تھی۔

''ٹھہرو۔'' میں نے منیجر سے کہا۔ ''مس کیرول آ گئی ہیں، میں ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا انہوں نے رقم طلب کی تھی۔ اگر اس لڑکی نے خالی میک اپ بکس چرایا ہے اور رقم مس کیرول کے پاس ہے تو میں اس لڑکی پر کوئی الزام عائد کرنا پسند نہیں کروں گا اور اگر اس نے ہی میرے کمرے سے فون کر کے رقم وصول کی تھی تو پھر میں کسی قسم کی رعایت نہیں کروں گا۔ اسے جیل جانا پڑے گا۔''

میں کیرول کی طرف لپکا جو ایک میز کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ''مس کیرول کیا آپ نے تھوڑی دیر پہلے منیجر کو فون کر کے اوپر رقم منگوائی تھی؟''

''پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔'' مس کیرول کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے رنگین شیشوں کی عینک کے پیچھے سے مجھے گھور کر دیکھا، اس کا موڈ بری طرح خراب تھا۔ ''میرے موڈ کا ستیاناس..... نہ کرو، دیکھ نہیں رہے کہ میں کھیلنے جا رہی ہوں اور اس وقت مجھے ذہنی یکسوئی کے لیے مکمل تنہائی درکار ہے۔''

میں واپس آ گیا۔ ''ٹھیک ہے، اس نے ہی رقم چرائی ہے، اسے جیل میں ڈال دو۔''

''تم، تم.....'' لڑکی نے غصے سے لال بھبھوکا ہوتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی کہ پولیس والے اشارہ پا کر اسے دھکا دیتے ہوئے ہال سے باہر لے گئے۔ ہال میں چند لمحوں کے لیے کھیل بند ہو گیا، سارے قمار باز تجسس بھری نظروں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ جب پولیس والے ہال سے باہر نکل گئے تو چند لمحوں بعد ہال کی ہنگامہ خیز زندگی دوبارہ رواں دواں ہو گئی۔ میں اور منیجر، ہم دونوں ہی انگلش زبان سے ناآشنا تھے اس لیے ہوٹل کا ایک مقامی ملازم پولیس والوں کے ساتھ چوری کی رپورٹ لکھوانے چلا گیا۔ کیرول کا موڈ دیکھتے ہوئے میں اس کے قریب جانے سے ڈر رہا تھا، اس نے ذہنی یکسوئی کا ذکر کیا تھا اور میں اس کی یک سوئی میں خلل ڈالنا نہیں چاہتا تھا اس لیے میں ہال کے دروازے کے پاس بیٹھ کر سگریٹ نوشی سے دل بہلانے لگا۔ منیجر نے کیرول کو پندرہ ہزار ڈالرز سے ہزار ڈالر وا لیے

کر دیے تھے جنہیں وہ حسبِ معمول تھوڑی دیر میں ہار گئی۔ وہ مشہور فلم اسٹار اور کلب کی پرانی گاہک تھی اس لیے کلب والے اسے قرض دینے سے انکار نہیں کرتے تھے۔ اس نے شاید چار پانچ ہزار قرض لیے ہوں گے کہ ہوٹل کا ایک ملازم کوئی پیغام لے کر اس کے پاس آیا اور وہ کھیل چھوڑ کر باہر جانے لگی میں بھی اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا لیکن جب کیرول نے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھورا تو میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ پتا نہیں کیوں اس کا موڈ اتنا خراب تھا۔ میں نے پہلے کبھی اس کی یہ کیفیت نہیں دیکھی تھی۔

ابھی میں کرسی پر بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ کلب کے داخلی دروازے کی طرف سے ایک تیز نسوانی چیخ سنائی دی، پھر دوسری اور تیسری چیخ درمیان میں ادھوری رہ گئی جیسے کسی نے اس عورت کے منہ پر ہاتھ رکھ کر چیخ کا گلا گھونٹ دیا ہو۔ فوراً ہی گولی چلنے کی آواز سنائی دی اور کسی گاڑی کا طاقت ور انجن غراتا ہوا بیدار ہو گیا۔ میں بجلی کی طرح باہر کی طرف لپکا، بغلی ہولسٹر میں رکھا ہوا ریوالور میرے ہاتھ میں آ چکا تھا لیکن جتنی دیر میں، میں نے وہ مختصر سا فاصلہ طے کیا وہاں میدان صاف ہو چکا تھا۔ دور مجھے ایک گاڑی کی عقبی بتیاں نظر آئیں جو فاصلے کے باعث دو سرخ نقطوں کے مانند چمک رہی تھیں۔ دربان سیڑھیوں پر اکڑوں بیٹھا کاندھے سے ابلنے والے لہو کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا اور سیڑھیوں کے قریب پختہ روش پر مجھے مس کیرول کی سنہری چپل نظر آئی، ایک چپل جو اس کے پیر سے نکل کر گر گئی تھی۔ چپل سے چند فٹ کے فاصلے پر کاغذ کا ایک ٹکڑا پڑا تھا، میں نے دوڑتے ہوئے جھک کر وہ پرزہ اٹھایا اور اسے جیب میں ٹھونستا ہوا گیراج کی طرف بھاگا جہاں ہماری گاڑی کھڑی تھی۔

ڈرائیور اس وقت تاش کھیلنے میں مشغول تھا لیکن خوش قسمتی سے کھیل گاڑی کی عقبی نشست پر ہو رہا تھا۔ میں نے آندھی اور طوفان کی طرح اگلا دروازہ کھولا، چابی گھومتے ہی طاقت ور انجن مستعد ہو گیا۔ میں نے عقبی گیئر ڈالا اور تیزی سے الٹی گاڑی گیراج سے باہر نکالنے لگا۔ اس مختصر سے وقفے میں ڈرائیور کے تینوں ساتھی پچھلے دروازے کھول کر کسی نہ کسی طرح باہر چھلانگ لگانے میں کامیاب ہو گئے۔ گیراج کا ایک دروازہ جڑ..... سے اکھڑ گیا گاڑی کی ایک سائڈ چپک گئی اور رنگ سے برہنہ ہو گئی اور بس وہ باہر نکل آئی۔ اگر میں گاڑی گھما کر باقاعدہ پختہ روش والا راستہ اختیار کرتا تو ایک بے حد قیمتی منٹ ضائع ہو جاتا، میں خوب صورت لان اور رنگ برنگے پھولوں کو روندتا ہوا پچاس میل کی رفتار سے آگے بڑھا۔ کلب کے داخلی دروازے پر مجمع لگ گیا تھا، میں نے لمحے بھر کے لیے بریک لگایا اور حلق پھاڑ کر چیخا۔ ''پولیس کو اطلاع دو، سرحدیں بند کر دو!'' پتا نہیں کسی نے میری بات سنی یا نہیں لیکن دوسرے ہی لمحے گاڑی سو میل کی رفتار سے فضا میں پرواز کر رہی تھی۔

ڈرائیور ہانپتا ہوا پچھلی نشست سے آگے آ گیا تھا۔ ''کیا ہوا؟''

''اغوا!'' میں نے کہا۔ ''سب کے سامنے اٹھا کر لے گئے۔ اگر ہم مس کیرول کو آزاد کرانے میں کامیاب نہیں ہوئے تو میں زندگی بھر کسی سے نظریں نہیں ملا سکوں گا۔ ادھر آؤ اسٹیئرنگ وہیل سنبھالو۔ میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔''

ڈرائیور گھبرا کر اٹھا اور کیڑے کے مانند پہلے عقبی نشست پر گیا، میں نے گاڑی کی رفتار قدرے کم کر دی اور دوسری طرف کھسک گیا، میرا ایک ہاتھ مضبوطی سے اسٹیئرنگ وہیل پر جما ہوا تھا، وہ خالی جگہ پر آ گیا، اس کا پیر ایکسیلریٹر پر جمتے ہی گاڑی اڑنے لگی۔ طاقت ور ہیڈ لائٹس نے دور تک سڑک کو خوب روشن کیا ہوا تھا۔

''دائیں جانب۔'' ایک دوراہے پر میں نے چیخ کر کہا۔ ''میں نے ان کی گاڑی اس طرف مڑتے ہوئے دیکھی تھی۔''

''لیکن اس طرف تو کوئی سڑک نہیں ہے، کچھ دور جا کر سڑک ختم ہو جاتی ہے اور آگے صرف ریت ہے، کوئی آبادی نہیں، کوئی پیٹرول پمپ نہیں، کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم اس طرف پھنس جائیں گے۔''

''پروا مت کرو، اسی طرف چلو، کتنا پیٹرول ہے؟''

''ٹنکی پوری بھری ہوئی ہے۔ یہاں پہنچتے ہی میں نے پیٹرول بھروا لیا تھا۔''

ڈرائیور نے ٹھیک کہا تھا۔ میل بھر بعد سڑک ختم ہو گئی اور سامنے ریت کا لق و دق صحرا پھیلا ہوا تھا۔ نرم ریت میں مجرموں کی گاڑی کے ٹائروں کے نشانات بہت واضح نظر آ رہے تھے۔ ہماری گاڑی ان نشانات پر بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ پھر مجھے کاغذ کے اس پرزے کا خیال آیا جو میں نے مس کیرول کی چپل کے پاس سے اٹھایا تھا۔ اس پر پنسل سے ایک پیغام درج تھا۔

''رہائی کی قیمت پچاس ہزار ڈالر ہے، لاس اینجلس میں ڈگلس کو اطلاع کر دو کہ مذاق اب بھیانک صورت اختیار کر گیا ہے، وہ ہمارا مطلب سمجھ جائے گا۔ ہم مس کیرول

کی جوا کھیلنے کی لت چھڑا دیں گے اور اگر ڈگلس نے پچاس ہزار ڈالرز ادا نہیں کیے تو وہ ہمیشہ کے لیے سونے کا انڈا دینے والی مرغی سے محروم ہوجائے گا۔“

صاف ظاہر تھا کہ یہ پیغام پہلے سے لکھا گیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ کیرول کا اغوا باقاعدہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت عمل میں آیا تھا اور پیغام سے یہ بھی ثابت ہوتا تھا کہ منصوبے کا خالق مس کیرول کا منیجر ڈگلس تھا، اس نے کیرول سے جوا کھیلنے کی عادت ترک کرانے کے لیے، یہ عملی مذاق تیار کیا تھا اور اغوا کرنے کے لیے جن لوگوں کی خدمات حاصل کی تھیں، ان کی نیت خراب ہوگئی تھی اور اب وہ اس سنہری موقع سے پورا فائدہ اٹھانے کے چکر میں تھے۔ انہیں علم تھا کہ اس قسم کا پیغام ملتے ہی ڈگلس کی حالت مُردوں سے بدتر ہوجائے گی اور وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ان کا مطالبہ پورا کردے گا۔

”مس کیرول کو اغوا کرنے والے مجرم امریکی ہیں، وہ مقامی باشندے نہیں ہیں۔“ میں نے ڈرائیور سے کہا۔ ”اس خط کی تحریر سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ اس صحرا میں ہم انہیں کسی طرح بھی نہیں کھو سکتے، یہاں روپوش ہونے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اگر ہم انہیں تلاش نہیں کرسکے تو یہ سراسر ہمارا قصور ہوگا۔“

”یہ تو ٹھیک ہے لیکن انہیں فرار ہونے کا کافی موقع ملا ہے، ہمارے اور ان کے درمیان کافی فاصلہ ہے پھر بھی نا امید ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔“

مجھے ایک اور خیال آیا۔ کیرول کو اغوا کرنے والے مجرموں سے ڈگلس اچھی طرح واقف تھا کیونکہ اس نے ہی انہیں اس کام پر مامور کیا تھا اور مجرموں کو بھی اس حقیقت کا علم ہے کہ ڈگلس ان سے اچھی طرح واقف ہے اس لیے پچاس ہزار ڈالرز ادا کرنے کے باوجود مجھے مس کیرول کے زندہ سلامت واپس آنے کی امید کم نظر آتی تھی۔

چاند کی دودھیا روشنی میں ریت کسی سفید چادر کی طرح ہماری نظروں کے سامنے پھیلی ہوئی تھی۔ خودرو جھاڑیاں اور ٹیلے میلوں دور تک بکھرے ہوئے صاف نظر آرہے تھے لیکن مجرموں کی گاڑی کا کہیں پتا نہیں تھا۔ گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ریت پر تازہ ٹائروں کے نشانات واضح نظر آرہے تھے اور یہ بات بھی طے شدہ تھی کہ وہ ہم سے زیادہ تیز رفتاری سے سفر نہیں کرسکتے تھے کیونکہ انہوں نے فرار کے لیے جو راستہ منتخب کیا تھا انتہائی غیر ہموار تھا۔ کبھی کبھار ہی ہموار سطح پر چلنے کا اتفاق ہوا تھا ورنہ کبھی دائیں جانب کے دونوں ٹائر اوپر ہوتے تھے ہر لمحے گاڑی الٹنے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ گاڑی کے اسپرنگ مسلسل دباؤ کا شکار تھے، چھوٹی موٹی جھاڑیاں متواتر ٹائروں کے نیچے آرہی تھیں اور جس راستے پر گاڑی چل رہی تھی، وہ نرم ریت تھی، ان حالات میں تیز رفتاری سے سفر کرنا صرف اسی صورت میں ممکن تھا کہ گاڑی زمین چھوڑ کر فضا میں پرواز کرنے لگے۔

”تیز چلاؤ۔“ میں نے ڈرائیور کو ہدایت کی۔ ”اگر وہ لوگ تیز رفتاری سے سفر کرسکتے ہیں تو ہم بھی ایسا کرسکتے ہیں، مس کیرول نے یہ گاڑی چوبیس ہزار ڈالرز میں خریدی تھی۔“

”یہ تو ٹھیک ہے لیکن اسے سڑکوں پر دوڑنے کے لیے بنایا گیا ہے، پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے نہیں۔“

میں نے ڈرائیور کو آرام دینے کے لیے خود اسٹیئرنگ وہیل سنبھال لیا۔ ایک منٹ بعد جب گاڑی ایک خاصے اونچے تودے پر چڑھی تو مجھے بہت دور سرخ روشنیوں کے دو نقطے نظر آئے جو فوراً غائب ہوگئے، میں نے گاڑی ایک بار پھر ایک اونچے ٹیلے پر چڑھادی، سرخ نقطے ایک مرتبہ نظر آئے لیکن اس کے بعد ہم ان کے دیدار سے محروم ہوگئے۔

”یہ ان کی گاڑی ہے، انہیں اب تک اپنے تعاقب کا احساس نہیں ہوسکا ورنہ وہ گاڑی کی عقبی بتیاں اس طرح روشن نہیں رکھتے۔“ میں نے کہا۔ ”اب دیکھو میں کس طرح عقاب کی طرح ان پر جھپٹتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے ایکسیلریٹر پر اور زور سے دباؤ ڈالا۔ فوراً ایک دھما کا سنائی دیا اور گاڑی کسی بے قابو ہاتھی کی طرح دائیں بائیں لہرانے لگی گاڑی کا اگلا ٹائر پنکچر ہوگیا تھا۔ کوئی نوک دار چٹان یا کوئی سخت کانٹوں والی جھاڑی نے یہ کارنامہ دکھایا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسٹیئرنگ وہیل کو قابو میں کیا اور ایک ہموار جگہ پر گاڑی روک دی۔ ڈرائیور اچھل کر باہر نکلا، اسے ٹائر تبدیل کرنے میں دو منٹ لگ گئے اور پھر ہمارا سفر دوبارہ شروع ہوگیا۔

”گزشتہ پچیس منٹ سے سخت پتھریلی زمین شروع ہوگئی ہے۔“ ڈرائیور نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ایسی زمین پر بے احتیاطی کی وجہ سے پنکچر ہونا معمولی بات ہے۔ نرم ریت میں پنکچر نہیں ہوتے، ہمیں احتیاط سے سفر کرنا ہوگا۔“

اور یہ حقیقت تھی، کچھ دیر پہلے میں نے محسوس کیا تھا کہ جھٹکوں کی شدت میں اضافہ ہوگیا ہے اور گاڑی پہلے سے زیادہ جمپ کر دوڑ رہی ہے۔

کچھ دیر سفر کرنے کے بعد مجھے راستے میں ایک چمکدار لباس پڑا ہوا نظر آیا۔ میں نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کی ہدایت کی۔ وہ مس کیرول کا لباس تھا لیکن اس کے اندر کیرول نہیں تھی۔

”خدا حافظ مس۔“ ڈرائیور نے لباس پہچانتے ہوئے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔

”نہیں، وہ رقم ملنے تک مس کیرول کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔“ میں نے جبڑے بھینچ کر جواب دیا۔ ”انہوں نے کیرول کو لباس تبدیل کرنے پر مجبور کیا ہے تاکہ دن کی روشنی میں وہ ان کے درمیان واضح طور پر نظر نہ آسکے۔“

اس واقعے کے بعد ڈرائیور کے جبڑے زیادہ نمایاں ہوگئے اور وہ بالکل خاموش ہوگیا، گاڑی کی رفتار میں بھی اضافہ ہوگیا تھا اور اس کی نظریں گاڑی کے سامنے زمین پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ پوری یکسوئی کے ساتھ گاڑی چلا رہا تھا اور اب اس کے انداز سے تھکن کا احساس بھی نمایاں نہیں تھا۔ آسمان پر مسلط سیاہی چھٹنے لگی اور نیلا رنگ اندھیرے سے جھانکنے لگا۔ سپیدۂ سحر نمودار ہوگیا تھا کچھ دیر بعد ہم نے گاڑی کی بتیاں گل کردیں، اب ہم اس کے بغیر بھی آسانی سے سفر کرسکتے تھے۔ ٹنکی میں پیٹرول باقی تھا لیکن بہت تیزی سے ختم ہورہا تھا، میں دل ہی دل میں دعا کررہا تھا کہ ان کی گاڑی کا پیٹرول ہم سے پہلے ختم ہو بصورت دیگر ہم مس کیرول کو ان سے چنگل سے آزاد کرانے کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔

صبح چھ بجے کے بعد ہمارا گزر ایک چھوٹے سے قصبے سے ہوا جس کے کچے راستے پر اگلی گاڑی کے ٹائروں کے نشانات نظر آرہے تھے اور ایک جلی ہوئی بلنج بھی ان کے وہاں سے گزرنے کی تصدیق کررہی تھی۔ بلنج کے گرد مقامی باشندے کھڑے ہوئے بلنج کے مالک سے تعزیت کررہے تھے۔ میں نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا اشارہ کیا اور اپنی ٹوٹی پھوٹی اسپینی زبان میں ان سے پوچھا کہ اگلی کار میں کتنے افراد سوار تھے۔

ان سب نے ہاتھوں کی چار انگلیاں کھڑی کردیں۔

”کتنے مرد، کتنی عورت؟“ میں نے دوسرا سوال کیا۔

جواب ملا۔ ”چاروں مرد تھے۔“

”میرے خدا۔“ ڈرائیور کے حلق سے آواز نکلی۔ ”انہوں نے......“

”نہیں وہ زندہ ہے اور انہوں نے مس کیرول کو مردانہ لباس پہنا دیا ہے یا مجرموں کی تعداد چار ہے اور آبادی سے گزرتے ہوئے انہوں نے کیرول کو گاڑی





کے فرش پر لٹا دیا ہوگا تا کہ کسی کی نظر نہ پڑے۔"

ہمیں دوبارہ سفر کا آغاز کرنے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا مقامی باشندوں نے ہماری گاڑی کو گھیر لیا اور بلیخ کی موت کا انتقام ہم سے لینا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم اگلی کار والوں کے ساتھی ہیں، اس غلط فہمی کی وجہ امریکی قومیت تھی، ان میں کچھ لوگ گھر والوں سے کلہاڑیاں لینے چلے گئے تھے اور صورت حال خاصی سنگین ہوگئی تھی۔

"ہم پولیس!" میں نے چیخ کر اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں انہیں سمجھایا۔ "وہ مجرم۔ ہم ان کا تعاقب کر رہے ہیں۔"

یہ سن کر ان کے چہرے مسرت سے دمکنے لگے اور وہ ہماری گاڑی کے سامنے سے ہٹ گئے۔ ڈرائیور نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت تیزی سے گاڑی اٹھائی، ٹائر رگڑ کھا کر بری طرح چیخے اور ان میں ایک مرغ کی چیخ بھی شامل ہوگئی۔ اس طرح بستی کا ایک اور باشندہ سوگوار ہوگیا۔

"ہمیں گاڑی میں پانی ڈال لینا چاہیے۔" ڈرائیور نے تجویز پیش کی۔

"چپ چاپ چلتے رہو، اگر رکے تو اس مرتبہ یہ لوگ کلہاڑیوں کے آنے کا بھی انتظار نہیں کریں گے۔"

صبح نو بجے تک صحرا کسی تنور کے مانند تپنے لگا۔ سورج کی شعاعیں سوئیوں کے مانند کھال سے گزرتی ہوئی ہڈیوں تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ چند لمحوں کے لیے نشست پر ساکت بیٹھنا دشوار ہوگیا۔ تمام رات سفر کرنے کے باعث ہڈیوں کا جوڑ اپنی جگہ سے کھسک گیا تھا اور آرام دہ بستر پر گہری نیند کی بھیک مانگ رہا تھا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس سمت میں کہاں جانا چاہتے ہیں۔" میں نے جھلا کر کہا۔ "کیا وہ کو لوراڈو دریا میں ڈوب کر مرنا چاہتے ہیں؟"

"شاید درمیان میں کہیں انہوں نے روپوش ہونے کا انتظام کیا ہوا ہے۔"

"وہ پہلے سے کوئی انتظام نہیں کر سکتے وہ کسی پناہ گاہ کی تلاش میں ہیں، ان پاس اس قسم کی تیاری کا کوئی وقت نہیں تھا۔" میں نے اس کے خیال کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ "یہ منصوبہ ڈگلس نے کل صبح بنایا تھا کیونکہ جمعہ کی رات تک مس کیرول کو خود یہاں آنے کا علم نہیں تھا۔ وہ سو کر تھکن اتارنا چاہتی تھی پھر اچانک ہی یہ پروگرام بن گیا۔"

نو بج کر بائیس منٹ پر میں نے ڈرائیور سے کہا۔ "یہاں گاڑی روکنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں نہیں روک رہا، گاڑی خود رکنا چاہتی ہے۔ پیٹرول ختم۔" یہ سنتے ہی میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ مقام پیٹرول ختم ہونے کے لیے کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ گاڑی کے رکتے ہی اندر کا درجۂ حرارت بہت تیزی سے بڑھنے لگا۔ چمڑے کا غلاف چڑھی ہوئی نشست اس طرح تپنے لگی جیسے اس کے نیچے آگ کا جہنم دہک رہا ہو۔

"بس ذرا نمک کی کمی ہے۔" ڈرائیور نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ "نمک کے بغیر ہمارا بھنا ہوا گوشت کچھ زیادہ لذیذ ثابت نہیں ہوگا۔" اس نے نشست کے نیچے سے میکسیکو کی بنی ہوئی تیز شراب کی ایک بوتل نکالی اور دانتوں سے اس کا منہ کھولنے لگا۔

"ٹھہرو۔" میں نے شراب کی بوتل اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ "کیوں نہ ہم یہ شراب ٹینک میں ڈال کر دیکھیں ممکن ہے گاڑی کو ہماری بددیانتی کا احساس نہ ہونے پائے اور وہ اسے پیٹرول سمجھ کر دوبارہ چلنے لگے۔"

میں ڈرائیور کے جواب کا انتظار کیے بغیر اچھل کر باہر نکلا اور پیٹرول کی ٹنکی میں شراب کی بوتل انڈیل دی۔ ڈرائیور مزید دو تین بوتلیں نکال لایا۔

"ہم ساری رات تاش کھیلنا چاہتے تھے اور اس کے لیے یہ تین بوتلیں خریدی گئی تھیں۔"

"جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کرو، تاخیر ہونے پر ممکن ہے انجن کو صحیح صورت حال کا علم ہوجائے اور وہ چلنے سے انکار کر دے۔"

اگنی شن گھومتے ہی انجن اسٹارٹ ہوگیا اور ہم نے تیزی سے ایک مرتبہ پھر اپنا سفر شروع کر دیا۔ اب گاڑی شراب پر چل رہی تھی۔

"تمہیں ان بوتلوں کا پورا کریٹ خریدنا چاہیے تھا۔"

"اس سے صرف اتنا فرق پڑے گا کہ ہمارے کباب کچھ دیر بعد کسی اور مقام پر تیار ہوں گے اور اب یہ عمل زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوگا۔ معدے میں شراب موجود ہو تو اذیت کا احساس کم ہوجاتا ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ ہماری گاڑی کا پیٹرول ختم ہوگیا اور ان کا اب تک کیسے چل رہا ہے؟ انہوں نے راستے میں کہیں پیٹرول دوبارہ بھروایا۔"

جواب میں میرے ساتھی نے اچانک بریک لگا کر گاڑی روک دی۔ "ان کا پیٹرول بھی ختم ہوگیا ہے۔ وہ دیکھو سامنے وہ گاڑی ہے نا؟ کہیں میری نظریں دھوکا تو نہیں

کھارہیں؟''

مجرموں کی کار ہم سے اتنے فاصلے پر تھی کہ ہم اسے نہیں دیکھ سکتے تھے، سورج کی منعکس ہونے والی شعاعیں اس کی موجودگی کا پتا دے رہی تھیں اور وہ انعکاس منجمد تھا۔ اگر متحرک ہوتا تو شاید ہم اسے نہ دیکھ پاتے کیونکہ ہمارے درمیان تین گہری کھائیاں اور دو ٹیلے حائل تھے۔ جس جگہ مجرموں کی گاڑی کھڑی تھی اس کے بالکل قریب ایک تکون نما اونچا سا ٹیلا تھا جس کا سایہ مغرب کی طرف پڑ رہا تھا اور گاڑی مشرق کی جانب ہونے کے باعث براہ راست آسمان سے برستی ہوئی آگ کی زد میں کھڑی تھی۔

''پیٹرول ختم ہو گیا ہے یا گاڑی میں کوئی نقص پیدا ہو گیا۔'' میں نے کہا۔ ''اگر وہ چلنے کے قابل ہوتی تو اسے یوں دھوپ میں کھڑا نہیں کیا جاتا بلکہ دوسری طرف ٹیلے کے سائے میں روکتے۔ تم دائیں طرف سے آگے بڑھو تاکہ ٹیلا ہمارے درمیان حائل ہو جائے اور وہ ہمیں نہ دیکھ سکیں۔''

یہ حکمت عملی محض دل کا بہلاوا تھی۔ جو حقیقت میں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا وہ یہ تھی کہ مس کیرول ان کے قبضے میں ہے اور وہ مسلح ہیں اس کے ساتھ یہ امکان بھی پیش نظر تھا کہ اگر انہوں نے ہمیں حملہ آور ہوتے دیکھ لیا تو ممکن ہے ان کی چلائی ہوئی پہلی گولی کیرول کا خاتمہ کر دے، ایسے لوگوں سے کچھ بعید نہیں ہوگا کہ وہ خطرے اور ناکامی کا سامنا ہونے پر کس ردعمل کا اظہار کریں۔ مجھے معلوم تھا کہ میرا ساتھی بھی مسلح ہوگا کیونکہ مس کیرول نے اسے ایک بھرا ہوا ریوالور ہمیشہ اپنے پاس رکھنے کی سختی سے ہدایت کی ہوئی تھی کہ ہنگامی حالات میں اس سے بھی کام لیا جا سکے۔

''اگر ان کی گاڑی کی چمک اتنی دور سے ہمیں نظر آ سکتی ہے تو ہماری گاڑی سے منعکس ہونے والی چمک انہیں بھی نظر آ سکتی ہے۔'' ڈرائیور نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کہا۔

''وہ ہمیں نہیں دیکھ سکتے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کیونکہ سورج ان کے سامنے ہے اور ہمارے عقب میں ہے، اگر ان میں سے کوئی اس دھوپ میں ٹیلے پر چڑھنے کی ہمت کرے تو وہ ہماری گاڑی دیکھ لے گا۔ مجھے یقین ہے کہ انہیں اب تک اپنے تعاقب کا بھی احساس نہیں ہو سکا ہے۔''

ہم ایک بہت بڑے دائرے کی شکل میں گھومتے ہوئے ٹیلے کے سامنے والی سمت میں پہنچ گئے اور پھر ناک کی سیدھ میں ٹیلے کی طرف ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ دوسری طرف ٹیلا ہونے کے باعث مجرموں کی گاڑی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ بہت دیر سفر کرنے کے بعد آخرکار ہماری گاڑی اونچائی پر چڑھنے لگی اور ہم ٹیلے کے پھیلے ہوئے لمبے سایے کی پناہ میں آ گئے۔ وہ سایہ کیا تھا بس آسمانی جنت کا ایک ٹکڑا محسوس ہوتا تھا۔ میں نے ٹیلے کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی اپنے ساتھی کو گاڑی روکنے کی ہدایت کی۔

''باقی سفر پیدل طے کریں گے۔'' میں نے کہا۔

''گولیاں چلنے کی صورت میں ہم اپنی گاڑی کو ڈھال کی حیثیت سے استعمال کر سکیں گے لیکن اگر ہم نے اسے یہیں چھوڑ دیا تو پھر ہم اپنے بچاؤ کے لیے کیا کریں گے؟''

''اس قسم کے مقابلے کی نوبت نہیں آئے گی، یہ مت بھولو کہ مس کیرول ان مجرموں کے درمیان موجود ہے اس لیے ہمیں انتہائی خاموشی اور سوچ سمجھ کر حملہ کرنا پڑے گا۔''

''تمہیں فوج میں جرنیل ہونا چاہیے تھا۔'' ڈرائیور نے تعریفی لہجے میں کہا اور ہم گاڑی سے اتر کر ٹیلا پیمائی کرنے لگے جس کی شکل تکون نما تھی۔ میرا خیال تھا کہ ہم اوپر چڑھ کر جب دوسری طرف دیکھیں گے تو دشمن ہمیں کسی شطرنج کی بساط پر بکھرے ہوئے مہروں کے مانند نظر آئیں گے، اس کے علاوہ انہیں یہ بھی علم نہیں ہو سکے گا کہ ان کے مقابلے پر صرف دو آدمی ہیں یا ہمارے ساتھ دوسرے افراد بھی ہیں جو ٹیلے کے پیچھے پوزیشن سنبھالے ہوئے ہیں۔ جو ٹیلا دور سے سیدھا سادا نظر آ رہا تھا، ٹیڑھی کھیر ثابت ہوا۔ سایے میں ہونے کے باوجود چڑھائی ایسی کٹھن اور دشوار ثابت ہوئی کہ دانتوں...... پسینا آ گیا۔ ہمارے سینے دھونکنی کی طرح پھول پچک رہے تھے اوپر پہنچ کر ہم کچھ دیر اپنے سانس درست کرتے رہے پھر میں نے اپنے ساتھی کو کاندھے نیچے رکھنے کا اشارہ کیا اور چھپکلی کے مانند سنگلاخ زمین سے چپکے ہوئے ہم آگے بڑھے اور ہم نے ذرا سی ناک باہر نکالتے ہوئے نیچے نظریں دوڑائیں۔ مجرموں کی گاڑی چونکہ ٹیلے سے دور کھڑی تھی اس لیے ہمیں فوراً نظر آ گئی لیکن اس کے اندر یا اس کے قریب کوئی نظر نہیں آیا۔

''کیا وہ پیدل ہی آگے بڑھ گئے۔'' اس نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

''شش۔'' میں نے اسے خاموش کرتے ہوئے کہا اور گردن آگے بڑھائی۔ وہ لوگ ٹیلے کے بالکل قریب تھے اور جس مقام پر وہ کھڑے تھے، ٹیلے کا وہ حصہ نیچے کی طرف دیوار کی طرح سیدھا اور سپاٹ تھا۔ تین مجرم کھڑے کسی مسئلے پر بحث میں مصروف تھے اور چوتھا ان سے چند گز کے فاصلے پر ایک پتھر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے

پر گہرے رنگ کے شیشوں کی عینک موجود تھی۔

میں نے اپنے ساتھی کو کہنی مارتے ہوئے ریوالور کی نال سے چوتھے کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں شرط لگا سکتا ہوں کہ وہ شخص جو ایک طرف تنہا بیٹھا ہے، مس کیرول کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا، اس نے کیرول کا چشمہ لگایا ہوا ہے اور ننگے پیر ہے۔'' اس نے مردانہ لباس پہنا ہوا تھا اور سر پر بہت بڑا ہیٹ تھا۔

جنگ کا نقشہ بہت حوصلہ افزا اور ہمارے حق میں تھا۔ تینوں مجرم اب تک ہمارے وجود سے لاعلم تھے۔ ہم احتیاط سے ٹیلے پر اترتے ہوئے ان کے سروں پر پہنچ سکتے تھے اور اوپر سے انہیں ریوالوروں کی زد پر لے کر غیر مسلح کر سکتے تھے، کیرول ان کی جامہ تلاشی لے کر چھپے ہوئے ہتھیار برآمد کر سکتی تھی جس کا اسے خاصا تجربہ تھا، اس نے مار دھاڑ والی کافی فلموں میں کام کرتے ہوئے یہ کردار ادا کیا تھا۔ اس کے بعد ہم چھلانگ لگا کر نیچے اترتے اور انہیں پریڈ کراتے ہوئے اپنی گاڑی تک لے جاتے۔

میں نے ڈرائیور کو چوٹی سے نیچے اترنے کا اشارہ کیا اور خود بھی نیچے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ پھر میں نے اس سے کہا کہ وہ چوٹی کے دوسری سمت چلا جائے، اس طرح دشمنوں پر یہ ظاہر ہوگا کہ ہماری تعداد زیادہ ہے۔ وہ ریوالور ہاتھ میں پکڑ کر میرے عقب میں کھڑا تھا۔ میری ہدایت پر عمل کرنے کے لیے پلٹا اور پھر ایک واقعہ پیش آیا، اچانک میں نے اس کی پشت اپنی پیٹھ سے چپکتے ہوئے محسوس کی اور پھر وہ مجھے آگے کی طرف دھکیلنے لگا، ایسا کرتے ہوئے اس کا بدن بری طرح کپکپا رہا تھا۔ مجھے ریوالور پتھریلی زمین پر گرنے کی آواز سنائی دی گویا ڈرائیور کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا تھا۔ اس کے مسلسل دھکیلنے اور پیچھے ہٹنے کے عمل نے مجھے پریشان کر دیا۔ وہاں اتنی جگہ نہیں تھی کہ میں آگے کھسک کر اسے پیچھے ہٹنے کی جگہ دیتا اور اگر میں چوٹی پر چڑھتا تو نیچے کھڑے ہوئے مجرموں کی مجھ پر نظر پڑنا یقینی امر تھا۔

میں نے ترچھا ہوتے ہوئے سر گھما کر پیچھے دیکھا۔ ایک سیاہ رنگ ناگ دو پتھروں کے درمیان کھڑا پھن پھیلا کر جھوم رہا تھا۔ زمین سے اس کا دھڑ میرے ساتھی کی ٹھوڑی تک اٹھا ہوا تھا اور وہ اس قدر قریب تھا جیسے وہ اپنے پھن سے میرے ساتھی کو ہوا جھل رہا ہو۔ اس کے پھن کی چوڑائی میری دونوں ہتھیلیوں کے برابر تھی اور وہ کسی بھی لمحے حملہ کرنے والا تھا، صورت حال کچھ ایسی تھی کہ اس میں کچھ سوچنے سمجھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ چابک کی طرح میرا ریوالور والا ہاتھ اٹھا، گھوما اور ناگ کے پھن پر متواتر تین گولیاں چلیں۔ وہ اس قدر قریب تھا کہ نشانہ خطا ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پہلی گولی چلتے ہی سانپ نے بڑی تیزی سے حملہ کیا لیکن پہلی ہی گولی اس کا خاتمہ کر چکی تھی، اس کا دھڑ آگے بڑھا اور پھر کسی کٹی ہوئی پتنگ کی ڈور کے مانند زمین کی طرف جھکتا چلا گیا۔ ناگ تو جہنم رسید ہو گیا لیکن اپنے ساتھ میرا منصوبہ بھی تباہ کر گیا۔ اب ہم دشمن پر بے خبری میں حملہ نہیں کر سکتے تھے۔ ہم بڑی پھرتی سے نیچے جھکتے ہوئے گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئے لیکن مجرم میری توقعات سے کہیں زیادہ پھرتیلے ثابت ہوئے بیٹھتے بیٹھتے ہمارے دونوں طرف گولیاں سنسنانے لگیں۔

تینوں مجرم جو چند لمحے قبل ایک جگہ کھڑے گرما گرم بحث میں مصروف تھے، اس طرح اچھل کر ادھر ادھر پھیلے جیسے گندا ٹماٹر اپنے نشانے پر لگ کر پھٹتا ہے اور اس کا گودا

پچکاریوں کی صورت میں اچانک اِدھر اُدھر پھیل جاتا ہے۔ ایک نے دوڑ کر جھاڑی کے پیچھے پناہ لی، دوسرا ٹیلے کے مزید قریب آگیا جہاں ایک بڑا سا پتھر چھجے کی طرح باہر نکلا ہوا تھا اور تیسرا جہاں کھڑا تھا، وہیں زمین پر بیٹھنے لگا کیونکہ میرے ریوالور کی بقیہ دونوں گولیاں اس کے جسم میں گھس کر غائب ہوگئی تھیں۔ ڈرائیور بھی اپنا ریوالور سنبھال کر چوٹی کی دوسری طرف سے جھک کر مجرموں پر گولیاں برسا رہا تھا۔

چوتھا مجرم جوان سے علیحدہ ایک پتھر پر بیٹھا تھا گولیاں چلنے کی آواز سنتے ہی پہلے تو ہکا بکا رہ گیا اور جب اسے خطرے کا احساس ہوا تو وہ اچھل کر کھڑا ہوگیا اور ننگے پیروں تیزی سے کار کی طرف دوڑنے لگا۔ اس کا بھاگنے کا انداز ظاہر کر رہا تھا کہ وہ مس کیرول ہے، تپتی ہوئی ریت نے فوراً اسے رقص کرنے پر مجبور کردیا اور یوں اس کی دوڑ کی رفتار سست ہوگئی، ننگے تلووں گرم ریت پر بھاگنا بہت ہی مشکل کام ہوتا ہے۔ کیرول کو گاڑی کی طرف بھاگتا دیکھ کر مجرم ٹیلے کے نیچے پتھریلے چھجے کے نیچے چھپ گیا تھا، وہ اچانک اپنی پناہ گاہ سے نکل کر کیرول کی طرف لپکا۔ اس وقت میں ریوالور میں گولیاں بھرنے میں مصروف تھا۔ دوسرا مجرم جو جھاڑی کے پیچھے روپوش ہوگیا تھا۔ اس نے فوراً اپنے ساتھی کی تقلید کی، دوسرا قدم اٹھاتے ہی میں نے اس کی کنپٹی کے قریب گول نشان بنتے ہوئے دیکھا اور پھر اس سوراخ میں سے خون ابلنے لگا۔ مجرم کوئی آواز نکالے بغیر ریت پر ڈھیر ہوگیا لیکن پہلا شخص اتنی دیر میں کیرول کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اس نے پیچھے سے کیرول کے سر پر جما ہوا ہیٹ اتار کر پھینک دیا۔ فوراً ہی کیرول کے سنہری بال کاندھوں پر بکھر گئے۔ وہ اپنی دانست میں ہماری غلط فہمی دور کرنا چاہتا تھا اور یہ جتانا چاہتا تھا کہ مردانہ لباس پہنے ہوئے چوتھا شخص اس کا ساتھی نہیں ہے بلکہ مس کیرول ہے جسے وہ ڈھال کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔

''گولی مت چلانا، رک جاؤ۔'' میں نے چیخ کر ڈرائیور کو مخاطب کیا لیکن صورت حال بھانپتے ہی اس کی انگلی لبلبی پر ساکت ہوگئی تھی۔

مجرم نے کیرول کا ایک ہاتھ بڑی بے رحمی سے پیچھے کی طرف موڑ دیا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میرے بدن میں آگ لگ گئی لیکن میں کیا کرسکتا تھا مگر ڈرائیور کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ اس سے پہلے کہ میں اسے روک پاتا۔ وہ بڑی تیزی سے ڈھلان پر تقریباً لڑھکتے ہوئے ٹیلے سے نیچے اترنے لگا اس کے ساتھ چھوٹے موٹے بہت سے پتھر بھی لڑھکنے لگے۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے ڈر ہوا کہ کہیں یہ اناڑی اپنی گردن نہ توڑ لے۔ اب ٹیلے پر میرا رکنا فضول تھا، میں نے ڈرائیور کی تقلید کی لیکن لڑھکنے والے انداز میں نہیں، میں تیزی کے ساتھ جسمانی توازن سنبھالتا ہوا، قدم جماتا ہوا، ٹیلے سے اترنے لگا۔

ہمیں اس بے جگری سے نیچے اترتا ہوا دیکھ کر مجرم نے بے تحاشا گولیاں چلانی شروع کردیں۔ اس کا ریوالور کیرول کی بغل میں دبا ہوا تھا اس لیے گولیاں چلنے پر ریوالور کی نال سے جو بے تحاشا دھواں خارج ہوا تو کیرول کے بدن کا اوپری حصہ اس دھویں میں روپوش ہوگیا۔ اچانک مس کیرول نے حرکت کی اور پوری قوت سے ریوالور کو اپنی بغل میں دبوچ کر ہلنا شروع کردیا۔ اس کا مقصد مجرم کا نشانہ خطا کرنا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ ڈرائیور کے کوئی گولی نہیں لگی کیونکہ ٹیلے پر سے اترنے کے بعد بھی وہ اپنی رفتار میں کمی نہیں کرسکا تھا۔ اس کی حالت ایسی گاڑی کے مانند تھی جو اونچائی پر سے نیچے اتری ہو اور جس کے بریک بھی ناکارہ ہوں۔

مجرم نے مس کیرول کی بغل میں سے ریوالور نکالنے کی بڑی کوشش کی اور ایک مرتبہ پوری قوت سے اس کی ناک پر گھونسا بھی مارا جس نے کیرول کے ہوش وحواس غائب کردیے اور وہ غشی کی حالت میں مجرم کی گرفت میں جھولنے لگی۔ اس صورت حال نے مجرم کو بوکھلا دیا۔ وہ ریوالور اور کیرول، دونوں کو ریت پر پھینک کر تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف لپکا اور اندر گھس گیا۔ میں کیرول کے بدن کو پھلانگتا ہوا مجرم کی طرف لپکا کیونکہ اگر وہ ٹامی گن اٹھا لیتا تو لمحے بھر میں ہم تینوں کو بھون کر رکھ دیتا۔

ٹامی گن گاڑی کی پچھلی نشست پر پڑی تھی، وہ ٹامی گن اٹھانے میں کامیاب ہوگیا اور میری طرف پلٹ رہا تھا کہ میں جست لگا کر اس پر گر گیا، ٹامی گن نے پچھلے دروازے کے ایک حصے اور شیشے کے پرخچے اڑا دیے، میں نے ریوالور والا ہاتھ گھمایا جو خالی ہو چکا تھا، ریوالور کی نال دشمن کی پسلیوں میں گھس گئی اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ میں نے پھرتی سے نال پکڑتے ہوئے ریوالور کا دستہ پوری قوت سے اس کی پیشانی پر مارا، اس نے ٹامی گن چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے میرا حلق دبوچ لیا اور پوری قوت سے گلا گھونٹنے لگا، میرا سانس گھٹنے لگا اور آنکھوں کے سامنے تاریکی چھانے لگی، اچانک میرے حلق پر اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور پھر وہ نشست پر گر گیا۔

جب میرے ہوش وحواس بحال ہوئے تو میں نے اپنے ساتھی کو دوسرے دروازے کے پاس کھڑا ہوا پایا۔ اس نے ریوالور کا دستہ مجرم کی کھوپڑی پر بجا کر اسے بے ہوش کردیا تھا۔

''واہ، تم نے کمال کردیا دوست۔'' میں نے ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا مطلب ہے کہ تم جس بے جگری سے ٹیلے سے اترے تھے، اس طرح جان ہتھیلی پر رکھنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔''

''لعنت بھیجو بے جگری پر، ٹیلے پر اچانک میرا توازن بگڑ گیا تھا۔ میں اتر نہیں رہا تھا، گر رہا تھا۔''

''خیر، خیر تمہارے اس طرح گرنے نے کھیل کا پانسا پلٹ دیا۔''

ہم نے مجرم کو باندھ کر گاڑی میں ڈالا اور مس کیرول کے پاس پہنچے جو ہوش میں آگئی تھی۔ اس کی ناک اور جبڑے پر ورم آگیا تھا اور وہ ایک بازو کو حرکت دینے کے قابل نہیں تھی۔ چہرے پر ریت جمی ہوئی تھی۔ ہم نے سہارا دے کر اسے کھڑا کیا اور جب اس نے چشمہ اتارا تو ہم دونوں اس کی صورت دیکھنے لگے، وہ کیرول نہیں تھی۔

''اس طرح گھورنے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے ایک ہاتھ سے چہرے پر جمی ہوئی ریت صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ میں فلم اسٹار کیرول نہیں ہوں لیکن میرا قد، جسامت اور شکل وصورت مس کیرول سے بہت ملتے ہوئے ہیں اس لیے جب بھی تفریح کا موڈ ہوتا ہے تو میں کلب میں آکر ٹھہر جاتی ہوں۔ سب مجھے فلم اسٹار کیرول سمجھتے ہیں۔ میری رہائش اور کھانے پینے کے اخراجات مس کیرول کے کھاتے میں چلے جاتے ہیں جس کی ادائیگی ان کا منیجر یہ سمجھ کر کردیتا ہے کہ مس کیرول نے ضرور وہاں قیام کیا ہوگا لیکن اب اس تجربے کے بعد میں زندگی بھر یہ حرکت نہیں کروں گی۔ میں تم لوگوں سے صرف یہ درخواست کرنا چاہتی ہوں کہ مجھے ایسی جیل بھیجا جائے جہاں سورج کی ایک کرن بھی داخل نہ ہوتی ہو۔ اگر ہم مہذب دنیا میں واپس پہنچ جائیں تو۔''

سہ پہر تین بجے ہمیں ایک ہیلی کاپٹر اپنے سروں پر منڈلاتا ہوا نظر آیا، وہ ہمیں دیکھ کر نیچے اتر آیا۔ میں نے نقلی کیرول اور ڈرائیور کو ہیلی کاپٹر میں سوار کردیا اور خود دو لاشوں، دو کاروں اور ایک زندہ مجرم کی نگرانی کے لیے وہیں ٹھہر گیا، مجبوری تھی، کیونکہ ہیلی کاپٹر میں مزید دو افراد کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ مجھے کھانے پینے کا سامان دے کر واپس چلے گئے۔

امدادی پارٹی کے ساتھ جب میں واپس ایگوا کالائنٹ پہنچا تو پیر کا سورج مشرق سے نمودار ہوگیا تھا، مس کیرول جیل سے رہا ہو چکی تھی اور کلب کے دروازے پر میرا انتظار کر رہی تھی اس پر نظر پڑتے ہی میری روح فنا ہوگئی کیونکہ اسے جیل کی ہوا کھلانے کی پوری ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی تھی۔

''اوہ مس کیرول۔'' میں نے شرمندگی سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی غلطی پر بہت نادم ہوں لیکن اس میں میرا بھی زیادہ قصور نہیں تھا۔ آپ نے حلیہ تبدیل کیا ہوا تھا اور حالات کچھ اس قسم......''

مس کیرول نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے خاموش کردیا۔ ''بس اب شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں، اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا، حلیے کی تبدیلی بہت ضروری تھی، میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ہالی ووڈ میں، میں نے ایک ستارہ شناس سے مشورہ کیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ مجھے جوئے میں ناکامی میرے بالوں کے رنگ اور میرے وجود سے خارج ہونے والی نرم شعاعوں کی بدولت ہوتی ہے۔ اگر میں اپنے بالوں کا رنگ تبدیل کرلوں اور اپنے وجود سے خارج ہونے والی غیر مرئی شعاعوں میں سختی پیدا کرلوں تو پھر جوئے میں ہارنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اس نے بالکل صحیح کہا تھا۔ تم نے خود دیکھ لیا کہ میں دو بازیوں میں کتنی رقم جیت گئی تھی۔ اگر اس وقت میں خود کو تم پر ظاہر کردیتی تو میری خوش بختی، بدقسمتی میں تبدیل ہوجاتی، اس لیے میں خاموش رہی۔''

''تو آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں؟''

''ناراض؟ اگر تم وہ حرکت نہ کرتے تو میں جیل جانے کے بجائے اغوا کرلی جاتی اور پھر تم نے غلط فہمی کی بنا پر ایک دوسری لڑکی پر میرا دھوکا کھاتے ہوئے جس ذہانت اور دلیری سے مجرموں کا مقابلہ کرتے ہوئے اس کی جان بچائی اور اسے مجرموں کے پھندے سے نکالا، تمہارے اس کارنامے پر مجھے فخر ہے، میں تم سے بہت خوش ہوں۔ ڈرائیور نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے، میں تمہیں ڈکس کی جگہ اپنا منیجر مقرر کر رہی ہوں، اس نے مجھے اغوا کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا وہ ناقابل معافی ہے۔ آج سے تم میرے منیجر ہو اور میں جب کوئی فیصلہ کرلیتی ہوں تو انکار برداشت نہیں کرسکتی۔''

میں بھلا کس طرح انکار کرسکتا تھا۔



اشکِ ندامت

ملک صفدر حیات

زن، زر اور زمین کے قصّے جتنے پرانے اتنے ہی نت نئے افسانے سامنے آکر دنیا کو حیران کرتے رہے ہیں... یہاں بھی دل کا معاملہ تھا پر نہ دل اپنی جگہ تھا اور نہ ہی نشانہ... ایسے میں خطا کا ہوجانا لازمی امر تھا... اور جب خطا ہوجائے تو سزا کسی بھی روپ میں ڈھل کر تعاقب سے باز نہیں آتی۔ وہ خطاوار کی جھولی میں ایسے آن گرتی ہے جیسے یہی اس کا اصل مسکن ہو... کچھ ایسا ہی مثلث یہاں بھی زیرِعتاب تھا جس کے گرد خونِ ناحق نے ایک مضبوط دائرہ کھینچ لیا تھا... تاکہ مجرم قانون کی دسترس سے نکلنے نہ پائے، جہاں ملک صفدر جیسے باضمیر لوگ فعل کردار ادا کرتے ہوں وہاں معاشرے میں مجرم اور جرم زیادہ دیر کھل کھیل نہیں سکتے۔

دھوکے میں جان گنوانے والے معصوم انسان

کا عبرت اثر قصہ

جھنگ وسطی پنجاب کا ایک ایسا ضلع ہے جہاں ملک کے دو بڑے دریا جہلم اور چناب ہم آغوش ہوکر ایک طرف تو اس ضلع کی زمین کی زرخیزی بڑھاتے ہیں تو دوسری جانب عشق و محبت کی داستانیں رقم کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ "ہیر رانجھا" اس سلسلے کی سب سے بڑی مثال ہے جو لوک ورثہ کی حیثیت کی حامل ہے۔

ان دنوں میں اسی ضلع جھنگ کے ایک دور دراز تھانے میں تعینات تھا اور اتفاق سے میرا تھانہ مذکورہ بالا دونوں دریاؤں کے درمیان واقع تھا اور وہ مقام بھی میرے تھانے سے زیادہ دور نہیں تھا جہاں یہ دونوں دریا آپس میں مل جاتے تھے۔ ایک روز میں حسبِ معمول تیار ہوکر تھانے پہنچا تو ایک سنسنی خیز خبر میری منتظر تھی۔

وہ مئی کا مہینا تھا۔ موسمِ گرما آغاز ہو چکا تھا۔ گندم کی فصل تیار کھڑی تھی۔ میں اپنے کمرے میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ ایک کانسٹیبل نے آکر اطلاع دی۔ "ملک صاحب! ساتھ والے پنڈ میں ایک واردات ہوگئی ہے۔"

"کس قسم کی واردات؟" میں نے کانسٹیبل سے پوچھا۔

"جناب! ایک گبرو جوان کو بڑی بے دردی سے قتل کردیا گیا ہے۔" اس نے بتایا۔ "تھوڑی دیر پہلے دو بندے آئے تھے تھانے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ قتل ہونے والے جوان کی لاش ادھر کھیتوں میں پڑی ہے۔"

"تم ساتھ والے کون سے پنڈ کی بات کر رہے ہو سکندر علی؟ ہمارے تھانے سے قریب تر دو گاؤں ہیں۔ ایک گلاب پور اور دوسرا نذیر آباد......"

"جی...... میں گلاب پور کا ذکر کر رہا ہوں۔" کانسٹیبل سکندر نے جواب دیا۔

گلاب پور نامی وہ گاؤں میرے تھانے سے محض آدھے میل کے فاصلے پر واقع تھا جبکہ نذیر آباد اور میرے تھانے کے درمیان لگ بھگ پونے میل کا فاصلہ تھا اور یہ دونوں گاؤں آپس میں شمالاً جنوباً ایک میل کے فاصلے پر آباد

تھے وہ اس طرح کہ گلاب پور شمال کی جانب اور نذیر آباد جنوب کی طرف۔ دونوں گاؤں کی زرعی اراضی بھی آپس میں ملی ہوئی تھی۔

میں نے کانسٹیبل سے پوچھا۔ ’’قتل کی اس واردات کی اطلاع لے کر آنے والے کہاں ہیں؟ انہیں میرے پاس بھیجو۔‘‘

’’جناب! وہ اطلاع دینے کے بعد واپس چلے گئے ہیں۔‘‘ کانسٹیبل نے بتایا۔ ’’انہیں جلدی تھی۔ ویسے میں نے ان کی تاریخ اور جغرافیہ معلوم کرلیا ہے۔‘‘

’’مجھے بھی بتاؤ......‘‘ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

’’ان میں سے ایک کا نام ہے فیاض اور دوسرے کا یوسف۔‘‘ کانسٹیبل نے جواب دیا۔ ’’اور ان دونوں بندوں کا تعلق بھی گلاب پور ہی سے ہے جناب۔‘‘

’’اور مقتول کے حدود اربعہ کے بارے میں کیا پتا چلا؟‘‘

’’وہ گبرو جوان بھی گلاب پور ہی کا رہنے والا ہے ملک صاحب۔‘‘ سکندر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ’’اس کا نام ناصر ہے...... ناصر کبڈی کا بڑا ماہر کھلاڑی تھا۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’ٹھیک ہے سکندر، جائے وقوعہ پر پہنچنے کی تیاری کرو۔‘‘

’’اچھا جی......!‘‘ اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور میرے کمرے سے نکل گیا۔

جھنگ کے اس دور دراز تھانے میں میری تعیناتی کو ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ میں وہاں کے ماحول اور سرکردہ لوگوں سے تو اچھی طرح واقف ہوچکا تھا لیکن بہ قول کسے...... میں خود کو ابھی وہاں کی ’’وائی‘‘ کہنے کی پوزیشن میں نہیں آیا تھا۔

پندرہ بیس منٹ کے اندر کانسٹیبل سکندر نے آکر مجھے بتایا۔ ’’ملک صاحب! میں نے دو صحت مند گھوڑوں کا بندوبست کردیا ہے۔ آپ کا جب بھی حکم ہو، ہم روانہ ہوجائیں گے۔‘‘

’’بس، تو ہم ابھی اور اسی وقت روانہ ہو رہے ہیں۔‘‘ میں نے کرسی چھوڑتے ہوئے کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اور کانسٹیبل سکندر علی دو گھوڑوں پر سوار ہوکر جائے وقوعہ کی سمت رواں دواں تھے۔

☆☆☆

جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا، موضع گلاب پور میرے تھانے سے صرف نصف میل کی دوری پر واقع تھا لیکن یہ مختصر سا فاصلہ کسی سڑک پر سفر کرتے ہوئے طے نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ گلاب پور اور میرے تھانے کے بیچ پکی یا کچی سڑک نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ ہمارے گھوڑے کھیتوں کے بیچوں بیچ ایک آڑی ٹیڑھی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے موضع گلاب پور پہنچ گئے۔

گاؤں کے اندر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ناصر کی لاش کھیتوں میں پڑی ہے۔ چند لوگوں کی نگرانی بلکہ راہنمائی میں ہم جائے وقوعہ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ وہ مقام کھیتوں کے بیچ گاؤں سے نصف فرلانگ کے فاصلے پر واقع تھا۔

وہ ایک ادھورا کمرا تھا جس کی اب چھت دکھائی دے رہی تھی اور نہ ہی دیواریں سلامت تھیں۔ دروازے والی جگہ پر بھی چوکھٹ یا کواڑ دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ہاں، بڑے وثوق کے ساتھ یہ کہا جاسکتا تھا کہ گزرے وقتوں میں کبھی وہاں کئی کمرے کی عمارت ہوا کرتی تھی۔

ناصر نامی جوان کی لاش اسی آدھے ادھورے کمرے کے سامنے پڑی تھی۔ جائے وقوعہ پر دو درجن سے زائد افراد کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ میں نے سب کو پیچھے ہٹایا اور اکڑوں بیٹھ کر لاش کا معائنہ کرنے لگا۔

بلاشبہ وہ ایک سجیلا گبرو جوان تھا۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ بائیس سے پچیس کے درمیان قائم کیا جو بعد ازاں تیئس ثابت ہوا۔ وہ ایک مضبوط و نمایاں قد کاٹھ اور پہلوانی بدن کا مالک جوان تھا۔ رنگت گندمی اور سر کے بال گھنگھرالے۔ قدرت نے اسے کسرتی بدن کی خوب صورتی کے علاوہ مردانہ وجاہت سے بھی دل کھول کر نوازا تھا لیکن اس وقت وہ زندگی سے خالی گوشت پوست کے ایک ڈھیر سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ ناصر کی...... حسرت ناک موت کا مجھے دلی صدمہ ہوا تھا۔

میں نے باریک بینی سے جب ناصر کی خون خون لاش کا جائزہ لیا تو مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ اسے کسی تیز دھار چھرے یا خنجر کے متعدد وار کرکے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں اور بازوؤں پر موجود زخموں کے نشانات کو دیکھ کر واضح ہوجاتا تھا کہ اس نے خود کو بچانے کے لیے بہت کوشش کی تھی مگر حملہ آور نے اس کی ایک نہیں چلنے دی تھی اور بالآخر اسے بے بسی کی موت کو گلے لگانا پڑا تھا۔

گاؤں والے ناصر کو کبڈی کے حوالے سے گلاب پور کی آبرو سمجھتے تھے۔ ایسی بے بسی کی موت...... یہ سوچنے پر مجبور کرتی تھی کہ حملہ آور ایک سے زیادہ افراد تھے ورنہ وہ

گبرو کسی ایک قاتل کے بس کا تو نہیں تھا۔ یہ بات طے تھی کہ اسے کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت گھیر کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ گویا یہ قتل کی ایک منظم واردات تھی۔

میں نے لاش کے تفصیلی معائنے کے بعد اس پر ایک چادر ڈلوادی اور موقع پر موجود لوگوں سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ سب سے پہلے جو شخص میرے سامنے آیا، اس کی حالت بڑی غیر ہو رہی تھی۔ وہ ساٹھ کے آس پاس کا ایک سانولا آدمی تھا۔ اس کا نام بشیر لوہار معلوم ہوا۔ وہ منت ریز لہجے میں مجھ سے مستفسر ہوا۔ ’’تھانے دار صاحب! کس ظالم نے میرے ناصر کی جان لی ہے؟‘‘

اس کے درد بھرے سوال نے مجھے بتا دیا کہ وہ مقتول ناصر کا باپ تھا۔ میں نے بشیر لوہار کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ’’چاچا...... ابھی تو میں نے تفتیش کا آغاز کیا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ تمہارے بیٹے کا قاتل بہت جلد میری گرفت میں ہوگا۔‘‘

وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ’’میرا بیٹا تو گیا اس دنیا سے...... قاتل اگر آپ کی گرفت میں آ بھی گیا تو اس کی گرفتاری سے میرا بیٹا تو واپس نہیں آئے گا نا......‘‘

غم کی شدت نے بشیر لوہار کے حواس مختل کردیے تھے۔ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھا تھا۔ ان لمحات میں اسے صرف ایک ہی بات یاد تھی کہ اس کا جوان بیٹا قتل کردیا گیا تھا۔ وہ اس کے علاوہ اور کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اس کی حالت پر بہت ترس آیا اور میں نے ہمدردی بھرے انداز میں کہا۔ ’’چاچا! آپ ایک طرف آرام سے بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے بعد میں تسلی سے بات کرتا ہوں......‘‘

’’اچھا جی۔‘‘ وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

اس وقت تک سورج کافی اوپر اٹھ چکا تھا اور اچھا خاصا پریشانی کا باعث بھی بن رہا تھا۔ وہ مئی کا مہینا تھا۔ مئی اور جون تو ویسے بھی گرمی کے لحاظ سے اپنی قیامت خیزی میں سب مہینوں پر سبقت رکھتے ہیں۔ کھیتوں کے اندر تا حدِ نگاہ تیز چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے بشیر لوہار کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنایت بھرے انداز میں کہا۔ ’’چاچا! آپ اپنے گھر چلے جاؤ تو بہت اچھا ہوگا۔ موسم بہت خوفناک ہو رہا ہے۔ میں یہاں سے فارغ ہونے کے بعد سیدھا تمہارے گھر آؤں گا۔ پھر بات کریں گے۔‘‘

’’گرم ٹھنڈے سب موسم دیکھتے ہوئے ساری زندگی گزری ہے تھانے دار پتر!‘‘ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مجروح لہجے میں بولا۔ ’’یہ دھوپ اور گرمی میرا کیا بگاڑے گی۔ میں ادھر درخت کے نیچے جاکر بیٹھ جاتا ہوں......‘‘ لمحاتی توقف کے بعد وہ دکھی لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ’’میری سب سے قیمتی متاع، میرے دل کا ٹکڑا زندگی کی بازی ہار گیا۔ اس سے بڑا صدمہ اور کیا ہوگا میرے لیے!‘‘

میں نے مقتول کے باپ بشیر لوہار سے زیادہ بحث نہیں کی اور اسے ایک بندے کے ساتھ، ایک سایہ دار درخت کی جانب بھیج دیا۔ میں فی الحال اس کے ساتھ اس سے زیادہ ہمدردی نہیں کرسکتا تھا۔

جائے وقوعہ کا میں نے نقشہ تیار کرلیا تھا۔ آلۂ قتل کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا جن کے لیے میرے تئیں ’’آلاتِ قتل‘‘ کے الفاظ زیادہ موزوں تھے کیونکہ مقتول کی لاش اور اس کے بدن پر دکھائی دینے والے متعدد خوفناک گھاؤ کو دیکھ کر اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی تھی کہ ناصر پر حملہ آور ہونے والے افراد دو یا دو سے زیادہ تھے...... تو ظاہر ہے آلاتِ قتل بھی دو یا دو سے زیادہ ہی تھے۔

موقع پر موجود گواہوں کے بیانات کا سلسلہ تو بعد میں بھی جاری رکھا جاسکتا تھا۔ میری نظر میں سب سے اہم مسئلہ اس وقت مقتول ناصر کی لاش کو اسپتال بجھوانے کا تھا۔ موسم کے تیور بڑے خطرناک دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے فی الفور ناصر کی لاش کو پوسٹ مارٹم کی غرض سے سرکاری اسپتال بجھوا دیا۔ کانسٹیبل سکندر کو بھی میں نے لاش کے ساتھ ہی روانہ کردیا تھا۔ جائے وقوعہ کی کارروائی میں اس نے میری بھرپور مدد کی تھی اور اب اس کی وہاں کوئی خاص ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔

میں نے اس ادھورے کمرے کے پاس کھڑے ہوکر چاروں جانب نگاہ دوڑائی۔ وہ مقام گاؤں گلاب پور سے محض آدھا فرلانگ کے فاصلے پر کھیتوں کے درمیان واقع تھا۔ لاش کی حالت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اسے رات کے وسطی حصے میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس بات کا پتا چلانا بہت ضروری تھا کہ آدھی رات کے وقت وہ اپنے گھر سے نصف فرلانگ دور کھیتوں کے اندر کیا کر رہا تھا؟

یہ سوال بہت زیادہ اہمیت کا حامل تھا...... میں نے وہاں موجود لوگوں سے گھما پھرا کر قتل کی اس لرزہ خیز واردات کے بارے میں مختلف سوالات کیے لیکن کوئی بھی مجھے ایسا جواب نہ دے سکا جو میرے لیے تسلی کا باعث ہوتا اور جو تفتیش کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوسکتا۔ میں نے ان دو افراد سے بھی پوچھ گچھ کی جو اس اندوہناک واقعے کی

اطلاع دینے تھانے پہنچے تھے۔ فیاض اور یوسف بھی اس قتل کے حوالے سے کچھ نہیں جانتے تھے۔ آخر میں، میں نے اس آدمی سے سوال وجواب کیے جس نے آج صبح ناصر کی لاش کو اس ادھورے کمرے کے باہر پڑے دیکھا تھا۔

اس بندے کا نام الیاس اور عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ پیشے کے اعتبار سے الیاس کمہار تھا۔ وہ مختلف قسم کے چھوٹے بڑے برتن تیار کیا کرتا تھا اور ظاہر ہے، ان برتنوں کی تیاری کے لیے چکنی مٹی کی ضرورت ہوتی تھی۔

''الیاس! تم صبح ہی صبح کہاں جا رہے تھے؟'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔

''سرکار، ملا کی دوڑ مسجد تک ہوتی ہے۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''میں جدی پشتی کمہار ہوں جناب! میرے ہاتھ مٹی کے ساتھ کھیل کر اسے برتنوں کی شکل دیتے ہیں۔ بس سرکار.....'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ٹھنڈی سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میں بھی روزانہ مٹی کی تلاش میں صبح ہی صبح گھر سے نکل کھڑا ہوتا ہوں۔ آج بھی میں اسی کام سے جا رہا تھا۔ موتی بھی میرے ساتھ تھا۔ ناصر کی لاش کو دیکھ کر ہم دونوں کو جھٹکا لگا تھا۔''

''موتی کون؟'' اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے پوچھ لیا۔

''موتی میرے پالتو کتے کا نام ہے تھانے دار صاحب۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اسے آپ گاؤں کی گلیوں میں آوارہ پھرنے والا کوئی کتا نہ سمجھیں۔ موتی بہت ہی تمیز دار اور سمجھ دار کتا ہے۔''

مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ الیاس ایک باتونی شخص تھا اور اپنی بات کو خوامخواہ طویل کرنا بھی اس کی عادت میں شامل تھا۔

''تم اور تمہارا کتا موتی حسبِ معمول آج صبح کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔'' میں نے اسے واپس موضوع کی طرف لاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے ناصر کی لاش کو دیکھا تو پریشان ہوگئے۔ پھر تم نے کیا کیا؟''

''میں نے لاش کو دیکھ کر اونچی آواز میں چیخنا چلّانا شروع کر دیا تھا۔'' وہ جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''اس وقت کھیتوں میں اِکّا دُکّا لوگ اپنے کام کا آغاز کر چکے تھے۔ میری آواز پر وہ فوراً متوجہ ہوگئے اور میری جانب لپکے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہاں موجود ہر شخص کو پتا چل گیا کہ بشیر لوہار کے لڑکے ناصر کو کسی نے بڑی بے دردی سے قتل کر دیا ہے۔''

وہ اپنی طویل بات ختم کرکے خاموش ہوا تو میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''کیا تم روزانہ صبح اپنے موتی کے ساتھ اسی راستے سے گزرتے ہو..... میرا مطلب ہے، اس ادھورے کمرے کے پاس سے تمہارا گزر ہوتا ہے؟''

''نہیں جناب......'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میرا راستہ تو ذرا ہٹ کر ہے۔ میں ادھر سے گزرتا ہوں۔'' بات کے اختتام پر اس نے ایک سو گز دور ایک جانب اشارہ بھی کر دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''آج اس کمرے کے قریب سے گزرنے کا کوئی خاص سبب تھا؟''

''جی ہاں، خاص سبب تھا۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا سبب تھا؟''

''میں تو جناب ہمیشہ کی طرح آج بھی اپنے راستے پر جا رہا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اچانک موتی نے پہلے ہلکے ہلکے غرانا اور پھر بھونکنا شروع کر دیا۔ موتی کی اس حرکت پر میں چونک اٹھا کیونکہ میرا تجربہ یہ ہے کہ موتی جب بھی اس قسم کا ردعمل ظاہر کرتا ہے، کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور نازل ہوتی ہے اور آج بھی بالکل ویسا ہی ہوا......'' وہ لمحے بھر کے لیے تھما پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے موتی کی حرکت پر توجہ دی تو یہ اپنے راستے سے ہٹ کر اس کمرے کی جانب بڑھنے لگا۔ میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا اور یہاں پہنچ گیا۔ اس کے بعد کی بات میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں۔''

الیاس کی وضاحت انتہائی قابلِ یقین اور سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ جانور خصوصاً کتا بہت سے ایسے معاملات کا ادراک کر لیتا ہے جو انسان کے بس کی بات نہیں۔ خاص طور پر اس کے سونگھنے کی حس ناقابلِ یقین حد تک تیز ہوتی ہے۔

''تم نے یہاں پہنچ کر ناصر کی لاش کو دیکھا اور چلا کر لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا اس وقت تم نے آس پاس کسی مشکوک بندے کو بھی دیکھا تھا؟''

''کیسا مشکوک بندہ؟'' الٹا اس نے مجھ سے ہی سوال کر ڈالا۔

''کوئی بھی ایسا بندہ یا بندے جن پر ناصر کے قاتل ہونے کا شک کیا جا سکے؟'' میں نے اپنی بات کی وضاحت

کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں جناب۔'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''ایسا کوئی بندہ مجھے تو یہاں نظر نہیں آیا۔''

میں نے مزید دو چار سوال کے بعد الیاس کمہار کو فارغ کر دیا اور مقتول ناصر کے باپ بشیر لوہار کے ساتھ گاؤں کی جانب چل پڑا۔

☆☆☆

بشیر لوہار کا گھر گلاب پور کے وسط میں واقع تھا۔ وہ ایک مختصر سا خاندان تھا۔ میاں بیوی اور دو بچے جن میں سے ایک اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا تھا۔ ناصر سے چھوٹی اس کی بہن رخسانہ تھی جس کی عمر لگ بھگ سولہ سال رہی ہوگی۔ بشیر لوہار نے اپنے گھر کے بیرونی کمرے میں بھٹی لگا رکھی تھی جہاں وہ دن بھر لوہے سے ''کھیلتا'' رہتا تھا۔ بس یہی اس کی زندگی تھی اور وہ اپنی اس زندگی سے بہت مطمئن تھا تاہم ناصر کی المناک موت نے گویا اس کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔

بشیر مجھے اپنے گھر کے اندرونی حصے میں لے گیا اور برآمدے میں بٹھایا۔ وہ خود بھی میرے سامنے ہی بیٹھ گیا۔ میں نے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا۔

''بشیر چاچا! تمہارے بیٹے کے ساتھ جو بھی افسوسناک واقعہ پیش آیا، اس کا مجھے بہت دکھ ہے اور میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ میری اولین کوشش بھی ہوگی کہ میں اس واقعے کے ذمے دار کو جلد از جلد قانون کی گرفت میں لا کر سخت ترین سزا دلواؤں لیکن اس کے لیے مجھے تمہارے بھرپور تعاون کی ضرورت پیش آئے گی۔''

بشیر کی بیوی زبیدہ بی بی بھی میرے سامنے آکر بیٹھ گئی تھی۔ میں نے جو بات بشیر سے کی تھی، وہ اس نے بھی سن لی تھی۔ بشیر کے جواب سے پہلے وہ بول اٹھی۔

''تھانے دار جی! بتائیں، ہم آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں'' اس نے غمزدہ لہجے میں کہا۔ ''ہماری تو دنیا ہی اندھیر ہو کر رہ گئی ہے۔''

''میں سمجھ سکتا ہوں کہ یہ کتنا بڑا واقعہ ہے۔ اگر میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا تو پھر کبھی بھی یہ گتھی حل نہیں ہو سکے گی۔''

بشیر کی بہ نسبت اس کی بیوی میں زیادہ دم خم نظر آتا تھا۔ میری بات کے جواب میں اس نے کہا۔ ''میں بھی یہی چاہتی ہوں، جس ظالم نے میرے ناصر سے حیاتی چھینی ہے وہ جلد از جلد عبرت ناک انجام کو پہنچے۔'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بڑے عزم سے بولی۔ ''بتائیں، آپ کو ہم سے کس قسم کا تعاون چاہیے؟''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی۔ ''مجھے بتائیں، ناصر کا قتل کون کر سکتا ہے؟''

''یہ بتانا تو بہت مشکل ہے جناب۔'' بشیر بے بسی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''رب ہی بہتر جانتا ہے۔''

''رب تو بہتر جانتا ہی ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''لیکن جب تک آپ کسی پر شک ظاہر نہیں کریں گے، تفتیش کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکے گی۔''

بشیر نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''ناصر تو پورے گاؤں کی آنکھوں کا تارا تھا۔ ابھی پچھلے مہینے ہی تو اس نے کبڈی کا ٹورنامنٹ جیتا تھا۔ اگر ناصر گلاب پور کی کبڈی ٹیم میں نہ ہوتا تو جیت کا اعزاز نذیر آباد کے حصے میں آتا تھا۔ اس ٹورنامنٹ میں چار گاؤں کی ٹیموں نے حصہ لیا تھا۔ سلطان نگر اور چک بیالی (بیالیس) تو ابتدا ہی میں کٹ گئی تھیں۔ اصل کانٹے کا مقابلہ گلاب پور اور نذیر آباد کے درمیان تھا۔ فائنل میچ میں ناصر کی عمدہ کارکردگی نے گلاب پور کا سر فخر سے بلند کر دیا تھا۔ یہ ٹورنامنٹ ہر سال اپریل کے مہینے میں منعقد کرایا جاتا ہے۔''

بشیر لوہار نے کبڈی ٹورنامنٹ کے حوالے سے بات ختم کی تو میں نے سوال کیا۔ ''چاچا! تمہارے بیٹے کی کبڈی کی میں نے بھی بڑی تعریف سنی ہے۔ میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ ناصر اپنے گاؤں کی آبرو تھا لیکن.....'' میں نے بات ادھوری چھوڑ کر ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''چاچا! تم نے بھی ایک زندگی گزاری ہے۔ یہ بات تو تمہارے تجربے میں بھی آئی ہوگی کہ جہاں کسی انسان کے دس دوست ہوتے ہیں، وہاں اس کا ایک آدھ دشمن بھی ضرور موجود ہوتا ہے؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کی بات سے انکار نہیں کر سکتا۔''

''مجھے اسی دسویں آدمی کی تلاش ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''جس ظالمانہ انداز میں ناصر کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے وہ کسی...... بدترین دشمن ہی کا کام ہو سکتا ہے اور...... ایسے سفاک شخص تک مجھے صرف آپ لوگ ہی پہنچا سکتے ہو۔''

بشیر لوہار نے اضطراری انداز میں اپنی پیشانی کو مسلا پھر الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا کہ ایسا بندہ کون ہو سکتا ہے۔''

میں نے بشیر کی بیوی زبیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تم یاد کرنے کی کوشش کرو...... گلاب پور میں کون تمہارے بیٹے کو سخت ناپسند کرتا تھا...... کبھی کسی کے ساتھ اس کا جھگڑا ہوا ہو؟“

”نہیں جناب!“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”ناصر تو بہت ہی سلجھا ہوا اور امن پسند انسان تھا۔ گاؤں میں کبھی اس کا کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔“

”اور گاؤں سے باہر......؟“ میں نے یکے بعد دیگرے دونوں کی طرف دیکھا۔

”باہر بھی کسی سے اس کی دشمنی نہیں تھی۔“ بشیر لوہار نے جواب دیا۔ ”وہ سارا دن میرے ساتھ کام میں مصروف رہتا تھا۔ صبح شام ورزش وغیرہ کے لیے اکھاڑے میں چلا جاتا تھا۔“

”یہ اکھاڑا کس طرف واقع ہے؟“ میں نے کسی فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔

”ٹیوب ویل کے قریب ہی جی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کھیتوں میں۔“

ٹیوب ویل کے نام پر میں چونکا۔ ”کیا تم اسی ٹیوب ویل کی بات کر رہے ہو جو پہلے اس جگہ ہوا کرتا تھا جہاں سے ناصر کی لاش ملی ہے؟“

”جی ہاں، یہ ٹیوب ویل کسی زمانے میں اسی کمرے میں لگا ہوا تھا۔“ اس نے تائیدی لہجے میں بتایا۔ ”لیکن یہ کافی عرصہ پہلے کی بات ہے۔“

”بشیر چاچا! میری تجربہ کار نگاہ بتاتی ہے کہ تمہارے بیٹے کو پچھلی رات کے درمیانی حصے میں قتل کیا گیا ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”تم نے بتایا ہے کہ ناصر صبح و شام اکھاڑے میں کسرت وغیرہ کے لیے جایا کرتا تھا پھر وہ آدھی رات کو گھر سے باہر کیا کر رہا تھا اور وہ بھی اکھاڑے سے سو، دو سو گز دور......؟“

”یہ بات تو ہماری سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھانے دار صاحب۔“ زبیدہ بی بی نے تفکر آمیز نظر سے مجھے دیکھا۔ ”ناصر پچھلی رات ادھر کیا کرنے گیا تھا۔“

”کیا وہ رات کو معمول کے مطابق گھر میں سویا تھا؟“

”جی بالکل......!“ زبیدہ نے جواب دیا۔

بشیر لوہار بولا۔ ”کل شام سے پہلے وہ ورزش کرنے اکھاڑے میں بھی گیا تھا۔ پھر ہم چاروں نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا اور تھوڑی دیر کے بعد سونے کے لیے لیٹ گئے۔“

”آپ لوگ رات میں سوتے کہاں ہیں؟“ میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑاتے ہوئے سوال کیا۔ ”موسم ایسا ہے کہ کمروں کے اندر گھس کر سونا ممکن نہیں رہا......“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب! آج کل دن تو دن، رات میں بھی اچھی خاصی گرمی ہو رہی ہے۔“ بشیر نے جواب دیا۔ ”میں، زبیدہ اور ہماری بیٹی رخسانہ گھر کے صحن میں چارپائیاں بچھا کر سوتے ہیں۔“

”اور ناصر...... وہ رات کو کہاں سوتا تھا؟“

”وہ چھت پر سوتا تھا جی۔“ زبیدہ نے جواب دیا۔ بشیر نے کہا۔ ”صرف سردیوں کے دو تین مہینے وہ اپنی چارپائی نیچے لاتا تھا ورنہ اس کی ہمیشہ سے یہ عادت تھی کہ وہ رات کو چھت پر ہی سویا کرتا تھا۔“

”میں وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں جہاں ناصر رات کو سوتا تھا۔“

”آپ آئیں میرے ساتھ۔“ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں چھت پر تھے۔ جہاں پر ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ چارپائی پر ایک تکیہ اور چادر بھی موجود تھی اور ان دونوں چیزوں کی موجودگی بتاتی تھی کہ وہاں رات کوئی سویا تھا۔ میں نے چاروں جانب نگاہ دوڑا کر ماحول کا جائزہ لیا۔

شہروں کی طرح گاؤں میں کثیر المنزلہ مکانات تعمیر نہیں کیے جاتے۔ چودھری یا گاؤں کے کسی بڑے کے گھر کے علاوہ تمام مکان کچے اور ایک منزلہ ہی ہوتے ہیں۔ میں پچپن ساٹھ سال پہلے کی بات کر رہا ہوں جب نناوے فیصد مکانات مٹی سے بنائے جاتے تھے۔ آج کل تو گاؤں دیہات کی شکل ہی بدل کر رہ گئی ہے۔ پنجاب کے ستر فیصد گاؤں میں آج بجلی پانی کی سہولت موجود ہے۔ مکانات پختہ اینٹوں سے تعمیر کیے جاتے ہیں۔ سواری میں موٹر سائیکل عام دیکھنے میں آتی ہے اور موبائل فون کا استعمال بھی کافی بڑھ گیا ہے۔

گلاب پور ایک روایتی گاؤں تھا۔ بیشتر مکانوں کی چھتیں ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی تھیں۔ میں نے گرد و پیش کا اچھی طرح جائزہ لیا اور ایک مرتبہ پھر ہم نیچے برآمدے میں آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے ایک مرتبہ پھر سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا۔

”آپ لوگوں کو کب پتا چلا کہ ناصر گھر میں موجود نہیں؟“

”آج صبح ہی پتا چلا تھا جی۔“ بشیر لوہار نے بتایا۔ ”ناصر کو صبح اٹھنے میں کافی پریشانی ہوتی ہے۔ اس کی آنکھ آسانی سے نہیں کھلتی۔ اس نے زبیدہ کی ڈیوٹی لگا رکھی تھی کہ وہ علی الصباح اسے جگا دیا کرے۔ زبیدہ فجر کی اذان کے

ساتھ ہی جاگ جاتی ہے۔ آج صبح جب یہ ناصر کو اٹھانے کے لیے چھت پر پہنچی تو وہ وہاں موجود نہیں تھا......“

”موجود نہیں تھا...... کیا مطلب؟“ میں نے اضطراری انداز میں پوچھا۔

اسی وقت زبیدہ لسّی والا جگ اور گلاس لے کر ہمارے پاس پہنچ گئی۔ بشیر نے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ اسی سے پوچھ لیں کہ آج صبح چھت پر اس نے کیا نظارہ دیکھا تھا......“

”نظارہ......!“ میں نے سوالیہ نظر سے باری باری ان دونوں کے چہرے دیکھے۔

بشیر لوہار کی دونوں باتوں نے مجھے بُری طرح چونکا دیا تھا۔ میرے اندر سے ایک آواز اٹھی کہ اس کیس کا کوئی سرا میرے ہاتھ آنے والا ہے۔ زبیدہ میرے لیے گلاس میں لسّی انڈیل چکی تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”زبیدہ بی بی! بشیر چاچا کیا کہہ رہا ہے۔ آج صبح جب تم ناصر کو اٹھانے چھت پر پہنچیں تو تم نے کون سا نظارہ دیکھا تھا؟“

وہ ایک طرف بیٹھ گئی پھر ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”میں تو جی روزانہ ہی صبح اسے جگانے جایا کرتی تھی لیکن آج جو کچھ میں نے دیکھا، وہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا......“

”وہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

”جناب! میں روزانہ چھت پر جا کر اسے آواز دیا کرتی تھی...... ناصر پتر! اٹھ جا، صبح ہو گئی ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”دوسری نہیں تو تیسری آواز پر وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا لیکن آج صبح جب ایسا نہیں ہوا تو مجھے حیرت ہوئی اور میں نے جھنجوڑ کر اسے جگانے کی کوشش کی اور اسی وقت پتا چلا کہ ناصر تو چارپائی پر موجود ہی نہیں......“ وہ لمحے بھر کے لیے رکی، ایک بوجھل سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”چارپائی پر چادر کے نیچے تکیہ اس طرح رکھا ہوا تھا کہ دور سے دیکھنے پر یہی نظر آئے کہ وہاں کوئی سو رہا ہے......“

”اوہ......!“ میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ”اس کا مطلب ہے، پچھلی رات ناصر اپنی مرضی سے گھر سے نکلا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ آپ لوگوں میں سے کسی کو اس کی غیر حاضری کا احساس ہو؟“

”جی۔ یہی بات سمجھ میں آ رہی ہے۔“ بشیر نے کمزور سی آواز میں کہا۔

”اس کا مطلب ہے......“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”وہ اس سے پہلے بھی یہ حرکت کرتا رہا ہوگا۔“

”جناب! اگر پہلے ناصر نے ایسا کیا ہوتا تو زبیدہ کی نظر میں آ جاتا۔“ بشیر نے کہا۔

”نہیں......“ میں نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی۔ ”اس سے پہلے وہ اس لیے زبیدہ کی پکڑ میں نہیں آیا کہ صبح سے پہلے وہ واپس آ جایا کرتا ہوگا۔“

ان لمحوں میں میرا ذہن نہایت ہی تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ صرف ایک نکتے نے یہ کیس کھول کر میرے سامنے رکھ دیا تھا۔ مجھے اس معاملے میں سے عشق معشوقی کی بو آ رہی تھی۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار جی؟“ زبیدہ نے الجھن زدہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ ”ایسی کوئی بات ہمارے علم میں تو نہیں۔“

”میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔“ میں نے باری باری ان دونوں کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”آپ لوگوں کا بیٹا رات کی تاریکی میں کسی سے ملنے گھر سے باہر جایا کرتا تھا۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ کوئی لڑکی ہو۔ بتائیں، ناصر کا گاؤں کی کسی لڑکی کے ساتھ چکر چل رہا تھا؟“

”چکر......!“ دونوں نے بے یقینی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر بشیر نے مجھ سے کہا۔ ”تھانے دار جی! ناصر اس قسم کا لڑکا نہیں تھا۔ وہ تو گلاب پور کی لڑکیوں اور عورتوں کو اپنی مائیں بہنیں سمجھتا تھا۔ وہ کبھی کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔“

”میں مان ہی نہیں سکتا کہ اس کا کسی لڑکی سے کوئی محبت کا معاملہ نہ چل رہا ہو۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ پچھلی رات اسی لڑکی سے ملاقات کرنے کھیتوں میں پہنچا تھا۔ اگر آپ لوگ مجھے اس لڑکی کے بارے میں صاف صاف بتا دو تو میں بڑی آسانی سے ناصر کے قاتلوں تک پہنچ جاؤں گا۔“ لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر حتمی لہجے میں کہا۔ ”وہی لڑکی صحیح معنوں میں بتا سکتی ہے کہ پچھلی رات ادھر کھیتوں میں کیا واقعہ پیش آیا تھا۔“

”جناب! آپ ہم سے، بڑی سے بڑی قسم لے لیں۔ ہمیں ناصر کے کسی بھی ایسے معاملے کی خبر نہیں۔“ بشیر نے منت آمیز لہجے میں کہا۔ ”اور نہ ہی ہم ایسی کسی لڑکی کو جانتے ہیں۔“

"بشیر چاچا! عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے اور قسمیں کھانے یا کھلانے سے پولیس والوں کا کام نہیں چلتا۔" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں بہت جلد اس بات کا پتا چلا لوں گا کہ پچھلی رات تمہارا بیٹا کس سے ملنے کھیتوں میں پہنچا تھا لیکن اچھا یہی ہوتا کہ آپ لوگوں سے مجھے پتا چلتا۔"

زبیدہ نے بے بسی سے کہا۔ "اگر ہمیں اس معاملے کی ذرا سی بھی سن گن ہوتی تو ہم آپ کو ضرور بتا دیتے۔"

"ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ کا اندازہ غلط ہے یا آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔" بشیر نے عاجزی سے کہا۔ "لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہمیں اس حوالے سے کچھ بھی پتا نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "میں آپ لوگوں کی بات کا یقین کر لیتا ہوں۔ اکثر ماں باپ کو اپنی اولاد کی سرگرمیوں کی خبر نہیں ہوتی اور وہ انہیں معصوم اور بے خطا ہی سمجھتے رہتے ہیں۔ پھر جب ان کا کوئی کارنامہ سامنے آتا ہے تو دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ جاتے ہیں۔ ناصر کے معاملے میں بھی بہت جلد ایسا ہی ہوگا......" میں نے لمحاتی توقف کر کے باری باری دونوں کے چہروں کا جائزہ لیا پھر پوچھا۔

"یہ بتائیں، گلاب پور میں ناصر کی سب سے زیادہ گہری دوستی کس کے ساتھ تھی؟"

"جمیل کے ساتھ......!" وہ بہ یک زبان ہو کر بولے۔

میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "مجھے یقین ہے، جو بات آپ کے علم میں نہیں وہ جمیل کو ضرور پتا ہوگی۔ کیا آپ میں سے کوئی جمیل کو یہاں بلا سکتا ہے؟ میں اس سے پوچھ کچھ کرنا چاہتا ہوں یا آپ مجھے اس کے گھر تک پہنچا دیں۔"

"وہ تو ہمارا پڑوسی ہے جناب۔" بشیر نے بتایا۔ "ادھر ساتھ والے گھر میں رہتا ہے لیکن ابھی اس سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔"

"کیوں نہیں ہو سکتی ملاقات؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"وہ دو دن سے ٹوبہ ٹیک سنگھ گیا ہوا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے کل ہی جمیل کے بارے میں ناصر سے پوچھا تھا اور اس نے بتایا تھا جمیل پرسوں واپس آئے گا...... یعنی کل!"

"ٹھیک ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جمیل تو کل واپس آئے گا لیکن میں پھر بھی اس کے گھر والوں سے پوچھ کر اپنی تسلی کرنا چاہتا ہوں۔"

"جمیل کے باپ کی پرچون کی دکان ہے اور وہ اس وقت دکان پر ہی ہوگا۔" بشیر نے کہا۔ "آپ میرے ساتھ آئیں، میں آپ کو کفیل سے ملوا دیتا ہوں۔"

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پوچھا۔ "کیا کفیل کی دکان یہاں سے دور ہے؟"

"نہیں جی، اس نے گھر کے اندر ہی بیٹھک میں دکان کھولی ہوئی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "ایک دروازے سے نکلیں گے تو ساتھ ہی آپ کو کفیل کی دکان نظر آ جائے گی۔" ہم دونوں اس کے گھر سے باہر نکل آئے۔ بشیر لوہار نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ جیسے ہی میں نے اس کے دروازے سے قدم باہر نکالا، کفیل کی پرچون والی دکان میری آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ آتے وقت میں نے اس دکان کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔

کفیل کی عمر چالیس سے چڑھتی ہوئی تھی۔ وہ ایک دبلا اور دراز قامت شخص تھا۔ اس نے ہلکی ہلکی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں اور سر پر سفید ٹوپی بھی لگا رکھی تھی۔

میں نے لگ بھگ پندرہ منٹ تک اس کے ساتھ گفتگو کی۔ وہ مجھے دیکھ کر اپنے کام کو سمیٹ بیٹھا تھا اور پوری توجہ مجھ پر مبذول کر دی تھی۔ اسے ناصر کی موت کا دلی صدمہ تھا۔ اس لیے نہیں کہ مقتول ناصر اس کے بیٹے کا گہرا دوست تھا بلکہ اس لیے کہ وہ ناصر اور اس کی کبڈی کو بے حد پسند کرتا تھا۔ وہ خود بھی جوانی میں یہ کھیل کھیل چکا تھا۔ اس نے پوری کوشش کی تھی کہ اس کا بیٹا جمیل بھی پہلوانی اور... شہ زوری کے کاموں میں حصہ لے لیکن جمیل نے اسے سخت مایوس کیا تھا۔ جمیل کو کبھی اس قسم کا کوئی شوق رہا ہی نہیں تھا۔

کفیل سے ہونے والی گفتگو اس لحاظ سے بے نتیجہ رہی کہ وہ ناصر کے قتل کے حوالے سے مجھے معلومات فراہم نہیں کر سکا تھا۔ وہ بھی مقتول کے کسی جانی دشمن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا البتہ اس امر کی اس نے تصدیق کی تھی کہ جمیل کل ٹوبہ ٹیک سنگھ سے واپس آ جائے گا۔

"کفیل!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "جمیل جیسے ہی گلاب پور پہنچے، تم اسے میرے پاس تھانے بھیج دینا۔ مجھے امید ہے، وہ اس قتل پر کچھ روشنی ڈال سکے گا۔"

"جی...... آپ فکر نہ کریں۔" وہ فرماں برداری سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں خود اسے لے کر آپ کے پاس آؤں گا۔"

میں کفیل کی دکان سے باہر نکل آیا۔ میں نے واپسی کا

ارادہ ظاہر کیا تو بشیر لوہار نے مجھ سے پوچھا۔

"تھانے دار صاحب! ناصر کی لاش کب تک مجھے مل جائے گی؟"

میں اس دکھی باپ کی دلی کیفیات کو بہ خوبی محسوس کر سکتا تھا۔ میں نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔ "بشیر چاچا! مجھے امید ہے، کل شام تک ناصر کی لاش اسپتال سے واپس آ جائے گی لیکن تم اپنے ذہن میں پرسوں کا دن رکھو تو تمہیں "انتظامات" کے سلسلے میں پریشانی نہیں ہوگی۔" لمحاتی توقف کے بعد میں نے استفسار کیا۔

"تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"جی!" اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے اسے ضروری ہدایات دیں، اس کے دکھ درد میں اپنی مکمل شرکت اور شمولیت کا یقین دلایا اور دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس آ گیا۔

☆☆☆

میرا ذہن اور دل کسی بھی قیمت پر یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ مقتول ناصر کا کسی لڑکی کے ساتھ کوئی چکر نہ ہو۔ اس نے اپنی چارپائی پر چادر اور تکیے کی مدد سے جو کہانی بننے کی کوشش کی تھی، وہ صد فیصد اسی جانب اشارہ کرتی تھی کہ وہ اپنے گھر والوں کے علم میں لائے بغیر کہیں گیا تھا اور چاہتا تھا کہ گھر والوں کو اس کی اس حرکت کا پتا بھی نہ چلے اور اس بات کا بھی قوی امکان تھا کہ وہ ایسی حرکت پہلے بھی کئی بار کر چکا ہوگا۔

میرا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ میں نے بڑی توجہ اور تفصیل کے ساتھ جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کیا تھا۔ وہ ایک ایسا مقام تھا جو چوری چھپے کی ملاقاتوں کے لیے بڑا موزوں ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ ادھورا کمرا اگرچہ چھت اور دروازے سے بے نیاز تھا تاہم اس کی بچی کھچی دیواریں دو بدیسیوں کی خفیہ ملاقات کے لیے بہترین آڑ فراہم کرتی تھیں۔ چونکہ وہ ایک متروک کمرا تھا لہٰذا اس حوالے سے اس طرف کسی کا دھیان بھی نہیں جا سکتا تھا۔ میں تو کہتا ہوں، اگر دن میں بھی کوئی جوڑا اس پناہ گاہ سے فیض یاب ہونے کا ارادہ کرتا تو اسے مایوسی نہ ہوتی کجا یہ کہ آدھی رات کی تاریکی میں......

گھوم پھر کر میری سوچ کی سوئی لڑکی کے کردار پر آ کر اٹک جاتی تھی۔ ایک ایسی لڑکی جو مقتول سے محبت کرتی تھی، ایک ایسی لڑکی جسے مقتول بے پناہ چاہتا تھا اور وہ دونوں راتوں کی تاریکی میں چھپ چھپ کر ملتے تھے۔ میری سوچ

ہونہار شاگرد

استاد۔ "برائی کیا ہے؟"

شاگرد۔ "جناب میں بتاتا ہوں مگر پہلے میرے سوال کا جواب دیں کیا سردی کا کوئی وجود ہے؟"

استاد۔ "ہاں۔"

شاگرد۔ "جناب...... سردی کوئی چیز نہیں حرارت کی غیر موجودگی کو ہی سردی کہتے ہیں اور کیا اندھیرے کا کوئی وجود ہے؟"

استاد۔ "ہاں۔"

شاگرد۔ "پھر غلط جناب...... اندھیرا کوئی چیز نہیں روشنی کی غیر موجودگی کو ہی اندھیرا کہتے ہیں۔ ہم فزکس میں حرارت اور روشنی تو پڑھتے ہیں سردی اور اندھیرا نہیں، اسی طرح برائی کوئی چیز نہیں۔ اللہ تعالیٰ، ایمان اور پیار پہ بھروسا نہ ہونا ہی دراصل برائی ہے۔"

یہ ہونہار شاگرد تھا...... البیرونی۔

مرسلہ: محمد جاوید، تحصیل علی پور

مہکتی کلیاں

☆ جو شخص زیادہ سوچنے والا ہوتا ہے، وہ سب سے صحیح کام کرتا ہے۔

☆ دوسروں کے ساتھ زیادہ نیک سلوک وہی شخص کر سکتا ہے جو خود مصیبتوں میں مبتلا رہ چکا ہو۔

☆ ہر شخص ایک ضخیم کتاب ہے، بشرطیکہ آپ کو پڑھنا آتا ہو۔

☆ عقل مند دوسروں کی اور بے وقوف اپنی غلطیوں سے سبق سیکھتے ہیں۔

☆ پُرامید ہو کر سفر کرنا منزل پر پہنچنے سے بہتر ہے۔

مرسلہ۔ صدف ثاقب راجا، پنڈ دادن خان

کی اسی سنسنی خیزی کا دعویٰ تھا کہ وہ لڑکی بھی موضع گلاب پور ہی سے تعلق رکھتی تھی۔ میرے اس انداز میں سوچنے کا ایک خاص سبب تھا۔

جائے وقوعہ، وہ ادھورا کمرا گلاب پور گاؤں سے صرف نصف فرلانگ کے فاصلے پر کھیتوں کے بیچوں بیچ واقع تھا۔ کوئی بھی لڑکی گلاب پور کے اندر سے سو، سوا سو گز کا فاصلہ طے کر کے اس ادھورے کمرے تک بہ آسانی پہنچ سکتی تھی۔ بہ صورتِ دیگر، جائے وقوعہ سے دوسرا نزدیکی گاؤں تھا نذیر آباد...... نذیر آباد اور جائے وقوعہ کے درمیان لگ بھگ ساڑھے سات فرلانگ یعنی ایک ہزار چھ سو پچاس گز کا زمینی فاصلہ حائل تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی لڑکی اتنا لمبا سفر کر کے مقتول سے ملنے اس مقام پر پہنچی ہوگی۔ تو یہ بات طے تھی کہ ناصر کی محبوبہ بھی گلاب پور ہی کی رہنے والی تھی۔

ان تمام تر حالات و واقعات کی روشنی میں ایک اور بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی تھی اور وہ یہ کہ قاتل اس بات سے بہ خوبی آگاہ تھا کہ ناصر اس رات وہاں ضرور آئے گا۔ اگر وہ اتنا جانتا تھا تو پھر وہ اس حقیقت سے بھی یقیناً واقف ہوگا کہ مقتول رات کی تاریکی میں کس مقصد کے لیے اس الگ تھلگ مقام پر گیا تھا۔ اگر اس پچویشن پر غور کیا جاتا تو ایک سنسنی خیز بات ابھر کر سامنے آتی تھی۔

ناصر کا قاتل جو کوئی بھی تھا یا تھے...... وہ ناصر اور حسینہ لڑکی کے تعلقات سے واقف تھا اور یہ تعلقات اس کے لیے انتہائی ناقابلِ برداشت تھے۔ اگر اسی نتیجے پر اتفاق کر لیا جاتا تو پھر یہ تسلیم کرنا بھی لازم ٹھہرتا تھا کہ وہ شخص اس لڑکی کا کوئی امیدوار بھی ہوسکتا تھا......

اب پہلی فرصت میں مجھے اس لڑکی کو تلاش کرنا تھا جس کی محبت میں کبڈی کا ماہر ناصر گرفتار تھا اور اس تلاش کے لیے میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے، جمیل کی واپسی کا انتظار نہیں کرسکتا تھا۔

دوپہر کے بعد میں نے ایک کانسٹیبل کو حنیفاں کی جانب روانہ کر دیا۔ حنیفاں زبردست قسم کی پھاپھے کٹنی تھی۔ اس کا دنیا میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کے بارے میں صحیح طور پر کوئی یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ رہتی کہاں ہے۔ سب اسے ''کریم پاؤڈر والی حنیفاں'' کہتے تھے یا پھر ''چاچی حنیفاں''۔ وہ نگر نگر، گاؤں گاؤں گھوم پھر کر چوڑیاں، کریم، پاؤڈر اور عورتوں کے استعمال کی دیگر اشیا فروخت کیا کرتی تھی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ لوگ تو اس کے بارے میں درست معلومات نہیں رکھتے تھے مگر وہ سب کی سن گن خوب رکھتی تھی۔ اور راز کی بات یہ تھی کہ وہ غیر محسوس انداز میں پولیس کے لیے مخبری بھی کیا کرتی تھی اسی لیے میں نے فی الفور اسے تھانے بلا لیا تھا۔ میں پہلے بھی ایک آدھ بار اس کی خدمات حاصل کر چکا تھا۔

لگ بھگ پانچ بجے سہ پہر حنیفاں میرے کمرے میں، میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''چاچی! کیا حال ہے تمہارا؟''

وہ جگت چاچی تھی۔ چھوٹا بڑا ہر کوئی اسے چاچی ہی کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے کہا۔

''اللہ کا شکر ہے سرکار۔ آپ سنائیں، کس خدمت کے لیے بلایا ہے؟''

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھ لیا۔ ''گلاب پور کی طرف کب سے تمہارا چکر نہیں لگا؟''

''ایک ہفتہ پہلے ادھر گئی تھی ملک صاحب۔'' اس نے سرسری انداز میں کہا۔ ''کیوں، کوئی خاص بات؟''

''پچھلی رات وہاں ایک نوجوان کا قتل ہوگیا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس کے قاتل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

قتل والی بات سن کر اس کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ بھویں سکیڑتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''ادھر کون قتل ہوگیا ہے جی......؟''

''مقتول کا نام ہے ناصر۔'' میں نے بتایا۔ ''بشیر لوہار کا بیٹا ناصر۔ آج صبح ہی میں نے اس کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوائی ہے۔''

''آپ...... کہیں...... اس ناصر کی بات...... تو نہیں کر رہے جو کبڈی کا کھلاڑی بھی ہے......؟'' وہ سرسراتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ہاں ہاں...... بالکل وہی۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''کیا تم اسے جانتی ہو؟''

''اسے کون نہیں جانتا ملک صاحب۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''وہ تو گلاب پور والوں کا ہیرو تھا جناب۔ گاؤں کا بچہ بچہ اس سے محبت کرتا تھا...... مجھے اس کی موت کا سن کر بہت دکھ ہوا ہے۔ کس بدذات نے اس گبرو جوان کو قتل کیا ہے؟''

اس نے ایک ہی سانس میں متعدد سوالات کر ڈالے۔ میرے لیے یہ بات واقعی حیران کن تھی کہ ناصر کو بشیر لوہار کے بیٹے کی بہ نسبت کبڈی کے ایک کھلاڑی کی

حیثیت سے لوگ زیادہ جانتے تھے۔ کم از کم حنیفاں کے بے ساختہ تبصرے سے تو میں نے یہی محسوس کیا تھا۔

''حنیفاں!'' میں نے اسے ٹھہرے ہوئے لہجے میں مخاطب کیا۔ ''اگر مجھے پتا ہوتا کہ ناصر کو کس نے قتل کیا ہے تو میں فوراً جا کر اس بندے کو ہتھکڑی لگا لیتا پھر تمہیں تھانے بلانے اور تم سے اس کیس میں مدد لینے کی ضرورت ہی کیا تھی؟''

''ہوں۔'' وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''حکم کریں ملک صاحب...... میں اس سلسلے میں کس طرح قانون کے لیے مفید ثابت ہوسکتی ہوں۔ مجھے آپ کے کام آ کر خوشی ہوگی۔ میری دلی خواہش ہے کہ ناصر کا قاتل جلد از جلد آہنی سلاخوں کے پیچھے نظر آئے۔''

''شاباش! تم نے میری خواہش کی بھی ترجمانی کی ہے۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''مجھے یقین ہے، تم قاتل کی گرفتاری کے سلسلے میں بہت اہم کردار ادا کرسکتی ہو۔''

''آپ حکم کریں، مجھے کرنا کیا ہے؟'' وہ اٹین شین ہوگئی۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے بڑے جذباتی انداز میں بتایا ہے کہ گلاب پور کا بچہ بچہ ناصر سے محبت کرتا تھا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایسا کہا ہے یا نہیں؟''

''جی، یہ ایک حقیقت ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن میں سمجھ نہیں سکی، آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟''

''میں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ گلاب پور کا بچہ بچہ مقتول ناصر سے بے پناہ محبت کرتا تھا لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ جوان، گلاب پور کی کس حسینہ سے محبت کرتا تھا۔ گاؤں کی کس لڑکی کے ساتھ اس کا معاشقہ چل رہا تھا؟''

''اوہ......'' اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور بولی۔ ''تو قتل کی اس واردات کا تعلق ناصر کی محبت کی کسی کہانی کے ساتھ بھی جڑا ہوا ہے؟''

''ایک سو ایک فیصد حنیفاں!'' میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

وہ گمبھیر انداز میں مستفسر ہوئی۔ ''آپ کا مطلب ہے، اس لڑکی نے ناصر کا خون کیا ہے؟''

''نہیں، میرا ہرگز یہ مطلب نہیں۔'' میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''لیکن مجھے یہ یقین ضرور ہے کہ اگر وہ لڑکی میرے سامنے آجائے تو میں بہ آسانی ناصر کے قاتل یا قاتلوں تک رسائی حاصل کرسکتا ہوں اور......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے بڑی کھوجتی ہوئی نظر سے حنیفاں کی طرف دیکھا اور سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تمہاری سنجیدگی اور دلچسپی کو دیکھ کر میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تم ناصر کے کسی ایسے معاشقے کے بارے میں اچھی طرح جانتی ہو۔''

''اچھی طرح تو نہیں مگر مجھے کچھ اڑتی اڑتی خبر ضرور ہے۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ ''آپ مجھے ایک دن کی مہلت دیں تو میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے آپ کے سامنے رکھ دوں گی۔''

''ٹھیک ہے، میں تمہیں ایک دن کا وقت دیتا ہوں۔'' میں نے اس کی فرمائش پوری کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے پاس کل شام تک کی مہلت ہے لیکن تھانے سے نکلنے سے پہلے تمہیں ایک کام کرنا ہوگا۔''

اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''کون سا کام؟''

''دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی تو کل شام تک الگ ہوسکے گا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اس وقت تو دونوں باہم ملے ہوئے ہیں یعنی لسی بنی ہوئی ہے...... ہے نا؟''

''جی!'' اس نے پلکیں جھپکائیں۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''بس تو پھر یہاں سے روانہ ہونے سے پہلے مجھے اس لسی کی ایک جھلک دکھا دو۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تم نے تھوڑی دیر پہلے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ تمہیں ناصر کے عشقیہ معاملات کی اڑتی اڑتی خبر ہے......؟''

''جی...... وہ اڑتی اڑتی خبر ہے۔'' وہ انکشاف کرتے ہوئے بولی۔ ''ریشماں!''

''ریشماں......!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''یہ ریشماں کون ہے؟''

''ریشماں کا اصل نام ریشم ہے جی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ شکور ترکھان کی بیٹی ہے جو ادھر گلاب پور ہی میں رہتا ہے لیکن ملک صاحب!'' وہ لمحے بھر کو رکی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''یہ ابھی کچی پکی اطلاع ہے...... آپ نے مجھے تصدیق کرنے کے لیے ایک دن دیا ہے۔ میں کل آپ سے کوئی ٹھوس بات کروں گی۔''

’’ٹھیک ہے حنیفاں۔‘‘ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔’’ ذرا ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنا۔ کسی کو احساس نہیں ہونا چاہیے کہ تم کس مشن پر ہو۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟‘‘

’’چنگی طراں سمجھ رہی ہوں ملک صاحب۔‘‘ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ’’ آپ بالکل بے فکر ہوجائیں۔‘‘

اور میں حنیفاں کی طرف سے بے فکر ہوگیا۔

اس سے میں پہلے ہی کئی مرتبہ مخبری کے کام لے چکا تھا اور اس نے کبھی مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز گرمی کا زور مزید بڑھ گیا تھا۔ گزشتہ روز کی بہ نسبت آج دھوپ میں کہیں زیادہ تپش پائی جاتی تھی۔ سورج نکلنے سے پہلے ہوا بند ہوگئی تھی۔ لگتا تھا آج کا دن بہت قیامت خیز گزرے گا۔ اس سال گرمیاں کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کر گئی تھیں۔

میں نے دن کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ظہر کی نماز ادا کی ہی تھی کہ مجھے اطلاع دی گئی، گلاب پور سے دو افراد مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ میں نے انہیں فوراً اپنے کمرے میں بلالیا۔ ان میں ایک کفیل کریانہ فروش اور دوسرا اس کا بیٹا جمیل تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد دراز قامت کفیل نے کہا۔

’’تھانے دار صاحب! میں نے اپنا وعدہ پورا کردیا۔ جمیل نے گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ میں اسے لے کر آپ کے پاس آگیا ہوں۔‘‘

’’شاباش!‘‘ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ’’کفیل! اگر تمہاری طرح ہر شخص فرض شناسی اور ذمے داری کا مظاہرہ کرے تو ہمارا ملک جنت سے بھی زیادہ خوب صورت بن سکتا ہے۔‘‘

’’بس جی، میں تو اپنا فرض پورا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔‘‘ وہ سادگی سے بولا۔’’ آگے اللہ کی مرضی!‘‘

میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور کہا۔ ’’کفیل! تمہیں تھوڑی دیر کے لیے باہر برآمدے میں بیٹھنا ہوگا۔ میں جمیل سے تنہائی میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’جی ضرور......‘‘ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔’’ تھانے دار صاحب! آپ جمیل سے دل کھول کر باتیں کریں اور مجھے اجازت دیں۔‘‘

’’ٹھیک ہے تم اگر چاہو تو واپس جاسکتے ہو۔‘‘ وہ بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔’’ جمیل! یہاں سے فارغ ہونے کے بعد تم سیدھے گھر ہی آنا۔‘‘

’’ٹھیک ہے ابا جی۔‘‘ وہ فرماں برداری سے بولا۔ ’’آپ بے فکر ہوکر جائیں۔‘‘

کفیل تھانے سے رخصت ہوا تو میں جمیل کی جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ ایک گورا چٹا اور پستہ قامت جوان تھا۔ عمر پچیس کے اردگرد نظر آتی تھی۔ اس وقت وہ خاصا افسردہ دکھائی دیتا تھا۔ میں نے براہ راست گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔’’ جمیل! تمہیں ناصر کو پیش آنے والے واقعے کا تو پتا چل ہی گیا ہوگا؟‘‘

’’جی تھانے دار صاحب!‘‘ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ’’مجھے اس کی موت کا جتنا دکھ ہے، میں بیان نہیں کرسکتا۔‘‘

’’تم بیان نہ بھی کرو، میں پھر بھی تمہارے غم کو محسوس کرسکتا ہوں۔‘‘ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔’’ تمہارے خیال میں ناصر کی موت کا ذمے دار کون ہوسکتا ہے؟‘‘

’’جناب! فوری طور پر کچھ کہنا تو ممکن نہیں۔‘‘ وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔’’ آپ کی تفتیش کیا کہتی ہے؟‘‘

’’میری تفتیش......‘‘ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔’’ میری تفتیش تو تمہاری جانب اشارہ کرتی ہے۔‘‘

یہ بات کہتے ہوئے میرے ذہن میں جمیل کے لیے کوئی بھی منفی یا شک زدہ خیال نہیں تھا لیکن وہ بدک کر مجھے تکنے لگا اور اضطراری لہجے میں بولا۔’’ جناب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں بھلا اپنے دوست کی جان کیسے لے سکتا ہوں؟‘‘

’’مجھے یقین ہے کہ تم ناصر کی موت کے ذمے دار نہیں ہو۔‘‘ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔’’ کیونکہ تم تو پچھلے تین دن سے گلاب پور میں تھے ہی نہیں۔‘‘

’’پھر......‘‘ اس کی الجھن میں حیرت کا بھی اضافہ ہوگیا۔’’ پھر آپ نے ایسا کیوں کہا کہ آپ کی تفتیش میری جانب اشارہ کرتی ہے؟‘‘

’’میں نے کچھ بھی غلط نہیں کہا جمیل۔‘‘ میں نے وضاحت کی۔ ’’میری تفتیش تمہاری جانب اس حوالے سے اشارہ کرتی ہے کہ تم مجھے ناصر کے قاتل تک پہنچا سکتے ہو۔‘‘ لمحاتی توقف کرکے میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور سنسناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

’’جمیل! کیا تم نہیں چاہتے کہ ناصر کا قاتل جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے باقی کی زندگی گزارے؟‘‘

’’میں اس سے بھی زیادہ چاہتا ہوں تھانے دار صاحب!‘‘ وہ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولا۔’’ مجھے تو وہ بندہ پھانسی کے پھندے پر لٹکا ہوا نظر آنا چاہیے۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا، اس وقت میرے دل کی کیا حالت ہے۔‘‘

’’وہ پھانسی کے پھندے تک ضرور جائے گا جمیل!‘‘ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ’’لیکن اس کے لیے مجھے تمہارے بھرپور تعاون کی ضرورت ہے۔ میں تمہاری مدد ہی سے قاتل تک رسائی حاصل کرسکتا ہوں۔‘‘

’’آپ حکم کریں جناب۔‘‘ وہ بڑے جوش سے بولا۔ ’’ناصر کے قاتل کو عبرت ناک سزا دلوانے کے لیے میری جان بھی حاضر ہے۔‘‘

’’جمیل! میری تفتیش تو یہ کہتی ہے کہ ناصر کوئی پہلی مرتبہ چادر تکیے سے ڈراما رچا کر جائے وقوعہ تک نہیں پہنچا تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی بار یہ کھیل کھیل چکا تھا۔ تم اس کے گہرے اور رازدار دوست ہو۔ یہ بات تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ وہ رات کی تاریکی میں کس مقصد سے وہاں جایا کرتا تھا......؟‘‘

اس کی آنکھوں اور چہرے پر تذبذب کے آثار پیدا ہوئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھے کچھ بتانے کی کوشش کررہا ہو لیکن اندر سے کوئی قوت اسے ایسا کرنے سے روک رہی ہو۔ میں نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔

’’دیکھو جمیل! میں تو حقیقت تک پہنچ ہی گیا ہوں لیکن میں دیکھنا چاہتا ہوں تم مجھ سے کس حد تک سچ بولتے ہو...... اس سے یہ بھی پتا چل جائے گا کہ تم اپنے مقتول دوست سے کتنے مخلص ہو؟‘‘

’’جناب! آپ کس نتیجے پر پہنچے ہیں؟‘‘ وہ بے چینی سے بولا۔

’’وہ رات کی تاریکی میں کسی سے خفیہ ملاقات کرنے وہاں جایا کرتا تھا۔‘‘ میں نے اپنی سوچ سے جمیل کو آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’کسی لڑکی سے......؟‘‘

’’آپ کا اندازہ درست ہے۔‘‘ اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی۔

’’ریشماں سے نا......؟‘‘ میں نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

’’جی!‘‘ اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔

’’یہ سلسلہ کب سے چل رہا تھا؟‘‘

’’کوئی دو تین ماہ سے۔‘‘ اس نے جواب دیا۔’’ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ پہلے یہ پسندیدگی آنکھوں ہی آنکھوں تک محدود تھی۔ پھر بات چیت کا سلسلہ بھی چل نکلا اور پچھلے دو تین ماہ سے وہ رات کی تاریکی میں چھپ چھپ کر ملنے بھی رہے تھے۔‘‘

’’گویا ابھی ان کی ملاقاتوں کا معاملہ تازہ تازہ تھا۔‘‘ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ’’اس عشقیہ داستان سے اور کون کون واقف تھا؟‘‘

’’ناصر نے اپنی محبت کا راز صرف مجھے ہی بتایا تھا۔‘‘ وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ’’ریشماں اور ناصر کے درمیان میں ہی رابطے کا ذریعہ تھا۔‘‘

’’تم ان کا رابطہ کس طرح کرایا کرتے تھے؟‘‘

’’ریشماں ہماری دکان پر سودا لینے آیا کرتی ہے۔‘‘ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔’’ اسے اچھی طرح پتا ہے، میں کب دکان پر بیٹھتا ہوں اور کب ابا۔ وہ اسی وقت سودا لینے آتی تھی جب میں دکان پر موجود ہوں۔ میں دونوں کے پیغامات ادھر سے ادھر کردیا کرتا تھا۔‘‘

’’اوہ......‘‘ میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔’’ تو گویا تم ان دونوں کے بیچ ایک ڈاکیے کا کردار ادا کررہے تھے؟‘‘

وہ ہلکی سی ندامت کے ساتھ بولا۔’’ جی ہاں۔‘‘

’’پھر تو تمہیں یہ بھی پتا ہوتا ہوگا کہ وہ کس رات کھیتوں میں ملاقات کریں گے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’جی ہاں...... مجھے پوری خبر ہوتی تھی۔‘‘ وہ انکشافات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ’’بلکہ میں ہی ریشماں کو بتایا کرتا تھا کہ کس رات اسے کھیتوں میں پہنچنا ہے۔ اگر وہ اپنی آمد کا یقین دلاتی تھی تو پھر میں ناصر کو بتادیا کرتا تھا۔ ناصر ملاقات کے وقت سے تھوڑی دیر پہلے وہاں پہنچ جایا کرتا تھا۔‘‘

’’کیا ان کی محبت بھری اس ملاقات کے موقع پر تم بھی آس پاس ہی موجود رہا کرتے تھے؟‘‘ میں نے کرید کا عمل جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

’’نہیں جناب۔‘‘ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ’’میں کبھی اس طرف نہیں گیا تھا، البتہ دوسرے دن ناصر خود ہی مجھے بتادیا کرتا تھا کہ ان دونوں کے بیچ کس طرح کی محبت بھری باتیں ہوئی تھیں۔‘‘

’’اچھا، تو تمہیں پوری خبر تھی کہ ان کی محبت کتنی بلندی پر پرواز کررہی تھی؟‘‘ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

’’جی تھانے دار صاحب!‘‘ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔’’ وہ دونوں بہت تیزی سے قریب آرہے

تھے۔ ریشماں کا اصرار تھا کہ ناصر فوراً اپنا رشتہ اس کے گھر بھیجنے کی کوشش کرے یعنی...... اپنے والدین کو رشتہ لینے اس کے گھر بھیجے۔“

جمیل خاصے دلچسپ اور اہم انکشاف کر رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس کی فراہم کردہ معلومات بڑی نتیجہ خیز ثابت ہوں گی۔ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”کیا ناصر کو بھی شادی کی اتنی ہی جلدی تھی یا وہ محض تفریح کی غرض سے ٹائم پاس کر رہا تھا؟“

”وہ بھی ریشماں کو اپنانے کے لیے انتہائی سنجیدہ تھا مگر اس کی سنجیدگی میں ریشماں والی جلد بازی اور بے قراری نہیں تھی۔“ اس نے بتایا۔ ”میں سمجھتا ہوں، ریشماں کی بے چینی اور اضطراب کا ایک خاص سبب تھا جس کے پیشِ نظر وہ جلدی کا تقاضا کر رہی تھی۔“

”اور وہ سبب کیا تھا برخوردار؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”تھانے دار صاحب!“ وہ بتانے لگا۔ ”دراصل بات یہ ہے کہ ریشماں کی ماں سردار بی بی اس کا رشتہ اپنی بڑی بہن کے لڑکے سے کرنے کی خواہش مند تھی۔ آج کل ان کے گھر میں یہی باتیں ہو رہی تھیں لیکن ریشماں کا باپ شکور ترکمان اس رشتے کے لیے بالکل تیار نہیں۔ وہ ریشماں کے ددھیال میں اس کی شادی کرنا چاہتا ہے۔ ریشماں کو یہ بات بھی پتا ہے کہ بالآخر جیت اس کی ماں ہی کی ہوگی۔ گھر میں شکور ترکمان سے زیادہ اس کی بیوی کی چلتی ہے۔ اس صورتِ حال نے ریشماں کو بے حد پریشان کر رکھا تھا۔ وہ نہ تو اپنی خالہ کے بیٹے سے شادی کرنا چاہتی ہے اور نہ ہی شکور کے خاندان میں...... اسی لیے وہ ناصر پر زور ڈال رہی تھی کہ وہ جلد از جلد اپنے ماں باپ کو اس کے گھر بھیج دے۔“

”ٹھیک ہے، ریشماں کی پریشانی تو سمجھ میں آرہی ہے۔“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ”لیکن ابھی چند باتیں جواب طلب ہیں......“

وہ سوالیہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

”جمیل!“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر نہایت ہی سنجیدگی سے کہا۔ ”ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھے بتایا ہے کہ ریشماں اور ناصر کی محبت والا معاملہ تمہارے سوا اور کسی کے علم میں نہیں تھا۔ تم ہی ان دونوں کے مشترکہ رازدار تھے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”نہیں جناب...... حقیقت یہی تھی۔“ وہ بڑے وثوق سے بولا۔

”اور تم ہی ان دونوں کے بیچ ملاقات کی سیٹنگ کیا کرتے تھے؟“ میں نے کہا۔ ”یہ بات تمہارے ہی ذریعے سے ریشماں تک پہنچا کرتی تھی کہ کس رات کھیتوں میں ناصر اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ ہیں نا؟“

”جی ہاں!“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ”تم پچھلے دو دن سے گلاب پور میں نہیں ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے واپس آئے ہو لیکن ناصر کا قتل پچھلی رات کو ہوا ہے۔ وہ کھیتوں میں پہنچا تھا تو اس کی لاش ادھر سے ملی ہے اور...... آدھی رات کے وقت وہ ظاہر ہے، ریشماں سے ملنے ہی ادھر گیا ہوگا......“ میں نے لمحے بھر کو رک کر گہری نظر سے اسے دیکھا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”جب تم گلاب پور میں موجود ہی نہیں تھے تو پھر ریشماں کو اس ملاقات کی خبر کس نے دی ہوگی؟ کیا اس بار ناصر نے خود ہی اس سے کہہ دیا تھا کہ اسے کس رات ملاقات کے لیے کھیتوں میں پہنچنا ہے؟“

”نہیں جناب، ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جس دن میں ٹوبہ ٹیک سنگھ گیا ہوں اسی روز یہ بات طے ہوگئی تھی کہ پچھلی رات ان دونوں کو کھیتوں میں ملاقات کرنا ہے اور میں نے اس پروگرام سے ریشماں کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔ اس کی طرف سے یقین دہانی کے بعد ہی میں نے ناصر کو خوش خبری سنائی تھی کہ وہ ضرور آئے گی۔“

”اس کا مطلب ہے، ناصر گزشتہ رات پروگرام کے عین مطابق، ریشماں سے ملاقات کرنے ادھر کھیتوں میں پہنچا تھا؟“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

”جی بالکل!“ اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

”اور یقیناً ریشماں بھی وہاں گئی ہوگی؟“

اس نے ایک مرتبہ پھر سر کو اثباتی جنبش دی۔

”اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ پچھلی رات کھیتوں میں ناصر کے ساتھ جو ہولناک کھیل کھیلا گیا، ریشماں اس کی چشم دید گواہ ہے؟“ میں نے کہا۔ ”وہ قاتل کی نشان دہی کر سکتی ہے؟“

”جی ہاں، میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔“ جمیل نے معتدل لہجے میں کہا۔ ”اگر ناصر کو ریشماں کی آنکھوں کے سامنے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے تو اس کا بیان آپ کو قاتل تک پہنچنے میں مدد دے سکتا ہے لیکن......“

وہ بولتے بولتے رکا تو میں نے پوچھا۔ ”لیکن کیا؟“

"لیکن آپ ریشماں کا بیان لیں گے کیسے؟"

"ظاہر ہے، اس کے گھر جا کر...... اور کیسے؟" میں نے الجھن زدہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"یہ ٹھیک نہیں ہوگا تھانے دار صاحب!" وہ تشویش بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

"کیا ٹھیک نہیں ہوگا؟" میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ "جو بھی کہنا چاہتے ہو، کھل کر واضح الفاظ میں کہو جمیل۔"

"جناب! آپ کی تفتیش کا دائرہ اس کے گھر تک پہنچے گا تو ان کی محبت کی کہانی بھی ڈھکی چھپی نہیں رہ سکے گی۔" وہ متذبذب لہجے میں بولا۔ "میں نہیں چاہتا، یہ معاملہ کھل کر گاؤں والوں کے سامنے آئے۔ ناصر تو اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا، خوامخواہ ریشماں کی جگ ہنسائی ہوگی۔"

"ریشماں کی جگ ہنسائی کی اہمیت کا تو تمہیں بہت احساس ہے۔" میں نے کہا۔ "دوست کے قاتل کی گرفتاری کا دھیان نہیں؟"

"مجھے دونوں معاملات کا ایک جتنا خیال ہے جناب۔" وہ منت آمیز لہجے میں بولا۔ "اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔"

"میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکا۔" میں نے کہا۔ "ریشماں سے پوچھ گچھ کیے بغیر تفتیش کی گاڑی آگے کیسے بڑھے گی؟"

"میں آپ کو تفتیش سے تو نہیں روک رہا۔"

"پھر......؟" میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

"آپ ریشماں سے ضرور پوچھ گچھ کریں لیکن اس کے گھر جا کر نہیں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اس طرح تو اس بے چاری کی بڑی بدنامی ہوگی۔"

"اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

"ہے چارہ...... اگر آپ راضی ہو جائیں تو......"

"کیا کہنا چاہتے ہو جمیل؟" میں نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

"اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اس سلسلے میں ریشماں سے بات کرتا ہوں۔" وہ اپنی منصوبہ بندی سے مجھے آگاہ کرتے ہوئے بولا۔ "وہ پچھلی رات والے واقعے کے بارے میں جو بتائے گی، وہ میں آپ کے سامنے پیش کر دوں گا۔"

میں نے شک بھری نظر سے اس کی جانب دیکھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ ریشماں سے پوچھ گچھ کے حوالے سے مجھے بیچ میں سے ہٹانا چاہتا تھا۔ اگر وہ دانستہ ایسی حرکت کر رہا تھا تو اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ بہ ظاہر تو مقتول سے ہمدردی جتا رہا تھا لیکن ظاہر ہے، میں اس کا دل چیر کر تو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ ریشماں اور مقتول کے درمیان ایک نہایت ہی اہم کردار ادا کر رہا تھا۔

میں نے چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظر سے اسے دیکھا پھر حتمی لہجے میں کہا۔ "یہ مناسب نہیں ہے جمیل! میری تسلی اسی وقت ہوگی جب میں خود ریشماں سے سوال جواب کر لوں گا۔"

"ٹھیک ہے جناب! جیسی آپ کی مرضی۔" وہ شکست خوردہ انداز میں بولا۔ "میں تو آپ کی سہولت کی خاطر کہہ رہا تھا۔"

"برخوردار! میں تھانے دار ہوں ذرا وکھری ٹائپ کا۔" میں نے جمیل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ "آسانی اور آرام طلبی سے مجھے سخت نفرت ہے۔ اس لیے تم میری سہولت کا خیال نہ کرو۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ کی نوکری کا مطلب ہے، ہر وقت مشکلات سے نمٹتے رہنا...... کیا سمجھے؟"

"جی، سمجھ گیا۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "آپ کو جو ٹھیک لگتا ہے وہی کریں۔ میں تو ریشماں کی بدنامی اور رسوائی کی وجہ سے ہی کہہ رہا تھا۔ ظاہر ہے، جب پولیس تفتیش کے لیے اس کے گھر پہنچے گی تو پھر ناصر اور ریشماں کے عشق والا معاملہ چھپ نہیں سکے گا۔ پورے گاؤں کو خبر ہو جائے گی کہ ریشماں راتوں کو چھپ چھپ کر مقتول ناصر سے ملاقاتیں کیا کرتی تھی۔ یہ بات اس کی شادی کے راستے میں بہت سے کانٹے بھی بچھا سکتی ہے جناب!"

ایک لحاظ سے جمیل ریشماں کے لیے ٹھیک بھی کہہ رہا تھا۔ اگر کوئی کنواری لڑکی اس انداز میں کسی لڑکے سے منسوب پائی جائے تو اس کے کردار پر انگلیاں اٹھنے لگتی ہیں اور یقیناً اس کی شادی کے معاملے میں رکاوٹ بھی پیش آسکتی ہے لیکن میں اس نازک ایشو کو کوئی ایسے انداز میں ہینڈل تھوڑی کرتا کہ پورے گلاب پور میں اس کی منادی ہو جاتی۔ ہر کام کو سلیقے اور ڈھنگ سے کرنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔

"تم فی الحال ریشماں کی فکر چھوڑ دو۔" میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ "میں اس کے معاملے کو خود ہی دیکھ لوں گا۔ میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گا جس سے اس کی ذات سوالیہ نشان بن کر رہ جائے۔"

"بہت بہت شکریہ جناب۔" وہ تشکر آمیز انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "بس، میں یہی چاہ رہا تھا۔"

"اب تمہیں مجھ سے بھی ایک وعدہ کرنا ہوگا؟"

"کیسا وعدہ تھانے دار صاحب!" وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

"تم یہاں سے سیدھے گھر جاؤ گے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور آئندہ دو روز تک تم ریشماں سے نہیں ملو گے۔"

اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار نمودار ہوئے، پوچھنے لگا۔ "اس کا کیا مطلب ہے جناب؟"

"اس کا وہی مطلب ہے جو میں نے کہا ہے۔" میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔ "تم اگلے دو دن تک ریشماں سے نہیں ملو گے...... سمجھ گئے؟"

"اور اگر وہ خود ہماری دکان پر آئی تو؟"

"تو ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "تم اس سے نارمل انداز میں بات کرو گے۔ ہمارے درمیان جو بھی گفتگو ہوئی ہے اس کے بارے میں تم ریشماں کو کچھ نہیں بتاؤ گے۔"

"ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔" وہ فرماں برداری سے بولا۔ "میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔"

مزید چند نصیحتوں کے بعد میں نے اسے رخصت کر دیا۔ وہ جیسے ہی تھانے سے نکلا، میں نے اس کی خبر گیری کے لیے ایک سادہ لباس کانسٹیبل کو اس کی کڑی نگرانی کے لیے روانہ کر دیا۔ میں نے کانسٹیبل کو سمجھا دیا تھا کہ اسے خود کو پوشیدہ رکھ کر کس طرح کام کرنا ہے۔

بہ ظاہر جمیل کی نیت میں کوئی فتور نظر نہیں آتا تھا لیکن وہی بات کہ نیت کا حال صرف خدا کو معلوم ہے۔ اگر جمیل کسی بھی حوالے سے ناصر کے قتل میں ملوث ہوتا یا اس واقعے کے حوالے سے اس کے پاس کوئی ایسی معلومات ہوتیں جو اس نے مجھ سے چھپانے کی کوشش کی تھی تو شام سے پہلے اس کی چوری پکڑی جاتی۔ اگر اس کے دل و دماغ میں کوئی گڑبڑ تھی تو وہ ریشماں سے ملاقات کی ضرور کوشش کرتا۔ بہرحال، جو بھی تھا وہ بہت جلد سامنے آنے والا تھا۔

میں نے آج ہی ریشماں کے گھر جا کر اس سے پوچھ گچھ کا فیصلہ کر لیا تھا اور وہ اس طرح کہ گاؤں والوں کو میرے حوالے سے کوئی ایسا شک نہ ہو کہ میں خاص طور پر ریشماں کو ٹارگٹ کر کے وہاں پہنچا ہوں۔

واقعی کسی سیانے نے بہت ٹھیک کہا ہے...... نیت صاف، منزل آسان! میری نیت صاف تھی اس لیے قدرت نے شام سے پہلے ہی میرے گلاب پور جانے کا بڑا مناسب بندوبست کر دیا۔ سہ پہر میں اسپتال سے ناصر کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش آگئی تھی۔ میں نے ناصر کے وارثوں کو تھانے بلانے کے بجائے لاش کو خود گلاب پور پہنچانے کا ارادہ کیا اور جب میں تھانے سے نکل ہی رہا تھا کہ حنیفاں بھی وہاں پہنچ گئی۔ میں اسے فوراً اپنے کمرے میں لے گیا اور پوچھا۔

"کیا رپورٹ ہے حنیفاں؟"

"وہ جو میں نے اڑتی اڑتی بتائی تھی، وہ بات سو فیصد سچ ہے ملک صاحب!" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "ریشماں اور ناصر کے درمیان عشق پیچا چل رہا تھا۔"

"ٹھیک ہے، تم نے تصدیق کر دی ہے تو میں بھی مطمئن ہو گیا ہوں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے لائق اور کوئی خدمت؟"

"فی الحال نہیں......"

"میں پھر کب حاضری دوں ملک صاحب؟" وہ امید بھری نظر سے مجھے تکنے لگی۔

"تین چار دن کے بعد چکر لگانا۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "اسپتال سے ناصر کی لاش آگئی ہے۔ اب میں بہت مصروف ہو جاؤں گا۔"

"میرا انعام تو یاد ہے نا ملک صاحب؟"

"اور میں تمہیں تین چار دن کے بعد کس لیے بلا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "انعام کی تم فکر نہ کرو۔ پہلے کبھی ایسا ہوا ہے کہ میں نے تم سے کام لیا ہو اور انعام نہ دیا ہو؟"

"نہیں ملک صاحب! ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ جلدی سے معذرت کرتے ہوئے بولی۔ "میں تو بس آپ کو یاد دلا رہی تھی۔"

تھوڑی دیر کے بعد وہ مجھے سلام کر کے واپس چلی گئی۔

☆☆☆

پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ کے مطابق مقتول ناصر کی موت پچیس مئی کی رات کو ہوئی تھی۔ موت کا وقت رات گیارہ سے ایک بجے کے درمیان بتایا گیا تھا۔ اس کے جسم پر متعدد زخم پائے گئے تھے جو تیز دھار آلات کے ذریعے لگائے گئے تھے۔ زخموں کے تفصیلی معائنے سے یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ حملہ آور دو سے زیادہ تھے اور انہوں نے خنجروں اور تیز دھار چھریوں کی مدد سے مقتول کو لہولہان کر دیا تھا۔ سب سے زیادہ کاری وار اس کے پیٹ اور سینے پر کیے گئے تھے۔ سینے کے خطرناک زخموں ہی نے

ناصر کو موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔

میرا یہ اندازہ سو فیصد درست نکلا تھا کہ ناصر کو موت کے گھاٹ اتارنے والے حملہ آور ایک سے زیادہ افراد تھے جو ناصر کے لیے اپنے دل و دماغ میں شدید ترین نفرت رکھتے تھے اور یہ بات بھی طے تھی کہ قاتل ریشماں اور ناصر کی شبینہ مصروفیات سے بھی بہ خوبی آگاہ تھے۔ گویا یہ سیدھا سیدھا "زن زر زمین" کے مثلث کا ایک زاویہ یعنی "زن" تھا۔ صحیح صورت کیا تھی، اس راز سے تو ریشماں ہی پردہ اٹھا سکتی تھی۔

میں اس وقت ریشماں کے گھر ہی میں بیٹھا ہوا تھا۔

جب میں ناصر کی لاش اس کے ورثا کے حوالے کرنے گلاب پور پہنچا تھا تو بشیر لوہار کے گھر کے سامنے بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ بعض عمر رسیدہ افراد مجھ سے یہ جاننے کی کوشش میں بھی تھے کہ ناصر کے قاتل کا کچھ پتا چلا یا نہیں۔ میں نے سب کو موقع محل کی مناسبت سے تسلی بخش جواب دے دیا تھا۔ اسی جمگھٹے میں ریشماں کا باپ شکور ترکھان بھی موجود تھا۔

میں شکور ترکھان کو چپکے سے ایک طرف لے گیا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔ "شکورا! میں قتل کی اس واردات کے سلسلے میں تم سے بھی تھوڑی پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھ سے؟" وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ جیسے توقع نہ ہو کہ میں اس سے بھی کچھ پوچھ سکتا ہوں۔

"شکورا! تم بھی چاہتے ہو گے کہ میں جلد از جلد ناصر کے قاتل کو گرفتار کر کے عبرت ناک سزا دلواؤں؟" میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کر کے کہا۔

"جی تھانے دار صاحب!" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اس گاؤں کا بچہ بچہ یہی چاہتا ہے۔ ناصر تو گلاب پور کی عزت و آبرو تھا۔"

میں نے دل میں کہا، تمہیں کیا پتا کہ گلاب پور کی عزت و آبرو تمہاری عزت و آبرو کے ساتھ کون سا کھیل، کھیل رہا تھا۔ پھر زبان سے کہا۔

"بس تو پھر تمہیں میرے سوالات کے جواب دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ میں تو فرداً فرداً سبھی سے پوچھ گچھ کر رہا ہوں۔ یہ میری ڈیوٹی اور تفتیش کا حصہ ہے شکورا!"

شکور ترکھان کی باتوں سے مجھے یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی اور مقتول کے باہمی تعلقات سے آشنا نہیں تھا۔ ان دونوں نے محبت کی پینگیں اس احتیاط کے ساتھ بڑھا رکھی تھیں کہ ہما شما تو کیا، خواص کو بھی اس کی کانوں کان خبر نہیں تھی۔ ورنہ کہیں سے تو آواز نکلتی۔

میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑانے کے بعد کہا۔ "شکورا! یہاں کھڑے ہو کر بات کرنا مناسب نہیں ہو گا۔ کیوں نہ تمہارے گھر میں آرام سے بیٹھ کر اس موضوع پر گفتگو کریں؟"

"ٹھیک ہے جناب!" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "آپ آئیں میرے ساتھ......"

میں خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا اور اس وقت اسی کے گھر کی بیٹھک میں بیٹھا ہوا تھا۔ شکور ترکھان کی دو اولادیں تھیں۔ ایک بیٹی ریشم عرف ریشماں اور اس کا چھوٹا بھائی شاہد جو ابھی بارہ سال کا تھا اور اس وقت گھر سے باہر اپنے دوستوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں شکور کی بیوی سردار بی بی بھی چائے کی ٹرے اٹھائے بیٹھک میں آ گئی اور وہیں میرے سامنے جم کر بیٹھ گئی۔ شکور ترکھان نے بڑے احترام سے کہا۔

"تھانے دار صاحب! آپ چائے لیں اور مجھ سے سوال بھی کرتے جائیں۔ سردار بی بی بھی ادھر ہی بیٹھی ہے۔ اس سے بھی جو پوچھنا ہو، پوچھ لیں......"

"آپ کی بیٹی ریشماں کہاں ہے؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

سردار بی بی نے بتایا۔ "وہ گھر میں ہی ہے جناب۔ کل سے اسے بخار چڑھا ہوا ہے۔ حکیم جی سے دوا بھی لا کر دی ہے لیکن کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ بخار تھوڑی دیر کے لیے کم ہوتا ہے پھر پھونک کر چڑھ جاتا ہے۔"

"ریشماں کا بخار حکیم کی دوا سے ٹھیک نہیں ہو گا سردار بی بی!" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب؟" شکور نے عجیب سی نظر سے مجھے دیکھا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں شکور......" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ریشماں کو عشق کا بخار چڑھا ہوا ہے۔ ناصر کی المناک موت نے اس کے دل و دماغ کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔"

میرے اس انکشاف پر دونوں میاں بیوی نے الجھن زدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر بہ یک زبان ہو کر بولے۔ "ہماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا؟"

"میں سمجھاتا ہوں۔" میں نے رسانیت بھرے انداز میں کہا۔ "میری باتوں کو غور سے اور ٹھنڈے دل و دماغ سے سننا۔ میں آپ لوگوں کو کوئی فرضی کہانی نہیں سنانے لگا۔ یہ ایک سچ حقیقت ہے۔ میں پوری تحقیق کے بعد

ہی ذمے داری کے ساتھ یہ سب آپ کو بتا رہا ہوں۔"

وہ حیرت اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ آنکھیں پھاڑے مجھے تکنے لگے۔ میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع اور موثر الفاظ میں انہیں صورتِ حال سے آگاہ کر دیا اور آخر میں شکور ترکھان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں دراصل تم سے نہیں بلکہ تمہاری بیٹی سے پوچھ گچھ کرنے کے لیے یہاں آیا ہوں۔ مجھے امید ہے، ریشماں ناصر کے قاتل تک میری راہنمائی کر سکتی ہے۔"

"مجھے تو بالکل بھی یقین نہیں آ رہا۔" سردار بی بی پریشانی کے عالم میں بولی۔

شکور میری بات سن کر کسی گہری سوچ میں غرق ہو گیا تھا۔

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "پریشان یا فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ معاملہ اسی گھر کی چار دیواری کے اندر رہے گا۔ ریشماں میری بیٹی کی طرح ہے۔ میں جانتا ہوں، اس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ ناصر کی موت میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔ آپ اسے یہاں بلائیں یا مجھے اس کے پاس لے جائیں۔ میں آپ لوگوں کے سامنے اس سے چند سوالات کروں گا اور خاموشی سے واپس چلا جاؤں گا۔"

میں اگر چاہتا تو زبردستی بھی اپنا مقصد حاصل کر سکتا تھا۔ میں اس علاقے کا تھانے دار تھا۔ کسی میں میرے سامنے دم مارنے کی مجال نہیں تھی لیکن میں تھانے دار ہونے کے ساتھ ہی ایک عزت دار انسان بھی تھا اور دوسروں کی عزت کا بھی احساس تھا میرے دل میں۔ مجھے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ ناصر اور ریشماں والے معاملے سے اس کے ماں باپ واقف نہیں تھے اور میری زبانی یہ احوال سننے کے بعد وہ دونوں گویا زمین میں گڑے جا رہے تھے۔ میں وہاں انہیں ذلیل کرنے نہیں آیا تھا لہٰذا مجھے ایسا کوئی کام نہیں کرنا تھا جس سے ان کی عزت کا جنازہ نکل جائے۔

بادل ناخواستہ مجھے گھر کے اندرونی حصے میں ریشماں کے پاس پہنچا دیا گیا۔ ہمارے درمیان یہ طے ہو گیا تھا کہ پوچھ گچھ کے دوران میں وہ لوگ ریشماں کے قریب نہیں بیٹھیں گے بلکہ دروازے کے پیچھے کھڑے ہو کر ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو سنتے رہیں گے۔ یہ احتیاط اس لیے برتی گئی تھی کہ بعد ازاں ریشماں کو اپنے والدین کی نگاہوں کا سامنا کرتے ہوئے شرمندگی کا احساس نہ ہو۔ میں نے شکور ترکھان اور اس کی بیوی کو اس بات کا پابند بنا دیا تھا کہ وہ میرے جانے کے بعد ریشماں سے کسی نوعیت کی باز پرس نہیں کریں گے بلکہ اس قصے کو بھول ہی جائیں گے۔ اسی میں ان کی بھلائی تھی۔ وہ اس بات کے لیے تہ دل سے میرے شکر گزار تھے کہ میں نے انہیں اعتماد میں لے کر ان کا مان رکھ لیا تھا۔

جب وہ مجھے ریشماں کے پاس پہنچا کر واپس چلے گئے تو میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ "ریشماں! میں ایک خاص مقصد سے تمہارے پاس آیا ہوں۔"

اس نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی۔ وہ بیس، اکیس سال کی ایک دلکش و خوب صورت لڑکی تھی لیکن اس وقت بخار نے اس کا حال بے حال کر رکھا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے تمہارے ماں باپ کو کچھ نہیں بتایا لیکن سچ یہ ہے کہ میں تم سے ناصر کے بارے میں پوچھنے آیا ہوں۔"

ناصر کے ذکر پر وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی کٹورا آنکھوں میں نمی اتر آئی وہ بھیگی ہوئی آواز میں بولی۔

"کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

میں نے اس کی سہولت کی غرض سے کہا۔ "چونکنے اور پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔ میں تمہارے اور ناصر کے معاملے سے پوری طرح واقف ہو چکا ہوں۔ جمیل نے مجھے سب کچھ کھول کر بتا دیا ہے۔ میں جلد از جلد ناصر کے قاتل کو گرفتار کر کے کڑی سزا دلوانا چاہتا ہوں اور قاتل تک تم مجھے پہنچا سکتی ہو۔"

"میں...... وہ کیسے جی؟" وہ قدرے سنبھلے ہوئے انداز میں بولی۔

یہ جان کر کہ میں اس کی لو اسٹوری سے واقف ہو چکا ہوں، اس نے مزاحمت کے سارے ہتھیار پھینک دیے تھے اور یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی تھی کہ وہ میری توقع سے زیادہ تعاون پر آمادہ نظر آتی تھی۔

"وقوعہ کی رات تم ناصر سے ملنے کھیتوں میں گئی تھیں۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ ناصر پر کن لوگوں نے حملہ کیا تھا؟"

"میں اس رات ناصر سے ملنے نہیں گئی تھی۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

اس کی آواز میں شامل اعتماد نے مجھے یقین دلا دیا کہ وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہی تھی لیکن تصدیق پھر بھی ضروری تھی۔ میں نے کہا۔

"جمیل نے مجھے بتایا ہے کہ اس رات تم دونوں کی ملاقات کا پکا پروگرام تھا۔ یہ بات اس سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ ناصر وہاں پہنچا تھا؟"

"یہی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی کہ ناصر وہاں کیوں گیا تھا۔" وہ الجھے ہوئے انداز میں بولی۔ "جبکہ اس نے خود ہی پروگرام کینسل کیا تھا۔"

"پروگرام کینسل کیا تھا؟" میں چونک اٹھا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں تھانے دار صاحب۔" وہ سپاٹ آواز میں بولی۔ "مجھے کچھ پتا نہیں، ناصر پروگرام کینسل کرنے کے بعد خود وہاں کیوں گیا تھا۔ کل سے یہی سوچ سوچ کر میرا دماغ پھٹا جارہا ہے۔"

"ایک منٹ......" ان لمحات میں میرا ذہن برق رفتاری سے کام کررہا تھا۔ "تم دونوں کے بیچ رابطے کا ذریعہ جمیل ہی تھا نا؟"

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"لیکن جمیل تو پچھلے دو دن سے گلاب پور میں موجود ہی نہیں تھا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "پھر پروگرام کو کینسل کرنے والی بات تمہیں کس نے بتائی تھی؟"

"امتیاز نے......!" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"کون امتیاز؟" میں نے تیز آواز میں پوچھا۔

"امتیاز چاچا مقبول کا لڑکا ہے جی۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا امتیاز کو بھی تم دونوں کے چکر کی خبر تھی؟"

"نہیں جی...... وہ تو بے چارہ بچہ ہے۔" ریشماں نے بتایا۔ "امتیاز کی عمر آٹھ نو سال ہوگی۔ ادھر ہمارے پڑوس ہی میں رہتا ہے۔"

"اوہ......" میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ "امتیاز نے تم سے کیا کہا تھا؟"

"جس رات ہماری ملاقات طے تھی، اسی شام امتیاز نے مجھے دیکھ کر کہا تھا کہ ناصر بھائی نے کہا ہے، آج نہیں آنا......"

"تم نے امتیاز سے کوئی سوال نہیں کیا تھا؟"

"کیا تھا جی......" وہ بولی۔ "مجھے تو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ ناصر نے امتیاز کے ہاتھ کیوں پیغام بھجوایا تھا۔ میں نے امتیاز کو چیک کرنے کے لیے پوچھا تھا کہ کہاں نہیں جانا مجھے؟"

"پھر اس نے کیا جواب دیا؟" میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔

"اس نے جواب دیا کہ وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا۔" ریشماں نے بتایا۔ "ناصر بھائی نے بس اتنا کہا تھا کہ ریشماں کو چپکے سے بتادو، آج نہیں آنا۔ اسے کوئی ضروری کام ہے......" وہ لمحے بھر کے لیے رکی، ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"جمیل تو ٹیک سنگھ گیا ہوا تھا ورنہ میں اس کی دکان پر جاکر تصدیق کرلیتی۔ امتیاز کو مزید کچھ معلوم نہیں تھا اور ناصر سے جاکر میں پوچھ نہیں سکتی تھی۔ بس، میں نے یہی فیصلہ کیا کہ آج رات ناصر سے ملنے نہیں جاؤں گی۔"

"اوہ!" میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "اس کا مطلب ہے، ناصر کو پوری منصوبہ بندی سے قتل کیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے، امتیاز اس شخص کو ضرور جانتا ہوگا جس نے ناصر کے حوالے سے اسے تمہارے لیے پیغام دیا تھا۔"

"آپ امتیاز سے پوچھیں جی۔" وہ نرمی سے بولی۔ "میری تو حالت بہت خراب ہورہی ہے۔ بار بار چکر آرہے ہیں اور آپ دیکھ رہے ہیں نا...... بخار بھی کتنا تیز چڑھا ہوا ہے۔"

"تم آرام کرو ریشماں!" میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "سارے معاملات اب میں خود سنبھال لوں گا۔ تم نے جتنا تعاون کردیا ہے، وہی میرے لیے کافی ہے۔"

میں دوبارہ بیٹھک میں پہنچا تو میاں بیوی نے مجھے گھیر لیا۔ شکور ترکھان نے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔

"تھانے دار صاحب! کچھ پتا چلا؟"

میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "کچھ نہیں بلکہ سب کچھ پتا چل گیا ہے۔"

"ہمیں بھی تو بتائیں۔" سردار بی بی نے کہا۔

"آپ اپنے پڑوسی کے بچے امتیاز کو یہاں بلائیں۔"

"وہ ابھی تو شاہد کے ساتھ گلی میں کھیل رہا تھا۔" وہ جلدی سے بولی۔ "میں ابھی بلاتی ہوں اسے......" یہ کہتے ہوئے وہ بیٹھک سے باہر نکل گئی۔

شکور ترکھان نے فکرمندی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "پر کچھ پتا تو چلے۔"

"ابھی پتا چل جائے گا۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "امتیاز کو آجانے دیں۔"

اگلے ہی لمحے سردار بی بی امتیاز کو لے کر بیٹھک میں آگئی۔

امتیاز کی عمر لگ بھگ آٹھ سال رہی ہوگی۔ وہ ایک معصوم اور بھولا بھالا بچہ تھا۔ میں نے پیار سے اسے اپنے پاس بلایا اور سر پر ہاتھ پھیرنے کے بعد پوچھا۔

"بیٹا! تمہارا نام کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "امتیاز!"

"جانتے ہو، میں کون ہوں؟"

"آپ پولیس ہو۔" وہ بڑے غور سے مجھے دیکھتے

ہوئے بولا۔

امتیاز خاصا سمجھ دار بچہ ثابت ہورہا تھا۔ میں نے نرم لہجے میں سوال و جواب کا سلسلہ جاری رکھا۔ "تمہیں پتا ہے، پولیس کیا کرتی ہے؟"

"پولیس سب لوگوں کو پکڑ کر تھانے میں بند کردیتی ہے۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

"سب لوگوں کو نہیں۔" میں نے کہا۔ "صرف ان کو جو گندے ہوتے ہیں۔ تمہیں پتا ہے نا، گندے لوگ کون ہوتے ہیں؟"

"جو جھوٹ بولتے ہیں وہ گندے بچے ہوتے ہیں۔" وہ معصومیت سے بولا۔ "اور جو گالیاں دیتے ہیں وہ بھی گندے بچے ہوتے ہیں۔"

"شاباش!" میں نے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے پوچھا۔ "امتیاز بیٹا...... صحیح صحیح بتاؤ تم گندے بچے ہو یا اچھے بچے؟"

"میں اچھا بچہ ہوں جی۔" وہ بڑے فخر سے بولا۔ "میں کسی کو بھی گالیاں نہیں دیتا۔"

"اور تم جھوٹ بھی نہیں بولتے...... ہیں نا؟"

اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔

"پرسوں شام کو تم نے ریشماں باجی سے کہا تھا نا کہ ناصر بھائی نے کہا ہے، آج نہیں آنا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ایسا ہوا تھا نا؟"

"جی ہوا تھا۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"تم بہت اچھے بچے ہو امتیاز۔" میں نے سراہنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "میں تمہیں بہت ٹافیاں دوں گا۔ اب یہ بھی بتادو کہ تم نے ریشماں باجی کو کہاں جانے سے منع کیا تھا؟"

"یہ تو مجھے نہیں پتا جی......" وہ بڑی معصومیت سے بولا۔ "آپ کو یقین نہیں آرہا تو میں رب کی قسم کھاتا ہوں۔"

"نہیں بیٹا، قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے تم پہ بھروسا ہے۔" میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ "تم نے تو ریشماں باجی سے وہی کہا جو ناصر بھائی نے تم سے کہا تھا...... ہیں نا؟"

"نہیں جی۔" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ "کیا نہیں؟"

"یہ بات مجھ سے ناصر بھائی نے نہیں کہی تھی۔" اس نے جواب دیا۔

"پھر کس نے کہی تھی؟" میں نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

"حیدر بھائی نے......!"

"تمہارا مطلب ہے حیدر علی۔" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ "زلیخاں بی بی کے بیٹے حیدر علی نے؟"

"جی جی...... وہی حیدر بھائی۔" وہ جلدی سے بولا۔

☆☆☆

حیدر علی کا گھر بھی گلاب پور ہی میں واقع تھا لہٰذا وہاں تک رسائی حاصل کرنے میں مجھے کسی وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ حیدر علی، سردار بی بی کی بڑی بہن زلیخاں بی بی کا بیٹا یعنی ریشماں کا کزن تھا۔ میری معلومات کے مطابق سردار بی بی اپنی بیٹی کا رشتہ حیدر علی سے کرنے کی خواہش رکھتی تھی اور یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ حیدر علی کا دعویٰ ہے کہ ریشماں اس کی بچپن کی مانگ (منگیتر) ہے۔ اس تناظر میں یہ سمجھنا کوئی راکٹ سائنس نہیں تھا کہ جب حیدر علی کو ریشماں اور ناصر کے تعلقات کا پتا چلا ہوگا تو اس نے اپنے رقیب کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی ہوگی۔

ان حالات میں نظر یہی آرہا تھا کہ یہ کیس حل ہوچکا۔ حیدر علی میرے ہتھے چڑھے گا اور میں ڈرا دھمکا کر یا تھوڑی بہت تفتیش کے بعد اس کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہوجاؤں گا لیکن ایسا ہوا نہیں۔

جب میں زلیخاں کے گھر پہنچا تو پتا چلا کہ حیدر علی وہاں موجود نہیں ہے۔ زلیخاں بی بی نے بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے وہ گھر ہی میں تھا۔ میں نے اس سے سوال کیا۔ "گھر میں تھا تو اب کہاں ہے؟"

کون سے نبی کہاں دفن ہیں

حضرت آدم علیہ السلام...... سری لنکا
حضرت نوح علیہ السلام...... اردن
حضرت ہود علیہ السلام...... لبنان
حضرت لوط علیہ السلام...... عراق
حضرت ابراہیم علیہ السلام...... اسرائیل
حضرت اسحاق علیہ السلام...... فلسطین
حضرت یعقوب علیہ السلام...... فلسطین
حضرت یوسف علیہ السلام...... فلسطین
حضرت ایوب علیہ السلام...... عمان
حضرت اسماعیل علیہ السلام...... سعودی عرب

مرسلہ: محمد خواجہ، کورنگی کراچی

''پتا نہیں جی......'' وہ پریشان ہوکر بولی۔ ''مجھے تو کچھ بتایا نہیں......'' ایک لمحے کو رک کر اس نے پوچھا۔ ''پر بات کیا ہے جی...... آپ حیدر کو کیوں ڈھونڈ رہے ہیں؟''

اس کی تشویش بجا تھی۔ پولیس کسی دروازے تک چلی آئے اور اس گھر کے کسی مکین کے بارے میں پوچھ گچھ کرے تو اہلِ خانہ کا فکرمند ہوجانا عین فطری بات ہے۔

میں زلیخاں کو... اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا لہٰذا نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں یہ تو پتا ہے نا، گلاب پور کا ایک گبرو جوان قتل ہوگیا ہے؟'' بات ختم کرکے میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''ج...... جی!'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''بشیر لوہار کے جوان جہان بیٹے ناصر کو کسی ظالم نے بڑی بے دردی سے قتل کردیا ہے۔''

''کسی نے نہیں...... ایک خاص بندے نے!'' میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک دیکھتے ہوئے کہا۔

''خاص بندے نے...... کون خاص بندہ؟'' وہ بکھری ہوئی آواز میں بولی۔

''جس کی تلاش مجھے تمہارے گھر تک لے آئی ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''تمہارا لاڈلا بیٹا، حیدرعلی۔''

''اوہ......'' وہ ایک سراسیمہ سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''میرا بیٹا کسی کو قتل نہیں کرسکتا...... آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''ہر ماں باپ کا یہی خیال ہوتا ہے کہ ان کا بیٹا بہت معصوم ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ گھر سے سیدھا مسجد جاتا ہے اور مسجد سے گھر لیکن جب پولیس کسی ایسے جلیبی کی طرح سیدھے بندے کو تفتیش کی چکی میں ڈالتی ہے تو پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ایک دم الگ ہوجاتا ہے۔ میں پکے ثبوت کے ساتھ یہاں آیا ہوں۔''

''کون سا ثبوت؟'' وہ کمزور سی آواز میں بولی۔

''ثبوت حیدر کی زبان ہی سے تمہیں سناؤں گا۔'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔ ''ذرا وہ میرے ہاتھ تو لگ جائے۔''

''پتا نہیں، آپ کس قسم کی باتیں کررہے ہیں تھانے دار صاحب!'' وہ مریل سی آواز میں بولی۔ ''میرے تو کچھ بھی پلے نہیں پڑ رہا......''

میں دانستہ کھل کر ریشماں اور امتیاز کا نام نہیں لے رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ریشماں کی محبت گلاب پور کی گلی گلی کا فسانہ بن کر رہ جائے۔ ہاں، جب حیدرعلی میرے ہتھے چڑھ جاتا تو پھر اس سے کھل کر اس موضوع پر بات ہوسکتی تھی۔

میں نے حیدرعلی کو اس کے گھر سے غائب پاکر پورے گلاب پور میں تلاش کرایا مگر وہ کہیں سے بھی دستیاب نہ ہوسکا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ گاؤں سے باہر جاچکا ہے۔ گاؤں کا کوئی فرد حیدرعلی کے بارے میں یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہوگا۔

اس صورتِ حال میں ایک خیال بڑی سرعت سے میرے دماغ سے گزرا اور وہ یہ کہ...... کہیں گاؤں میں پولیس کی آمد نے اسے چوکنا تو نہیں کردیا اور وہ خود ہی کہیں اِدھر اُدھر ہوگیا ہو۔

حیدرعلی کی یہ پراسرار گمشدگی بھی اس امر کی جانب اشارہ کرتی تھی کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ میں کافی دیر سے گلاب پور میں موجود تھا۔ میں نے مقتول ناصر کی لاش کو اس کے ورثا کے حوالے کرنے کے بعد شکور ترکھان کے گھر کا رخ کیا تھا جہاں شکور کے علاوہ اس کی بیٹی ریشماں سے بھی میری تفصیلی بات ہوئی تھی جو کہ اب اس کیس کا ایک اہم کردار بن چکی تھی۔ ممکن ہے، حیدرعلی نے مجھے شکور کے گھر جاتے دیکھ لیا ہو اور دل کے چور نے اس کے کان کھڑے کردیے ہوں لہٰذا وہ منظر سے غائب ہوگیا ہو...... حیدرعلی کا فوری طور پر دستیاب ہونا بہت ضروری تھا جو عملاً مجھے ممکن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے زلیخاں کو ہدایت کی کہ اس کا بیٹا حیدرعلی جیسے ہی گھر آئے، وہ اسے میرے پاس تھانے بھیج دے۔ اس نے میرے احکام کی تعمیل کا یقین دلایا اور میں گلاب پور سے نکل کر اپنے تھانے آگیا۔

تھانے آکر میں نے ایک اہم کام یہ کیا کہ ایک سادہ لباس پولیس اہلکار کو حیدرعلی کی تلاش پر مامور کردیا۔ اسے گلاب پور میں رہتے ہوئے گاؤں کے اندرونی حالات پر نظر رکھنا تھی اور یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ اگر حیدرعلی واقعی گاؤں سے باہر گیا ہے تو وہ کہاں جاسکتا ہے۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ وہ گاؤں ہی میں کہیں چھپا بیٹھا ہو۔

☆☆☆

آئندہ روز میں فجر کی نماز سے فارغ ہوا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کوارٹر کا صحن عبور کرنے کے بعد داخلی دروازہ کھولا تو سامنے کانسٹیبل نیاز کھڑا تھا۔ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ میری نگاہ کا مطلب سمجھتے ہوئے جلدی سے بولا۔

''ملک صاحب! اتنی صبح تکلیف دینے کے لیے معذرت چاہتا ہوں مگر بات ہی ایسی ہے کہ......''

''تکلیف اور معذرت کی باتیں چھوڑو۔'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''میں خود کو چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر تصور کرتا ہوں۔ تم بتاؤ، معاملہ کیا ہے؟''

''گلاب پور سے ایک اہم اطلاع آئی ہے۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''آپ نے جس کانسٹیبل کو سادہ لباس میں وہاں حیدرعلی کی نگرانی پر مامور کر رکھا ہے، اس نے ایک بندے کے ذریعے یہ اطلاع دی ہے کہ حیدرعلی رات کے آخری پہر واپس آیا تھا اور اس وقت اپنے گھر میں سو رہا ہے۔''

یہ واقعی انکشاف انگیز اور اہم اطلاع تھی۔ میں نے کانسٹیبل نیاز کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''نیاز! حوالدار بخش علی سے کہو کہ ابھی اور اسی وقت اطلاع کنندہ کے ساتھ گلاب پور روانہ ہوجائے اور پہلی فرصت میں حیدرعلی کو گرفتار کرکے تھانے لے آئے۔''

''جی...... جو حکم ملک صاحب۔'' اس نے مؤدبانہ انداز میں گردن جھکا کر کہا اور تھانے کے اندرونی حصے کی جانب قدم بڑھا دیے۔

میں نے کوارٹر کا داخلی دروازہ بند کیا اور حیدرعلی کے بارے میں سوچتے ہوئے ناشتے میں مصروف ہوگیا۔ ابھی تک حالات و واقعات کی جو کڑیاں میرے ہاتھ لگی تھیں ان سے بننے والی زنجیر حیدرعلی کو مجرم کی شکل میں پیش کرتی تھی۔ وہ ریشماں کو اپنی ''منگ'' یعنی منگیتر گردانتا تھا۔ امتیاز والے واقعے سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی تھی کہ حیدرعلی کو ریشماں اور مقتول ناصر کے تعلقات کا علم تھا لہٰذا اس امر کے امکانات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ حیدرعلی نے اپنی راہ کا کانٹا ہٹانے کی کوشش کی ہوگی۔

ناشتے کے بعد جب میں تیار ہوکر تھانے پہنچا تو سورج کافی اوپر تک اٹھ چکا تھا۔ آج گزشتہ چند روز کی بہ نسبت گرمی کی شدت میں کچھ کمی محسوس ہورہی تھی مگر اسے سہانا موسم نہیں کہا جاسکتا تھا۔ گرمی کم ہو یا زیادہ اس کا اپنا ایک تکلیف دہ مزاج ہوتا ہے۔

کچھ ہی دیر کے بعد حوالدار بخش علی مطلوبہ شخص حیدر علی کو گرفتار کرکے تھانے لے آیا۔ حیدرعلی کی نگرانی پر مامور سادہ لباس پولیس اہلکار تو ان کے ہمراہ تھا ہی۔ اس کے علاوہ بھی ایک شخصیت ان کے ساتھ تھی اور وہ تھی حیدرعلی کی ماں زلیخاں بی بی...... سردار بی بی کی بڑی بہن!

زلیخاں اپنے بیٹے کی گرفتاری پر اچھا خاصا واویلا مچا رہی تھی جس کی وجہ سے تھانے کا ماحول کسی مچھلی بازار کا منظر پیش کررہا تھا۔ حیدرعلی اصل مجرم تھا یا نہیں اس بات کا حتمی فیصلہ تو تفتیش کے بعد ہی کیا جاسکتا تھا لہٰذا موقع محل کے مطابق ایک ماں کے جذبات کی قدر اور احترام بھی واجب تھا۔

''زلیخاں بی بی! شور کیوں مچا رہی ہو؟'' میں نے برہمی سے کہا۔

''ہا ہائے......'' وہ عجیب سے دکھی لہجے میں بولی۔ ''آپ میرے جوان جہان بیٹے کو گرفتار کرکے لائے ہیں اور میں فریاد بھی نہ کروں؟''

''میں نے تمہارے بیٹے کو پوچھ گچھ کے لیے تھانے بلوایا ہے، پھانسی لگانے کے لیے نہیں۔'' میں نے ڈانٹنے والے انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''میرا حیدر قاتل نہیں ہوسکتا۔'' وہ اضطراری لہجے میں بولی۔ ''آپ خوامخواہ اس بے چارے پر شک کررہے ہیں۔''

''میں کچھ بھی خوامخواہ نہیں کرتا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہارا بیٹا بےقصور ہے تو میں اس بات کی تمہیں گارنٹی دیتا ہوں کہ اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ میں حیدرعلی کا دشمن نہیں ہوں مگر میں اپنے فرض سے مجبور ہوں۔ قانون کے تقاضے پورے کرنا ضروری ہیں۔''

مجھے اندازہ نہیں کہ میری بات کس حد تک اس کی سمجھ میں آئی تھی تاہم میری تسلی نے کسی حد تک اسے مطمئن کردیا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اللہ کرے گا، میرا بیٹا بےگناہ ثابت ہوگا۔''

''میرا مشورہ ہے کہ تم واپس گلاب پور چلی جاؤ۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اگر حیدرعلی بےقصور ہوا تو آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے یہ صحیح سلامت اپنے گھر پر تمہاری نظر کے سامنے موجود ہوگا۔''

اس کا تھانے سے جانے کو جی تو نہیں چاہ رہا تھا تاہم میرے سمجھانے بجھانے پر وہ گھر جانے کے لیے راضی ہوگئی۔ میں نے حیدرعلی کو اپنے کمرے میں طلب کرلیا۔ حوالدار بخش علی بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ حیدرعلی میرے سامنے کھڑا ہوگیا تو میں کچھ لمحے کے لیے... گہری نظر سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا پھر چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''حیدر! اس کمرے میں تمہاری زبان کھل جائے گی یا تمہیں ڈرائنگ روم کی سیر کرانا پڑے گی؟''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ میرے سوال پر وہ اندر سے

ڈھل کر رہ گیا تھا تاہم خود کو مضبوط ظاہر کرنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔
''جی، میں نے کیا...... کیا ہے......؟''
''کیا کیا ہے...... کے تم!'' میں نے دہاڑ کر کہا۔ ''یہ بھی میں بتاؤں کہ تمہارے کالے کرتوت کیا کیا ہیں...... ہیں؟''
وہ سراسیمہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔
میں نے کہا۔ ''تم نے ناصر کو قتل کیا ہے۔''
''ن...... نہیں جی......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔''
''پھر ناصر کا قاتل کون ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔
''م...... مجھے...... کچھ پتا نہیں...... تھانے دار صاحب......''
''تمہیں یہ تو پتا ہے نا کہ...... ریشماں تمہاری بچپن کی مانگ ہے......'' میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔
''جی...... جی ہاں!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔
''اور یہ بھی تمہارے...... علم میں تھا کہ مقتول ناصر اور تمہاری مانگ ریشماں میں پچھلے کچھ عرصے عشق ہو چلا رہا تھا...... ہیں نا؟''
''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب!'' وہ مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔
''میں وہی کہہ رہا ہوں جو تم اچھی طرح سمجھ چکے ہو۔'' میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ ''سیدھی طرح حقیقت کا اعتراف کرتے ہو یا میں کوئی دوسرا طریقہ اختیار کروں؟''
''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں جناب۔'' وہ نگاہ چراتے ہوئے بولا۔ ''میں نے ناصر کو قتل نہیں کیا۔''
''ناصر کے قتل والی بات پہلے ہو چکی......'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''ابھی میرے اس سوال کا جواب دو کہ تمہیں ریشماں اور ناصر کے باہمی تعلقات کا علم تھا یا نہیں...... ہاں یا نہ......؟''
''ن...... نہ......'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا۔''
''ہوں!'' میں نے تیز نظر سے گھورتے ہوئے اس سے سوال کیا۔ ''تم تو امتیاز کو بھی نہیں جانتے ہوگے؟''
''کون امتیاز!'' وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا۔
''مقبول چاچا کا بیٹا امتیاز......'' میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''جس کی عمر آٹھ نو سال ہوگی اور جو ریشماں کے بھائی شاہد کا دوست اور ان کا پڑوسی بھی ہے......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''کچھ یاد آیا یا تمہارے سر میں چھترول کرنا پڑے گی؟''
''اچھا...... آپ اس بچے کی بات کر رہے ہیں۔'' وہ بے نیازی سے بولا۔
''ہاں وہی بچہ جس کے ہاتھ تم نے ریشماں کے لیے یہ پیغام بھجوایا تھا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کہ ناصر بھائی نے کہا ہے وہ آج نہیں آتا۔''
''م...... میں نے...... تو اس سے...... ایسی کوئی بات...... نہیں کہی تھی۔'' وہ گڑبڑائے ہوئے انداز میں بولا۔
''تمہارے اس کارنامے کے دو گواہ موجود ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ایک امتیاز جس کے ہاتھ تم نے یہ پیغام بھجوایا تھا اور دوسری ریشماں جس کے لیے تم نے یہ پیغام بھجوایا تھا...... اب بتاؤ کیا کہتے ہو؟''
وہ میری اس چڑھائی کے نتیجے میں بری طرح بوکھلا گیا اور اپنی جان بچانے کے لیے آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔
حوالدار نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ملک صاحب! یہ کتے کا تخم آپ کی بات نہیں سمجھ رہا۔ آپ ایک گھنٹے کے لیے اسے میرے حوالے کر دیں۔ پھر دیکھیں کس طرح یہ فر فر بولنے لگے گا۔''
اور میں نے حیدر علی کو حوالدار بخش علی کے حوالے کر دیا۔
کسی بھی مجرم کی بچت اسی وقت تک ہوتی ہے جب تک وہ پولیس کے ہتھے نہیں چڑھ جاتا۔ ایک مرتبہ وہ قانون کی گرفت میں آجائے تو پھر پولیس کے پاس اس کی زبان کھلوانے کے ایک سو ایک طریقے موجود ہوتے ہیں۔
تھوڑی ہی دیر کے بعد ڈرائنگ روم (کمرۂ تفتیش) کی جانب سے حیدر علی کے بلبلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ آوازیں کرب ناک صداؤں میں بدل گئیں۔
ایک گھنٹے سے بھی پہلے حوالدار نے میرے کمرے میں آکر خوشخبری سنائی۔ ''ملک صاحب! مبارک ہو۔ حیدر نے اقبالِ جرم کر لیا ہے۔ آپ اس کا بیان لے لیں۔''
''مطلب یہ کہ اس نے ناصر کو قتل کرنے کا اقرار کر لیا ہے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے بخش علی کی جانب دیکھا۔
''جی نہیں!'' وہ نفی میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”پھر......؟“

حوالدار رازدارانہ انداز میں مجھے ان انکشافات سے آگاہ کرنے لگا جو اس کی ”کاری محنت“ کے نتیجے میں حیدر علی کی زبان سے ہوئے تھے۔

☆☆☆

حیدر علی، ناصر کے قتل میں بالواسطہ ملوث نہیں تھا۔ یہ کام اس نے بلاواسطہ کیا تھا۔ ننھے امتیاز کے توسط سے ریشماں تک یہ پیغام اسی نے بھجوایا تھا کہ...... ناصر بھائی نے کہا ہے، آج نہیں آنا۔

یہ پیغام حیدر نے دراصل چودھری آفتاب کے ایما پر دیا تھا تاکہ وقوعہ کی رات ریشماں اپنے عاشق سے ملنے مقررہ مقام پر نہ پہنچے اور ناصر کو ٹھکانے لگانے میں کسی دقت کا سامنا نہ ہو۔

چودھری آفتاب کا تعلق نزدیکی گاؤں نذیر آباد سے تھا۔ وہ نذیر آباد کے چودھری فرید احمد کا بیٹا تھا اور کبڈی کا کھلاڑی تھی۔ حالیہ کبڈی ٹورنامنٹ کا فائنل جیسا کہ اس کہانی کی ابتدا میں بتایا جاچکا ہے، گلاب پور اور نذیر آباد کی ٹیموں کے درمیان کھیلا گیا تھا اور اس مقابلے میں نذیر آباد کو شکستِ فاش کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ فتح اور کپ گلاب پور کے حصے میں آئے تھے۔ اس مقابلے میں ایک کبڈی مقتول ناصر اور چودھری آفتاب کے بیچ بھی پڑی تھی جس میں ناصر نے چودھری آفتاب کو اس بری طرح رگیدا تھا کہ اس کی ناک اور باچھوں سے خون جاری ہوگیا تھا۔ ایک تو گاؤں کی شکست اور اس پر اپنی یہ درگت چودھری آفتاب کے جذبۂ انتقام کو ہوا دینے کے لیے کافی تھی۔ میدان جنگ (کبڈی والے کھیت) میں تو وہ ناصر کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکا تھا مگر اس نے کبڈی کے اس فاتح کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا فیصلہ کرلیا۔

چودھری آفتاب کو اس حقیقت کا علم تھا کہ حیدر علی، ریشماں کو اپنے بچپن کی مانگ کہتا ہے۔ کسی طرح چودھری آفتاب نے یہ پتا بھی چلا لیا کہ ان دنوں ناصر اور ریشماں کے بیچ عشق و محبت کے معاملات عروج پر ہیں لہٰذا اس نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کا خطرناک منصوبہ بنالیا۔

حیدر علی کو ریشماں اور ناصر کے تعلقات کا شک تو تھا لیکن جب چودھری آفتاب نے اس کی اس جانب خصوصی توجہ دلائی تو وہ آپے سے باہر ہوگیا۔ چودھری نے اسے سمجھایا کہ جذبات میں آنے کے بجائے اگر طریقے سلیقے سے کام کیا جائے تو سانپ بھی مرجاتا ہے اور لاٹھی بھی سلامت رہتی ہے۔ حیدر علی نے چودھری آفتاب کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔

حیدر علی نے اپنے ہاتھوں سے ناصر کو قتل نہیں کیا تھا تاہم وہ اس سازش کا حصہ رہا تھا بلکہ جب چودھری کے بھیجے ہوئے دو بندے تیز دھار خنجروں کی مدد سے ناصر کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار رہے تھے تو حیدر علی تھوڑے فاصلے پر اندھیرے میں کھڑا یہ خونیں تماشا دیکھ رہا تھا۔

حیدر علی کے اقبالِ جرم اور گواہی پر میں نے اسی روز خود نذیر آباد جاکر چودھری آفتاب کو ناصر کے قتل کے سلسلے میں گرفتار کرلیا۔ آفتاب نذیر آباد کے چودھری فرید احمد کا بیٹا تھا لہٰذا اس گرفتاری کے سلسلے میں مجھ پر اچھا خاصا دباؤ بھی تھا تاہم میں نے چودھری فرید کے اثر رسوخ کی ذرا پروا نہ کی اور چودھری آفتاب اور اس کی نشاندہی پر ان دو بندوں کو بھی حوالات کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا جو ناصر کے قتل میں ملوث تھے۔

اپنی ہر کوشش کو ناکامیاب ہوتے دیکھ کر چودھری فرید نے دھمکی آمیز لہجے میں مجھ سے کہا تھا۔ ”ملک صاحب! آپ کو میری طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔ میں اپنے بیٹے کو عدالت سے چھڑا لوں گا۔“

”چودھری صاحب! میں صرف خدا کی طاقت اور قانون کی بالادستی پر یقین رکھتا ہوں۔“ میں نے چودھری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ”آپ نے جتنا زور لگانا ہے، لگالیں۔ انشاء اللہ آپ کا ہونہار لختِ جگر عدالت سے سیدھا جیل جائے گا۔“

میں نے حیدر علی، چودھری آفتاب اور ناصر کے دونوں قاتلوں کے خلاف حتی الامکان سخت پرچہ کاٹ کر انہیں عدالت کے حوالے کردیا۔ دونوں قاتل چونکہ اپنے جرم کا اقرار کرچکے تھے لہٰذا ان کی باقی ماندہ زندگی تو جیل کی بلند و بالا پتھریلی دیواروں کے پیچھے گزرنا تھی۔ حیدر علی اور چودھری آفتاب کو بھی شریکِ جرم اور اس خطرناک سازش کا حصہ ہونے کے جرم میں اور کہیں نہیں بلکہ سیدھا جیل ہی جانا تھا۔

جب میں ان چاروں مجرموں کو عدالت میں پیش کرنے لے جارہا تھا تو میں نے دیکھا، حیدر علی کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ یہ اشکِ ندامت تھے لیکن اب اظہارِ ندامت کا وقت گزر چکا تھا۔ وقت گزر جانے کے بعد ہر قسم کا پچھتاوا اور پشیمانی بے معنی ہوکر رہ جاتے ہیں۔ ریشماں کو ناصر نہ مل سکا اور حیدر علی کو ریشماں حاصل نہ ہوئی۔

(تحریر: حُسام بٹ)



ریگِ ساحل

ڈاکٹر شیر شاہ سید

امید کے دیے روشن رکھنے کے لیے انسان کو کس قدر تیز ہواؤں کا سامنا اور طوفانوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ زیرِنظر تحریر پڑھ کر ہوگا بالخصوص جب... تمام کاوشیں بیکار اور ہر دکھ بے ثمر ٹھہرے اور بھڑکتے بھڑکتے جلتے چراغ یکدم دھواں دھواں ہوجائیں تو ہر سو اندھیروں کا راج ہوجاتا ہے... ایسے میں ٹھوکر لگ ہی جاتی ہے۔

کانپتے ہاتھوں سے آبگینہ سنبھالنے والی دکھوں کی ماری ایک ماں کی کتھا

اس کے دو بچے پہلے ہی مرچکے تھے، پیدا ہونے سے قبل... ایک حمل کے اٹھارویں ہفتے میں اور دوسرا بائیسویں ہفتے میں۔ ”نہ جانے ہماری قسمت میں کیا ہے۔“ اس نے تقریباً روہانسا ہوکر کہا تھا۔ ”ڈاکٹر صاحب جو بھی علاج ممکن ہوسکے، کیجیے گا۔ میں بڑی امیدیں لے کر آیا ہوں۔ مجھے آپ کے دوست رفیق نے بھیجا ہے۔“

اسے رفیق نے ہی بھیجا تھا۔ رفیق کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن کے محکمۂ مالیات میں کام کرتا تھا اور وہ کے ایم

سی میں ہی چپراسی تھا۔ اس نے رفیق کو بتایا تھا کہ دو دفعہ اس کی بیوی کو حمل ٹھہرا اور اچھا خاصا وقت گزر گیا مگر پانچویں چھٹے مہینے میں بچے ضائع ہو گئے۔ اب پھر سے اس کی بیوی کو حمل ٹھہر گیا ہے اور آنے والے وقت کے خوف سے وہ پریشان تھا۔ رفیق نے اسے اپنا کارڈ دے کر میرے پاس بھیج دیا تھا۔

وہ دونوں میاں بیوی میرے پاس ساتھ ہی آئے تھے۔ وہ ڈھائی ماہ کے حمل سے تھی اور پریشانی اس کے چہرے سے صاف عیاں تھی اور ایسی صورتِ حال میں مریضوں کا پریشان ہونا کوئی غیر معمولی بات تھی بھی نہیں۔ میں نے انہیں تسلی دی۔ سمجھایا کہ انہیں اب میرے پاس ہر دو ہفتے بعد آنا ہوگا۔ جب حمل کو چودہ ہفتے گزر جائیں گے تو پھر فیصلہ کریں گے کہ کیا کرنا ہے۔

اس نے بتایا کہ وہ دوسرے ڈاکٹر کے پاس بھی گئے تھے اور ان ڈاکٹر صاحب نے کچھ گولیاں اور انجکشن لگانے کو کہا تھا۔ وہ انجکشن بہت مہنگے تھے مگر پھر بھی ان لوگوں نے دو انجکشن لگوائے تھے۔

ایسے مریض کو سمجھانا بہت مشکل ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر حمل کے اولین زمانے میں کسی بھی قسم کی کوئی بھی دوا نہیں کھانی چاہیے یہاں تک وٹامن اور آئرن کی گولیوں کی بھی ضرورت نہیں ہے اور ہوتا یہ ہے کہ اس قسم کے مریض دواؤں اور دعاؤں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ہر قسم کے پیر، فقیر، دعا کرنے والی مائیاں، تعویذ لکھنے والے بابے، پانی پھونک کر دینے والے مولوی صاحب اور محلے کی نام نہاد دائیاں جو ہر قسم کے زنانے امراض کا علاج کرتی ہیں، کے پاس یہ لوگ اپنے علاج کے لیے شوق سے جاتے ہیں۔

میرے پاس آنے سے پہلے یہ لوگ بھی ایسی جگہوں پر گئے تھے۔ زمان کی ماں کا خیال تھا کہ اس کی بہو پر کسی قسم کا سایہ ہے جو حمل ضائع کرادیتا ہے۔

میرے پاس آنے سے قبل جس ڈاکٹر صاحب کے پاس یہ لوگ گئے تھے انہوں نے بھی بجائے مریض کو یہ باتیں سمجھانے کے الٹا مہنگی دوائیں لکھ دی تھیں جن کی فی الحال کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے دونوں کو سمجھایا کہ اب مزید دوائیں کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان دواؤں کے کھانے سے دوا بنانے والی کمپنی کے علاوہ کسی کا بھی فائدہ نہیں ہے۔ میرے خیال میں تو تعویذ، پانی والے بابے کا پانی اور روحانی علاج سب ہی بے کار تھا، مگر مریض کو یہ بتانا اس سے بھی زیادہ بے کار ہے۔

وہ لوگ دو ہفتے بعد پھر آئے تھے، ویسے ہی پریشان۔ میں نے ان کا خود اپنی مشین پر الٹرا ساؤنڈ کیا۔ بچے کا دل بن چکا تھا اور وہ اوپر نیچے جھکولے لے لے کر دھڑک رہا ہے۔ میرے خیال میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا اور یہی امید کی جاتی تھی کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی ہوگا۔ میں نے پہلی دفعہ اس لڑکی کے چہرے پر اطمینان کا ایک سایہ سا پڑتا دیکھا۔ ایسا لگا جیسے وہ سوچ رہی ہے کہ اس کی شادی بچ گئی ہے۔ زندگی بچ گئی ہے۔ اسے سب کچھ مل گیا ہے۔

جاتے جاتے زمان نے بڑی عقیدت سے میرا ہاتھ پکڑا۔۔۔ اس کا بس چلتا تو شاید وہ چوم بھی لیتا۔ میں نے اب ان دونوں کو چار ہفتے کے بعد بلایا تھا۔

چار ہفتوں کے بعد وہ لوگ پھر آئے تھے۔ میرا کلینک بھرا ہوا تھا، مریضوں کے اژدحام میں، میں پھنسا ہوا تھا۔ ان کی باری آنے پر میں نے انہیں دیکھا، بہ ظاہر ہر بات درست تھی۔ اس کا وزن بھی بڑھا ہوا تھا۔ بلڈ پریشر بھی ٹھیک تھا اور خون، پیشاب کے ٹیسٹ میں بھی کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی کہ پریشان ہوا جاتا۔ میں نے دوبارہ الٹرا ساؤنڈ کیا تھا جس میں مجھے احساس ہوا تھا کہ بچہ دانی کا منہ جس کو سختی کے ساتھ بند ہونا چاہیے وہ اتنی سختی سے بند نہیں تھا۔ الٹرا ساؤنڈ سے ہی مجھے پتا لگ گیا تھا کہ ہونے والا بچہ لڑکا ہے۔

پہلی والی بات ذرا بری خبر تھی۔ سولہویں سترھویں ہفتے میں بچے کی ایسی صورتِ حال مناسب نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جب بچے کا وزن بڑھے گا تو اس کے بوجھ سے اس کا منہ مزید کھل جائے گا جس کا نتیجہ وقت سے پہلے پیدا ہونے کی صورت میں نکلے گا اور بچہ نہیں بچ سکے گا۔

دوسری بری خبر یہ تھی کہ ہونے والا بچہ لڑکا تھا۔ لڑکیاں سخت جان ہوتی ہیں خاص طور پر اگر نوزائیدہ ہوں اور وقت سے پہلے پیدا ہونے والے بچوں میں لڑکیوں کے بچنے کی زیادہ امید ہوتی ہے۔ وہ زمانے کے سرد و گرم سہنے کو تیار ہوتی ہیں۔ بہ ظاہر نرم و نازک مگر حقیقت میں مضبوط، برداشت کرنے کو تیار۔ لڑکے اور خاص طور پر یہ نوزائیدہ اور بچے تو بہت کمزور ہوتے ہیں۔ میرے لیے پریشانیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔

میں نے دونوں کو سمجھایا تھا کہ کیا مسئلہ ہے اور صابرہ سے میں نے کہا کہ ہفتے کے دن اسے آنا ہوگا تاکہ آپریشن تھیٹر میں اسے بے ہوش کرکے اندر ٹانکے لگا دیے جائیں اور اگر منہ کھلنے والا ہو تو نہ کھلے۔ وہ دونوں پریشان

ہوگئے۔ بات تو پریشانی ہی کی تھی۔

جاپان، آسٹریلیا، یورپ اور امریکا میں تو چھبیس اور اٹھائیس ہفتوں کے بچے بھی بچ جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بڑا مسئلہ ہے۔ سوائے چند ایک پرائیویٹ اسپتالوں کے، ان کچے بچوں کا کہیں اور علاج نہیں ہوسکتا ہے۔

ہفتے کے دن صابرہ اسپتال میں داخل ہوگئی، خاندان کے بیس پچیس آدمی ساتھ تھے۔ کوئی آیت کریمہ پڑھ رہا تھا، کوئی پنج سورہ لیے بیٹھا تھا۔ دس منٹ کا آپریشن تھا۔ وہ اسپتال میں دو دن رہنے کے بعد گھر چلی گئی تھی۔

دو ہفتے کے بعد وہ دونوں پھر آئے تھے۔ صابرہ نے بتایا تھا کہ بچے کی حرکت اسے محسوس ہونے لگی ہے، نہ کوئی درد اٹھ رہا ہے اور نہ کوئی خون گیا ہے۔ وہ دونوں اچھے موڈ میں تھے اور ان کے حوصلے بلند تھے۔ صابرہ کی ہر چیز ٹھیک تھی۔ میں نے دونوں کو تسلی دی تھی کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے صرف انتظار کریں۔ میں نے دیکھا کہ دونوں میاں بیوی نے ایک طرح کی انگوٹھی پہنی ہوئی تھی۔ یہ کیا ہے، میں نے پوچھا تھا۔

”یہ ہمارے ایک جاننے والوں نے ایک پٹھان سے لیا ہے، بہت خاص پتھر ہے۔ یہ خاص طور پر ہمارے لیے بنوایا ہے۔“ زمان کی انگوٹھی میں سفید پتھر تھا اور صابرہ کی انگوٹھی میں ہرے رنگ کا ذرا بڑا سا پتھر تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ پتھر نیچے سے ہر وقت جسم کو چھوتا رہتا ہے اور بچے کو جانے والا خون بھی اس پتھر کو چھوتا ہوا جاتا ہے۔ بنانے والے نے بتایا تھا کہ اس کا اثر بچے پر پڑے گا اور بچہ وقت پر ہی پیدا ہوگا۔

مجھے پتا تھا کہ ان بے جان پتھروں سے کچھ نہیں ہوتا مگر مریض کی ذہنی تسلی سے کبھی کبھی جسمانی تکلیف بھی ختم ہوجاتی ہے، یہ سوچ کر میں نے کچھ نہیں کہا۔۔۔۔ دنیا جب سے بنی ہے انسان بے جان پتھروں کو ہی مالک و مختار سمجھتا رہا ہے۔

وہ دونوں پڑھے لکھے نہیں تھے۔ زمان اسکول سے بھاگ گیا تھا۔ باپ کی سبزی کی دکان پر بھی نہیں بیٹھا تھا۔ اسے کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن میں کام کرنے کا شوق تھا۔ کوئی سرکاری کام مل جائے۔ اسے سبزی کی دکان پر نہیں بیٹھنا تھا۔ اسے آفس میں کام کرنا تھا، چاہے چپراسی ہی کیوں نہ بننا پڑے۔ ایک سال کی تنخواہ رشوت میں دے کر سفارش کے بعد اسے کے ایم سی کی نوکری مل گئی تھی اور وہ اسی میں خوش تھا۔ کے ایم سی میں کام ہی کیا تھا۔ کچھ کام، کچھ

یونین بازی، دن بھر پان کھانا اور شام کو گھر آجانا مگر وہ گھر کا بڑا تھا۔ سارے گھر کی نظر اس پر تھی اور پڑھا لکھا نہ ہونے کے باوجود اچھی بات یہ تھی کہ وہ دونوں میری بات پر آنکھ بند کرکے عمل کرتے تھے۔ ہمیشہ کلینک بھی آتے رہتے تھے۔ موسم کیسا بھی ہو، چاہے شہر میں بسوں کی بندش ہو یا پہیہ جام ہڑتال ہو، ہر دوسرے دن وہ آجاتے تھے۔ اس نے رفیق کے کارڈ کو پلاسٹک کروالیا تھا اور ہر بار مجھے رفیق کا سلام ضرور کہتا تھا۔

اٹھائیسویں ہفتے تک سب کچھ ٹھیک تھا، وہ دونوں دو دن پہلے مجھے دکھا کر گئے تھے۔ ہر چیز ٹھیک تھی، صابرہ کا وزن، بلڈ پریشر، بچے کی حرکت مگر اس روز صبح وہ چیخ مار کر بیٹھ گئی تھی۔ کپڑے شرابور تھے مگر اسے کوئی درد نہیں ہورہا تھا۔ ٹیکسی میں بٹھا کر وہ لوگ اسے اسپتال لائے تھے۔

جو خطرہ تھا، وہی ہوا تھا۔ بچہ وقت سے پہلے دنیا میں آنے کی تیاری کررہا تھا۔ میں نے اسے داخل کرلیا اور انہیں بتایا کہ صابرہ کو دوائیں دی جارہی ہیں کہ درد نہ شروع ہوں ورنہ ایسے بچوں کو انتہائی نگہداشت کے کمرے میں رکھنا پڑتا ہے تاکہ بچے کو مناسب طریقے سے گرم رکھا جاسکے۔ اس کو سانس لینے میں جو مشکل ہوتی ہے اس کے لیے مشین سے سانس لینے کا انتظام ہوسکے۔ ہمارے اسپتال میں یہ انتظام نہیں ہے، نہ میرے پاس انتہائی نگہداشت کا کمرا ہے، نہ ہی سانس کی مشین اور نہ ہی ایسے بچوں کو دیکھنے والی تربیت یافتہ نرس۔ بچے کے پیدا ہونے کے بعد ہی اس سلسلے میں جو کچھ ہوگا وہ کرنے کی کوشش کروں گا، میں نے تسلی دی تھی۔

ان لوگوں کی تمام تر دعاؤں، تعویذوں، طرح طرح کے پتھروں، پھونکے ہوئے پانی پلانے اور میری دواؤں کے باوجود دوسرے دن صابرہ کے درد شروع ہوگئے اور چار گھنٹے کے اندر اندر ایک چھوٹا سا بچہ پیدا ہوگیا۔ بچوں کے ڈاکٹر نے دیکھا اور کہا کہ بچے کو سانس لینے کی مشین کی ضرورت پڑے گی۔

میں نے زمان کو صورتِ حال سمجھائی آغا خان اسپتال اور حبیب میڈیکل سینٹر میں یہ سہولت موجود تھی۔ مگر تقریباً پانچ ہزار روپے کا خرچہ تھا۔ میں نے بچوں کے سرکاری اسپتال میں فون کیا تو ان لوگوں نے بتایا کہ ان کے پاس دو ہی مشینیں ہیں اور ان دونوں پر پہلے سے بچے موجود ہیں اگر وہ صحیح ہوگئے تو پھر زمان کے بچے کے لیے جگہ ہوسکتی ہے، ساتھ ہی وہاں کی ڈاکٹر نے یہ بھی بتایا تھا کہ فی الحال ان بچوں کو ڈسچارج نہیں کیا جائے گا۔

سول اسپتال کے بچوں کے وارڈ سے بھی جواب مل گیا تھا۔ ان کے پاس خالی مشین تو تھی مگر مشین کے ساتھ بیٹھنے والی تربیت یافتہ نرس نہیں تھی۔ پاکستان واپس آنے کے بعد شروع شروع میں میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر یہ لاکھوں کروڑوں کی مشین خریدنے کا کیا فائدہ ہے جب ان مشینوں کے ساتھ بیٹھنے والا، ان کو چلانے والا، ان کو سمجھنے والا کوئی نہیں ہوتا ہے۔ بعد میں میری سمجھ میں آگیا تھا کسی کو تربیت دینے میں کمیشن نہیں ملتا ہے، صرف تھکن ہوتی ہے اور مشینوں کو خریدنے میں کمیشن ملتا ہے۔ ہر موقع پر ہر لحظہ اور ہر ایک کو اوپر سے لے کر نیچے تک۔ سول اسپتال کی ڈاکٹر نے مجھ سے کہا تھا ہمارے یہاں بھیجنے سے کچھ بھی نہیں ہوگا ہم سے اچھا تو ماں خود دیکھ لے گی۔

میری ساری کوششیں ناکام ہورہی تھیں۔ زمان نے کہا تھا کہ اس کے بچے کو آغا خان اسپتال ہی بھیج دیں، وہ روپوں کا انتظام کرے گا۔ قرض لے گا۔ زیور بیچے گا۔

میں نے حبیب میڈیکل سینٹر فون کرکے بات کی تھی کہ اس اسپتال میں کبھی کبھی غریبوں کے نوزائیدہ بچوں کا ڈاکٹروں کی سفارش پر فری میں بھی علاج ہوجاتا تھا مگر ان کی بھی ساری مشینوں پر پہلے سے بچے موجود تھے۔ آغا خان اسپتال میں ایک مشین خالی تھی۔ میں نے اسپتال کی ایمبولینس میں اپنے اسپتال کی نرس کے ساتھ بچے کو وہاں بھیج دیا تھا۔

پھر وہی سب کچھ ہوا جو ایسے حالات میں ہوتا ہے۔ ایسے بچے کمزور ہوتے ہیں ان کے جسم میں مدافعت نہیں ہوتی، زندہ رہنے کی خواہش ہوتی ہے، وہ کوشش بھی کرتے ہیں مگر ماحول انہیں ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے، دھیرے دھیرے۔ اس بچے کو بہت کچھ ملا تھا مہنگے ترین انجکشن، پھیپھڑوں کو سنبھالنے کے لیے دوا، پھر انفیکشن سے لڑنے کے لیے مہنگی ترین اینٹی بائیوٹک دوائیں۔

زمان نے پہلے قرض لیا، پھر بیوی کے زیورات بیچے۔ بارہ دن کے علاج میں ان کے گھر کا سب کچھ ختم ہوگیا تھا۔ پھر بچے کے پھیپھڑوں سے مشین نکال لی گئی تھی۔ وہ کمزور تھا مگر اب خود سانس لے رہا تھا۔ زمان کے پاس بھی سب کچھ ختم ہوچکا تھا۔ بچے کو اب صرف نرسری کی ضرورت تھی۔ آغا خان اسپتال سے مجھے فون آیا تھا کہ میں اسے اپنے اسپتال کی نرسری میں رکھ لوں۔ تھوڑے دنوں کے بعد بچہ اس قابل ہوجائے گا کہ گھر پر ماں کے پاس رہ سکے۔

صابرہ اور زمان دونوں ایمبولینس میں بچے کے ساتھ آئے تھے۔ صابرہ کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ زمان کے بڑھے ہوئے شیو والے چہرے پر تھکن نمایاں تھی۔ کپڑوں میں ملفوف بچے کو اس نے بڑی احتیاط سے بڑے پیار سے اپنے سینے سے لگایا ہوا تھا۔

اس نے بڑے خلوص و عقیدت سے مجھ سے ہاتھ ملایا تھا۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ میں نے بچے کو بچایا ہے۔ حالانکہ بچہ تو ان مشینوں نے بچایا تھا، ان مشینوں پہ کام کرنے والی نرسوں نے ڈاکٹروں نے بچایا تھا اور ان مہنگی ترین دواؤں نے بچایا تھا۔ ان چیزوں کے لیے زمان کے خاندان نے اپنا کافی کچھ بیچ دیا تھا۔ زیور بیچ دیے تھے، قرض لیا تھا اور نہ جانے کتنی تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ راتیں جاگ جاگ کر روئے تھے اور دن اضطراب میں کاٹے تھے۔ میں نے بچے کو نرسری میں داخل کرلیا تھا۔

مجھے یاد ہے بدھ کا دن تھا، صبح تین بجے مجھے اسپتال سے فون آیا۔ نیند میں، میں نے ریسیور اٹھایا... مجھے کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا صرف گرم سیسے کی طرح الفاظ میرے کانوں میں گھسے تھے۔ بے بی زمان مرگیا ہے۔

میں جب اسپتال پہنچا تو وہ دونوں میاں بیوی باہر ہی کھڑے ہوئے تھے، بار بار ہاتھ مل رہے تھے۔ وہ بالکل ٹھیک تھا، ڈاکٹر صاحب نہ جانے کیا ہوگیا، کیسے مرگیا۔ وہ دونوں بے یقینی کی کیفیت میں کبھی مجھے دیکھ رہے تھے، کبھی نرسری کے شیشے کی دیوار کو دیکھ رہے تھے۔

بچہ بالکل ٹھیک تھا مگر رات کو کسی وجہ سے الٹی ہوئی جو نرس رات ڈیوٹی پر تھی وہ بارہ بجے کے بعد بچے کے پاس بیٹھنے کے بجائے کرسیاں جوڑ کر سوگئی تھی۔ بچے نے الٹی میں جو کچھ نکالا تھا، اسے سانس کے ساتھ پھیپھڑے میں لے لیا تھا اور آہستہ آہستہ نیلا پڑنا شروع ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر ایک اور نوزائیدہ بچے کو لے کر نرسری میں آئی تھی تو دیکھا کہ نرس سو رہی ہے اور بچہ نیلا پڑ گیا ہے۔

مجھے ایسا لگا تھا جیسے میرا دل رک جائے گا۔ ''بچہ مرا تو نہیں تھا صرف نیلا ہی پڑا تھا، تم نے اسے سنبھالا کیوں نہیں آکسیجن کیوں نہیں دی، تم تو سمجھ دار ڈاکٹر ہو۔'' میں غصے سے چیخ پڑا۔

وہ ڈاکٹر تھوڑی دیر خاموش رہی.... نظر نیچے کیے ہوئے، میں دوبارہ چیخنے والا تھا کہ وہ بولی۔ ''میں نے آکسیجن دیا تھا سر، مگر آکسیجن ختم ہوچکی تھی۔ سارے سیلنڈر خالی تھے۔''

وہ بچہ نرس کے سونے اور آکسیجن کے نہ ہونے کی وجہ سے مرگیا تھا۔ میں زمان کو کبھی بھی بچے کے مرنے کی وجہ نہیں بتاسکا۔ اس سے بات کرتے وقت میرے گلے میں جیسے پھندا پڑ گیا تھا۔ میں اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں کہہ سکا تھا کہ خدا کی مرضی تھی زمان، خدا کی مرضی تھی۔ اندر، میرے بہت اندر مجھے پتا تھا کہ خدا کی مرضی نہیں تھی لیکن اس کے علاوہ میں کچھ اور کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

وہ دونوں چھوٹے سے بچے کی نعش سینے سے لگائے روتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ میرے سامنے سے چلے گئے۔

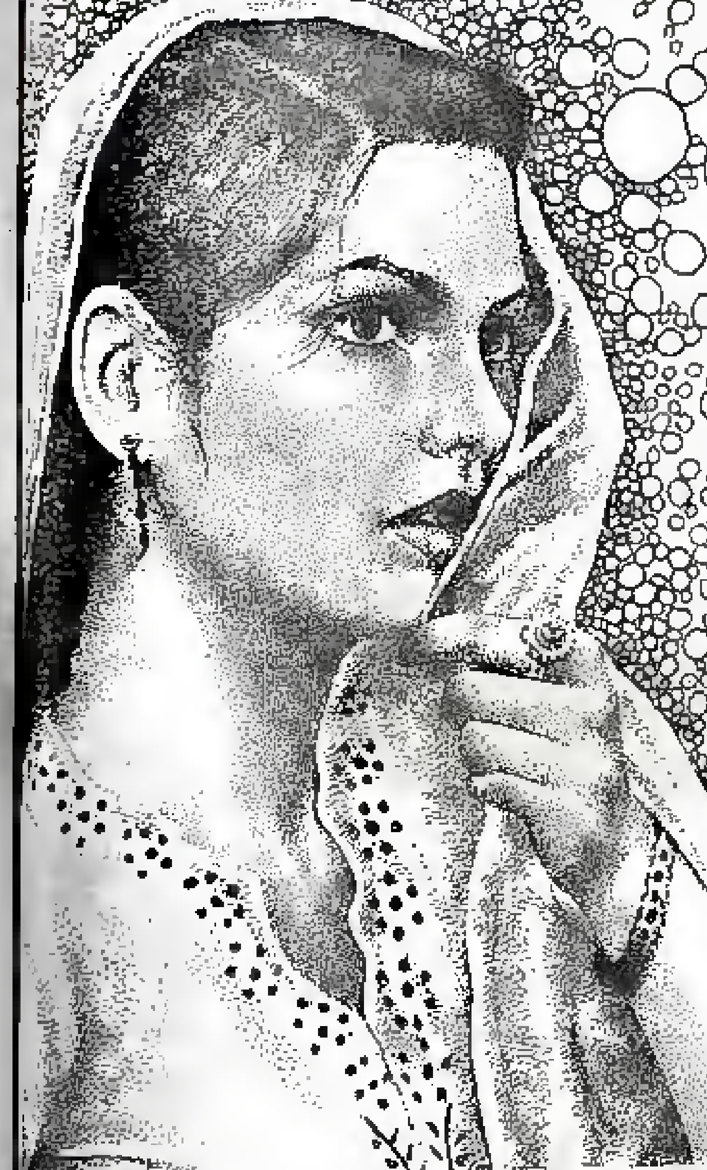
کئی ہفتوں بلکہ کئی مہینوں کے بعد ایک دن پھر مجھے بہت سویرے سویرے اسپتال جانا پڑ گیا تھا۔ میں گاڑی کھڑی کرکے نیچے اترا ہی تھا کہ سامنے بنچ پر وہ بیٹھا ہوا نظر آیا۔ صبح ہونے سے پہلے کے ہلکے ہلکے اندھیرے میں۔ میں فوراً ہی اسے پہچان گیا۔ ''تم یہاں اتنے سویرے سویرے کیسے؟ خیریت تو ہے زمان؟'' میں نے پوچھا تھا۔

اس نے مجھے اسی تشکر بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ ''آج بدھ ہے نا... اسی وقت منا یہاں مرگیا تھا، میں نے اسے اپنی گود میں اٹھایا تھا، سینے سے لگایا تھا اور اس کی لاش کو گھر لے گیا تھا۔ اس جگہ تھوڑی دیر پتھر کے اس بنچ پر میں اور صابرہ بیٹھ کر روئے تھے، پھر چلے گئے تھے یاد ہے نا... آپ کو۔ میں تو ہر بدھ کی صبح یہاں آتا ہوں، منے کو یاد کرنے۔ وہ مجھے بہت یاد آتا ہے ڈاکٹر صاحب۔ اسی پتھر کے بنچ پر بیٹھ جاتا ہوں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ آہستہ آہستہ میرے گریبان کے بٹنوں کے درمیان سے گزر کر میرے سینے کے بالوں کو دھیرے دھیرے چھیڑ رہے ہیں۔ میں اسے اٹھا کر چومتا ہوں اپنے سینے سے لگا کر بھینچتا ہوں، اپنے گالوں کو اس کے پھول جیسے نرم نرم گالوں پر رکھ لیتا ہوں۔ میرے سینے میں جیسے ٹھنڈ پڑ جاتی ہے اور دل زور زور سے دھڑکتا ہے جیسے کہہ رہا ہو میرا منا، میرا منا۔''

میں پھر سے ساکت ہوگیا تھا کسی نے میرے سر پر ہتھوڑے مارے تھے شن شن شن۔ آکسیجن، آکسیجن، آکسیجن۔ شاید مجھے بھی آکسیجن کی ضرورت تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نہ چاہتے ہوئے بے ساختہ پوچھ لیا تھا۔ ''کیوں، آخر کیوں؟''

''بہت سکون ملتا ہے مجھے یہاں پر قبرستان سے بھی زیادہ۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں میرے منے نے زندگی سے جنگ لڑتے ہوئے چند سانسیں لی تھیں...... کچھ دن جی کر مجھے نئی زندگی عطا کی تھی...... ایک جیتا جاگتا وجود میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا...... یہاں ہر چیز مجھے منے کی یاد دلاتی ہے۔ اسپتال کی دیواریں، نرسوں کی آوازیں، ڈاکٹروں کا غصہ، نرسری کی روشنی اور صبح ہونے سے پہلے کا ہلکا ہلکا سا اندھیرا۔'' اس نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ کھڑکی سے چھن چھن کر آنے والی روشنی میں اس کا چہرہ پُرسکون تھا، میرے اندر کے سیلاب سے ناآشنا۔

محفلِ شعر و سخن



❊ جبران احمد ملک......گلشن اقبال، کراچی
سر پہ سورج ہو یا ابر کا سائبان آب و دانہ کا غم
طائروں کا چلن، ہے پرانا سفر اور نئے بال و پر

❊ صوفیہ جمال......کراچی
وہ پھر ملے یہ احتمال بھی نہیں
اداس ہیں مگر ملال بھی نہیں
نہ جانے راستوں پہ کون لکھ گیا
ترا وصال اب کے سال بھی نہیں

❊ فرحان شیخ......پاک کالونی، کراچی
تمہیں بھی عشق کرنے کے ہنر آنے لگے ہیں
تو کیا اب خواب دن میں بھی نظر آنے لگے ہیں

❊ ڈاکٹر ناہید شیخ......سرگودھا
خواہش سے نہیں گرتے پھل جھولی میں
وقت کی شاخ کو میرے دوست ہلانا ہوگا
کچھ نہیں ہوگا اندھیروں کو برا کہنے سے
اپنے حصے کا دیا خود ہی جلانا ہوگا

❊ رعنا رضوی......مانچسٹر
فلک پہ نور دوامی بکھیرنے والے
زمیں کے لوگ اندھیروں میں سانس لیتے ہیں

❊ جنید نواز......اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور
دل کی تنگ گلیوں میں یوں مٹک کے چلتی ہے
یاد بھی تیری، جیسے گاؤں کی حسین لڑکی

❊ مرزا انور......شباب پکچرز، پکا بازار، میلسی
رات وہ شخص میرے خواب میں تھا
عکس جس کا ہر اک گلاب میں تھا

❊ ہارون رشید......مردان
حسرت بھری نگاہوں کو آرام تک نہیں
وہ یوں بدل گیا کہ اب سلام تک نہیں
بے اختیار اٹھتے ہیں میرے قدم اُدھر
حالانکہ اس گلی میں مجھے کام تک نہیں

❊ اشوک کمار......میر پور خاص
ذوقِ احساس میں ہوتی ہے تکلیف سراسر
اچھے رہتے ہیں وہ لوگ جو کسی کی پروا نہیں کرتے

❊ حکیم سید محمد رضا شاہ بخاری......میانوالی
خواب لفظوں میں ڈھل نہیں سکتے
کاش آنکھیں پڑھا کرے کوئی

❊ طالب حسین طلحہ......نیو سینٹرل جیل، ملتان
نہ میرے قلم سے لکھی گئی نہ میری زباں سے ادا ہوئی
جو آنکھ سے کہنے کی بات تھی وہ حروف میں نہ سمائے گی
کوئی پھول چنتا ہے کس طرح کوئی دھول ہوتا ہے کس طرح
یہ وقت وقت کی بات تمہیں زندگی ہی بتائے گی

❊ محمد اشفاق سیال......شورکوٹ سٹی
رنگ پیلا ہے تیرا کیوں ناصر
تجھے کیا رنج کھائے جاتا ہے

❊ مرزا طاہر الدین بیگ......میر پور خاص
کسی کے ایک آنسو سے ہزاروں دل دھڑکتے ہیں
کسی کا عمر بھر رونا یونہی بیکار جاتا ہے

❊ یمنیٰ احمد......کراچی
صحراؤں کا سفر ہے کیا ساتھ تم چلو گے
پُر ہول رہ گزر ہے کیا ساتھ تم چلو گے
تم کہکشاں سے اپنی آواز دو نہ مجھ کو
یہ دھوپ کا نگر ہے کیا ساتھ تم چلو گے

❊ اصغر علی......راولپنڈی
خاموشیوں میں اے دل آتی ہیں یہ صدائیں
جیسے کہ دے رہا ہو کوئی مجھے دعائیں
گو کام تو کٹھن ہے، گزریں تو اس گلی سے
جو ہم پہ چاہے بیتے، دل کو تو آزمائیں

❊ متین سلطان تنولی......کراچی
بہکا تو بہت بہکا، سنبھلا تو ولی ٹھہرا
اس خاک کے پتلے کا ہر رنگ نرالا ہے

❊ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
یارو! ہم آئینہ دل ہیں، ہم کو پتھر مت مارو!
ٹوٹتے ہیں جو کانچ کے ٹکڑے خنجر بنتے جاتے ہیں
ایک شناسائی کی خاطر خواب بنیں کیوں صدیوں کے
لمحوں کی قربت میں بھی تو دلبر بنتے جاتے ہیں

❊ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
سینے میں جلن سی ہے، اشکوں میں روانی بھی
دریاؤں کے پانی میں، کیا آگ لگائی ہے
بے نام اداسی میں دیکھے ہیں کئی چہرے
ہر چہرہ حقیقت میں پُردرد کہانی ہے

❊ مہرین ناز......حیدرآباد
اتنا لوٹا ہے گھنی چھاؤں نے اک عمر مجھے
اب تو سائے کی بشارت بھی ڈرا دیتی ہے

❊ زاہد چودھری......چھور کینٹ
خود کو دیتے ہی رہے ترکِ تعلق کا فریب
اور در پردہ کسی کو یاد بھی کرتے رہے

❊ اظہر حسین پچار......ہزاری، جتوئی
زندگی کو تیری ضرورت ہے
سخت گرمی میں بارشوں کی طرح

❊ افضل خان......پشاور
غیروں کا بھی غم رکھتے ہو تم دل میں ہمیشہ
کہنے کو تو تم میرے وفادار بہت ہو
خوش فہمی ہماری تھی کہ اپنا انہیں سمجھا
ہم سے جو یہ کہتے تھے سمجھدار بہت ہو

❊ محمد اعجاز......لاہور
ہوائے ترکِ تعلق چلی ہے دھیان رہے
مگر یہ بات ہمارے ہی درمیان رہے
گلہ تجھی سے نہیں بام و در کی ویرانی
کھلی فضا میں بھی ہم لوگ بے امان رہے

❊ محمد نعمان ندیم......صدر، کراچی
سمندروں سے زمینوں کا رزق آنے تک
یہ دھوپ میری ہے اور سائبان تیرا ہے
عذاب دربدری ہے کہ ہجرت مہ وسال
کہ خواب اور کسی کے ہیں دھیان تیرا ہے

❊ محمد بشارت......ننگر دودرہ
یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

❊ ادریس احمد خان......ناظم آباد، کراچی
فلک دیتا ہے جن کو عیش ان کو غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

❊ محمد رشید سیال......روہڑی
خوشیوں کا دور بھی آجائے گا
غم بھی تو مل گئے تھے تمنا کیے بغیر

❊ حبیبہ ساجد......کراچی
رم جھم رم جھم شامیں برسیں ساون رُت لہرائے
خوشبو پیچ پتنگ باندھیں اور ڈور الجھتی جائے
یاد رو پہلی کرنیں سورج رتھ سے ایسے اتریں
میں آگے بڑھ جاؤں سایا رستے میں رہ جائے

❊ ایم افضل کھرل......تحصیل و ضلع ننکانہ صاحب
درد دینا تھا تو کسی اور طرح سے دیتے
زندگی بن کر زندگی ہی چھین لی تم نے

❊ راجہ افتخار علی انی......چوآسیدن شاہ، سوہڑہ
بہت برا ہے مگر تم سے اچھا ہے
یہ دل کا درد میرے ساتھ تو رہتا ہے

❁ لبلیٰ......کراچی
خشک ہونٹوں سے ہوا کرتی ہیں میٹھی باتیں
پیاس بجھ جائے تو لہجے بھی بدل جاتے ہیں

❁ عثمان انصاری......نیو سینٹرل جیل ملتان
چاہت، فکر عشق ومحبت اور وفا
میری اپنی عادتوں نے میرا تماشا بنا دیا

❁ نصرت، فرحت، رفعت......فیصل آباد
تم اپنے جذبات مجھے سونپ کر تو دیکھو
ہر شخص امانت میں خیانت نہیں کرتا

❁ محمد اشرف تبسم، محمد حنیف آصف......بحریہ ٹاؤن، پنڈی
آنسوؤں کی زکوٰۃ مجھ پہ ہی فرض کیوں؟
سچ تو وہ بھی ادا کرے محبت اسے بھی تھی

❁ محمد ارشد......فشریز محکمہ، پیرووال
نغمۂ موج سے اے دوست صدا آتی ہے
زندگی نام ہے اٹھتے ہوئے طوفانوں کا

❁ سید اکبر شاہ......اوگی، مانسہرہ
مزہ برسات کا چاہو تو ان آنکھوں میں آ بیٹھو
وہ برسوں میں کہیں برسے، یہ برسوں سے برستی ہیں

❁ اعجاز احمد راحیل......ماہی، ساہیوال
بوتل میں مے، مے میں نشہ، میں نشے میں ہوں
کہ عشق میں غم، غم میں مزہ میں مزے میں ہوں

❁ ریاض بٹ......حسن ابدال
تیری چپ چاپ نگاہوں کو سلگتے پاکر
میری بے زار طبیعت کو بھی پیار آہی گیا

❁ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان......فورٹ عباس
دل کے بند کواڑوں پہ یوں دستکیں نہ دو
وہ کسی اور کا ہو چکا ہے اسے تم بھی بھول جاؤ

❁ زاہد احمد خانداد......ناگن چورنگی، کراچی
تم سادہ مزاجی سے مٹے جاتے ہو جس پر
وہ شخص تو دنیا میں کسی کا بھی نہیں ہے

❁ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن، خانیوال
اس کی تلاش میں نکلوں بھی تو کہاں جاؤں؟
وہ بدل گیا ہے کہیں کھویا تو نہیں ہے

❁ محمد جاوید......تحصیل علی پور
پھر کہاں کا حساب رہتا ہے
محبت جب بے حساب ہوجائے

❁ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ......خانیوال
آج مزاج اچھا ہے ہمارا صفی!
ستم کوئی کرنا ہے تو لوٹ آؤ

❁ محمد یونس پروانہ......حیدرآباد تھل، ضلع بھکر
پھر کوئی نیا دکھ ملے گا شاید!
آج بہت مہربان ہے مجھ پہ وہ ستم گر

❁ محمد حنیف ساحل......خانیوال
کچھ تو بدلا ہے جاناں
میں، دنیا یا پھر تم

❁ رمضان پاشا......گلشن اقبال، کراچی
وہ عطر دان سا لہجہ مرے بزرگوں کا
رچی بسی ہوئی اردو زبان کی خوشبو

❁ بشیر احمد بھٹی......فوجی بستی، بہاولپور
کاغذ کے کچھ ٹکڑوں پر ہیں ان کے تحفے میرے پاس
لیکن سچ کا رنگ نہ پایا ان جھوٹی تحریروں میں

❁ احسان سحر......میانوالی
کبھی سایہ بن کر چلتے ہو، کبھی دھوپ کی صورت جلتے ہو
گر جیتنا چاہو دل میرا، تو روپ نرالا بن جاؤ

❁ محمد صفدر قریشی......فیصل آباد
اہل غرض کی اس دنیا میں شام سے پہلے پنچھی کا
چونچ میں دانا داب کے لانا اچھا لگتا ہے

❁ محمد اقبال......کورنگی، کراچی
اک دستک کی رِم جھم نے اندیشوں کے در کھول دیے
رات اگر ہم سو جاتے تو سپنا دیکھنے والے تھے

محفلِ شعر و سخن

کوپن برائے شمارہ ستمبر 2014

نام:..................................

پتا:..................................

مانوس اجنبی

سلیم انور

چہروں پر لکھی تحریریں بعض اوقات فریب میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ وہ بھی دھوکا کھا گئی تھی... زخموں سے رسنے والا خون کسی قاتل کو بھی قابلِ رحم بنا دیتا ہے... اور اس کا نرم دل تو ویسے بھی دل بند کرنے کے سامان کر بیٹھا تھا کہ ایسے میں... اچانک دل کے دروازے پر دستک ہوئی اور اسے نہ چاہتے ہوئے بھی اس اجنبی کے لیے دروازہ کھولنا پڑا جو اسے مانوس لگ رہا تھا۔



ایک خونی معرکہ......ایک انا اور دو پیار کی کھلی تفسیر

ڈورس دروازے پر دستک کی آواز سن کر جلا گئی لیکن اس نے اپنا جملہ مکمل کرنے سے پہلے کمپیوٹر سے اٹھنے کی زحمت نہیں کی۔ اسے نہ تو کسی کی آمد کی توقع تھی اور نہ ہی وہ چاہتی تھی کہ کوئی اسے ڈسٹرب کرے۔ اسی وجہ سے اس نے میٹنگ کے چھوٹے سے قصبے سے پندرہ میل کی دوری پر یہ الگ تھلگ کیبن کرائے پر لے لیا تھا۔ یہ کیبن ایک سونی سڑک پر واقع تھا جہاں سے بہت کم گاڑیاں گزرتی تھیں اور کوئی وہاں ٹھہرنا گوارا نہیں کرتا تھا۔

وہ تین ہفتہ قبل اور تدفین کے عین بعد سیوکس فالز سے روانہ ہوئی تھی۔ اس نے اپنی کار میں اپنے شوہر کے تیار کردہ نوٹس کے انبار کے انبار بھر دیے تھے۔ یہ ایک قدرتی امر تھا کہ وہ اس قصبے میں واپس جارہی تھی جسے وہ اور جم بہتر طور پر جانتے تھے۔ یہ قصبہ پائن رج رزرویشن کے کنارے پر واقع تھا۔ جم نے اپنے کام کا آغاز یہیں سے کیا تھا اور یہیں پر ڈورس کو وہ تنہائی مل سکتی تھی کہ وہ اپنے آنجہانی شوہر کے کام کو تکمیل تک پہنچا سکے۔ وہ اس کتاب کو خود مکمل کرنا چاہتی تھی جو اس کا شوہر لکھ رہا تھا۔ امریکن انڈین کلچر پر اس کے اس بے کراں اور غیر معمولی مطالعے کو کتابی شکل دینا ہی ڈورس کا مشن تھا۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہوتا جو جم کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھتا۔ ڈورس نے جم کے پیغام کو بہ خوبی سمجھا تھا اور وہ اس کی کتاب کو حقیقی شکل دینے اور بامعنی بنانے کی بھرپور صلاحیت رکھتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اسے کتاب کو فوری طور پر شائع کروانا ہوگا کیونکہ نوجوان پروفیسر جم کی یاد اس کے ساتھیوں کے ذہنوں میں بدستور تازہ تھی۔

دستک اب بلند ہوگئی جیسے کوئی دروازے پر گھونسے ماررہا ہو۔ خیالوں سے حقیقت کی دنیا میں آتے ہی ڈورس کو حسبِ عادت سر درد کا احساس ہونے لگا جو کمپیوٹر پر گھنٹوں بیٹھے رہنے کے سبب ہوا کرتا تھا۔

شاید کوئی بھولا بھٹکا مسافر ہوگا جو فون استعمال کرنا چاہتا ہو۔ ڈورس نے سوچا۔ اس وقت تقریباً نصف شب ہورہی تھی۔ ڈورس کو قطعی حیرانی نہیں ہوئی۔ کام میں مگن رہنے سے اکثر وقت کا احساس نہیں ہو پاتا تھا۔ اس نے پورچ کی لائٹ کا سوئچ آن کردیا اور دروازے پر پڑے گہرے رنگ کے بھاری پردے کو قدرے سرکاتے ہوئے شیشے سے باہر کی طرف دیکھا۔

شیشے کی دوسری جانب سے جو آنکھیں اسے گھور رہی تھیں، وہ ہیجان میں مبتلا اور تیر کی طرح کاٹ دینے والی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ ایک آدمی تھا جو خون میں نہایا ہوا تھا۔ اس کے سر پر ایک گہرا گھاؤ دکھائی دے رہا تھا جس سے خون اس کے خاکستری بالوں سے بہتا ہوا اس کی سفید قمیص کو تربتر کررہا تھا۔ اس شخص نے اپنا بڑا سا ہاتھ عاجزانہ انداز میں اوپر اٹھایا تو شیشے پر خون کے دھبے پڑ گئے۔

"مائی گاڈ۔"

ڈورس نے دروازے کی چٹخنی پر سے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا جسے وہ کھولنے جارہی تھی۔ وہ سٹ کر فون کی جانب چلی گئی۔ اسے علم تھا کہ مینگ کے قصبے کا شیرف پندرہ سے بیس منٹ میں یہاں پہنچ جائے گا۔ وہ جب سے اس کیبن میں آئی تھی تو نہ کسی نے اسے فون کیا تھا اور نہ ہی اس نے کسی سے فون پر کوئی رابطہ کیا تھا۔ اس نے ریسیور کو مضبوطی کے ساتھ اپنے کان سے لگایا تو وہ بے جان تھا۔ کیا فون صحیح کام کررہا تھا؟ اس نے ڈائل ٹون لانے کے لیے بار بار کوشش کی لیکن فون میں بھی وہی سکوت سنائی دے رہا تھا جو اس کے کیبن میں چھایا ہوا تھا۔

دروازے پر ضربیں دوبارہ پڑنے لگیں۔ گھونسوں کی متذبذب ضربات اسے بے جان فون سے زیادہ خوف زدہ کررہی تھیں۔ ڈورس محتاط قدموں سے دروازے کی جانب بڑھی اور دوبارہ باہر کی طرف جھانکا۔

"تم......" وہ شخص ڈورس پر نگاہ پڑتے ہی ہانپتے ہوئے بولا۔ "تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔"

جب ڈورس نے پہلی نگاہ میں اس زخمی شخص کو دیکھا تھا تو اس کے مقابلے میں اب وہ کہیں زیادہ کمزور نظر آرہا تھا۔ اگر یہ شخص مرگیا اور میں نے اس کی مدد کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تو پھر؟ ڈورس سوچنے لگی، وہ چاہے اس معاملے میں کچھ بھی محسوس کررہی ہو، وہ چاہے جتنی بھی خوف زدہ کیوں نہ ہو، اسے دروازہ لازمی کھول دینا چاہیے۔ اسے اس زخمی شخص کو اندر لے آنا چاہیے۔ اس کے بہتے ہوئے خون کو روکنے کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ اگر خون کا بہنا بند نہیں کیا گیا تو جلد ہی اس شخص کی موت واقع ہوجائے گی۔

ڈورس نے دروازے کا تالا کھولتے ہوئے چٹخنی گرادی اور ہاتھ بڑھا کر اسے سہارا دینے لگی۔ دروازے میں قدم رکھتے ہی وہ زخمی شخص لڑکھڑا گیا اور ڈورس کی اسے پکڑنے کی تمام تر کوششوں کے باوجود وہ نیچے گر پڑا۔

ڈورس اس شخص کے چوڑے جھکے شانوں، گھنے بالوں، سانولی رنگت اور اس کے خون کو تکنے لگی جو قالین میں جذب ہورہا تھا۔ پھر جوں ہی ڈورس نے اس شخص کو پلٹ کر سیدھا کیا، اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ان آنکھوں کی رنگت ...گہرے رنگ کی تھی۔ ان آنکھوں میں تکلیف کے آثار نمایاں دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بار بار پلکیں جھپکا رہا تھا اور آنکھیں بند کررہا تھا۔

اس شخص نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی آواز دبی دبی اور الفاظ بے ربط تھے۔ وہ ان الفاظ کو بار بار دہرا رہا تھا جیسے کسی قسم کی وارننگ دینا چاہ رہا ہو۔ ڈورس نے جھک کر اپنے کان اس شخص کے منہ کے پاس کردیے تاکہ ان الفاظ کو سمجھنے کی کوشش کرسکے۔

"تم......تم......دروازے کو لاک کردو۔" وہ کہنا چاہ رہا تھا۔

ڈورس یہ سنتے ہی نروس زدہ انداز میں گھومی اور لپک کر دروازہ بند کرتے ہوئے اس کا تالا بھی دبا دیا پھر واپس اس زخمی شخص کی جانب پلٹ کر بولی۔ "باہر کون ہے؟" اس مرتبہ ڈورس کی آواز بھی اس شخص کی طرح گھٹی گھٹی سی تھی۔

ڈورس کے لیے اس شخص کے جواب کو سمجھنا ناممکن تھا۔ کسی بچے کی طرح اس شخص نے اپنا لرزتا ہاتھ ڈورس کی جانب بڑھا دیا۔ اس کوشش نے جیسے اس کی طاقت سلب کرلی۔ اس کا ہاتھ نیچے گرتے ہی اس کی آنکھیں بھی بند ہوگئیں۔

ڈورس تولیا لینے کے لیے باتھ روم کی جانب لپکی پھر محتاط طریقے سے اس کے چہرے پر سے خون صاف کرنے لگی۔ اس زخمی شخص کے چوڑے چہرے پر ہلکی سی ڈاڑھی کے آثار نمایاں ہوگئے۔ ٹھنڈے پانی نے اس شخص کی توانائی عارضی طور پر بحال کردی۔ وہ ٹھہرے ٹھہرے سانس لینے لگا۔

"میں اپنی گاڑی کا ٹائر تبدیل کرنے کے لیے رک گیا تھا۔" اس نے کہنا شروع کیا۔ "جب اس شخص نے اپنی کارروکی تو میں سمجھا کہ وہ میری مدد کرنا چاہتا ہے۔ اس نے ٹائر آئرن سے میرے سر پر وار کردیا۔" پھر اس شخص کے حلق سے قلقل کی سی آواز نکلنے لگی۔ قدرے توقف کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔ "میری بیوی نے چلانا شروع کردیا۔ اس نے میری نظروں کے سامنے اس پر بھی حملہ کردیا اور اسے مار ڈالا۔"

"کیا وہ مرچکی ہے کیا تمہیں یقین ہے؟" ڈورس نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس کی آواز ایک کراہ کی طرح نکلی۔

"تم کس طرح بچ کر نکل آئے؟" ڈورس نے اسے جواب دینے کا موقع نہیں دیا۔ "کیا اس نے تمہارا تعاقب کیا ہے؟"

"میں پیدل بھاگ پڑا تھا۔ یہاں اطراف میں بس یہی ایک مکان ہے۔ یہ بات اسے بھی معلوم ہے۔ وہ مجھے مار ڈالے گا۔" یہ کہتے ہوئے اس زخمی شخص کی آواز درد کی شدت سے کانپنے لگی۔ "میں اس شخص کو شناخت کرسکتا ہوں......"

"بہتر ہوگا کہ تم بات کرنے کی کوشش نہ کرو۔"

"جینٹ مرچکی ہے۔" وہ زخمی شخص شدتِ جذبات سے مغلوب ہوکر ڈورس سے چمٹ گیا اور مایوسی سے سسکیاں لینے لگا۔ ساتھ ہی اس کے جسم پر کپکپی بھی طاری ہوگئی۔

اچھی باتیں

☆ ایسے لوگوں میں سے نہ ہونا جو دوسروں کے گناہوں کے بارے میں فکرمند ہوں اور اپنے گناہوں سے غافل رہتے ہوں۔ (حضرت امام حسینؓ)

☆ نہ گورا رنگ حسن کی علامت ہے اور نہ ہی کالا رنگ بدصورتی کی علامت۔ حسن صرف دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے، رنگوں میں نہیں کیونکہ کفن سفید ہوکر بھی خوف کی علامت ہے اور کعبہ کالے غلاف میں بھی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ سبحان اللہ

☆ انسان خود قابلِ اعتبار نہیں ہوتا بلکہ اس کا کردار اور اس کی سچائی اسے قابلِ اعتبار بناتی ہے۔

☆ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ تم پانی جیسا بنو جو اپنا راستہ خود بناتا ہے پتھر جیسے نہ بنو جو دوسروں کا راستہ بھی روک لیتے ہیں۔

نیکی

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آج کل نیکی کا زمانہ نہیں، تو وہ لوگ انسان سے نیکی کا بدلہ چاہتے ہیں اور جو لوگ اللہ پاک کے سوا کسی اور سے نیکی کے اجر کی توقع رکھتے ہیں تو ان کے لیے ہر زمانہ نیکی کا زمانہ نہیں۔ اس لیے نیکی انسان سے کرو، اس کا صلہ اللہ پاک دے گا۔

حیرت انگیز

☆ ایک لقمہ 7 سیکنڈ بعد پیٹ میں پہنچتا ہے۔

☆ انسانی بال 3 کلو تک وزن اٹھا سکتے ہیں۔

☆ ہر انسان کی ناک کی لمبائی اس کے ہاتھ کے انگوٹھے برابر ہوتی ہے، بعد میں ناپنا پلیز۔

☆ عورتیں مردوں کی نسبت زیادہ پلکیں جھپکاتی ہیں۔

☆ ناپ لو جی اپنی ناک انفارمیشن کی ایسی تیسی پہلے اپنی ناک ناپ لو۔

بڑا جھوٹ

کچھ دوستوں میں سب سے بڑا جھوٹ بولنے کا مقابلہ ہورہا تھا اور جس نے یہ مقابلہ جیتا۔ اس کا جھوٹ ملاحظہ فرمایئے۔ "میں نے دیکھا کہ ایک جگہ بہت سی خواتین جمع ہیں، لیکن وہ بالکل خاموش ہیں۔"

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

"جو ہونا تھا سو ہوگیا۔" ڈورس اسے دلاسا دینے لگی۔"اب تمہیں حوصلہ کرنا ہوگا۔جیت تم سے یہی توقع رکھتی ہوگی۔" وہ نرم لہجے میں اس سے باتیں کررہی تھی۔ اس کے الفاظ تسلی آمیز تھے لیکن ان میں حقیقت نہیں تھی۔

کچھ دیر کے بعد اس شخص کی بے ترتیب سانسیں پُرسکون ہوگئیں اور تواتر کے ساتھ چلنے لگیں۔ ڈورس نے اسے اطمینان کے ساتھ قالین پر لٹا دیا اور اپنے بلاؤز پر لگے خون کے دھبے کو صاف کرنے لگی۔

اس شخص نے ایک بار پھر آنکھیں کھول لیں۔ ان میں بے بسی عیاں تھی۔ وہ ملتجیانہ لہجے میں بولا۔"کیا تمہارے پاس گن ہے؟"

جم اور ڈورس نے کئی دن ٹارگٹ پریکٹس میں گزارے تھے۔ نشانہ بازی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوششوں سے ڈورس بھی ایک عمدہ نشانہ باز بن چکی تھی۔ پھر یونیورسٹی سے روانگی سے قبل اس نے دونوں کا مشترکہ ریوالور اپنے سوٹ کیس میں رکھ لیا تھا اور وہ اندر بیڈروم میں موجود تھا۔

وہ بیڈروم میں چلی گئی اور کانپتے ہاتھوں سے سلنڈر میں شیل ڈالنے کے بعد بیرونی کمرے میں لوٹ آئی۔ کیا اس شخص کی سانسیں خطرناک حد تک مدھم ہوچکی ہیں؟ یہ جاننے کے لیے وہ اس کے برابر میں جھک گئی اور سننے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کی سانسیں بہ مشکل سنائی دے رہی تھیں لیکن متوازی تھیں۔

ڈورس نے ریوالور نیچے رکھ دیا اور اس کی شناخت کے لیے اس کے لباس کی تلاشی لینے لگی۔ اس شخص کا بٹوا کھولتے ہوئے اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ بٹوے میں سیاہ بالوں والی ایک دلکش عورت کی تصویر، ڈھیروں نقدی اور ساؤتھ ڈکوٹا کا ایک ڈرائیونگ لائسنس موجود تھے۔ لائسنس پر نام اور پتا بھی درج تھا۔

گورڈن لاٹل، پیدائش 1959ء، مشن، ساؤتھ ڈکوٹا۔

وہ اس شخص کے بارے میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں جان سکی، البتہ اس پیاری سی عورت کی تصویر دیکھ کر تصور میں اس کے کانوں میں اس کی دردناک چیخیں سنائی دینے لگیں اور وحشیانہ ضربات کا منظر گھومنے لگا۔

اتنے میں دروازے پر ایک تیز دستک ہوئی۔ ڈورس نے فوراً ریوالور اٹھالیا۔ ریوالور کی آہنی دھات اسے یخ محسوس ہورہی تھی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دروازے کی دوسری جانب کھڑے ہوئے شخص کی موجودگی کو بہ خوبی محسوس کررہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب سی ہوگئیں اور اس کی ٹانگوں کی طاقت جواب دینے لگی۔

"کون ہے..... کون ہو تم؟"

"تم مجھے اندر آنے دو۔"

ڈورس نے پردہ اٹھایا اور پھر فوراً ہی گرادیا۔ اس نے ایک لمحے میں جو منظر دیکھا تو اسے بے ساختہ اپنے شوہر جم کی یاد آگئی۔ وہی ناک نقشہ، چہرے کے وہی نمایاں خطوط، حساس سیاہ آنکھیں، ہونٹوں کا اسی طرح بھینچنا۔ پھر جم اور اس شخص کا چہرہ آپس میں گڈمڈ ہونے لگے۔ یہ کیفیت اسے اکسانے لگی کہ وہ دروازے کے پٹ کھول دے اور ان مضبوط بازوؤں میں بہ حفاظت سما جائے۔

ڈورس فوراً ہی پیچھے ہٹ گئی۔ وہ اب اپنی آنکھوں پر مزید اعتبار نہیں کرسکتی تھی۔ کیا وہ حقیقت اور منطق سے آگے کی حد تک خوف زدہ ہوچکی ہے؟ اسے اس حد تک سراسیمہ ہونا نہیں چاہیے؟

"مجھے معلوم ہے کہ وہ وہاں اندر موجود ہے۔ پورچ میں ہر طرف خون پھیلا ہوا ہے۔" اس شخص نے بلند آواز سے کہا۔

ڈورس یہ توقع کررہی تھی کہ وہ شخص نشے میں دھت یا پاگل ہوگا لیکن اس کی آواز تو پوری طرح اس کے قابو میں تھی اور وہ پورے ہوش وحواس میں بات کررہا تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم خوف زدہ ہو لیکن تمہیں مجھ سے کوئی ڈر محسوس نہیں ہونا چاہیے۔ میں یہاں تمہاری مدد کرنے کے لیے آیا ہوں۔" اس شخص نے کہا۔

ڈورس نے اس شخص کی ایک اور جھلک دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ وہ دراز قامت اور دبلا پتلا تھا۔ وہ بالکل سیدھا کھڑا تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی جدوجہد کررہا تھا۔ کیا وہ خوف کے جذبات تھے یا غیظ وغضب کے؟ کاش وہ ان ذہین سیاہ آنکھوں کے درمیان ابھری ہوئی باریک لکیروں میں چھپے سچ کو پڑھ سکتی۔

ڈورس نے پردہ گرادیا۔ کیا وہ کوئی انڈین ہے؟ شاید اس کی رگوں میں انڈین آباؤاجداد کا خون دوڑ رہا ہو۔ ڈورس نے سوچا۔ اس کے لانبے سیاہ بال ہوا کے جھونکے سے لہرا رہے تھے۔

"تم کون ہو؟" ڈورس نے پوچھا۔

"میرا نام آرلن رچرڈ ہے اور میں پائن رج پہنچنے کے لیے دن بھر ڈرائیو کرتا رہا ہوں۔"

"تم نے یہاں تک اس کا پیچھا کیوں کیا ہے؟ وہ کس

طرح زخمی ہوا ہے؟" ڈورس نے بیک وقت دونوں سوال کر ڈالے۔

"وہ دونوں روڈ سائڈ پارک پر رکے ہوئے تھے۔ وہ اور اس کی بیوی کے درمیان یقیناً آپس میں جھگڑا ہو رہا تھا اور اس کی بیوی نے ٹائر آئرن سے اس کا سر پھاڑ دیا۔ تب وہ اپنے حواس کھو بیٹھا۔ میں جب وہاں پہنچا تو یہ اس وقت بھی اس پر ضربیں لگا رہا تھا۔ وہ مرچکی تھی۔" یہ کہہ کر اس نے قدرے توقف کیا پھر اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے دوبارہ گویا ہوا۔"جب اس نے مجھے دیکھا تو وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ زیادہ دور نہیں جا پائے گا۔"

ڈورس نے پلٹ کر ایک اچٹتی نگاہ فرش پر پڑے ہوئے زخمی شخص پر ڈالی۔ اب اسے کیا کرنا چاہیے؟ وہ سوچنے لگی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے چہرے کا تمام خون نچوڑ لیا گیا ہو اور خود اس کا چہرہ بھی اس زخمی شخص کی طرح پھیکا پڑ گیا ہو۔

"مجھے اندر آنے دو۔" ڈورس کو خاموشی اپنے اطراف میں ایک خوف کے مانند چھائی محسوس ہونے لگی۔

"میں تمہاری زندگی بچانا چاہتا ہوں۔ اس کے پاس اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ وہ تمہیں قتل کردے گا۔" اس شخص کے بولنے کے ساتھ ہی دروازے کا ہینڈل گھوما اور لکڑی کے ہلکے سے چٹخنے کی آواز ابھری جیسے کوئی مضبوط شانوں سے اس پر دباؤ ڈال رہا ہو۔"تمہیں اس بات کی اجازت دینا ہوگی کہ میں تمہاری مدد کروں۔"

"اگر تم مدد کرنا چاہتے ہو تو میٹنگ چلے جاؤ اور شیرف کو یہاں بھیج دو۔" ڈورس نے کہا۔

پھر وہ اس شخص کی روانگی کا انتظار کرنے لگی۔ اس کی سانسیں بے ترتیب ہورہی تھیں۔ ڈورس کو یقین تھا کہ وہ شخص وہاں سے روانہ نہیں ہوا ہے۔ وہ تصور میں اسے مستعد کھڑا دیکھ رہی تھی جو موقع کی تاک میں تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ پورچ کی لائٹ کے حلقے سے نکل کر سائے کے پیچھے چلا گیا ہو اور کیبن کے دروازے پر نگاہ جمائے ہوئے ہو۔

"کیا تم اب بھی موجود ہو؟" ڈورس نے پوچھا۔

"اگر میں چلا گیا تو جب میں واپس آؤں گا تو ہوسکتا ہے کہ اس وقت تم زندہ نہ ملو۔" اس شخص نے جواب دیا۔

ڈورس کی نظر تیزی سے گورڈن نامی زخمی شخص کی جانب اٹھ گئیں جو فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے کافی دیر سے اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ اگر وہ اس حد تک بے بس نہ دکھائی دے رہا ہوتا تو شاید وہ ثابت قدم نہ رہ پاتی۔ ریوالور ہاتھ میں موجود ہونے کی بنا پر شاید وہ ایک چانس لے لیتی اور دروازہ کھول دیتی۔

"اس کی..... حالت بہت خراب ہے اور مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔" ڈورس نے بلند آواز سے کہا۔

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے، تم نقصان اٹھالوگی۔"

ڈورس کو بے ساختہ اپنے شوہر جم کی یاد آگئی۔ اس شخص کی آواز سے شدت کے ساتھ ذمے داری کا احساس بھی عیاں تھا..... بالکل جم کی طرح!

"میں تمہیں یونہی چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔" اس شخص نے پُروثوق لہجے میں کہا۔

اس مرتبہ خاموشی کچھ زیادہ دیر تک چھائی رہی۔ اس دوران ڈورس کو سوچنے کا وقت مل گیا۔

اگر اس شخص کا اصل نام آرلن رچرڈ ہی ہے تو اسے گھر میں زبردستی در آنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئے گی۔ اس کی باتوں سے ظاہر ہورہا ہے کہ وہ بلاشبہ کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی ڈورس نے ریوالور کے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ خالی بوتلوں اور کاغذ کے بنے ہوئے سیاہ دائروں والے اہداف پر نشانہ بازی کی مشق کرنا ایک الگ بات تھی البتہ کسی جاندار کو شوٹ کرنا دل گردے کا کام تھا۔

اگر وہ شخص زبردستی تالا توڑ کر اندر گھس آیا تو کیا وہ اسے شوٹ کرسکے گی؟ وہ تذبذب میں پڑ گئی۔

"تم سمجھ کیوں نہیں رہی ہو، اندر موجود شخص بے حد خطرناک ہے۔ تمہاری زندگی کا انحصار مجھ پر ہے۔" اس شخص نے ایک بار پھر اسے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔"اب جلدی سے دروازہ کھول دو۔"

"یہاں سے قریب ترین ٹاؤن میٹنگ ہے جو مغرب میں پندرہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ قدیم باشندوں کے لیے الگ کیا ہوا علاقہ نہیں ہے۔ شیرف کا دفتر شہر کی حدود کے عین اندر واقع ہے۔" ڈورس نے کہا۔

وہ ایک بار پھر انتظار کرنے لگی کہ ہوسکتا ہے اس کے کہنے پر وہ شخص یہاں سے چلا جائے۔ وہ اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کررہی تھی اور اس کی سانسیں بدستور بے ترتیب تھیں۔

"میں دروازے کا تالا توڑنے جارہا ہوں۔"

یہ سنتے ہی ڈورس کا دل ڈوب گیا۔ اس کے اس جملے نے ڈورس کے سب سے بڑے خدشے کی تصدیق کردی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ شخص اب چند قدم پیچھے ہٹ چکا ہے

تاکہ اپنے پورے وزن کے ساتھ دروازے سے ٹکرا جائے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ دروازے کا تالا اس شخص کی طاقت کی تاب نہیں لا سکے گا اور ٹوٹ جائے گا۔

''اگر تم نے دروازہ توڑا تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گی۔'' ڈورس نے پُرسکون لہجے میں دھمکی دی۔

''تم کسی کو شوٹ نہیں کرو گی۔'' اس شخص کی آواز میں کسی قسم کی گھبراہٹ نہیں تھی اور اس نے پُریقین لہجے میں یہ بات کہی تھی۔

تب ڈورس نے اپنا ریوالور بلند کیا اور کمرے کے ایک گوشے کا نشانہ لیتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔

گولی چلنے کی تیز آواز سناٹے میں گونج گئی اور لکڑی کے پینل میں ایک نفیس چھوٹا سا سوراخ نمودار ہو گیا۔ اس کی یہ حرکت اس لحاظ سے درست ثابت ہوئی کہ وہ جو چاہتی تھی وہ مقصد حل ہو گیا۔ اس کے کانوں میں دور جاتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔

اب وہ کیا کرنا چاہے گا؟ یقیناً وہ شیرف کو لانے کے لیے میٹنگ تو ہرگز نہیں جائے گا...... پھر کیا کرے گا؟ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

''ہمیں یہاں سے باہر نکلنا ہوگا۔'' ڈورس نے زخمی گورڈن سے مخاطب ہو کر کہا۔

جب گورڈن نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ گیلے تولیے کو بار بار اس کے چہرے پر رگڑنے لگی۔

بالآخر گورڈن نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ البتہ کوشش کے باوجود وہ کچھ بولنے سے قاصر تھا۔

''تم اٹھنے کی کوشش کرو۔ میں تمہاری مدد کروں گی۔'' ڈورس نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

اس جدوجہد کے دوران ڈورس زخمی گورڈن سے مسلسل باتیں کرتی رہی البتہ اس کا لہجہ سرگوشی جیسا تھا۔

''میری کار برابر میں گیراج کے اندر موجود ہے۔ ہمارے پاس یہاں سے بچ نکلنے کا یہی ایک چانس ہے۔''

انہوں نے آہستہ آہستہ کھسکتے ہوئے بیرونی کمرا پار کر لیا۔ ڈورس نے اپنا ریوالور نیچے رکھ دیا تاکہ زخمی گورڈن کو سہارا دینے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ استعمال کر سکے۔ گورڈن کا وزن کافی زیادہ تھا۔ جب وہ ان دو چھوٹی سیڑھیوں تک پہنچے جو گیراج کے سیمنٹ کے بنے ہوئے فرش پر اتر رہی تھیں تو گورڈن خطرناک حد تک ڈگمگانے لگا۔

ڈورس محتاط طریقے سے اپنے وزن سے گورڈن کے وزن کا توازن برقرار رکھتے ہوئے بروقت اس کے سامنے آ گئی اور اسے گرنے سے بچا لیا۔

''تم میرا سہارا لیتے ہوئے نیچے اترنے کی کوشش کرو۔ ہم تقریباً کار تک پہنچ چکے ہیں۔''

ڈورس اب بری طرح ہانپ رہی تھی۔ جب اس نے زخمی گورڈن کو حفاظت کے ساتھ کار کے اندر پہنچا دیا تو اس کا پورا بدن پسینے میں نہا چکا تھا۔ جب وہ خود ڈرائیونگ پر بیٹھی تو اسے یاد آ گیا کہ وہ ریوالور تو کچن کاؤنٹر پر چھوڑ آئی ہے۔ وہ کار سے اتر کر تیزی سے مکان کے اندر کی جانب لپکی مگر چند ہی لمحوں بعد پلٹی تو ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔

اس نے کار میں سوار ہونے کے بعد ریوالور اپنے پاس سیٹ کے قریب رکھ لیا۔ اس نے گیراج کا دروازہ کھولنے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ دروازے کی باریک پلائی ووڈ بری طرح خستہ حال ہو چکی تھی اور ان کے راستے میں مزاحم نہیں ہو سکتی تھی۔

ڈورس نے کار اسٹارٹ کی اور ایکسلریٹر پر پورا زور ڈال دیا۔ کار اچھل کر آگے بڑھی اور دروازے کی لکڑی کو پھاڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ دروازے کے پرخچے اڑ گئے اور لکڑی کے ٹکڑے ہوا میں ادھر ادھر بکھر گئے۔

گیراج سے نکلتے ہوئے ڈورس نے ایک دراز قامت، دبلے پتلے شخص کے ہیولے کو دیکھا جو پورچ کی روشنی سے بچ کر اس مقام سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر ساکت اور پُراعتماد کھڑا ہوا تھا جہاں کچھ دیر پہلے ڈورس نے اس سے بات کی تھی اور فائر کر کے اسے دھمکایا تھا۔ وہ اب بھی چوکنا کھڑا تھا جیسے موقع کی تاک میں ہو۔ ڈورس کا خیال درست ثابت ہو گیا تھا۔ اس شخص کا وہاں سے جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

وہاں سے اپنے نکلنے کے جنون میں ڈورس اس شخص کی کار کی صرف ایک ہی جھلک دیکھ سکی تھی۔ وہ پرانے ماڈل کی ایک نیلی یا سیاہ رنگ کی کار تھی لیکن اگر وہ میٹنگ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تو تب بھی وہ اس کار کے بارے میں شیرف کو تفصیل بتانے سے قاصر رہے گی۔

ڈورس کی کار اب سڑک پر رواں تھی۔ دونوں جانب خالی اور غیر آباد میدان تیزی سے گزر رہے تھے۔ تنگ اور جابجا بل کھاتی ہوئی سڑک اس قابل نہیں تھی کہ اس پر تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا جائے۔ اسے نہایت مہارت اور احتیاط سے ڈرائیونگ کرنا تھی۔ وہ بارہا ان تیز رفتار گاڑیوں کے ٹریجک حادثات کے بارے میں سن چکی تھی جن کے تباہ حال ڈھانچے اچانک الٹ جانے سے سڑک کے کنارے دیکھنے کو ملتے تھے۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' گورڈن نے پوچھا۔ اس کا لہجہ مدھم لیکن آواز قابلِ فہم تھی۔

''مجھے فوری طور پر تمہیں اسپتال پہنچانا ہوگا۔ میٹنگ میں ایک چھوٹا سا اسپتال موجود ہے۔''

ڈورس بہ مشکل تمام اس کا احتجاج سن پائی جو اس نے بڑبڑانے کے انداز میں کیا تھا۔ ''میں وہاں نہیں جانا چاہتا۔''

تب ڈورس نے تیزی سے ایک اچٹتی نگاہ گورڈن پر ڈالی۔ اس کی پتھرائی ہوئی غیر منطقی نظریں ڈورس کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئیں۔ ڈورس نے اپنی نگاہیں دوبارہ سامنے سڑک پر مرکوز کر دیں۔

اب اس کا دل ڈوب سا رہا تھا۔ یہ شخص قاتل بھی ہو سکتا ہے۔ اگر وہ واقعی قاتل تھا تو جال میں پھنسے ایک پاگل جانور کے مانند اپنی ذات اور اپنے جرم کے تحفظ کی خاطر آزادی کے ساتھ حملہ آور ہو سکتا تھا۔ اس خیال نے کہ شاید اس نے غلط فیصلہ کیا ہے، ڈورس کو اپنی رگوں میں خون جمتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ بہ مشکل تمام صرف یہ الفاظ ادا کر پائی۔

''میں متعلقہ حکام کو آگاہ کر دوں گی۔ وہ تمہیں تحفظ فراہم کر دیں گے۔ ایک بار ہمارے میٹنگ پہنچنے کے بعد تم محفوظ ہو جاؤ گے۔''

''ہم خطرے کی زد میں ہیں۔'' گورڈن نے کہا۔

''تمہارا پہلے ہی خاصا خون ضائع ہو چکا ہے۔ ہم اس کے علاوہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتے۔'' ڈورس نے جواب دیا۔

ڈورس نے اس کی جانب دیکھا تو نہیں لیکن وہ اس کی جلتی ہوئی آنکھوں کی حدت بہ خوبی محسوس کر رہی تھی جو اسے گھورے جا رہی تھیں۔ وہ آنکھیں غیر ہوش مندانہ اور بے حد غضب ناک لگ رہی تھیں۔

''نہیں۔'' اس مرتبہ اس کی آواز بلند اور توانا تھی۔ ''تم ڈرائیونگ کرتی رہو اور مجھے ریڈ سٹی لے چلو۔''

''میں یہ نہیں کر سکتی۔ وہ بہت دور ہے۔'' ڈورس نے عقب بین آئینے پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ اس کی نظریں فاصلے پر دکھائی دینے والی ہیڈ لائٹس پر جم گئیں۔

کاش وہ جان سکتی کہ ان دونوں میں سے کس شخص پر یقین کرے؟ وہ سوچنے لگی۔ ایک لمحے کے لیے بلاشبہ اس نے یہی سوچا کہ آرلن رچرڈ جلد از جلد ان تک آن پہنچے۔ اس لیے کہ وہ اسے اس کے شوہر کی یاد دلاتا تھا گویا وہ کوئی معجزہ دکھا دے جیسے کہ جون وین ان پرانی فلموں میں کیا کرتا تھا جو ڈورس نے دیکھی تھیں۔

لیکن ڈورس کو یہ یقین نہیں تھا کہ ان دونوں میں سے کس نے اس سے سچ بیانی کی تھی۔ ڈورس نے اپنی کار کے ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔

جو شخص مسلسل ان کا تعاقب کر رہا تھا، اس کے پاس یقیناً اس بات کا کوئی نہ کوئی جواز ہوگا۔ وہ کبھی بھی ڈورس کی جان بچانے کی خاطر جو اس کے لیے قطعی اجنبی تھی، اپنی جان خطرے میں ڈالنے کے لیے رضامند نہیں ہو سکتا تھا۔ ڈورس نے یہ بات خود کو سمجھائی۔

ڈورس نے اپنی جانب کی کھڑکی کا شیشہ قدرے نیچے کھسکایا۔ تیز سرد ہوا اس کے چہرے سے ٹکرانے لگی۔ اس کے شوہر کی موت بھی ایک ایسی ہی سرد، سیاہ اور بے چاند کی رات میں واقع ہوئی تھی۔ ڈورس کو اب بھی اپنی وہ کیفیت یاد تھی جب وہ ایمرجنسی کی جانب رواں تھی۔ جی کا متلانا، وہ بے اثر باتیں جو وہ کہہ اور کر رہی تھی، حوصلہ شکنی، غصہ، جھنجلاہٹ، بے بسی۔ جم مر رہا تھا اور وہ اسے بچا نہیں سکتی تھی۔

گورڈن اب زیادہ چوکنا ہو گیا تھا۔ اب اس کا لہجہ

کفایت شعاری

ٹھیکیدار۔ مالک... زمین کو نقشہ دکھا کر ''اس مکان پر سات لاکھ خرچ ہوں گے اور اگر اس کے اوپر بھی بنوانا چاہیں تو اس پر تین لاکھ خرچ ہوں گے۔''

مالک زمین۔ ''کچھ سوچ کر۔ تو فی الحال اوپر کا حصہ بنا دیا۔ نچلا بعد میں بنوا لیں گے۔''

بچے

مشہور سائنس دان آئن اسٹائن کا کہنا ہے کہ میں نے ہمیشہ سوال و جواب بچوں سے کر کے سیکھا ہے۔

مثلاً میں نے ایک دفعہ ایک آٹھ سالہ بچے سے پوچھا۔ ''جب پانی ابلتا ہے تو اس میں سے شوں شوں کی آواز کیوں آتی ہے؟''

بچے نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ اس میں موجود جراثیم مر رہے ہوتے ہیں۔ یہ ان کی چیخیں ہوتی ہیں۔''

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

بھی درشت تھا۔ "میٹنگ پر نہیں رکنا۔" اس نے کہا۔

"میں وہی کروں گی جو میرے خیال میں بہتر ہوگا۔" اور پھر وہ دونوں ایک ہی وقت میں اس ریوالور پر جھپٹ پڑے جو ان کے درمیان سیٹ پر رکھا ہوا تھا۔

گورڈن کی پھرتی نے ڈورس کو حیران کردیا۔ ریوالور ہاتھ میں آتے ہی وہ اپنی طرف کے دروازے کی جانب کھسک گیا۔

اپنے رویے کے بارے میں محسوس ہونے والی ضمیر کی خلش جو ڈورس کو اس شخص کے جرم کے بارے میں متنبہ کررہی تھی، اب ایک مکمل حقیقت میں تبدیل ہوچکی تھی۔ وہ شخص ریوالور پر بھی قبضہ نہیں جماتا اگر وہ اسے استعمال کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

"تمہیں اپنی حفاظت کے بارے میں پریشان ہونے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں۔" ڈورس نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "میں کار کو سیدھا شیرف کے دفتر کے اندر لے جاکر روکوں گی۔"

"ہم کبھی بھی اندر نہیں پہنچ پائیں گے۔"

"کیا اس شخص کے پاس ہتھیار ہے؟" ڈورس نے پوچھا۔

"بلاشبہ ہے۔"

"میرے پاس کار میں اتنا پیٹرول نہیں ہے کہ ہم ریڈسٹی تک جاسکیں۔" ڈورس نے ڈیش بورڈ پر لگے پیٹرول گیج پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

ساتھ ہی وہ سوچنے لگی کہ جب وہ سودا سلف لینے کے لیے دتھرو پ گئی تھی تو اس وقت اس نے ٹنکی کیوں نہیں بھروائی تھی؟ میٹر کی سوئی کے مطابق کار کی ٹنکی خالی ہونے کے قریب تھی۔

"ہم شاید میٹنگ تک بھی نہ پہنچ پائیں۔" ڈورس نے کہا۔

اگلے چوراہے پر واقع گیس اسٹیشن جہاں سے وہ عام طور پر پیٹرول بھروائی تھی، کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ وہ مضطربانہ نظروں سے گیس اسٹیشن کی عمارت کے خاکے کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگی جو اندھیرے کے باعث واضح نظر نہیں آرہا تھا۔ نہ گھاس پھوس کا بنا ہوا ٹن شیڈ دکھائی دے رہا تھا اور نہ ہی اس کے لمبے ستون۔ عقب میں بنا ہوا کیبن جہاں بوڑھا ایلیکس رہتا تھا، وہ بھی اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

بوڑھا ایلیکس، ڈورس کا واحد پڑوسی تھا لیکن اس کے پاس رکنے سے کوئی مسئلہ حل ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اگر اس نے کسی طرح بوڑھے ایلیکس کو جگا دیا تو اسے بھی قتل کیے جانے کا امکان تھا اور ڈورس یہ خطرہ کسی طرح مول لینا نہیں چاہتی تھی۔

وہاں نہ رکنے کا فیصلہ کرتے ہی ڈورس نے کار کی رفتار بڑھادی۔ اس کی رفتار بڑھانے کے باوجود عقب میں نظر آنے والی ہیڈ لائٹس مزید قریب ہونے لگیں۔ یقیناً ان کے پیچھے آنے والی کار نے بھی اپنی رفتار میں اور اضافہ کردیا تھا۔

ڈورس نے ان ہیڈ لائٹس کو اور ساتھ بیٹھے ہوئے گورڈن کو وقتی طور پر اپنے ذہن سے محو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنا دھیان سڑک پر لگا دیا۔ اطراف کے ویران میدان اس تیزی سے گزر رہے تھے کہ ڈورس کا سر چکرانے لگا۔

اسے اپنے سینے میں دل دھڑکتا بند ہوتا محسوس ہوا جب اس نے ایکسلریٹر کو دبایا اور اس کی کار نے معمولی سا جھٹکا لیا۔ پھر یہ جھٹکے زیادہ تیزی سے اور بار بار ہونے لگے حتیٰ کہ کار سے صدائے احتجاج بلند ہونے لگی اور وہ ایسی آوازیں نکالنے لگی جیسے کسی پر اچانک کھانسی کا دورہ پڑ گیا ہو۔

ڈورس نے محسوس کرلیا کہ کار کی رفتار ختم ہوتی جارہی ہے۔ پیٹرول بس ختم ہونے کو تھا۔ نہیں، ابھی نہیں۔ ڈورس نے دل ہی دل میں کہا۔ خاص طور پر اس وقت نہیں جب ہیڈ لائٹس عقب میں ان کے بے حد نزدیک پہنچ چکی تھیں۔

پچھلے گیس اسٹیشن پر بوڑھے ایلیکس کو بیدار نہ کرکے اس سے غلطی سرزد ہوئی تھی۔ کار دھیمی رفتار سے چلتے ہوئے رکنے لگی۔ ڈورس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اسٹیئرنگ گھماتے ہوئے کار کو سڑک کے کنارے لے جائے اور پھر کار رک گئی۔

"یہ تم کیا کررہی ہو؟" گورڈن نے ڈورس پر ریوالور تانتے ہوئے کہا۔ "تم یہاں نہیں رک سکتیں۔"

"ہماری کار میں پیٹرول ختم ہوگیا ہے۔" ڈورس نے مدد کے لیے ویران میدان کا سرسری جائزہ لیا۔ اس کا شدت سے یہ جی چاہ رہا تھا کہ کار سے چھلانگ لگا کر دوڑ پڑے لیکن اطراف میں نہ تو کوئی درخت تھا اور نہ حفاظتی پناہ گاہ، نہ ہی قریب میں کسی قسم کی مدد لینے کا کوئی اشارہ دکھائی دے رہا تھا۔ بس تنہائی اور ویرانی تھی جو ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔

کار کی اندرونی مدھم روشنی میں اس نے وہ تبدیلی دیکھی جو تیزی سے گورڈن پر طاری ہوچکی تھی۔ اب وہ کسی طور پر بے بس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اس غضب ناک ریچھ کی طرح لڑنے کے لیے تیار تھا جو مرنے یا مرجانے کے لیے آمادہ ہو۔

اتنے میں ان کے پیچھے آنے والی کار کے پہیے چرچرائے اور وہ ان کی کار کے عقب میں محتاط فاصلے پر آکر رک گئی۔ کار میں سے ایک سیاہ ہیولا لپک کر باہر آیا۔ ڈورس نے اپنا سانس روک لیا۔

وہ سایہ تیزی کے ساتھ ڈورس کی کار کے اس حصے کی جانب بڑھ رہا تھا جدھر گورڈن بیٹھا ہوا تھا۔

وہ اپنے آپے سے باہر دکھائی دے رہا تھا۔ تب اچانک ڈورس کے ذہن میں یہ خیال بجلی کے مانند کوندا کہ اس وقت بھی اس شخص کے چہرے پر بالکل یہی ہولناک تاثرات رہے ہوں گے جب اس نے کاری ضربیں لگاتے ہوئے اپنی بیوی کو قتل کیا ہوگا۔

ڈورس نے تیزی سے چہرہ گھمایا۔ اسے کھڑکی سے آرلن رچرڈ کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ چہرہ جو بڑی حد تک اس کے شوہر جم کے چہرے جیسا لگ رہا تھا۔ ڈورس کو یہ معلوم نہیں تھا کہ آیا آرلن کے پاس کوئی ہتھیار ہے یا نہیں۔ اسے لازمی طور پر ان دونوں میں سے کسی ایک کی مدد کرنی تھی اور اس کے فیصلے کا مطلب زندگی یا موت تھا لیکن یہ فیصلہ درست ہونا چاہیے۔ تب اس نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر گورڈن پر جھپٹ پڑی۔ اس کے ہاتھ پاگلوں کی طرح گورڈن کے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور کو اپنی گرفت میں لینے کی جدوجہد کرنے لگے۔

اس نبرد آزمائی میں ریوالور کی نال اوپر کی جانب اٹھ گئی اور اس کشمکش میں ٹریگر اچانک دب گیا۔ ساتھ ہی ایک گولی زنانے کے ساتھ ونڈ اسکرین کے ایک گوشے میں سوراخ کرتی ہوئی اندھیرے میں پار نکل گئی۔ ونڈ اسکرین پر مکڑی کا جال سا بن گیا۔

اس دوران میں ڈورس نے آرلن کو تیزی سے متحرک دیکھا۔ اس نے کھڑکی سے اندر ہاتھ ڈالتے ہوئے گورڈن کی دونوں کلائیوں کو اپنی مضبوط انگلیوں کی گرفت میں جکڑ لیا اور پوری قوت سے انہیں مروڑتے ہوئے چیخا۔

"اس سے ریوالور چھین لو۔"

گورڈن کی کلائیاں جیسے بے جان سی ہوچکی تھیں۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے پھسل کر بہ آسانی ڈورس کے ہاتھ میں آگیا۔

"ریوالور مجھے دے دو۔" آرلن رچرڈ نے کہا۔

"نہیں۔" گورڈن چیخ پڑا۔

ڈورس نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا پھر ریوالور آرلن کو تھما دیا۔

"تم میری کار کی عقبی نشست پر جاکر بیٹھ جاؤ۔" آرلن نے ڈورس سے کہا پھر اس نے گورڈن کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے ڈورس کی کار سے نیچے اتارا اور اسی طرح گھسیٹتے ہوئے اپنی کار تک لے گیا اور اسے اگلی نشست پر بٹھا دیا۔ پھر کار کی اسٹیئرنگ نشست سنبھالتے ہی وہ ڈورس کی جانب گھوم گیا۔ جب اس نے ریوالور کو بلند کیا تو ڈورس پر ایک بار پھر غیر یقینی کی کیفیت طاری ہوگئی۔

"یہ لے لو۔" آرلن نے ریوالور ڈورس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسے براہِ راست نشانے پر لیے رکھنا جب تک ہم میٹنگ نہیں پہنچ جاتے۔"

اس ویرانے میں پھیلی خاموشی کو صرف گورڈن کی سسکیاں توڑ رہی تھیں جو چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے عجیب انداز میں رو رہا تھا۔

☆☆☆

جب گورڈن کو اسٹریچر پر لے جایا جارہا تھا تو ڈورس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے دیکھ سکے۔

شیرف نے پہلے آرلن رچرڈ سے علیحدگی میں بات کی پھر ڈورس سے بات کی کہ وہ اس کا تحریری بیان لینا چاہتا ہے۔ جب بیان دینے کے بعد ڈورس شیرف کے دفتر سے بے ترتیب ہوتے ہوئے باہر نکلی تو آرلن اس کا انتظار کررہا تھا۔ جم کی آنکھوں کی طرح وہ سیاہ حساس نگاہیں اسے کمرے سے باہر نکلتے دیکھتی رہیں۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی تھی۔

ممنونیت اور اطمینان کے جذبات نے ڈورس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ ایک غلط فیصلہ کرنے کے بے حد قریب پہنچ چکی تھی اگر وہ گورڈن کی بات کو صحیح مان لیتی۔

"مجھے تمہاری باتوں پر یقین کرلینا چاہیے تھا۔" ڈورس نے آرلن سے کہا۔ "لیکن حقیقت میں میرا یہ خیال نہیں تھا کہ وہ ایسا کچھ کرسکتا ہے جو تم نے کیا۔ تم نے ایک مکمل اجنبی کو بچانے کی خاطر اتنی راضی خوشی اپنی زندگی خطرے میں ڈال دی۔ اس بات کا میں تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔"

"میں ایسا کیوں نہ کرتا؟" آرلن نے جواب دیا۔ اس کے ہونٹوں پر چھائی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔ "کیا تم نے سن وعن یہی نہیں کیا؟ کیا ہم دونوں تمہارے لیے مکمل اجنبی نہیں تھے؟"

"لیکن اب تم اجنبی نہیں ہو۔" ڈورس نے قدرے شرماتے ہوئے کہا اور پھر فضا میں ان دونوں کے قہقہے بکھر گئے۔



محی الدین نواب

نویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادوباراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کُن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

... محبت کی چاہتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمر داد اور چاچی منشی کے ساتھ اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا، وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کردی۔ سال نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اچانک باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہوگیا۔ اس رات زلیخا نے اسے ایک قیمتی ہار بھی تحفتاً دیا تھا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میں گوٹھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون تھا۔ لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا، اس کا [illegible] بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کر چکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کر لی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی پر ہار کر کے قتل کر دیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا اور وہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف جتی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سمیرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بطور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد کو شادی کے لیے ایک لاکھ کی ضرورت تھی۔ محبوب نے زلیخا کے دیے ہوئے ہار کو ایک لاکھ میں خریدنے کی پیشکش کی لیکن مراد راضی نہ ہوا۔ اسی دوران مراد کے گھر چوری کی واردات ہوئی اور چور نقد رقم کے ساتھ زلیخا کا وہ ہار بھی لے گئے لیکن پکڑے گئے یوں مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہو گیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں رابعہ جانتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہٰذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہوگئی یہ بات پارٹی کے لیڈر تک پہنچی تو چانڈیو استعفا دے کر چلا آیا۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہو گیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، مگر محبوب چانڈیو اسے بچا لایا۔ دوسری جانب جاسوس بیکر بیٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ جو کہ جیلر کی بیٹی ہے، رنگو، وساکی، بیرم اور دارا اکبر کے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی اور اس سے شادی اسے ورغلا کر ماروی سے دور کر رہی تھی جبکہ ماروی پر بھی دباؤ تھا کہ وہ محبوب سے شادی کر لے لیکن دونوں اپنے عشق پر قائم تھے۔ مقدمے کو معلوم نہیں کب تک چلنا تھا لیکن محبوب نیک نیتی سے ان کا مددگار رہا اور حتیٰ کہ جب ماروی محبوب کے احسانات سے بچنے کے لیے جان بوجھ کر غائب ہو گئی جس میں سمیرا بھرپور مدد کر رہی تھی تاکہ محبوب ماروی کی مدد سے باز آجائے مگر اس خبر کے بعد وہ دلبرداشتہ ہو کر خود مراد کی جگہ جیل میں قید ہو گیا جبکہ دوسری جانب ماروی کی تلاش کا لالچ دے کر مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہو گیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہو گیا۔ جبکہ دوسری جانب سمیرا اور جتی صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ ایک موقع پر مرینہ مراد کا پیچھا کرتے ہوئے راستے میں ماروی تک پہنچ گئی اور محبوب نے فون پر اپنے باپ کے ذریعے رابطہ کرایا تو اسی خبر سے محبوب میں نئی زندگی دوڑ گئی۔ مرینہ اپنے باپ کے بل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی۔ مگر قسمت کی دیوی مراد پر مہربان تھی جو مرینہ کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا، اتفاق سے راستے میں ماروی چاچی اور چاچا کے ساتھ اس کے ہاتھ لگ جاتی ہے لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو معلوم ہو جاتا ہے کہ مرینہ ماروی کو جام تماچی کے چودھری کے پاس لے جا رہی ہے لہٰذا مشکلات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے وہ ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کر لیتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگتی ہے جس کے باعث اس کی یادداشت چلی جاتی ہے اور یہ صورت حال محبوب اور مراد دونوں کے لیے پریشان کن ہوتی ہے۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے رہائی پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہو جاتا ہے مگر یہ بات جیلر یا مرینہ کسی کو کانوں کان پتا نہیں ہوتی۔ البتہ جتی صاحب اور سمیرا کے علم میں یہ بات آجاتی ہے۔ محبوب اور مراد کے جگہ بدل لینے سے حالات بھی بدلتے جا رہے تھے۔ ادھر چودھری کی بیوی اپنی چال میں کامیاب رہی اور چودھری رفتہ رفتہ موت کے منہ میں جاتا رہا۔ مرینہ اور مراد میں فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ مرینہ کے پالتو غنڈے مراد کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال کر لے جاتے ہیں۔ باہر نکل کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ جس میں قانون کا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مر جاتا ہے۔ جس کی بہت شہرت ہوتی ہے اور مراد ہیرو ٹھہرتا ہے۔ دوسری جانب ماروی کے علاج کے لیے باہر سے ایک ڈاکٹر عدیلہ کو بلایا جاتا ہے جو خود بھی دہری شخصیت کا شکار ہے۔ وہ عدیلہ بھی ہے اور عادل بھی۔ مرد بھی ہے اور عورت بھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

عدیل عاشقانہ مزاج کا حامل نہیں تھا۔ وہ مزاجاً اور فطرتاً لڑکی بن چکا تھا۔ اسے کبھی کسی لڑکی سے عشق نہیں ہوا۔ جو بھی لڑکی اسے اچھی لگتی تھی اور جس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رہنے کو جی چاہتا تھا، اسے سہیلی بنا کر رازداری سے کچھ وقت گزار لیتا تھا۔

صرف ایک جولی ہی ایسی تھی جسے آزمائش کے طور پر

اس نے سہیلی نہیں معشوق بنایا تھا پھر اسے رازدار بنا کر بیوی بنالیا تھا۔ اس کے بعد ایک بچی کا باپ بن گیا تھا۔ جولی کی وفات کے بعد عدیل رحمان پھر اپنے وجود کے اندر سو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح عدیلہ ہی بن کر رہنے لگا تھا۔ اس کی مجبوری تھی۔ وہ مستقل مرد بن کر نہیں رہ سکتا تھا۔

اب اس کے مام اور پاپا پھر اس کے پیچھے پڑ گئے تھے کہ وارث کے طور پر ایک بیٹا ہونا چاہیے۔ وہ بیوی کے نام پر کسی کو ہمیشہ کے لیے گلے کا پھندا نہیں بنانا چاہتا تھا۔

بہت عرصے بعد اس نے ماروی کو دیکھ کر محسوس کیا کہ وہ سب سے مختلف ہے۔ حسینۂ عالم تو نہیں ہے لیکن ایک معصوم سی شوخ سی اور تیکھی سی کشش رکھتی ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں اس کا شاعرانہ وجود کہہ رہا تھا کہ ایسی حسین اور پُرکشش ہستیاں کبھی کبھی پیدا ہوتی ہیں۔

ایک طویل عرصے کے بعد اس کے اندر کا عدیل رحمان بے اختیار کشش محسوس کر رہا تھا۔ آئندہ ہر روز آٹھ گھنٹے اس کے ساتھ رہنے والا تھا۔ یوں زندگی میں پہلی بار اسے معلوم ہونے والا تھا کہ محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے۔

فی الحال وہ عدیلہ کی حیثیت سے سوچ رہی تھی کہ جس طرح اب تک دوسری لڑکیوں کو نظرانداز کرتی آئی ہے اسی طرح ماروی سے بھی کترائے گی۔ یا اس کے جذبات سے کھیلتی رہے گی۔ جب دل بھر جائے گا تو اس سے بھی دور ہو جائے گی۔

وہ صبح دس بجے پھر ایک ماہرِ نفسیات ڈاکٹر کی حیثیت سے ماروی کے پاس آئی۔ اس کا ذکر عدیلہ کی حیثیت سے ہی کرنا چاہیے کیونکہ وہ لڑکی ہی رہ کر اس کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے والی تھی۔ وہ جولی کے ساتھ بھی در پردہ مرد بن کر رہنے کے باوجود بظاہر لڑکی ہی بن کر رہتی تھی۔

اس نے ماروی کے ساتھ چائے پینے کے بعد کہا۔ ”باہر موسم اچھا ہے۔ کیوں نہ ہم باغیچے میں چہل قدمی کریں۔“

وہ اپنی معالج کے ساتھ باغیچے میں آگئی۔ وہاں سبز ملائم گھاس پر ٹہلتے ہوئے اسے بتانے لگی کہ کل شام سے آج صبح تک کیسے وقت گزارتی رہی ہے۔

ماروی کے دل میں چور تھا۔ اس نے ٹی وی ڈرامے کی فضیلہ کے جذبات اور احساسات کو جس طرح محسوس کیا تھا اسے جانے کیوں چھپا لیا تھا۔ وہ خود اچھی طرح اپنے آپ کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

اس نے اُلجھن میں رہ کر سوچا۔ ”کیوں چھپا لیا....؟ اگر مجھ سے پوچھا جائے تو میں بتا نہیں پاؤں گی۔ مجھے اپنی یہ حرکت اپنی ہی سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔“

عدیلہ نے کہا۔ ”کبھی ٹی وی دیکھو تو یاد کرنے کی کوشش کرو کہ ایسا کوئی منظر کبھی دیکھا ہے یا ایسا کوئی فرد تمہاری نظروں سے گزرا ہے؟ جو تمہیں کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے اور اُلجھا کر رکھ دیتا ہے۔ تم توجہ سے دیکھتی رہو گی سوچتی رہو گی، کوششیں کرتی رہو گی تو کچھ نہ کچھ یاد آتا رہے گا۔“

ماروی گلاب کے ایک پودے کے پاس رک گئی۔ اس نے ایک خوبصورت سا گلابی پھول توڑ کر عدیلہ کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔“

عدیلہ نے خوش ہو کر کہا۔ ”تھینک یو۔ تم بہت محبت کرنے والی لڑکی ہو۔ میں تمہاری اس محبت کو گھر لے جاؤں گی۔ رات کو اپنے سرہانے رکھوں گی۔“

وہ دوسرے پودوں کی طرف جانے لگیں۔ عدیلہ نے کہا۔ ”روزانہ صبح سے رات تک ہمارا بہت سا وقت ساتھ گزرے گا۔ میں تمہیں موجودہ دور کی اور موجودہ ماحول کی بہت سی باتیں سمجھاتی اور سکھاتی رہوں گی۔ تمہیں ہمیشہ ایک دیہاتی ان پڑھ لڑکی بن کر نہیں رہنا چاہیے۔“

پھر اس نے پوچھا۔ ”اچھا اپنی تعلیم کے بارے میں بتاؤ۔ تم نے اردو اور انگریزی کتنی پڑھی ہے؟“

”میں اردو اور سندھی لکھ پڑھ لیتی ہوں۔ انگریزی کے صرف حروف پہچانتی ہوں۔“

”کیا ایسے الفاظ سمجھ لیتی ہو جیسے میسج Send کرنا۔ دروازے پر ناک کرنا۔ کال ریسو کرنا ....؟“

”ہاں انگریزی کے ایسے الفاظ سمجھ لیتی ہوں۔“

وہ بولی۔ ”Look at me“

ماروی نے اسے دیکھا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا تم سمجھ گئیں کہ میں تمہیں اپنی طرف دیکھنے کو کہہ رہی ہوں؟“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ”نہیں، میں آپ کو دیکھ رہی ہوں کہ انگریزی میں کیا کہہ رہی ہیں؟“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”نہ سمجھتے ہوئے بھی تم نے میری طرف دیکھا.......ویسے میں یہی کہہ رہی تھی۔“

وہ دونوں مخمل جیسی گھاس پر چہل قدمی کر رہی تھیں۔ عدیلہ نے کہا۔ ”آئی لائیک یو۔ آئی نیڈ یو۔“

ماروی چلتے چلتے رک گئی۔ اسے دیکھ کر بولی۔ ”میں کچھ سمجھ رہی ہوں۔ ٹی وی ڈرامے میں شیرازی نے فضیلہ سے ایسی ہی کوئی بات کی تھی۔ میری سمجھ میں آگیا تھا کہ وہ اس سے کوئی پیار بھری بات کہہ رہا ہے۔“

"عدیلہ نے کہا۔" تمہاری ذہنی صلاحیتوں کا ایک باب تاریکی میں گم ہوگیا ہے۔ اب یہ موجودہ کورا ذہن بھی توانا ہے۔ تم بہت جلد کسی بھی بات کو گرفت میں لے لیتی ہو۔

"میرے ساتھ انگریزی کے چھوٹے چھوٹے فقرے بولتی رہو۔ میں تمہیں کسی حد تک ایجوکیٹڈ بنا دوں گی۔ تم ایجوکیٹڈ کے معنی سمجھ رہی ہو نا؟"

"شاید آپ کہہ رہی ہیں کہ ---- کہ مجھے ایک بہت ہی قابل لڑکی بنا دیں گی۔"

"میں یہی کہہ رہی ہوں۔ لیکن مجھے آپ نہ کہو۔ میں نہ تو بزرگ ہوں۔ نہ استاد ہوں۔ ہم آپس میں سہیلی بن کر رہیں گے۔"

عدیلہ کی اپنائیت اور باتوں میں ایسا پیار تھا کہ وہ اسی لمحے سے اسے سہیلی مان گئی۔ سہیلیوں کے درمیان فاصلے ختم ہوجاتے ہیں۔ وہ بے تکلفی سے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑتی ہیں اور ایک دوسرے کے گلے لگتی ہیں۔

لیکن وہ عدیلہ کا ہاتھ پکڑنے سے کترا رہی تھی۔ فضیلہ اور شیرازی کے ڈرامے نے اسے اُلجھا دیا تھا۔ اُلجھن سلجھی تو نہیں تھی۔ تاہم اس سے فاصلہ رکھ کر خوش تھی۔ عدیلہ کی قربت اچھی لگ رہی تھی اور وہ محسوس کر رہی تھی کہ خود کو بھولنے کے بعد پہلی بار نئی نئی معلومات کے ساتھ اس دنیا کو دیکھ رہی ہے۔

شام کو عبدالرحمان نے بیٹے کو فون پر مخاطب کیا۔ "ہائے عدیل! گھر کب آ رہے ہو؟"

عدیلہ نے اپنے فون کو یوں دیکھا جیسے باپ کو تنبیہہ کر رہی ہو۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ماروی اور چاچی سے دور آ کر بولی۔ "پلیز پاپا! یہ یاد رکھیں کہ میں یہاں لیڈی ڈاکٹر ہوں مجھے فون پر بھی بیٹا نہ بولیں۔ میں نہیں چاہتی' یہاں کوئی سن لے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "اکثر ماں باپ بیٹیوں کو لاڈ پیار سے بیٹا کہتے ہیں۔ تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے' کسی کو شبہ نہیں ہوگا۔"

"ہمارے دل میں چور ہے۔ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کبھی چوری پکڑی جائے گی۔"

"اچھی بات ہے' جب تک اس کوٹھی میں رہو گی' میں تمہیں عدیلہ بیٹی کہوں گا۔"

"تھینک یو پاپا!"

"یہ بتاؤ کب تک آ رہی ہو؟"

"رات دس گیارہ بجے تک آؤں گی۔"

"یعنی بارہ گھنٹے سے زیادہ وقت وہاں گزارا کرو گی؟"

"کبھی بور ہو جاؤں گی تو بھاگ کر چلی آؤں گی۔"

اس نے سر گھما کر دور صوفے پر بیٹھی ہوئی ماروی کو دیکھا پھر مسکرا کر کہا۔ "شاید کبھی بوریت نہیں ہوگی۔ یہاں کا ماحول بہت ہی خوبصورت' بہت ہی اچھا ہے۔"

"تم نے اپنی مام سے اپنی پیشنٹ کی تعریف کی تھی۔ کیا واقعی وہ بہت خوبصورت اور پرکشش ہے؟"

"یس پاپا! کچھ ایکسٹرا آرڈنری ہے۔ میں اسے رہ رہ کر دیکھنے لگتی ہوں۔ یہ دوسری لڑکیوں سے الگ ہے۔"

"ایک بات پوچھوں؟"

"کم آن پاپا!"

"تم اس کی خوبصورتی کو صرف عدیلہ کی آنکھ سے دیکھ رہے ہو' یا عدیل کے دل سے محسوس کر رہے ہو؟"

وہ اس سوال کا فوراً ہی جواب نہ دے سکی۔ اس نے سر گھما کر ماروی کو دیکھا۔ باپ نے پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟ میں نے جولی کی وفات کے بعد کئی بار کہا ہے کہ اور ایک بار بہو لے آؤ۔ تم نے اپنی مام کو ایک بہو دی ہے۔ اب تمہارا فرض کیا ہے؟ کیا اپنے باپ کو ایک بیٹا نہیں دو گے؟"

"پلیز آپ ایسی باتیں یہاں فون پر نہ کریں۔"

"ابھی کروں گا۔ فون بند نہ کرنا۔ ابھی وہ تمہارے آس پاس کہیں ہوگی۔ تم اسے دیکھ رہے ہوگے۔ سچ بولو۔ تمہارا دل اس پر آ رہا ہے یا نہیں؟"

اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"میں اس سے ملنا چاہوں گا۔ تمہاری مام اس کی بڑی تعریفیں کر رہی ہیں۔ ظاہر ہے تمہاری زبان نے اس کا قصیدہ پڑھا ہے۔ تب ہی یہ کہہ رہی ہیں کہ ایک بار اور ایک بہو آ جائے۔"

"سوری پاپا! میں گھر آ کر بات کروں گی۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ وہیں دور سے ماروی کو دیکھنے لگی۔ اس نے تو پہلی ہی ملاقات میں محسوس کیا تھا کہ وہ سب سے الگ ہے اور سامنا ہوتے ہی اس کے دل کو چھو رہی ہے۔

جبکہ وہ جلد ہی اس سے متاثر ہو کر خود کو اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ماروی اور طرح کی لڑکی ہے۔ وہ سستے جذبات سے کبھی اس کی طرف مائل نہیں ہوگی۔

اسی لیے اس نے پہلے مرحلے میں اسے معشوق نہیں بنایا تھا۔ پہلے اسے سہیلی بنا لیا تھا۔ ماروی نے اپنے صوفے سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ "بات ہو گئی؟"

"ہاں میرے پاپا تھے۔"

وہ قریب آ کر اسے توجہ سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "تمہارے پاپا نے کوئی پریشان کرنے والی بات کی ہے؟"

وہ اس سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔ "نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بھلا پریشانی کیا ہوگی؟"

"اللہ کرے ایسی کوئی بات نہ ہو۔ پتا نہیں مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے۔"

عدیلہ نے کہا۔ "تم بہت اچھی ہو۔ بہت ذہین ہو۔ اندر کی فیلنگس کو سمجھ لیتی ہو۔ فیلنگز کا مطلب سمجھتی ہو؟"

"شاید تم کہہ رہی ہو کہ میں اندر کی بات کو سمجھ لیتی ہوں۔"

عدیلہ نے خوش ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی تعریف کرنا چاہتی تھی لیکن ماروی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہی اچانک تبدیلی محسوس ہوئی۔ یکبارگی عدیلہ نے اندر سے کروٹ لی۔ عدیل بیدار ہو گیا۔ وہ کچھ بول نہیں پائی۔ اس کا منہ کھلا پھر بند ہو گیا۔

ماروی نے پوچھا۔ "کیا ہوا....؟"

"کچھ تو ہے۔ تم کچھ بولنے والی تھیں۔"

"ہاں۔ تم اتنی اچھی لگ رہی ہو کہ تمہاری تعریفیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن الفاظ نہیں ملے تو منہ کھول کر چپ ہو گئی۔"

"اب میں اتنی بھی اچھی نہیں ہوں۔ مجھے مغرور نہ بناؤ۔"

عدیلہ نے کہا۔ "میں نے تمہارا ہاتھ پکڑا ہے۔ کل تم نے اپنی فیلنگ بتائی تھی۔ آج بولو' کچھ الگ سا محسوس کر رہی ہو؟"

"ہاں۔ جی چاہتا ہے یہ ہاتھ تمہارے ہاتھ میں ہی رہے۔"

اب تو اس کا دل بھی یہی کہہ رہا تھا۔ وہ بولی۔ "تم میری پیشنٹ بھی ہو اور سہیلی بھی ہو۔ اب تو ہاتھ میں ہاتھ رہے گا اور ہمیشہ ساتھ رہے گا۔"

ایسے وقت کار کا ہارن سنائی دیا۔ دونوں دروازے کے قریب تھیں۔ ماروی نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ محبوب اپنی کار سے باہر آ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی خوش ہو کر بولا۔ "یہاں آتے ہی پہلے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ کیسی ہو؟"

وہ بولی۔ "خدا کا شکر ہے۔ آپ کی مہربانی ہے۔"

عدیلہ نے اس کے لیے دروازے کو پوری طرح کھول دیا۔ وہ اس سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ "میں ماروی کے چہرے پر رونق دیکھ رہا ہوں اور یہ یقیناً تمہارا کمال ہے۔"

وہ بولی۔ "آف کورس یہ میرا کمال ہے۔ میں نے اسے مریضہ نہیں اپنی سہیلی بنایا ہے۔ آپ یقیناً میرے طریقہ کار کو میرے ٹریٹمنٹ کو سمجھ رہے ہوں گے۔"

محبوب نے سر ہلا کر کہا۔ "آف کورس...."

وہ بولی۔ "اب یہ صرف ایک ڈاکٹر کے ساتھ یہاں وقت نہیں گزارے گی۔ اپنے تمام معاملات کو میرے جیسی سہیلی کے ساتھ شیئر کرتی رہے گی۔"

"بہت خوب۔ آخر ایک ڈاکٹر ہو۔ انسانی نفسیات کو بڑی گہرائی تک سمجھتی ہو۔"

اس نے ماروی اور محبوب کے ساتھ چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آتے ہوئے کہا۔ "ابھی میں نے کہا ہے تم اپنے معاملات مجھ سے شیئر کرتی رہو گی۔ انگریزی کے ایسے الفاظ کو سنتی رہا کرو' سمجھتی رہا کرو اور بولتی بھی رہا کرو۔"

محبوب خوش ہو کر عدیلہ کو تعریفی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ علاج کرنے آئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ ایک آدھ گھنٹا اسے سائیکولوجیکل ٹریٹمنٹ دیتی۔ کچھ موثر دوائیں دیتی پھر چلی جاتی لیکن وہ اس کی معلمہ بھی بن رہی تھی۔ اسے موجودہ ماحول اور سوسائٹی کے مطابق رہنے سہنے اور بولنے کے طور طریقے بھی سکھا رہی تھی۔ کوئی ڈاکٹر بارہ گھنٹے کسی مریض کے پاس نہیں رہتا۔

محبوب کو یہ دیکھ کر اطمینان ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر عدیلہ صرف پیشہ ورانہ طور پر فرائض ادا کرنے نہیں آئی تھی۔ وہ صرف گھر میں آ کر نہیں' دل میں اتر کر اس بھولنے والی کو نئی یادیں نئی زندگی اور نئی محبتیں دے رہی تھی۔

یہ ایک ذرا مایوسی کی بات تھی کہ محبوب کو نئی محبتیں تو کیا' پرانی محبتیں بھی نہیں مل رہی تھیں۔ مراد بھی رہائی پا کر آنے کے بعد مایوس ہونے والا تھا۔ آئندہ وہ دونوں ماروی کے روبرو آتے جاتے رہیں گے۔ آس پاس بھٹکتے رہیں گے اور شہر دل میں داخل ہونے کا دروازہ نہ جانے کب تک ڈھونڈتے رہیں گے۔

عدیلہ رات کے کھانے سے پہلے گھر جانا چاہتی تھی۔ ماروی نے جانے نہیں دیا۔ اس سے کہا۔ "تم لنچ اور رات کا کھانا میرے ساتھ کھایا کرو گی' صرف صبح کا ناشتا گھر سے کر کے آؤ گی۔"

عدیلہ نے کہا۔ "تمہیں لنچ کہنا آ گیا ہے۔ میں نے... دوپہر کو یہ لفظ تمہارے سامنے کہا تھا۔ تم نے یاد کر لیا۔ آئندہ یہ یاد رکھو کہ رات کے کھانے کو ڈنر کہتے ہیں۔"

ماروی نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ تم ڈنر کر کے جاؤ گی۔"

محبوب مسکرانے لگا۔ وہ اس کی قربت سے اس کے

دیدار سے اور اس کی رس بھری باتوں سے سحر زدہ ہو رہا تھا۔
وہ کھانے کے بعد عدیلہ کو اپنی کار میں اس کے گھر پہنچانے گیا۔ راستے میں ماروی کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔ اس نے پوچھا۔ ''تمہاری اب تک کی ریڈنگ کیا ہے؟ کیا اندازہ کرتی ہو؟ کب تک اس کی یادداشت واپس آجائے گی۔''
اس کا ذکر ہوتے ہی وہ نگاہوں کے سامنے پھول کی طرح کھل گئی۔ تصور میں مسکرانے لگی۔ اس وقت عدیلہ کے نہیں عدیل کے دل میں دھڑکنے لگی۔ اس نے خود سے کہا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ کوئی معشوقہ نہیں ہے۔ میری پہیلی ہے۔''
پھر محبوب سے کہا۔ ''میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ... یادداشت کب تک بحال ہوگی۔ پچھلی زندگی کی تمام باتیں مٹ چکی ہیں۔ مجھے کوئی ایک سرا مل جائے تو میں اسے تھام لوں پھر اسے ہاتھ میں لے کر آگے بڑھوں۔''
''موجودہ ذہنی حالت کیسی ہے؟''
''بہت اچھی ہے۔ بہت ذہین ہے۔ اس کا ذہن کسی بھی بات کو پیچیدہ احساسات اور جذبات کو سمجھ لیتا ہے۔ کل سے اب تک اس نے بہت سی باتوں کو یاد رکھا ہے۔''
محبوب تھوڑی دیر تک خاموش رہا۔ ڈرائیو کرتا ہوا سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''بدترین حالات نے اسے چھین لینا چاہا۔ میں نے اسے ہاتھ سے بے ہاتھ ہونے نہیں دیا۔ لیکن کیا کروں؟ اپنی ہی تقدیر ظلم کر رہی ہے۔ اس سے کیسے لڑ سکتا ہوں؟''
عدیلہ نے اسے کن انکھیوں سے دیکھا۔ ان لمحات میں اچانک ہی محبوب اسے ایک رقیب جیسا لگا۔ پہلے صرف محبوب اور مراد بیمار تھے اور وہ ایک انار تب بھی ان سے دور تھا۔ اب وہی انار ڈاکٹر عدیلہ عرف عدیل رحمان کے ہاتھ میں آنے والا تھا۔ حالات کہہ رہے تھے کہ وہ ڈاکٹر مریض بن رہا ہے۔ اگر بن گیا تو شاید وہ بے چارے دو مریض دیکھتے رہ جائیں گے۔
وہ اپنے گھر پہنچ گئی۔ رخشی اور عبدالرحمان نے بڑی محبت سے محبوب کا استقبال کیا۔ اس نے کچھ دیر وہاں بیٹھ کر ماروی کی دماغی کمزوری کے متعلق گفتگو کی پھر ان سے رخصت ہو گیا۔
اس کے جاتے ہی باپ نے کہا۔ ''بیٹے! میں نے اور تمہاری مام نے فیصلہ کر لیا ہے۔ ہم اور انتظار نہیں کریں گے ہمیں جلد سے جلد ایک پوتا چاہیے۔''
عدیلہ نے کہا۔ ''میں نے وعدہ کیا ہے، مام کو ایک پوتی دی ہے تو آپ کو ایک پوتا ضرور دوں گی۔''
''ایسے وقت عدیلہ کی طرح نہ بولو۔ کہو کہ ضرور دوں گا۔''
''ہاں ضرور دوں گا۔''
''کب دو گے۔ جب میں مر جاؤں گا؟''
''آپ نہیں مریں گے۔ لمبی عمر جئیں گے۔''
''کیا تمہیں آسمان سے خبر ملی ہے کہ میں لمبی عمر جینے کا ٹھیکا لے کر آیا ہوں؟''
ماں نے کہا۔ ''کیوں پاپا کو ٹال رہے ہو۔ ایک چھوٹا سا کام ہے۔ جولی کی طرح کسی سے بھی شادی کرو۔ ایک بیٹا اپنے باپ کو دو۔ پھر چاہو تو اس ماں بننے والی کی چھٹی کر دو۔''
''پلیز مام! جب کسی کو اپنا بناؤں گا تو اسے کبھی نہیں ٹھکراؤں گا۔ وہ میرے گھر کی عزت اور میری ذمے داری ہوگی۔''
رخشی نے کہا۔ ''میری بچی میں انسانیت اور شرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ چلو کسی کو بھی گھر لاؤ۔ پر لاؤ تو سہی۔''
اس نے ماں کو دیکھ کر کہا۔ ''کہہ دیا ہے لاؤں گی۔''
پھر باپ کو دیکھ کر کہا۔ ''لاؤں گا۔''
''کہہ دینے سے ہماری تسلی نہیں ہوگی۔ جب لڑکی موجود ہے تو دیر کیوں کرتے ہو؟''
عدیلہ نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کہاں ہے لڑکی؟''
ماں نے کہا۔ ''ماروی... کل رات تم اس کی اتنی تعریفیں کر رہی تھیں کہ صاف پتا چل رہا تھا، اس پر فدا ہو گئی ہو۔''
''ایسی کوئی بات نہیں ہے مام!''
''نہیں ہے تو ہو جائے گی۔ کیونکہ وہ تمہیں اپنا قصیدہ پڑھنے پر مجبور کر رہی ہے۔''
''آپ دونوں اس کی ہسٹری نہیں جانتے۔''
''جانتے ہیں۔ کل ہی تو تم نے بتایا تھا کہ اس کی میموری بالکل ختم ہو گئی ہے۔''
رحمان نے کہا۔ ''یہ تو اور اچھا ہے، وہ سب کو بھول کر صرف تمہیں یاد رکھے گی۔''
''اور جب یادداشت واپس آئے گی تو شکایت کرے گی۔ روئے گی کہ میں نے اس کے ایک نہیں دو چاہنے والوں سے اسے چھین لیا ہے۔''
''اگر ہم اس بات کی ضمانت دیں کہ اس کی میموری واپس نہیں آئے گی تو اسے ہماری بہو بناؤ گے؟''
اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''آپ کیسے ضمانت دیں گے؟ ڈاکٹر میں ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ کسی نہ کسی دن اس کی یادداشت واپس آسکتی ہے۔''

''تم ہماری بات مانو گے ہم جیسا کہیں گے، ویسا کرو گے تو وہ صرف تمہیں ہی یاد رکھے گی۔''
''آپ مجھ سے کیا منوانا چاہتے ہیں؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟''
رخشی اور رحمان نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا پھر ماں نے کہا۔ ''ٹریٹمنٹ بدل دو۔ اس کی دوائیں بدل دو۔ دو نمبر دوائیں دو۔''
باپ نے کہا۔ ''تمام انحصار تمہارے ٹریٹمنٹ پر ہے۔ نہ تم یاد کرنے کی راہ پر اسے لگاؤ گے نہ کبھی اسے کچھ یاد آئے گا۔''
عدیلہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ حیرت سے ماں باپ کا منہ تکنے لگی۔ ایسا وہ آسانی سے کر سکتی تھی۔ ایسی سازش اس کے ذہن میں پک سکتی تھی لیکن اپنے پیشنٹ سے اور اس کے عزیزوں سے ایسی دغابازی کا خیال تک نہیں آیا تھا۔
رخشی نے پوچھا۔ ''کیا سوچ رہی ہو؟ کیا ماروی میری بچی سے راضی نہیں ہوگی؟''
عدیلہ نے کہا۔ ''اسے راضی کرنا بعد کا مسئلہ ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ میں ماروی سے چیٹ نہیں کروں گی۔ اس کے اعتماد کو کبھی دھوکا نہیں دوں گی۔''
باپ نے کہا۔ ''دھوکا نہ دو۔ دھوکا ضروری نہیں ہے۔ میرا بیٹا اتنا ہینڈسم اور اسمارٹ ہے کہ ماروی اسے اصلی روپ میں دیکھے گی تو ہزار جان سے عاشق ہو جائے گی۔''
''ہم اسے راضی کر لیں گے لیکن بات تو تمہارے راضی ہونے سے بنے گی۔ تم خوامخواہ ہمیں ٹال رہے ہو۔''
عدیلہ ان سے بحث کر رہی تھی۔ اندر سے خود ہی کمزور پڑ رہی تھی۔ وہ چھپا ہوا عدیل بے اختیار ماروی کی طرف جھک رہا تھا اور اسے سمجھا رہا تھا کہ آج وہ تمام دن اس کی سہیلی بن کر اپنے آپ کو دھوکا دیتا رہا ہے۔
وہ ان کے سامنے سے اٹھ کر جانے لگی۔ باپ نے کہا۔ ''میں نے Andorens Hormones کے انجکشن لا کر رکھے ہیں۔ کل صبح جانے سے پہلے ہمارے سامنے ایک انجکشن لو گے تب ہمیں اطمینان ہوگا کہ بہلانے والے ہو۔''
وہ کوئی جواب دیے بغیر تیزی سے چلتی ہوئی اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ دروازہ کھولتے ہی بیڈ کے سرہانے والی میز پر انجکشن کے وہ پیکٹس نظر آئے۔ اس کی نظریں ان پر ٹھہر گئیں۔
ہارمونز انسانی زندگی میں سب سے زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس وقت سرہانے کی میز پر جو ہارمونز کے انجکشن رکھے ہوئے تھے، ان کے اثر سے نسوانیت کم سے کم ہو جاتی تھی۔ مردانگی کے احساسات اور جذبات میں اضافہ ہونے لگتا تھا۔
جولی کی طرف مائل ہونے کے لیے اس نے انہی انجکشن کا سہارا لیا تھا۔ پیدائشی اور فطری طور پر تو مرد تھا ہی اس انجکشن کی تاثیر یہ تھی کہ اسے نظر انداز کی ہوئی مردانگی کی طرف آسانی سے واپس لے آتے تھے۔
وہ دروازہ بند کر کے بیڈ کے پاس آئی پھر فوم کے گدے پر تھکے ہوئے انداز میں گر گئی۔
نہیں.... گر گیا۔

☆☆☆

پولیس اور انٹیلی جنس والے جیلر ولاور جان کو فرار ہونے کے ہر راستے پر ہر صوبے میں تلاش کرتے رہے تھے لیکن وہ ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اس کی بیٹی مرینہ کو حراست میں لے لیا گیا تھا۔ وہ فرار ہونے کے قابل نہیں تھی۔ سکھر کے اسپتال میں پڑی تھی۔
MET آفیسر کی حیثیت سے اس کی فائل پڑھی گئی۔ معلوم ہوا کہ وہ اینٹی ٹیررا سکواڈ کی جانب سے دارا اکبر اور بہزاد کے ساتھ پاکستان آئی تھی۔ برنارڈ سے ان تینوں کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ برنارڈ جیسے قاتل سیکرٹ ایجنٹ سے کیسے مل گئے؟ کیسے ان کا گٹھ جوڑ ہو گیا یہ اینٹی ٹیررا سکواڈ کے ذمے داران نہیں جانتے تھے۔
یہ الزام تھا کہ مرینہ نے اپنے جیلر باپ کے ذریعے برنارڈ کے فرار کے سلسلے میں بڑی سہولتیں پیدا کر دی تھیں۔
لندن کے ذمے دار افسران نے مرینہ، دارا اکبر اور بہزاد کے خلاف بیان دیا۔ یوں وہ تینوں MET افسران نہ رہے۔ مجرم کہلائے۔ بہزاد تو برنارڈ کے ساتھ مارا گیا۔ دارا اکبر کو آہنی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا۔ مرینہ زخمی تھی چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھی۔ اسے پولیس اسپتال میں علاج کے لیے بھیج دیا گیا۔
لندن کی ایک خطرناک MET آفیسر کہلانے والی مرینہ بری طرح پھنس گئی تھی۔ اپنی بہترین ملازمت سے گئی تھی۔ ایک بڑی جیل کا حکمران باپ مفرور مجرم بن گیا تھا۔ وہ ایسی حالت میں تھی کہ اس کے آگے پیچھے مدد کرنے والا اور اسے سہولتیں پہنچانے والا کوئی نہیں رہا تھا۔
کیسی عجیب بات تھی کہ ایسی ایجوکیٹڈ تربیت یافتہ ضدی اور مغرور لندن پلٹ پولیس افسر کو ایک گدھا گاڑی

والے نے ایسی کسمپرسی کی حالت میں پہنچا دیا تھا۔ وہ کئی دنوں تک جھنجلاتی رہی۔ مراد کو گالیاں دیتی رہی پھر عقل نے سمجھایا کہ وہ جاہل اور کمزور عورتوں کی طرح پیچ و تاب کھا رہی ہے۔

اس نے ایک نئے اعتماد اور حوصلے سے زیرلب کہا۔ ''میں کمزور اور بے بس رہ کر زندگی گزارنے کے لیے پیدا نہیں ہوئی ہوں۔ میرا نام مرینہ ہے۔ مجھے کوئی قیدی بنا کر نہیں رکھ سکے گا۔ میں یہاں سے مکھن کے بال کی طرح نکل جاؤں گی۔''

اس نے پولیس کے ایک اعلیٰ افسر کو اپنا بیان دینے کے لیے بلایا۔ اس نے اسپتال کے کمرے میں آکر کہا۔ ''تمہارے پاس بیان دینے کے لیے کیا رہ گیا ہے۔ تمہارے دو ساتھیوں میں ایک قاتل برنارڈ کے ساتھ مارا گیا ہے، دوسرا جیل میں ہے۔ تیسری تم یہاں پڑی ہو۔''

اس نے کہا۔ ''آفیسر! بیان مجھے دینا ہے اور تم ہو کہ بولتے جا رہے ہو۔ چلو بولتے رہو۔ جب تھک جاؤ گے تو میں بولوں گی۔''

وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''ہاں سب ہی کہتے ہیں کہ میں بہت بولتا ہوں۔ یہ میری بہت ہی بری عادت ہے۔ لو چپ ہو گیا۔ اب بولو۔''

مرینہ نے کہا۔ ''میں نے کسی کو قتل کیا ہے نہ کسی کو جسمانی اور دماغی نقصان پہنچایا ہے۔ کہیں ڈکیتی نہیں کی ہے۔ دنیا کی تمام پولیس اور تمام جاسوس مجھے مجرم ثابت کرنے کے لیے کہیں سے ثبوت اور چشم دید گواہ پیش نہیں کر سکیں گے۔''

''یہ تم کہہ رہی ہو۔ تمہاری گرفتاری کا حکم دینے والوں کے پاس تمہارے خلاف ثبوت بھی ہوں گے اور گواہ بھی۔''

''میں اپنی صفائی پیش کرنے، اپنا مقدمہ خود لڑنے کے لیے قانونی سہولتیں چاہتی ہوں۔''

افسر نے کہا۔ ''سہولتیں ضرور ملیں گی۔ تم عرضی لکھو۔ میں اسے اوپر تک پہنچاؤں گا۔''

اس نے اپنا مقدمہ آپ لڑنے کے لیے لکھا کہ قانونی اور عدالتی معاملات سے نمٹنے کے لیے اس کا کوئی عزیز رشتے دار نہیں ہے۔ لہٰذا اسے حراست میں رہ کر مقدمہ لڑنے کی سہولتیں دی جائیں اور اس کی عرضی جلد ہی منظور کی جائے۔

وہ عرضی بھیج کر انتظار کرنے لگی۔ اسے دو ہی دنوں میں عدالت سے اجازت نامہ حاصل ہو گیا۔ یہ اس کی پہلی کامیابی تھی۔ اس کی ماں کراچی سے اس کی دیکھ بھال کے لیے آتی رہتی تھی۔ اس نے ماں سے کہا کہ وہ کراچی واپس جائے اور ایک تجربہ کار اور شاطر وکیل کی خدمات حاصل کرے۔

دوسرے ہی دن وہاں سے ایک وکیل انوار فاروقی اس سے ملنے سکھر آ گیا۔ مرینہ نے اپنی تمام رام کہانی اسے نوٹ کرائی اور یہ اہم پوائنٹس نوٹ کرائے کہ برنارڈ کے ساتھ جیل توڑنے اور فرار ہونے کے جرم میں وہ شریک نہیں تھی۔ جس رات وہ فرار ہوا اس رات وہ سکھر کے اسپتال میں پڑی تھی۔ کسی ثبوت اور گواہ کے بغیر اس پر الزام لگایا جا رہا ہے۔ اس بات کا بھی ثبوت نہیں ہے کہ اس نے دارا اکبر اور بہزاد کو ساتھ لے کر برنارڈ سے گٹھ جوڑ کیا تھا اور جیلر باپ کے تعاون سے فرار ہونے کی راہ ہموار کر رہی تھی۔ اگر باپ نے ایسا کیا تھا تو باپ مجرم ہے کوئی قانون باپ کے جرم کی سزا بیٹی کو نہیں دے گا اور یہ کوئی الزام نہیں دے سکے گا کہ اس نے لندن سے یہاں آ کر کسی کو گولی ماری ہے یا کہیں ڈکیتی کی ہے۔ کوئی ایک چھوٹا سا جرم بھی اس کے خلاف ثابت نہیں کیا جا سکے گا۔

وکیل انوار فاروقی نے بڑے اعتماد سے اسے یقین دلایا کہ وہ جلد ہی قانون کی کمزور گرفت سے اسے رہائی دلائے گا۔

وہ اسکاٹ لینڈ یارڈ کی تربیت یافتہ تھی۔ قانون کے خطرناک کھلاڑیوں سے کھیلنا جانتی تھی۔ مراد اس کے سینے میں کیل کی طرح گڑا ہوا تھا۔ وہ پہلے اس کیل کو نکالنے کے لیے اس کی زندگی سے کھیلنا چاہتی تھی۔

یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ وہ سکھر میں اسے نیم مردہ کر کے کہاں گیا ہے؟ عقل کہتی تھی، وہ ماروی کے پیچھے کراچی ہی گیا ہے اور محبوب اسی کی جگہ جیل میں موجود ہے۔

اس نے اخبار پڑھا تھا اسپتال کے ٹی وی پر خبریں سنی تھیں کہ جیل کے قیدی نمبر سات سو سات مراد علی منگی نے فرار ہونے والے برنارڈ کو اور اس کے ایک ساتھی کو گولی مار دی ہے۔

اسے عزت اور شہرت مل رہی تھی۔ کہا جا رہا تھا کہ ایک سیکریٹ ایجنٹ کہلانے والے بدنام مجرم کو سزا اس نے دے دی تھی۔ مرینہ کے لیے اور جلنے کڑھنے والی بات یہ تھی کہ پورے ملک میں اس کی واہ واہ ہو رہی تھی اور کہا جا رہا تھا کہ وہ اس ماہ کی بائیس تاریخ کو رہائی پانے والا ہے۔ وہ اسی حد تک جانتی تھی کہ جیل میں محبوب ہے۔ کارنامہ اس نے انجام دیا ہے اور داد مراد کو مل رہی ہے۔

اس نے وکیل فاروقی سے پوچھا۔ ''اگر میں یہ ثابت کر دوں کہ مراد اور محبوب دو ہم شکل قانون کی آنکھوں میں

دھول جھونک رہے ہیں۔ وہاں اصل قیدی مراد کی جگہ محبوب ہے تو کیا اصل قیدی کو فرار کرانے کے جرم میں محبوب کو سزا نہیں ہوگی؟''

فاروقی نے کہا۔ ''جرم تو پھر جرم ہے۔ سزا تو ضرور ملے گی اور وہ مراد جو رہائی پانے والا ہے، اسے مفرور قرار دیا جائے گا۔ وہ قانون کو مطلوب ہوگا۔''

''یہی میں چاہتی ہوں۔ عدالت کی طرف سے مراد کو جو رہائی ملنے والی ہے، وہ اٹک جائے۔ دو ہم شکل مجرموں کا کیس نئے سرے سے شروع ہو جائے۔''

''اگر تمہارے بیان کے مطابق ابھی جیل میں مراد نہیں ہے، محبوب ہے تو پھر مراد قانوناً مفرور ہے۔ بہت بڑا کارنامہ انجام دینے کے باوجود اس کی رہائی روک دی جائے گی۔''

مرینہ نے اسی وقت اپنے زخمی ہو کر اسپتال پہنچنے کا بیان لکھا۔ ''میں سکھر میں تھی۔ تب جام تھارو کے وڈیرے زادے شاہ داد اور اس کے حواریوں سے دشمنی ہو گئی تھی۔ وہاں کے ایک تاریخی کھنڈر میں ان کے ساتھ کاؤنٹر فائرنگ ہوئی تھی۔

''اچانک معلوم ہوا کہ اس کھنڈر میں مراد علی منگی چھپا ہوا ہے۔ وہ بھی اپنی جان بچانے کے لیے ہم پر فائرنگ کر رہا تھا۔ انجام کار شاہ داد دو حواریوں کے ساتھ مارا گیا۔ باقی دو چار فرار ہو گئے۔ میں بھی بری طرح زخمی ہوئی تھی۔ میں نے مراد سے کہا۔ ''تم جیل سے نکل کر آئے ہو۔ تمہیں تلاش نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہارا ہم شکل جیل میں تمہاری جگہ ہے۔''

اس نے اعتراف نہیں کیا۔ اپنی اصلیت چھپاتے ہوئے کہا۔ ''تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میں مراد نہیں محبوب ہوں۔''

''میں نے محبوب کے بازو پر گولی کے زخم کا نشان دیکھا ہے۔ وہ مٹ نہیں سکتا۔ جبکہ تمہارے بازو پر نہیں ہے تم مفرور قیدی سات سو سات ہو۔''

''اس بات پر اس نے گولیاں چلائیں۔ میں اس کا مقابلہ کرتی رہی آخر چھلنی ہو کر گر پڑی۔ وہ مجھے مردہ سمجھ کر چلا گیا۔''

''اس نے بیان میں لکھا کہ وہ مفرور مراد اب جیل کے باہر ہے۔ قانون کو دھوکا دینے کے لیے وہاں اس کا ہم شکل موجود ہے۔ اس کا جلد سے جلد محاسبہ کیا جائے تو حقیقت سامنے آ جائے گی۔''

وکیل نے اس کا بیان عدالت میں پہنچایا۔ قیدیوں

امداد باهمی

قارئین کو یاد ہوگا۔ پاکستانی سینماؤں پر نئی فلم جمعۃ المبارک کے دن لگتی تھی۔ کئی تماشائی جمعۃ المبارک کی نماز ادا کیے بغیر سینما کا رخ کرتے تھے اور کئی جمعۃ المبارک کی نماز پڑھ کے نئی فلم دیکھنے چلے آتے تھے تاکہ نیکی اور برائی کا پلڑا برابر رہے۔ نیکی کا پلڑا جھکنے نہ پائے، فلم دیکھنے کا مزہ بھی آئے۔ جمعے کے روز سینماؤں پر بڑا رش ہوتا تھا، ٹکٹ بلیک میں فروخت ہوتے تھے۔ عموماً تھرڈ کلاس کی کھڑکی کی قطار سب سے طویل ہوتی تھی۔ ایک جمعے کا ذکر ہے۔ تھرڈ کلاس کی وری پر بڑا رش تھا۔ بطور دکھاوا قطار کا نظم وضبط درست کرنے کے لیے دو پولیس کے سپاہی آ گئے۔ ایک سپاہی دھان پان سا تھا۔ اس کی پتلون بھی ڈھیلی ڈھالی سی تھی۔ ایک آدمی دھکے سے قطار سے باہر ہوا تو کمزور پولیس والے نے اسے ڈنڈا رسید کر کے قطار سے نکال دیا۔ سپاہی کی پتلون ذرا سی نیچے کھسک گئی تو اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی پتلون کو پکڑ کے اوپر کیا۔ دوسرا سپاہی فوراً بول اٹھا۔ ''کریم بخشا! پتلون دی فکر چھڈ۔ تو قطار سِدھی رکھ۔ میں تیری پتلون تے ہتھ رکھناواں۔''

مرسلہ۔ بشیر احمد بھٹی، فوجی بستی، بہاولپور

نصیب

☆ بہت ڈر لگتا ہے مجھے ان لوگوں سے جو باتوں میں مٹھاس اور دل میں زہر رکھتے ہیں۔

☆ کبھی بھی اپنے نصیب کو برا مت کہو، کیونکہ تمہارا نصیب ہی ہے کہ میرے جیسا زبردست نائس انسان تمہارا دوست ہے، رونا، گانا چھوڑ، اہمیت دیکھ اپنی، میرے جیسے لوگ قسمت والوں کو ملتے ہیں۔

مرسلہ۔ رضوان تنولی کریڈی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

کے بدلنے کا اور فرار ہونے کا الزام ایسا سنگین اور چونکا دینے والا تھا کہ دوسرے ہی دن تحقیقات کرنے والی ٹیم قیدی نمبر سات سو سات کو چیک کرنے پہنچ گئی۔

جب نئے مجرموں کو قیدی بنانے کے لیے جیل خانے میں لایا جاتا ہے تو ان کے ساتھ مقدمات اور عدالتی فیصلے کی فائل ہوتی ہے۔ اس فائل کے ایک کاغذ پر قیدی کے جسم کا کوئی خاص شناختی نشان بھی لکھا جاتا ہے۔

مراد کو پہلی بار قیدی بنا کر لایا گیا تو اس کے دونوں بازوؤں پر کسی بندوق کی گولی کا نشان نہیں تھا۔ نشان محبوب کے بازو پر تھا۔ مرینہ کو پورا یقین تھا کہ جیل میں محبوب ہے۔ بازو کے نشان کے باعث بھید کھل جائے گا کہ وہ اصل قیدی مراد نہیں ہے۔

لیکن مرینہ کو مایوسی ہوئی۔ وکیل نے فون پر بتایا کہ وہاں اصل قیدی نمبر سات سو سات مراد علی منگی موجود ہے۔

یہ یقین کرنے والی بات نہیں تھی۔ مراد جیل سے باہر آنے کے بعد مرینہ کو دھوکا دے کر اسے بلوچستان اور سندھ کے علاقوں میں اپنے پیچھے دوڑا تا رہا تھا۔ آخری بار گھنڈر میں بھی وہی اس کے مقابلے پر تھا اور وہاں اسے نیم مردہ حالت میں چھوڑ کر گیا تھا۔

اب معلوم ہو رہا تھا کہ وہ پھر جیل کے اندر بیٹھا ہوا ہے۔ یوں سمجھ میں آ رہا تھا کہ دونوں ہم شکل نے پھر بڑی چالاکی سے ایک دوسرے کی جگہ بدل لی ہے۔

بہرحال مراد پر مرینہ کا یہ حملہ ناکام رہا تھا۔ ایک اچھی خبر یہ تھی کہ مرینہ کے مجرم ہونے یا نہ ہونے کے سلسلے میں عدالت سے رپورٹ طلب کی گئی تھی۔ اگر اس کے حق میں یہ رپورٹ ہوتی کہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا ہے اس کے خلاف کوئی ثبوت اور گواہ نہیں ہے اور ابھی مقدمہ تیار کیا جا رہا ہے تو پھر یقیناً اسے ضمانت پر رہائی کا حکم دے دیا جاتا۔

وہ نو سو چوہے مارنے والی بلی پھر سے پارسا بننے والی تھی۔

☆☆☆

عدیلہ رات کو سونے سے پہلے عدیل بن جاتی تھی۔

یہ روز کا معمول تھا۔ وہ بدن کا سارا سامان اتار کر ہلکا پھلکا ہو کر آرام سے سو جاتا تھا۔ اس رات آرام نہیں تھا۔ بے چینی اور الجھن سی تھی۔ بیڈ کے سرہانے ہارمونز کے انجکشن رکھے ہوئے تھے۔ ماں باپ ایک پوتا حاصل کرنے کے لیے اس کے پیچھے پڑ گئے تھے۔

اسے پھر ایک بار باپ بننے کے لیے عدیل بن کر رہنا تھا اور اس بار اسے کسی لڑکی کی طرف جبراً مائل ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ دل خود ہی ماروی کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ لیکن اس کا دل جیتنے کے سلسلے میں آئندہ بڑی پیچیدگیاں اور سوالیہ نشانات تھے۔

پہلی بات تو یہ کہ ماروی پر حقیقت ظاہر کرنے کے لیے اسے اپنا رازدار بنانا ہوگا۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ خود کو بھولنے والی اس کے پیار میں مبتلا ہوگی یا نہیں؟

اس کی اصلیت معلوم ہوگی تو ماروی کا ردعمل کیا ہوگا؟ اور اگر راضی ہو جائے گی، مراد اور محبوب کی محبتیں اسے دے گی تو وہاں سب پر ظاہر کرنا ہوگا کہ وہ ڈاکٹر عدیلہ نہیں ہے اور جب یہ بھید کھلے گا کہ وہ مرد ہے اور عورت بن کر سب کو دھوکا دیتا رہا ہے تو ماروی کے اطراف جتنے دوست اور رشتے دار ہیں، وہ دشمن بن جائیں گے۔ وہ بہروپیا بن کر مراد اور محبوب کی محبوبہ کو حاصل کرے گا۔ وہ دونوں یہ فریب برداشت نہیں کریں گے۔ کیا ان دونوں کی عداوتیں مول لینا دانشمندی ہوگی؟

وہ بیڈ پر کروٹ لیتے ہوئے سوچنے لگا۔ "دانشمندی یہ ہوگی کہ بھید نہ کھلے۔ میں عدیلہ ہی بن کر رہوں ایک سائیکو لوجسٹ کی حیثیت سے میرا کیریئر سلامت رہے۔

اور یہ تب ہی ہوگا جب ماروی دل و جان سے میری ہوگی اور میرے راز کو راز رکھے گی۔ کسی سے نہیں بولے گی کہ میں اس کے جسم و جان کا مالک بن گیا ہوں۔ ایسا ممکن ہے۔ ماروی میرے پیار کے جنون میں مبتلا ہوگی تو کبھی میرا بھید نہیں کھولے گی۔

اس کے برعکس کچھ اور ہوا تو؟

تو دیکھا جائے گا۔ میرا کیا بگڑے گا۔ یہاں ذرا بھی کسی کو معلوم ہوگا کہ میں عدیلہ نہیں ہوں عدیل ہوں تو میں پاکستان چھوڑ دوں گی۔ لندن میں اپنا کیریئر بناؤں گی۔

وہ سوچتے سوچتے سو گئی۔ کہتے ہیں سوتے وقت انسان خالی الذہن ہو جاتا ہے۔ نیند میں اپنے آپ سے غافل ہو جاتا ہے۔ پھر غافل ہو کر بھلا کیا سوچے گا؟

ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ آدمی نیند میں بھی غیر شعوری طور پر سوچتا ہے اور وہ سوچ خواب بن کر دکھائی دیتی ہے۔

اس نے نیند میں ماروی کو دیکھا وہ مسکرا رہی تھی کہہ رہی تھی۔ "ابھی تو میں ایک سادہ کاغذ ہوں کوئی بھی پیار سے جیت کر اس کاغذ پر اپنا نام لکھ سکتا ہے۔

آؤ نا۔۔۔ لکھو نا۔۔۔۔ میرے وجود کو اپنے نام کر دو نا۔۔۔!"

اس کی آنکھ کھل گئی۔ صبح ہو گئی۔ سامنے کی دیوار اوپر

سے نیچے تک آئینہ تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آئینے میں وہ بیٹھا ہوا تھا۔ نکھرا اور بنیان میں تھا۔ کوئی عدیلہ وہاں نہیں تھی۔

مرد کو مرد ہی رہنا چاہیے۔ وہ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر ناشتے کی میز پر آیا تو باپ نے اسے ہارمونز کا انجکشن لگایا۔ پھر کہا۔ "یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے کہ ماروی راضی ہو جائے گی تو اس کے ساتھ میرج لائف کیسے گزارو گے؟"

"نو پرابلم، اس لڑکی کا اپنا سگا کوئی نہیں ہے۔ چاچی، چاچا، مراد، محبوب اور معروف وغیرہ چلتے پھرتے۔۔۔ سرپرست ہیں۔

"وہ لندن جا کر رہنے کے لیے راضی ہو جائے گی تو کوئی اسے تمہارے ساتھ جانے سے روک نہیں سکے گا۔ وہاں تمہارے عدیل ہونے کا بھید کھلے گا تو کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

ماروی تو یوں بھی اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ باپ اسے اور اس کے اندر پکار رہا تھا۔ وہ معمول کے مطابق دس بجے اپنی مریضہ کے پاس خود مریض بن کر پہنچ گیا۔

وہی نازک اندام ماروی تھی۔ وہی خوبصورت ماحول تھا پر احساسات بدل گئے تھے۔ وہ پہلی بار اس کے سامنے خود کو عدیلہ کم عدیل زیادہ سمجھ رہا تھا۔

اسے ایک معالج کی حیثیت سے اس کے ساتھ زیادہ رہنا تھا اور ان کے درمیان فاصلہ بھی کم سے کم ہونے والا تھا۔ ماروی اسے دل و جان سے اپنی سہیلی سمجھتی تھی اس لیے جھجکتی نہیں تھی۔ کبھی بھی لگ کر بیٹھ جاتی تھی۔ بھلا سہیلی سے کیا شرمانا اور کترانا۔۔۔۔؟

اس روز عدیلہ نے تنہائی میں پوچھا۔ "یوں لگ کر بیٹھی ہو، کیسا لگ رہا ہے؟"

وہ بولی۔ "اچھا لگ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے تم دن رات میرے ساتھ رہو۔"

"تم ایک بار سمیرا سے بھی لگ کر بیٹھی تھیں۔ وہ تمہیں کیسی لگ رہی تھی؟"

"وہ بھی اچھی لگ رہی تھی۔"

پھر وہ کچھ سوچنے لگی۔ عدیلہ نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا سوچنے لگیں؟"

وہ بولی۔ "تم سمیرا سے الگ ہو۔ ابھی سوچ رہی ہوں کہ چاچی اور میڈم روزی سے بھی الگ ہو۔ میں ان سے بھی لگی رہتی ہوں۔ ابھی تم پوچھ رہی ہو تو فرق محسوس ہو رہا ہے۔"

"کیا فرق ہے بولو؟"

ماروی اسے دیکھ کر سوچنے لگی۔ وہ محسوس تو کر رہی تھی۔ مگر فرق سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

عدیلہ نے ذرا قریب ہو کر اسے ایک بازو کے حصار میں لے کر اپنے وجود سے لگا لیا۔ پھر کہا۔ "بھول گئی ہو تو اب سمجھو۔ شاید سمجھ میں آ جائے۔"

اس نے یکبارگی محسوس کیا کہ دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئی ہیں۔ کچھ الگ سا، کچھ اچھا سا لگ رہا ہے۔

لیکن کیا اچھا لگ رہا ہے؟ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ عجیب سی الجھن تھی۔ عدیلہ نے کہا۔ "کچھ بولو؟"

وہ دونوں بانہیں اس کی گردن میں ڈال کر بولی۔ "میں نہیں جانتی کیا بولوں۔ بس تم اچھی لگ رہی ہو۔"

وہ نہیں سمجھ رہی تھی۔ عدیلہ یا عدیل سمجھ رہا تھا اور اس کے دل کی دھڑکنیں کہہ رہی تھیں کہ وہ سیدھی سادی سی لڑکی ان جذبات کو نہیں سمجھ رہی ہے۔ جو شعوری طور پر سمجھ میں نہیں آ رہے ہیں لیکن اس کے قریب آنے سے اسے بے چین کر رہے ہیں۔

جیسے ایک اندھی لڑکی سورج کو دیکھ نہیں سکتی لیکن دھوپ کو اپنی بند آنکھوں پر محسوس کرتی ہے۔ کچھ ایسا ہی اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔

عدیلہ نے اس کے چہرے کو دونوں ہتھیلیوں میں لے کر کہا۔ "ایک بات بولوں، تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔"

"یہ تو میں نے ابھی کہا ہے کہ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔"

"ہاں مگر تمہارے اندر زیادہ کشش ہے۔ اتنی کشش ہے کہ تمہارا علاج کرنے کے بعد بھی تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکوں گی۔"

"میرے بس میں ہوگا تو تمہیں کبھی نہیں جانے دوں گی۔ دیکھا جائے تو میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ کسی سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ پتا نہیں آگے میرا کیا ہونے والا ہے؟ میں آئندہ تمہارے ساتھ کیسے رہ پاؤں گی۔"

"اگر میں کہوں، میرے ساتھ چلو تو چلو گی؟"

"ہاں تم مجھے بالکل اپنی لگ رہی ہو۔ جیسی کشش تمہاری ذات میں محسوس کر رہی ہوں، کسی اور میں نہیں پا رہی ہوں۔ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔"

عدیلہ نے اسے گلے لگا لیا۔ دو سہیلیاں ایک دوسرے سے لگ کر بولنے لگیں۔ "وعدہ کرو۔ ہمیشہ ساتھ رہو گی۔"

"میں تو رہوں گی۔ میرا کوئی نہیں ہے۔ میری دنیا کہیں گم ہو گئی ہے۔ آج سے تم ہی میری دنیا ہو۔"

"اور آج سے تم بھی میری ہو۔ میری اپنی ہو۔ وعدہ

کرو میں جو کہوں گی تم وہ کرو گی۔"

"تم مجھے حکم دو گی تو اچھا لگے گا۔"

"پہلا حکم یہ ہے کہ ہم دو سہیلیوں کی جو بھی باتیں ہوں گی' وہ کسی تیسرے کو نہیں بتاؤ گی۔"

"میرا کون ہے' جسے میں بتاؤں گی؟"

"ہماری کوئی بھی چھپانے والی بات ہوگی' اسے چاچی سے بھی نہیں بولو گی۔"

بند کمرے کے باہر چاچی مٹی کھڑکی کے پاس سے گزر رہی تھی۔ پردہ ذرا ہٹا ہوا تھا۔ اس نے اندر دیکھا تو وہ دونوں ایک دوسرے کی آغوش میں دکھائی دیں۔

وہ پہلے حیران ہوئی پھر خوش ہوئی۔ پچھلے تین دنوں سے دیکھتی آرہی تھی کہ وہ لیڈی ڈاکٹر ماروی سے بہت پیار کرتی ہے۔ اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارتی ہے۔

صرف وہی نہیں محبوب' معروف اور سمیرا بھی کہہ رہے تھے کہ عدیلہ توقع سے زیادہ فرض شناس ہے۔ بڑی ذمہ داری سے' بڑی توجہ سے اس کا علاج کر رہی ہے۔ مٹی کو یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اس نے ماروی کو اپنی سہیلی بنالیا ہے اور اسے انگریزی کی دو چار باتیں بھی سکھانے لگی ہے۔ ایسی محبت کرنے والی کہاں ملے گی کہ علاج بھی کر رہی تھی اور اپنے جیسی پڑھی لکھی لڑکی بھی بنا رہی تھی۔

مٹی نے دل ہی دل میں کہا۔ "خدا اس ڈاکٹر کو سلامت رکھے اور اس کے دل کی مرادیں پوری کرے۔"

وہ دعائیں دیتی ہوئی کھڑکی کے پاس سے چلی گئی۔ عدیلہ اس کی دعاؤں کے مطابق مرادیں پوری کرنے کی راہ پر چل پڑی تھی۔ ابھی تو یہ ابتدا تھی۔ ابھی وہ ماروی کو اپنی قربت سے اس طرح آشنا نہیں کرا رہی تھی جس طرح اس نے جولی کو کرایا تھا۔ ماروی بھی اس سے ایسے لگتی تھی جیسے چاچی کے گلے لگ رہی ہو۔

گلے لگ کر جادو جگانے اور جذبات میں ہلچل پیدا کرنے کا انداز ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اسے رفتہ رفتہ معلوم ہونے والا تھا کہ وہ کسی سہیلی کے نہیں' ایک دوست کے گلے لگا کرتی ہے۔

اور وہی نہیں' اس کے آس پاس رہنے والے کبھی یہ معلوم نہیں کر سکتے تھے کہ عدیلہ جاڑے کی دھوپ ہے۔ باہر سے ٹھنڈی ملائم ہے' اندر سے حرارت پہنچا رہی ہے۔

سمیرا اور معروف نے انہیں ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور ایک دوسرے سے لگتے دیکھا تھا۔ وہ بھی کسی طرح کا شبہ نہیں کر سکتے تھے۔

محبوب معمول کے مطابق شام کو آیا تھا اور رات دس بجے عدیلہ کو گھر پہنچانے گیا تھا۔ اس نے بھی دونوں سہیلیوں کو کئی بار ایک دوسرے سے بے تکلف ہوتے دیکھا تھا۔ ایسے وقت عدیلہ کی جگہ عدیل نظر آجاتا تو وہ اسے گولی مار دیتا۔

وہ ان کی جاگیر نہیں تھی۔ اپنی مرضی کی مالک تھی۔ اس کا دل جدھر جاتا وہ اُدھر جاتی۔ اس وقت حالات کیا ہوتے؟

ابھی تو وہ ان کی اپنی' صرف اپنی لگ رہی تھی۔ لیکن وہ دونوں اپنی مرضی اس پر مسلط نہیں کر سکتے تھے۔ اب تو اس کی ایک نئی زندگی' نیا ذہن' نئی سوچ تھی۔ تو نئی محبت اور نیا محبوب بھی ہوتا۔

اگر ہوا کا رُخ بدلتا تو وہ دونوں پرانے عاشق ماروی پر اعتراض نہیں کر سکتے تھے۔ کسی اصول کے اور کسی قانون کے مطابق اسے عدیل سے محبت کرنے سے روک نہیں سکتے تھے۔

☆☆☆

مراد کی رہائی کا دن آگیا۔

دشمن حشمت جلالی دوست تو نہیں ہوا تھا۔ بس اس نے سمجھوتا کیا تھا۔ اس مقدمے سے جان چھڑا رہا تھا۔ رابعہ نے بڑی حکمت عملی سے اس کے اندر یہ خوف پیدا کر دیا تھا کہ بیٹی زلیخا زندہ ہے' اگر وہ اچانک عدالت میں حاضر ہو جائے گی تو مراد پر سے اس کے قتل کا الزام از خود ختم ہو جائے گا۔

پھر وہ مقدمہ حشمت جلالی کے گلے پڑ جائے گا۔ بیٹی باپ کے خلاف بیان دے گی کہ باپ اور بھائی اسے قتل کرنا چاہتے تھے' وہ ان کے خوف سے فرار ہو گئی تھی۔

پھر ملازمہ رانی کو بیٹی بنا کر قتل کیا گیا تھا۔ تیزاب سے اس کا چہرا بگاڑ کر اسے زلیخا ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ایسے قتل اور فراڈ کے جرم میں باپ بیٹوں کو سزائے موت ہو سکتی تھی۔

ان کی خیریت اسی میں تھی کہ وہ جلد از جلد عدالتی پھندے سے جان چھڑا لیتے اور اس روز وہ یہی کر رہے تھے۔ اس مقدمے کو ختم کرنے دوڑے چلے آئے تھے۔

جج نے ان سب کو اپنے چیمبر میں بلایا تھا۔ باپ بیٹے دعائیں مانگ رہے تھے کہ زلیخا اچانک ہی نہ آئے۔ اگر آئے تو پہلے باپ اور بھائیوں سے ملے۔ وہ اس کے آگے ہاتھ پاؤں جوڑ کر اسے انتقامی کارروائی سے باز رکھیں گے۔

ایک تو اپنے ہی مقدمے میں پھنسنے کا خوف تھا۔ پھر یہ کہ سلو پوائزن نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اسے وہیل چیئر پر جج کے چیمبر میں لایا گیا تھا۔

وہاں ایک عرصے کے بعد مراد سے اس کا سامنا ہوا۔ وہ حشمت کو بیمار اور لاغر دیکھ کر بولا۔ "میں نہیں جانتا تھا کہ تمہارے جیسا مغرور وڈیرا ایک غریب سے دشمنی کرنے سے باز کیسے آگیا ہے؟ اب دیکھ رہا ہوں کہ بیماری نے تمہاری کمر توڑ دی ہے۔ خدا کی بے آواز لاٹھی سر پر پڑی ہے۔"

مغرور کبھی سر جھکانا نہیں جانتا۔ وہ اس کے آگے جھکنے والا نہیں تھا۔ لیکن اس وقت مجبور تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسری طرف منہ پھیر کر بیٹے سے باتیں کرنے لگا۔

محبوب اور معروف تجّی نے رابعہ کو سلام کیا تو اس نے خوش ہو کر انہیں دعائیں دیں پھر کہا۔ "آج کا دن ہم سب کے لیے مبارک ہے۔ ہم سب کو ایک جھوٹے مقدمے سے اور ایک دوسرے کی عداوتوں سے نجات مل رہی ہے۔"

رابعہ کے بھائی عظمت شاہ نے کہا۔ "آپ تمام حضرات میری آپا کو دعائیں دیں۔ ان کی کوششوں سے اور ان کی حکمت عملی سے یہ اچھا دن دیکھنا نصیب ہو رہا ہے۔"

رابعہ نے کہا۔ "آج اتفاق سے ہم یکجا ہوئے ہیں۔ میں چاہتی ہوں۔ فیصلے کے بعد آپ تمام حضرات مجھے تھوڑا سا وقت دیں۔ یہ ساتھ والے ہال میں بیٹھیں۔ میں مراد کے بارے میں ایک اہم انکشاف کرنا چاہتی ہوں۔"

مراد نے محبوب اور معروف نے چونک کر اسے دیکھا۔ رابعہ نے کہا۔ "ابھی آپ سوچ بھی نہیں سکیں گے کہ میں کیا کہنے والی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات اپنا قیمتی وقت مجھے دیں گے۔"

حشمت جلالی نے ناگواری سے کہا۔ "یہ بڑی بات ہے کہ میں نے مقدمہ ختم کر دیا ہے۔ یہ میری مہربانی ہے۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ فیصلہ سننے کے بعد تم کیا کہنے والی ہو۔ میں فوراً یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

دونوں بیٹوں نے کہا کہ وہ بھی ماں کی باتیں سننے کے لیے وہاں نہیں رکیں گے۔ باپ کے ساتھ چلے جائیں گے۔

رابعہ نے کہا۔ "تم تینوں میں سے کوئی میری مرضی کے خلاف نہیں جائے گا۔ جو جائے گا' وہ پچھتائے گا۔"

یہ ایک چیلنج تھا کہ رابعہ جب چاہے گی' اپنی بیٹی کو یہاں بلالے گی۔ وہ جو مقتول ہے اس دنیا میں نہیں ہے ماں کے ایک بلاوے پر حاضر ہو جائے گی تو کیا ہوگا؟

یہ ہوگا کہ ان تینوں کو دن میں تارے نظر آنے لگیں گے۔ محبوب مراد اور معروف نے دیکھا کہ رابعہ کے چیلنج کرنے پر تینوں باپ بیٹوں نے اپنی توہین محسوس کی تھی لیکن جوابًا اسے کچھ نہیں کہا تھا۔ یوں سمجھ میں آیا کہ وہ مغرور اور بدمعاش باپ اور بیٹے کسی وجہ سے رابعہ کے دباؤ میں ہیں۔

جج وقتِ مقررہ پر آیا۔ وہ سب تعظیماً اٹھ کر کھڑے ہو گئے پھر اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔ پیش کار نے اس کے سامنے مقدمے کی مختصری سمری دو صفحات میں رکھی۔ وہ اسے پڑھتے ہوئے بولا۔ "آپ حضرات ایک دوسرے کے فریق تھے۔ آپ نے آپس میں صلح کرنے کی اپیل کی تھی جسے عدالت نے منظور کیا ہے۔

"قتل کے ایک سنگین جرم کو معاف کرنے کے سلسلے میں لکھا گیا ہے کہ قاتل کی جانب سے خون بہا کی رقم یہاں سب کے سامنے ادا کی جائے گی۔

"یہ نہیں لکھا گیا ہے کہ رقم کتنی ہے۔ یہ لکھا گیا ہے کہ یہاں منصف کے سامنے ادا کی جائے گی۔"

جج نے کاغذ پر سے نظریں اٹھا کر فریقین کو دیکھا پھر پوچھا۔ "مدعی کتنی رقم کا مطالبہ کرتا ہے؟"

حشمت جلالی نے کہا۔ "میری بیٹی کا قاتل بہت غریب ہے۔ اس لیے کم سے کم پچاس لاکھ روپے طلب کر رہا ہوں۔"

رابعہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ "جناب عالی! مجھے اپنے شوہر کے اس مطالبے پر اعتراض ہے۔ میں مقتولہ کی ماں ہوں۔ جسے قاتل کہا جا رہا ہے' وہ گدھا گاڑی چلاتا ہے۔ لہٰذا میں خون بہا کے طور پر صرف پانچ روپے کا مطالبہ کر رہی ہوں۔"

یہ ایسی بات تھی کہ سب نے چونک کر مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ حشمت نے غصے سے کہا۔ "کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ ایک گدھا گاڑی والے سے پانچ روپے کی بھیک لو گی۔"

جج نے کہا۔ "محترمہ! مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ آپ رحم دل اور غریب پرور ہیں۔ لیکن پانچ روپے تو واقعی ایک مذاق لگ رہے ہیں۔"

بڑے بیٹے برکت نے اٹھ کر کہا۔ "جناب عالی! میری والدہ کو سمجھایا جائے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ یہ بھیک مانگ کر ہماری توہین کر رہی ہیں۔"

ماں نے کہا۔ "تو پھر پانچ روپے بھی نہ لو۔ جب بہن کا خون معاف کرنا ہی ہے تو رقم کیوں لو گے؟ کیا ہمارے گھر میں کھانے کو روٹی نہیں ہے؟"

چھوٹے بیٹے رحمت نے اٹھ کر کہا۔ "امی! آپ خدا کے لیے بیٹھ جائیں۔ ابا نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی اتنی رقم کا مطالبہ کیا ہے۔ ہم جانتے ہیں' مراد کے پیچھے محبوب علی چانڈیو ہیں۔ یہ صاحب حیثیت ہیں۔ یہ ابھی ہماری مطلوبہ رقم ادا

کردیں گے۔"

"اور میں قبول نہیں کروں گی۔"

محبوب نے کہا۔"محترمہ! ہم آپ کی عظمت کے معترف ہیں۔خدا آپ کو اور نیکیاں کرنے کی توفیق دے لیکن آپ اپنے شوہر کے مطالبے سے اختلاف کریں گی تو عدالتی فیصلہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔مراد علی منگی کو رہائی نہیں ملے گی۔"

رابعہ نے ناگواری سے حشمت کو دیکھا پھر محبوب سے کہا۔"آپ خدا پر بھروسا کریں۔وہ اور پروا لا رہائی دے گا۔"

جج نے کہا۔"شوہر سے آپ کا اختلاف انتہائی دلچسپ بھی ہے اور معنی خیز بھی ہے۔درپردہ کوئی بات ہے۔کیا آپ وہ بات بتانا چاہیں گی؟"

اس نے اپنے شوہر کو دیکھا۔شوہر کی آنکھوں میں التجا تھی کہ وہ اسے موقع سے فائدہ اٹھانے دے۔پچاس لاکھ روپے وصول کرنے دے۔بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لینے دے۔

رابعہ نے کہا۔"میاں صاحب۔۔۔! جناب عالی پوچھ رہے ہیں کہ درپردہ کیا بات ہے؟"

وہ نظریں چرانے لگا۔وہ بولی۔"بات تو ایک ہی سیدھی اور سچی ہے کہ دنیا کی کوئی ماں اپنی اولاد سے دودھ کے پیسے نہیں مانگتی۔میں نے اپنی بیٹی کو جو دودھ پلایا ہے اس کی قیمت مراد علی منگی سے نہیں لوں گی۔

"اپنے مجازی خدا سے کہتی ہوں کہ جج صاحب کا وقت برباد نہ کریں۔اور رقم کے مطالبے سے باز آجائیں۔"

وہ آہستہ آہستہ وہیل چیئر سے اٹھ کر بولا۔"جناب عالی! میری شریکِ حیات واقعی غریب پرور ہے۔میں اس کی قدر کرتا ہوں۔آج میں بھی نیکی کرتا ہوں۔خون بہا کے طور پر میرا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔"

بیوی کے سامنے فوراً ہی جھکنے اور بات مان لینے والی بات نے سب کو حیران کر دیا۔وہاں تمام حاضرین نے بڑے جوش و جذبے سے تالیاں بجائیں۔

تالیاں بجانے والوں کے ذہن میں کئی سوالات تھے۔لیکن وہ جانتے تھے کہ پوچھنے سے جواب نہیں ملے گا۔جج وہاں کسی کے ذاتی معاملات کو کریدنے نہیں آیا تھا۔اس نے بڑی بے نیازی سے مراد کی رہائی کا فیصلہ لکھ دیا۔

تجسس ختم ہونے والا نہیں تھا۔سب ہی کے دلوں میں کھد بد سی ہو رہی تھی کہ وہ تینوں باپ بیٹے رابعہ کے سامنے بھیگی بلیاں کیوں بنے ہوئے ہیں؟

ابھی اس سوال کا جواب ملنے والا تھا۔تھا۔جج کے جانے کے بعد وہ سب وہاں سے اٹھ کر ساتھ والے بڑے ہال میں آکر بیٹھ گئے۔تینوں باپ بیٹے بھی مجبوراً وہاں آگئے۔

معروف منگی نے رابعہ سے کہا۔"آپ نے ہمیں حیران کر دیا ہے۔ہم جانتے ہیں مسز جلالی فولادی ارادے کے مالک ہیں۔یہ نہ جھکتے ہیں نہ ٹوٹتے ہیں لیکن آپ نے انہیں جھکا دیا ہے۔"

وہ بولی۔"میں مقتولہ کی ماں ہوں اور وہ حقائق جانتی ہوں جو آپ نہیں جانتے اور۔۔۔"

اس نے شوہر اور بیٹوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔"اور جو میرے بیٹے اور میرے شوہر بھی نہیں جانتے۔اب ذرا کان کھول کر سنیں۔۔۔۔

"حقیقت یہ ہے کہ زلیخا کو یہاں کسی نے قتل نہیں کیا تھا۔کھیتوں میں پائی جانے والی لاش زلیخا کی نہیں ہماری نوکرانی رانی کی تھی۔"

حشمت جلالی نے تڑپ کر کہا۔"چپ ہو جاؤ۔یہاں ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو؟"

"میرا ضمیر مجھے جو کہنے کو بول رہا ہے وہ بول رہی ہوں۔"

وہ مراد کو دیکھ کر بولی۔"پہلے میں تم سے نفرت کرتی تھی۔تم نے میری بیٹی کو سہارا نہیں دیا تھا۔اسے مجبوراً جمال کے ساتھ حویلی سے بھاگنا پڑا۔نہ بھاگتی تو اپنے ہی گھر کے قصائی اسے مار ڈالتے۔ میرے شوہر اور بیٹوں نے تم پر اس کے قتل کا الزام لگایا اور زلیخا کو مار ڈالنے کے لیے اسے تلاش کرتے رہے۔لیکن وہ آج تک انہیں نظر نہیں آئی۔

"وہ سعودی عرب میں اپنے شوہر جمال کے ساتھ تھی۔میرے اور اس کے درمیان رازداری سے خط کتابت جاری رہتی تھی۔

"میری بیٹی نے مجھے سمجھایا کہ میں مراد سے نفرت نہ کروں۔کیونکہ یہ اس کی زندگی کا پہلا مرد تھا۔وہ اسے بھول نہیں پائی تھی اور اسے نہ بھولنے کی ایک اور اہم وجہ تھی۔"

رابعہ نے مراد کو دیکھتے ہوئے کہا۔"میں نے آپ حضرات سے ابھی کہا تھا کہ میں اس ہال میں بیٹھ کر مراد کے بارے میں ایک اہم انکشاف کرنا چاہتی ہوں۔

"تو مراد سنو! تم ایک بیٹے کے باپ ہو۔"

مراد محبوب اور معروف سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔وہ بولی۔"میری زلیخا نے تمہارے بیٹے کو جنم دیا ہے۔وہ شادی کے بعد بھی تمہیں بھلا نہیں پائی۔تم نہیں تھے نہ سہی وہ تمہارے بیٹے کو کلیجے سے لگائے رہتی تھی۔"

مراد نے پوچھا۔"رہتی تھی کیا مطلب؟"

"اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔"

تینوں باپ بیٹوں نے چونک کر اسے دیکھا پھر حشمت نے کہا۔"تم جھوٹ بول رہی ہو۔"

رابعہ نے مسکرا کر پوچھا۔"کیا میں کہہ دوں کہ وہ زندہ ہے اور کسی دن بھی تمہارے مظالم کا حساب لینے یہاں آئے گی؟"

وہ جلدی سے انکار میں سر ہلا کر بولا۔"نہیں۔زلیخا تو مر چکی ہے۔ہم نے ابھی اس کا خون بہا معاف کیا ہے۔"

رابعہ نے محبوب، مراد اور معروف سے پوچھا۔"آپ حضرات کا کیا خیال ہے۔زلیخا زندہ ہے یا نہیں؟"

مراد نے کہا۔"میں نے اسے ہلاک نہیں کیا ہے۔وہ زندہ ہوگی خدا کرے وہ میرے بیٹے کے ساتھ زندہ ہو۔"

وہ بولی۔"افسوس۔یہ ماں اپنی بیٹی کی وفات کا صدمہ برداشت کر رہی ہے۔"

پھر وہ حشمت سے بولی۔"تم نے زلیخا کا جو خط پڑھا اور اس کی ویڈیو فلم دیکھی، وہ سب فراڈ تھا۔"

وہ بے یقینی سے بولا۔"یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"وہی جو تم سن رہے ہو۔اس ویڈیو فلم کے مناظر اس وقت کے ہیں جب وہ زندہ تھی۔وہ خط جو تم لوگوں نے پڑھا اسے میرے داماد جمال نے لکھا تھا اور فون پر جو آواز سنی وہ زلیخا کی نہیں تھی۔"

وہ سن رہا تھا اور وہیل چیئر پر غصے سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔رابعہ نے مراد کو دیکھتے ہوئے کہا۔"میں نے ان تینوں پر یہ خوف طاری کیا تھا کہ مقدمہ ختم نہیں کرو گے تو زلیخا یہاں آکر ثابت کرے گی کہ وہ زندہ ہے اور تم بے قصور ہو۔پھر یہ تینوں رانی کو قتل کرنے کے جرم کی سزا پائیں گے۔"

محبوب نے کہا۔"اب سمجھ میں آیا کہ انہوں نے اپنی جانیں بچانے کے لیے مراد کا مقدمہ ختم کیا ہے۔"

معروف نے رابعہ سے کہا۔"آپ ان کی واقف ہیں، ان دو بیٹوں کی والدہ ہیں، ان کی حویلی میں ان کی جاگیر میں رہتی ہیں، میں حیران ہوں۔آپ ایک کہاوت کے مطابق پانی میں رہ کر مگرمچھوں سے بیر کر رہی ہیں۔"

رابعہ نے کہا۔"اس سے پہلے کہ یہ مجھے نقصان پہنچائیں میں وہاں سے نکل آئی ہوں۔میں آپ حضرات کے سامنے ان تینوں سے ہمیشہ کے لیے رشتہ ختم کر رہی ہوں۔"

وہ وہیل چیئر کو گھما کر وہاں سے جانا چاہتا تھا۔رابعہ نے سخت لہجے میں کہا۔"رک جاؤ۔ابھی آخری بات باقی ہے۔"

اس نے سر گھما کر اسے دیکھا۔وہ محبوب مراد اور معروف کو دیکھ کر بولی۔"یہ سچ ہے کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے' یہ کہاوت مجھ پر صادق آتی ہے۔میرے خدا نے مجھے بچا لیا ورنہ یہ مجازی خدا کہلانے والا ذلیل شخص بیٹی کو تو ہلاک نہ کر سکا' مجھے کر دیتا۔"

سب نے اسے گھور کر دیکھا۔وہ بولا۔"یہ جھوٹ ہے۔کیوں میرے خلاف بول رہی ہو؟ تمہیں جانی نقصان پہنچانے کا خیال تک میرے دل میں کبھی نہیں آیا۔"

وہ بولی۔"اپنے آپ کو دیکھو اور سمجھو تم چند ہفتوں میں اچانک اتنے بیمار اور کمزور کیسے ہو گئے؟

"لیکن نہیں سمجھ پاؤ گے کہ وہ زہر کی شیشی جو تمہارے بیگ میں رہتی ہے اور جس کا زہر تم میرے کھانے میں ٹپکایا کرتے تھے' وہی زہر تین ہفتوں سے تمہارے کھانے میں پہنچ رہا ہے۔"

حشمت جلالی کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔وہ گھبرا کر اپنے حلق اور سینے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

وہ بول رہی تھی۔"میں نے ایک دن تمہاری کمینگی دیکھ لی تھی۔تم نے اپنے بیگ میں سے وہ شیشی نکال کر اس میں سے ایک قطرہ میرے کھانے میں ٹپکایا تھا۔میں نہیں جانتی تھی کہ وہ زہر ہے۔عقل نے کہا وہ ضرور مجھے نقصان پہنچانے والی چیز ہے۔تب میں نے تمہاری لاعلمی میں اس شیشی سے وہ زہر نکال کر دوسری شیشی میں ڈال کر اپنے پاس رکھا اور روز تمہارے کھانے میں ایک قطرہ ٹپکاتی رہی۔تمہارے بیگ میں جو شیشی ہے' اس میں ایک بے ضرر مشروب ہے تم آج بھی اسے میرے کھانے میں ٹپکا کر میری موت کا انتظار کر رہے ہو۔"

محبوب نے کہا۔"شیم شیم۔۔۔۔"

مراد نے کہا۔"تھو ہے تم پر۔اپنی حالت دیکھو' جو گڑھا بیوی کے لیے کھودا تھا۔اس میں گر رہے ہو۔"

وہ اپنے دونوں بیٹوں کے ہاتھوں کو پکڑ کر کہہ رہا تھا۔"مجھے فوراً ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔اسے بتاؤ تین ہفتوں سے میرے اندر سلو پوائزن پہنچ رہا ہے۔جلدی کرو۔مجھے یہاں سے لے چلو۔"

رابعہ نے کہا۔"جاؤ مگر دیر ہو چکی ہے۔دعا کرو کہ مر ہی جاؤ۔اگر بچ گئے تو رانی کے مرڈر کیس میں تمہیں لٹکوا دوں گی۔"

دونوں بیٹے وہیل چیئر کو تیزی سے دوڑاتے ہوئے اس ہال سے باہر چلے گئے۔محبوب' مراد اور معروف اپنی کرسیوں سے اٹھ کر رابعہ کے پاس آئے۔معروف نے کہا۔"خدا آپ کو سلامتی دے۔آپ بڑی ذہانت سے اپنی بیٹی کے لیے اور اپنے لیے فائٹ کرتی آرہی ہیں۔"

محبوب نے کہا۔ ”آپ نے ان تینوں سے رشتہ توڑ دیا ہے۔ یہاں ہم تین آپ کے سامنے ہیں۔ آج سے ہمیں اپنا سمجھیں۔ آپ ہمیں آدھی رات کو بھی کال کریں گی تو ہم دوڑے چلے آئیں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”میں آپ سے کیا کہوں؟ جب سے سنا ہے کہ زلیخا نے میرے ایک بیٹے کو جنم دیا ہے۔ تب سے آپ کو اپنے بہت قریب دیکھ رہا ہوں۔ کیونکہ زلیخا نہیں رہی ہے تو میرا بیٹا ضرور آپ کی گود میں ہوگا۔“

”ہے تو نہیں مگر میرے ہی پاس آنے والا ہے۔ زلیخا نے اپنی وفات سے پہلے جمال سے کہا تھا کہ وہ نہیں رہے گی تو بیٹے کو اس کے باپ کے پاس پہنچا دے۔ باپ اسے نہیں پالے گا تو نانی اس کی پرورش کرے گی۔ اگلے چند مہینوں میں جمال چھٹی لے کر آئے گا تو بچے کو میرے حوالے کرے گا۔“

محبوب نے مراد سے کہا۔ ”میں نہیں جانتا کہ باپ بننے کے بعد تمہارے احساسات کیا ہیں؟ اور تم اپنے بچے کے مستقبل کے بارے میں کیا سوچو گے؟“

معروف نے کہا۔ ”بولو مراد! باپ بن کر کیسا لگ رہا ہے؟“

وہ بولا۔ ”مجھے تو یقین نہیں آرہا ہے۔ جب کہ یہ سچ ہے۔ مجھے پہلی بار زلیخا بہت یاد آرہی ہے۔ وہ مجھے دنیا کا سب سے قیمتی تحفہ دے کر گئی ہے۔ سب ہی جانتے ہیں اولاد وہ تحفہ ہے جس سے ہماری نسل آگے بڑھتی ہے۔“

وہ رابعہ سے بولا۔ ”آپ کی بیٹی میرے دل میں اور میری نسلوں میں ہمیشہ کے لیے زندہ ہوگئی ہے۔“

رابعہ کی آنکھیں خوشی سے بھیگ گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر مراد کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی کو چوما پھر کہا۔ ”تمہارا بیٹا میرے پاس امانت کے طور پر رہے گا۔ وہ تمہاری چیز ہوگی جب چاہو گے لے جاؤ گے۔ اسے میرے سائے میں پرورش پانے دو گے تو تمہاری احسان مند رہوں گی۔“

”احسان مندی کی بات نہ کریں۔ وہ آپ کا نواسہ ہے۔ آپ کے پاس رہے گا۔ میں اسے پیار کرنے کے لیے آتا رہوں گا۔“

یوں مراد نے بیٹے کے لیے یہ فیصلہ سنا دیا کہ وہ نانی کے پاس رہا کرے گا۔

☆☆☆

ماروی فرش پر بیٹھی چلغوزے چھیل کر خود کھا رہی تھی اور عدیلہ کی طرف بھی بڑھا رہی تھی۔ وہ معانج اس کے پیچھے بیٹھی کنگھی سے اس کے بال سلجھا رہی تھی۔ وہ ان کی دوستی کا چوتھا دن تھا۔ ان کا وقت بہت اچھا گزر رہا تھا۔ وہ دونوں بہت خوش تھیں۔

فی الحال دونوں میں یہ فرق تھا کہ ماروی اپنی ذات میں ایک ہی تھی۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ انسان دوغلا بھی ہوتا ہے اپنے اندر دہری شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔

عدیلہ چپ چاپ اس کا مشاہدہ کرتی رہتی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات کو سمجھتی تھی جبکہ وہ بیچاری خود اپنے آپ کو سمجھ نہیں پاتی تھی۔ عدیلہ نے مسکرا کر پوچھا۔ ”یہ بتاؤ میرے جانے کے بعد مجھے یاد کرتی ہو؟“

”بہت یاد کرتی ہوں اور یاد نہ کروں تب بھی تمہاری یاد آپ ہی آپ آتی رہتی ہے۔“

”میرے بارے میں کیا سوچتی ہو؟“

وہ سوچنے کے انداز میں بولی۔ ”ہوں اوں ..... سوچتی ہوں تم کیوں چلی جاتی ہو؟ نہ جاتیں تو اچھا لگتا۔“

”میرے رہ جانے سے کیوں اچھا لگتا؟“

”بڑا مزہ آتا۔ ہم ایک ساتھ سوتے۔ دیر تک جاگتے اور خوب باتیں کرتے۔“

عدیلہ اسے کرید رہی تھی۔ ایک ساتھ سونے والی بات پر چپ ہوگئی۔ اس نے تصور میں دیکھا اور سمجھا ایک ساتھ لیٹنے کا مرحلہ آئے گا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اتنی جلدی بھید کھل جائے۔ ایسا ہوگا تو وہ گھبرا جائے گی ڈر جائے گی۔ اس سے دور بھاگے گی تو دوسروں کو شبہ ہوگا۔ پھر بات چھپی نہیں رہے گی۔

ماروی نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔ ”تم چپ کیوں ہوگئیں؟ کیا سوچ رہی ہو؟“

عدیلہ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔ ”ہم چلتے پھرتے ایک دوسرے کے بدن سے لگ جاتے ہیں۔ کوئی بات نہیں لیکن بیڈ پر ایک ساتھ نہیں لیٹنا چاہیے۔“

”کیوں نہیں لیٹنا چاہیے؟“

”بس یونہی۔ میں ابھی تمہیں سمجھا نہیں سکوں گی۔“

”کیوں نہیں سمجھا سکو گی؟“

اس نے بڑے ہی جذباتی انداز میں ماروی کو دیکھا۔ وہ بولی۔ ”ہائے تم کیسے دیکھ رہی ہو۔ کل رات ڈرامے میں شیرازی فضیلہ کو ایسے ہی دیکھ رہا تھا۔“

”کیا واقعی ....؟ اگر میں بھی ویسے ہی دیکھ رہی ہوں تو بولو تمہیں کیسا لگ رہا ہے؟“

وہ پہلو بدلتے ہوئے بولی۔ ”تم۔ تم ابھی ....“

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ جھجکنے لگی۔

عدیلہ نے کہا۔ ’’ہاں بولو۔‘‘

’’وہ تم ابھی ..... شیرازی کی طرح لگ رہی ہو۔‘‘

اس بات نے واضح کر دیا کہ وہ عدیلہ کو ایک نئی تبدیلی کے ساتھ محسوس کر رہی ہے۔ اس نے کان کے قریب جھک کر کہا۔ ’’یہ جو محسوس کر رہی ہو۔ اسے اپنے تک رکھو۔‘‘

ماروی نے اس بات پر بڑے رازدارانہ انداز میں اسے دیکھا۔ وہ بولی۔ ’’چاچی سے ‘میرا سے اور میڈم روزینہ سے یہ نہ کہنا کہ میرے اندر تمہیں شیرازی دکھائی دینے لگا ہے۔ مجھ سے وعدہ کرو کسی سے نہیں بولوگی؟‘‘

ماروی نے کچھ سمجھتے ہوئے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اور الجھتے ہوئے انکار میں سر ہلا دیا۔

عدیلہ اسے کچھ اور سمجھانا چاہتی تھی پھر رک گئی۔ دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کو کھولا۔ میڈم روزینہ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ’’مسٹر مراد رہائی پا کر آئے ہیں۔ وہ سب ڈرائنگ روم میں ہیں۔‘‘

عدیلہ نے کہا۔ ’’تم چلو۔ ہم آرہے ہیں۔‘‘

وہ چلی گئی۔ اس نے سر گھما کر ماروی کو دیکھا۔ وہ آئینے کے سامنے جا کر اپنا لباس درست کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ’’مراد صاحب آگئے ہیں۔ محبوب صاحب بھی ہوں گے۔ دونوں ہم شکل ایک جگہ دکھائی دیں گے۔‘‘

’’ابھی دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر سوچنا‘ یاد کرنا کہ پہلے کبھی ایسے ہم شکل کو کہیں دیکھا ہے یا نہیں؟ کوشش کرنے سے شاید ماضی کا کوئی لمحہ جھلک دکھا جائے۔‘‘

ماروی نے پوچھا۔ ’’کیا ایک جھلک دکھائی دے گی تو پچھلی پوری زندگی یاد آجائے گی۔ کیا ان دونوں کو پہچان لوں گی؟‘‘

’’نہ پہچان سکو تب بھی ڈور کا ایک سرا مل جائے تو اسے تھام کر دوسرے سرے تک پہنچا جا سکتا ہے۔‘‘

’’مجھے تو اب تک اپنے بارے میں پوری طرح یاد نہیں آتا ہے کہ میں کہاں رہتی تھی اور کیسے زندگی گزر رہی تھی۔ پچھلے چار دنوں سے محبوب صاحب کو دیکھ رہی ہوں۔ یاد کرنے کی کوشش کرتی رہی ہوں۔ لیکن یاد ہی نہیں آتا کہ انہیں پہلے کہیں دیکھا ہے۔ مراد صاحب کی بھی پچھلی کوئی بات یاد نہیں آئے گی۔ کیا ہم ڈرائنگ روم میں چلیں؟‘‘

اس نے سوچا پھر کہا۔ ’’نہیں۔ تم لاؤنج میں جا کر بیٹھو۔ میں اپنے طور پر ان سے ملاقات کراؤں گی۔‘‘

وہ وہاں سے ڈرائنگ روم میں آئی۔ مراد دوسرے تمام افراد کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ ڈاکٹر عدیلہ کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ محبوب نے تعارف کرایا۔ ’’مراد! یہ ڈاکٹر عدیلہ ہیں۔ ماروی کا علاج کر رہی ہیں اور عدیلہ یہ ہیں مراد۔‘‘

دونوں نے ایک دوسرے کو سلام کیا۔ مراد نے کہا۔ ’’میں جیل خانے سے یہاں تک آپ کی تعریفیں سنتا آرہا ہوں۔ آپ ماروی کو زیادہ سے زیادہ وقت دے رہی ہیں۔ بڑی محنت اور لگن سے اس کا علاج کر رہی ہیں۔‘‘

’’میں کوشش کر رہی ہوں لیکن سر میں گہری چوٹ لگنے کے باعث دماغ بہت کمزور ہو گیا ہے۔ ماضی کی تمام باتیں تمام محبتیں اور تمام جذبے تاریکی میں گم ہو گئے ہیں۔

’’محبوب صاحب پچھلے چار دنوں سے یہاں آرہے ہیں۔ اس سے ملتے رہتے ہیں لیکن وہ انہیں پہچاننے سے قاصر ہے۔ ابھی آپ میرے ساتھ چلیں اس کے بعد محبوب صاحب کو وہاں بلاؤں گی۔‘‘

مراد اس کے ساتھ ڈرائنگ روم کے باہر آیا۔ وہ بولی۔ ’’ماروی جس صوفے پر بیٹھی ہے‘ میں وہیں سامنے والے کمرے میں رہوں گی۔ کھڑکی سے اسے دیکھتی رہوں گی۔ میں جا رہی ہوں۔ آپ ایک منٹ بعد لاؤنج میں جائیں۔‘‘

وہ چلی گئی۔ مراد کا دل دماغ اپنی ماروی کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ ایک منٹ کا انتظار بھی گراں گزر رہا تھا۔ وہ لاؤنج میں آیا۔ ماروی سر جھکائے صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ مراد کے شوقِ ملاقات کو ٹھیس پہنچی۔ نگاہوں میں اپنایت تو دور کی بات، دور کی شناسائی بھی نہیں تھی۔

اس نے بڑے دکھ سے پوچھا۔ ’’کیا مجھے نہیں پہچانو گی؟‘‘

وہ ہاں کے انداز میں سر ہلا کر بولی۔ ’’پہچان رہی ہوں۔‘‘

وہ خوش ہو کر تیزی سے قریب آکر بولا۔ ’’سچ۔ مجھے پہچان گئی ہو۔ میں تمہارے بچپن کا پیار ہوں۔‘‘

’’یہ تو میں نہیں جانتی۔ اتنا یاد ہے کہ سکھر کے اسپتال میں تم ہی آئے تھے۔‘‘

وہ جیسے جھاگ کی طرح ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ دونوں سر جھکائے ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر تھے۔ وہ ایک دوسرے کو جان سے زیادہ چاہتے آئے تھے۔ بچپن کی نادانی سے جوانی کی دانائی تک ڈوب کر پیار کرتے آئے تھے۔ کیا بدنصیبی تھی کہ اجنبی اور غیر بن کر ایک دوسرے سے دور بیٹھے تھے۔

عدیلہ ایک کمرے کی کھڑکی سے انہیں دیکھ رہی

تھی۔ مراد کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں تھیں۔ ماروی کا چہرہ کسی بھی دکھ اور مایوسی سے عاری تھا۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

وہ بڑے دکھ سے بولا۔ ’’ماروی ہماری محبت بچوں کا کھیل نہیں تھی اور بچپن کے تمام کھیل بھی بھلائے نہیں جاتے۔ وہ کبھی کبھی جوانی اور بڑھاپے میں یاد آتے ہیں۔ کیا تمہیں کوئی ایک کھیل یاد ہے۔ دل کی لگی نہ سہی بچپن کی کوئی دل لگی تو یاد کرو۔‘‘

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ’’میں کیا کروں؟ صبح اور شام کوشش کرتی رہتی ہوں کہ کچھ تو یاد آجائے لیکن میرا دماغ کسی کام کا نہیں رہا ہے۔ مجھے کبھی کچھ یاد نہیں آئے گا۔‘‘

’’چلو ایسا کرو کہ پچھلی زندگی یاد نہ کرو۔ یہ تو مانتی ہو کہ چاچی اور چاچا جھوٹ نہیں بول رہے ہیں۔ محبوب صاحب معروف صاحب اور میمن گوٹھ کے سیکڑوں لوگ گواہی دیں گے کہ چاچی اور چاچا سچے ہیں۔ انہوں نے بچپن سے تمہاری پرورش کی ہے اور مجھ سے تمہاری منگنی کی ہے۔‘‘

’’ہاں۔ اتنے لوگ جھوٹ نہیں بولیں گے۔ اس چھت کے نیچے پناہ دینے والے میرا علاج کرانے والے سب ہی نیک ایماندار اور سچے ہیں۔‘‘

’’تو پھر سچ کو تسلیم کرو۔ سب ہی کہتے ہیں کہ تم میری منگیتر ہو تو پھر ہو۔ سچ سے انکار نہ کرو۔ مجھے قبول کرو۔‘‘

اس نے تھوڑی دیر تک مراد کو دیکھا پھر پوچھا۔ ’’کیسے قبول کروں۔ تمہیں کبھی دیکھا نہیں ہے۔ سمجھا نہیں ہے۔ لڑکی تو دو ہی طرح سے قبول کرتی ہے۔ ایک تو یہ کہ ماں باپ کوئی لڑکا پسند کرتے ہیں۔ وہ اسے دیکھتی ہے نہ چاہتی ہے۔ بڑی سعادت مندی سے والدین کے کہنے پر قبول کر لیتی ہے۔

’’دوسری وہ ہوتی ہے۔ جو دیکھے سمجھے بغیر کسی کو قبول نہیں کرتی۔ میرا دل میرا دماغ بھی کسی کو دیکھے سمجھے بغیر کسی کے پیار میں ڈوبے بغیر اسے قبول نہیں کرے گا۔‘‘

’’ابھی تم نئے ذہن سے نئے دل سے مجھے دیکھو اور بولو کیا تمہیں اچھا لگ رہا ہوں؟‘‘

’’تم خود ہی بولو‘ کیا دو ہی ملاقاتوں میں اچھے برے کی پہچان ہو جاتی ہے؟‘‘

’’آئندہ بھی ہم ملتے رہیں گے‘ میں تمہارا دل جیتنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ تم وعدہ کرو کہ مجھے اپنے منگیتر کے طور پر یاد رکھو گی۔ اس طرح میں تمہیں اپنا لگتا رہوں گا۔‘‘

’’میں تمہیں ایک منگیتر کے طور پر یاد رکھوں گی۔‘‘

عدیلہ کھڑکی سے لگی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے فون کے ذریعے محبوب سے کہا۔ ’’آپ آجائیں۔‘‘

وہ ایک چھوٹا سا بیگ اٹھائے وہاں آیا۔ ماروی کے قریب ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ’’مجھے تو دیکھتی ہی رہتی ہو۔ آج مراد کی موجودگی میں دیکھ رہی ہو۔ ہم دونوں بالکل ایک جیسے ہیں اور تمہارے معاملے میں بالکل ایک جیسی تقدیر ہے ہماری۔

’’ہم دونوں ہی فی الحال تمہیں ہار رہے ہیں۔ ایسی بات نہیں ہے کہ تم سے مایوس ہو گئے ہیں۔ خدا نے چاہا تو جلد ہی تمہاری یادداشت واپس آجائے گی۔‘‘

دیوار پر بڑی سی ٹی وی اسکرین تھی۔ محبوب بیگ سے سامان نکال کر ڈی وی ڈی کو آپریٹ کرتے ہوئے بولا۔ ’’میں کوشش کر رہا ہوں کہ تمہیں گزری ہوئی باتیں یاد آجائیں۔‘‘

ذرا سی دیر میں وہ بڑی سی اسکرین روشن ہو گئی۔ وہاں ماروی کی ایک بڑی سی خوبصورت سی تصویر نظر آنے لگی۔ وہ ایک گہری سانس کھینچ کر خود کو بڑی لگن سے دیکھنے لگی۔

پھر منظر بدل گیا۔ میمن گوٹھ میں پانی کا ٹینکر کھڑا ہوا تھا۔ وہاں عورتوں مردوں بوڑھوں اور بچوں کی بھیڑ لگی تھی۔ وہ سب پانی بھر رہے تھے۔

ماروی نے کہا۔ ’’یہ میں ہوں۔ پانی بھر رہی ہوں۔ چاچی اور چاچا بھی ہیں اور تم بھی ہو۔‘‘

محبوب نے مراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’یہ میں نہیں ہوں تمہارے ساتھ مراد ہے۔‘‘

مراد نے کہا۔ ’’ماروی! یہ جگہ دیکھ رہی ہو۔ یہاں کے تمام لوگوں کو تم جانتی ہو۔ کچھ یاد کرو۔‘‘

اس نے اُدھر دیکھتے ہوئے انکار میں سر ہلایا۔ اسے وہ جگہ اور وہ لوگ یاد نہیں آرہے تھے۔

محبوب نے کہا۔ ’’خود کو اس علاقے میں دیکھ رہی ہو تو عقل کیا کہتی ہے؟ کیا تم یہاں چاچی چاچا کے ساتھ نہیں رہ چکی ہو؟‘‘

’’ہاں میں یہاں چاچی چاچا کے ساتھ رہ چکی ہوں۔ تب ہی تو اس جگہ دکھائی دے رہی ہوں۔‘‘

مراد نے کہا۔ ’’ہمارے ساتھ میمن گوٹھ چلو۔ وہاں سب ہی کہیں گے کہ تم مجھے دل سے چاہتی تھیں اور میری دلہن بننے والی تھیں۔ تب تو مجھے اپنا مان لو گی۔‘‘

وہ اسکرین کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ’’یہ ساری دنیا تم سے خوامخواہ جھوٹ نہیں کہے گی۔‘‘

وہ اس کی طرف جھک کر بولا۔ ’’میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے ابھی اسی وقت قبول کر لو۔ صرف اتنا کرو کہ دنیا والوں کو سچ

مان لو اور اپنے دل اپنے دماغ کو میری طرف مائل کرو۔"

محبوب نے کہا۔"جب تم مراد سے ملتی رہوگی تو ضرور اسے پھر سے پسند کرنے لگوگی۔ہم نہیں جانتے تمہارا موجودہ ذہن اور سوچ موجودہ مزاج تمہیں کدھر لے جائے گا؟

" اگر مراد تمہارے دل میں نہیں سمائے گا تو پھر میں بھی پڑا ہوں راہوں میں ...۔ یہاں سب ہی گواہ ہیں کہ میں دیوانہ وار تمہیں چاہتا ہوں۔تمہارا دل جیتنے کے لیے اپنا سب کچھ ہارتا جا رہا ہوں۔"

مراد نے اسے دیکھا پھر ماروی سے کہا۔"کوئی اپنے کسی رقیب کو برداشت نہیں کرتا۔لیکن سائیں کی رقابت میں عداوت نہیں ہے۔میرے لیے دیانتداری ہے۔"

وہ محبوب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔"یہ پوری سچائی سے چاہتے ہیں کہ تم میری ہو جاؤ اور اگر تقدیر کو منظور نہ ہو۔تمہارا دل مجھ سے پھر جائے تو میں دل سے کہتا ہوں کہ سائیں سے نہ پھرے۔تم ان کی دلہن بن جاؤ۔"

محبوب اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے کے انداز میں ٹی وی اسکرین کے پاس گیا۔وہاں ماروی آسمان کی سمت دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔وہ کبھی اسے اسکرین پر اور کبھی اپنے سامنے بڑی چاہت سے بڑی لگن سے دیکھ رہا تھا۔

پھر ٹی وی کی طرف سے واپس آتے ہوئے بولا۔"یہ بھول چکی ہے کہ ہم تینوں کا پیار اٹل ہے۔ اٹوٹ ہے۔میرا اور مراد کا دعویٰ تھا کہ تمہارا پیار ہم سے کوئی چھین نہیں سکے گا۔کیا ستم ہے کہ تمہاری دماغی کمزوری تمہیں ہم سے چھین رہی ہے۔

"ہماری ایک بات مانو ماروی! یہ نہ سوچو کہ ہم اجنبی نظر آرہے ہیں۔تم ہم سے بڑی اپنایت کے ساتھ ملتی رہو۔بڑے اعتماد سے اپنے اندر ہمیں ڈھونڈنے کی کوشش کرتی رہو۔میرا دل کہتا ہے کہ تمہاری یادداشت واپس آئے یا نہ آئے تم ہمارے دلوں میں واپس آجاؤ گی۔"

اس نے محبوب کو اور مراد کو دیکھا۔پھر کہا۔"دیکھا جائے تو میں یہاں اجنبی اور انجانے لوگوں کے ساتھ گزار رہی ہوں۔تم سب مجھے اپنا بنا رہے ہو۔مجھے بھی تم سب کو اپنا بنانے کے لیے تمہاری ذات میں دلچسپی لینی چاہیے۔"

محبوب نے خوش ہو کر کہا۔"تھینک یو ماروی۔"

مراد نے کہا۔"تم بہت اچھی ہو۔تم دیکھو گی کہ تمہاری اچھائی ہم سب کے لیے بہتری لائے گی۔"

عدیلہ کمرے کے اندر کھڑکی کے پاس کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ماروی کا علاج اصولاً اسی طرح ہونا تھا۔اسے اپنے تمام پرانے رشتوں اور شناساؤں کے ساتھ مل جل کر رہنا تھا۔ان کے ساتھ گھلنے ملنے سے ہی بھولی ہوئی باتیں یاد آسکتی تھیں۔

لیکن اس کے اندر ایک ذرا حاسدانہ اور رقیبانہ جذبات بھڑکنے لگے۔محبوب اور مراد سے ماروی کا گھلنا ملنا اسے کھٹک رہا تھا۔وہ دونوں قدآور چٹان جیسے مرد تھے اور عدیلہ کے اندر چھپا ہوا مرد ان سے کمتر تھا۔نہ ان کی طرح قد آور تھا نہ کسرتی جسم کا حامل تھا۔ اگرچہ وہ پیدائشی مرد تھا۔لیکن نازک اندام تھا۔

عدیلہ کو یہ خیال پریشان کرنے لگا کہ وہ دونوں اس کے قریب آتے رہیں گے اور اس کے ساتھ وقت گزارتے رہیں گے تو وہ ان کی مردانہ صفات سے متاثر ہوتی رہے گی۔

اب وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر سوچ رہی تھی۔"میں دیکھتی آرہی ہوں کہ اس کی کلائی پکڑتی ہوں تو یہ مردانہ گرفت محسوس کرتی ہے مگر سمجھتی نہیں ہے۔ایسے میں محبوب یا مراد نے کبھی اس کی کلائی پکڑی تو یہ سمجھائے بغیر مردانہ گرفت کو سمجھ لے گی۔

"ٹھیک ہے یہ دونوں اس سے ملتے رہیں لیکن ان کے درمیان فاصلہ رہنا چاہیے۔مجھے اس سلسلے میں کچھ کرنا ہوگا۔"

وہ ڈاکٹر تھی۔اس کا علاج کر رہی تھی۔انسانی نفسیات کی کھلاڑی تھی۔علاج کے بہانے ان دیوانوں کو اس سے دور کرتی رہتی تو کوئی اعتراض نہ کرتا۔

پہلے اس کے دو عاشق تھے۔اب تین ہو گئے تھے۔وہ تیسرا عاشق تو ان دن تھا۔دہری زندگی گزار رہا تھا اور دہری چالیں چلنا خوب جانتا تھا۔

☆☆☆

معروف مجی ڈرائنگ روم میں بیٹھا فون کے ذریعے کاروباری گفتگو میں مصروف تھا۔اس نے دفتری معاملات میں سمیرا سے بھی باتیں کیں۔پھر اسے بتایا کہ مراد کو رہائی مل گئی ہے اور وہ اسے کوٹھی میں لے آئے ہیں۔

سمیرا نے کہا۔"مراد ایک طویل عرصے کے بعد اپنی ماروی کے قریب آیا ہے۔وہاں ایک ہی چھت کے نیچے کب تک اس کے ساتھ رہے گا۔"

"محبوب اسے اپنے ساتھ کوٹھی میں رکھنا چاہتا ہے یا وہ کسی کرائے کے مکان میں بھی رہ سکتا ہے۔میں اس سلسلے میں ان دونوں سے ابھی بات کروں گا۔"

اسی وقت وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آگئے۔ان کے پیچھے ماروی اور عدیلہ تھیں۔معروف نے فون بند کر کے عدیلہ سے پوچھا۔"تمہاری پیشنٹ نے پہلی بار دونوں ہم شکل کو

ایک ساتھ دیکھا ہے۔اسے کچھ تو یاد آنا چاہیے۔"

عدیلہ نے کہا۔"نہیں ابھی تو مایوسی ہو رہی ہے۔اسے سیمن گوٹھ کے مناظر بھی دکھائے گئے ہیں۔خود کو وہاں دیکھنے کے باوجود اسے کچھ یاد نہیں آرہا ہے۔"

مراد نے کہا۔"ہم مایوس نہیں ہیں۔روز اس سے ملتے رہیں گے تو اسے کچھ نہ کچھ یاد آتا رہے گا۔"

عدیلہ نے اسے ایسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔"یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔یاد دلانے والی تو میں ہوں۔"

محبوب نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔"میں عدیلہ سے کہوں گا کہ ہم ماروی کو سیمن گوٹھ لے جائیں اور وہاں کے لوگوں سے ملائیں اسے ضرور کوئی بات یاد آئے گی۔"

وہ مسکرا کر ہلکے سے طنزیہ انداز میں بولی۔"علاج ایسے نہیں ہوتا۔ہم سب اس طرح ماروی کے پیچھے پڑ جائیں گے۔اسے زیادہ سے زیادہ باتیں جلد سے جلد یاد دلانے کی نادانی کریں گے تو اس کے زخمی اور کمزور دماغ پر بوجھ پڑے گا۔اس کا دماغ ابھی کمزور ہے۔خدانہ کرے یہ پاگل بھی ہو سکتی ہے۔"

چاچی نے ماروی کے پاس آکر بیٹھتے ہوئے کہا۔"خدا نہ کرے میری اچھی بھلی بیٹی پاگل ہو جائے۔اس کے دماغ پر بوجھ ڈالنے والی کوئی بات نہ کرو۔"

عدیلہ نے کہا۔"محبوب صاحب! مراد صاحب اچانک ہی ماروی پرائی ہو گئی ہے۔اس کی دماغی کمزوری کہہ رہی ہے کہ شاید یہ آپ دونوں کی زندگی میں واپس نہیں آئے گی۔آپ چاہیں گے کہ روز اسے ماضی کی زیادہ سے زیادہ باتیں یاد دلائیں۔یوں اس کے کمزور دماغ پر ہتھوڑے پڑتے رہیں گے اور میں یہ نہیں چاہوں گی۔"

معروف نے کہا۔"تم جو نہیں چاہوگی وہ نہیں ہوگا۔تم وہی کرو جو ایک ڈاکٹر کو کرنا چاہیے۔"

اس نے محبوب اور مراد پر ایک نظر ڈالی پھر کہا۔"فی الحال میں یہ سمجھتی ہوں کہ ان دونوں کو ماروی سے دور رہنا چاہیے۔"

ان دونوں کو ذہنی جھٹکا سا لگا۔وہ اعتراض کرنا چاہتے تھے۔عدیلہ نے کہا۔"آپ اس سے ضرور ملیں گے ایک دوسرے کے روبرو آئیں گے لیکن اس سے کافی فاصلہ رکھیں گے کوئی ضروری بات ہو تو دور سے کریں گے۔

"ڈاکٹر میں ہوں۔میں اس کی یادداشت واپس لاؤں گی آپ دونوں اسے یاد دلانے والی کوئی بات نہیں کریں گے۔"

وہ علاج کرنے والی ماہرِ نفسیات سے بحث نہیں کر سکتے تھے۔محبوب نے پوچھا۔"ہمیں ماروی سے کتنا فاصلہ رکھنا ہوگا؟"

"جتنا ابھی ہے۔"

وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان میں سے کوئی ماروی کے زیادہ قریب ہو اور اس کی آنچ اسے پہنچے۔وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ماروی کے پاس آکر بیٹھ گئی۔اس نے اسے ایک بازو کے حصار میں لے کر بھری محفل میں اپنے بدن سے لگا لیا۔

اس کے وجود میں اتنی آگ نہیں تھی کہ ماروی کو عدیل کی حرارت سے آشنا کرتی۔جتنی آنچ اسے ملتی تھی۔اسے وہ سمجھتی نہیں تھی۔صرف محسوس کر کے رہ جاتی تھی۔

دو عاشق تو پہلے سے تھے۔اب ان کی موجودگی میں تیسرے کے عشق کی ابتدا ہو رہی تھی۔دونوں عاشق اسے دیکھ رہے تھے۔ابھی عدیلہ کی سلامتی اس لیے تھی کہ وہ اسے رقیب نہیں سمجھ رہے تھے۔

عدیلہ نے معروف سے پوچھا۔"انکل...! کیا مسٹر مراد اسی کوٹھی میں رہیں گے؟"

اس نے کہا۔"میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ماروی کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے رہنا مناسب نہیں ہے۔"

محبوب نے کہا۔"مراد! میں تم سے کہنے والا تھا میرے ساتھ کوٹھی میں رہا کرو۔"

اس نے کہا۔"میں جیل کی کوٹھری میں بیٹھا سوچتا رہتا تھا۔آپ مجھ پر کب تک احسان کرتے رہیں گے اور میں کب تک احسان اٹھاتا رہوں گا۔"

"میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا ہے۔تم جانتے ہو شروع سے اب تک جو بھی کیا ہے سب ماروی کی حفاظت سلامتی اور خوشحالی کی خاطر کیا ہے۔

"میری محبت کا تقاضا تھا کہ میں اسے جھگی سے نکال کر ائر کنڈیشنڈ کوٹھی میں پہنچا دوں۔اس کا بینک بیلنس بنانے کے لیے اسے ماڈل بنانے کا بہانہ کیا اور لاکھوں روپے دیے۔

"تم جیل چلے گئے تو میں دشمن وڈیرے سے اسے تحفظ دینے کے لیے محافظ بن گیا۔اسے رہنے کے لیے کوٹھی دی۔

"تم جیل میں مجبور تھے۔ماروی کے لیے کچھ کر نہیں سکتے تھے اور مجھے اس پر احسانات کرنے سے روک نہیں سکتے تھے۔"

مراد نے سر ہلا کر کہا۔"ہاں میں جیل میں بیٹھا سوچتا تھا۔آپ دشمنوں سے اس کی عزت آبرو اور جان کی حفاظت کر رہے تھے۔یہ آپ کی مہربانیوں کی بدولت عیش و آرام سے زندگی گزار رہی تھی اور آپ سے متاثر بھی ہو رہی ہو

گی۔آپ اسے دیوانہ وار چاہتے ہیں۔یہ دھیرے دھیرے آپ کی طرف جھک رہی ہوگی۔"

مراد نے دور بیٹھی ہوئی ماروی کو دیکھا۔وہ اسے دیکھ رہی تھی اس کی باتیں سن رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔"کیا میرے ساتھ ایسا ہوتا رہا تھا؟"

مراد نے کہا۔"مجھے اپنی ماروی پر ناز ہے۔اس نے مجھ جیسے غریب محبت کرنے والے سے منہ نہیں پھیرا۔یہ میری تھی۔میری ہے اور یادداشت واپس آنے کے بعد بھی میری ہی رہے گی۔"

پھر وہ محبوب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولا۔"آپ اپنی دولت سے ماروی کو خرید سکتے تھے۔اور یہ مجھے جیل سے رہائی دلانے کے لیے اپنی قیمت لگا سکتی تھی۔لیکن نہ اس نے اپنی قیمت لگائی نہ آپ نے اسے خریدا۔آپ شروع سے اب تک اسے میری امانت کہتے آئے ہیں۔میں آپ کا یہ احسان مرتے دم تک یاد رکھوں گا۔"

محبوب نے کہا۔"احسان مانتے ہو تو میری یہ بات مانو۔آج سے میرے ساتھ میری کوٹھی میں رہا کرو۔"

"بس اور احسان نہ کریں۔میں اور کوئی احسان نہیں اٹھاؤں گا۔بہت ہو چکا۔اب میں آپ کی خدمت کرتا رہوں گا۔میرے اندر یہ شدید جذبہ ہے کہ آپ کے لیے ایسا کوئی کام کروں' جو کوئی دوسرا نہ کر سکے۔"

معروف نے کہا۔"ایسا کام تم ابھی کر سکتے ہو۔"

محبوب اور مراد نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔وہ بولا۔"تم محبوب کے لیے ماروی کو بھول جاؤ۔کسی اور سے شادی کر لو۔محبوب کے لیے اس سے بڑا کام اور کیا کر سکو گے؟"

"ماروی کی یادداشت جب تک واپس آئے گی۔تب تک تم بیوی بچوں والے ہو جاؤ گے۔اس وقت وہ تم سے مایوس ہو کر محبوب کی منکوحہ بن جائے گی۔"

مراد نے کہا۔"میں نے ماروی کو اپنا پابند نہیں کیا ہے۔کوئی بھی لڑکی اپنے دل سے اپنی مرضی سے کسی کو چاہتی ہے۔سائیں محبوب اپنی نیکی اور شرافت سے اس کا دل جیت رہے تھے۔یہ اچانک دماغی کمزوری کا شکار ہو گئی۔"

"ہو سکتا ہے یادداشت واپس آنے پر یہ ان کا کلمہ پڑھنے لگے۔اس کے دل کے معاملات یہی سمجھے گی۔ہم اور آپ اسے مجبور نہیں کر سکیں گے۔"

محبوب نے کہا۔"یہ تو سب جانتے ہیں کہ میں ماروی کو چاہتا ہوں۔مراد کو میری چاہت پر اعتراض نہیں ہے۔یہ دل کے فیصلے ہوتے ہیں۔میں نے اور مراد نے ابتدا ہی سے دل کا معاملہ ماروی پر چھوڑ رکھا ہے۔"

پھر وہ مراد سے بولا۔"بات تمہاری رہائش کی ہو رہی ہے۔تمہیں میرے ساتھ رہنا چاہیے۔"

اس نے کہا۔"مرینہ نے مجھے جیل سے نکال کر زندگی کا ایک نیا رخ دکھایا ہے۔یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی ہے کہ مجھے اپنی قوتِ بازو سے اپنے لیے راہیں کھولنا چاہئیں۔سائیں ! میں آئندہ کسی کا سہارا قبول نہیں کروں گا۔"

"یہ اچھی بات ہے کہ اپنے بل پر خودداری سے جینا چاہتے ہو۔لیکن تم کرو گے کیا؟"

"میں نے ڈاکوؤں سے مقابلہ کیا تھا۔وہاں سے مجھے لاکھوں روپے حاصل ہوئے تھے۔میں نے وہ رقم چاچی کے پاس رکھوائی ہے۔میں ٹیکسی خریدوں گا اور خود چلاؤں گا۔اتنی رقم ہے کہ دو ٹیکسیاں خرید سکتا ہوں۔"

وہ ماروی کو دیکھتے ہوئے بولا۔"یہ جھگی سے کوٹھی میں گئی ہے۔جب میری زندگی میں آئے گی تو اس کے لیے کوٹھی نہیں خرید سکوں گا۔دو کمروں کا مکان ضرور بنوا لوں گا۔"

ماروی ان کی باتیں سن رہی تھی۔کبھی مراد کو کبھی محبوب کو دیکھ رہی تھی۔ایک ہی شکل تھی۔باتیں بھی ایک ہی جیسی تھیں۔وہ دونوں محبت سے بول رہے تھے اور دونوں ہی اچھے لگ رہے تھے۔

عدیلہ اسے دیکھ رہی تھی۔اس کی آنکھوں کو پڑھ رہی تھی۔اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ کر رہی تھی کہ وہ ان دونوں سے متاثر ہو رہی ہے۔

اور یہ نہیں ہونا چاہیے۔اس نے ماروی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔"چلو اٹھو۔تمہیں یہاں کے معاملات میں زیادہ الجھنا نہیں چاہیے۔بیڈ روم میں چل کر آرام کرو۔"

ماروی نے ان دونوں کو دیکھا پھر وہاں سے اٹھ کر اس کے ساتھ اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔

اس کے چاہنے والے آئے دن نت نئے مسائل سے دوچار ہوتے آ رہے تھے۔

ایک دیوانہ اربوں روپے کا کاروبار اس پر نچھاور کر رہا تھا۔دوسرا راہ عشق میں خطرناک مجرموں سے ٹکرا رہا تھا۔پہلے دنیا جہان کے مجرموں سے کھیلنے والی مرینہ سے ٹکرایا پھر ایک بڑے ملک کے خطرناک سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو خاک میں ملا دیا۔

اس نے یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں کھیلا تھا۔ایک بڑے

ملک کے بہت بڑے اور اہم مشن کو ناکام بنایا تھا۔پاکستان کے ایٹمی راز کو کس طرح حفاظتی انتظامات میں رکھا گیا ہے اور کہاں چھپا کر رکھا گیا ہے۔یہ راز معلوم کرنے کے لیے سمندر پار سے لے کر پاکستان تک سازشوں کا ایک مستحکم سلسلہ قائم کیا گیا تھا۔

بین الاقوامی سطح پر سیاسی سازشوں کے کھلاڑی برنارڈ کی ناکامی برداشت کرنے والے نہیں تھے۔یہاں سے وہاں تک سب تلملا رہے تھے۔یہ معلومات حاصل کر رہے تھے کہ ان کا وہ دشمن قیدی نمبر سات سو سات کون ہے؟ اور جب معلوم ہوا کہ وہ پاکستان کا ایک معمولی گدھا گاڑی چلانے والا ہے تو اپنی توہین پر چیخ پڑے۔بدنام زمانہ مجرموں کے بگ باس نے کہا۔"ہمیں شرم سے ڈوب مرنا چاہیے۔ہم نے ایک گدھے سے مات کھائی ہے۔"

"ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اسے گولی سے اڑا دو۔"

مراد' محبوب اور ماروی کی پیار بھری دنیا پرسکون' پر امن تھی۔وہ بے خبر تھے۔یہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ پیار و محبت کے ایک سیدھے سادے سے کھیل میں جرائم کے انٹرنیشنل کھلاڑی بھی حصہ لینے چلے آئیں گے۔

بگ باس کو اطلاع دی گئی کہ مراد کو فوراً ہلاک نہیں کیا جا سکے گا۔وہ جیل میں ہے اور تین دنوں کے بعد باہر آئے گا۔

اور وہ باہر آ گیا تھا۔محبوب اور معروف کے ساتھ بخیریت ماروی کے پاس پہنچ گیا تھا۔وہاں سیکیورٹی گارڈز تھے۔وہ بخیریت ہی رہتا۔دوسرے دن وہاں سے نکلنے کے بعد کیا ہوتا' یہ نہیں جانتا تھا۔

☆☆☆

چار دیواری کے باہر دنیا بہت بڑی ہوتی ہے۔جتنی بڑی ہوتی ہے۔اتنے ہی بڑے خطرات بھی ہوتے ہیں۔

لیکن گھر میں چھپے ہوئے دشمنوں کو آستین کا سانپ اور میٹھی چھری کہتے ہیں۔کب ان کی مٹھاس نگل لے گی۔یہ ماروی مراد اور محبوب نہیں جانتے تھے۔

اس کوٹھی میں تمام رہنے والے مانتے تھے کہ عدیلہ بہت میٹھی تھی۔اس میں شبہ نہیں کہ وہ ہر لحاظ سے سلجھی ہوئی طبیعت کی تھی مگر کیا کیا جائے کہ اس کے اندر "تھی سے تھا" پیدا ہو گیا تھا اور وہ ماروی کے لیے باؤلا ہو رہا تھا۔

اس نے ڈرائنگ روم میں اسے ان کے سامنے رہنے نہیں دیا تھا۔وہاں سے بیڈ روم میں لے آئی تھی۔اس نے دروازے کو اندر سے بند کر کے اس کی طرف گھوم کر پوچھا۔"سچ بولو' کیا وہ دونوں اچھے لگتے ہیں؟"

اس نے معصومیت سے سر ہلا کر کہا۔"ہاں بہت اچھے ہیں۔وہ دونوں ہی میرے بارے میں بول رہے تھے۔مجھے وہ کس قدر چاہتے ہیں۔"

یہ سن کر وہ پریشان ہو گئی۔اس نے پوچھا۔"تمہارا کیا خیال ہے۔دونوں میں سے کون تمہیں زیادہ چاہتا ہے؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔دونوں ہی دیوانے لگتے ہیں۔"

"لڑکیاں کسی ایک کو پسند کرتی ہیں۔ایک وقت میں کوئی ایک ہی اچھا لگتا ہے۔"

وہ پیچھے ہٹ کر ہچکچاتے ہوئے بولی۔"مم۔میں نے ایسی کوئی بات نہیں سوچی ہے۔"

"آج نہیں سوچی۔کل سے سوچنے لگو گی۔پہلے کوئی اچھا لگتا ہے۔پھر اور اچھا لگتا ہے پھر اتنا اچھا لگتا ہے کہ دل میں آ کر بیٹھ جاتا ہے۔اس کے بعد نکالے نہیں نکلتا۔"

وہ الجھی ہوئی نظروں سے عدیلہ کو دیکھنے لگی۔وہ قریب آ کر اس پر جھک کر بولی۔"میں کیسی لگتی ہوں؟"

جیسے اس کی الجھن ختم ہو گئی۔وہ مسکرا کر بولی۔"تم تو سب سے اچھی لگتی ہو۔"

عدیلہ نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔"پہلے مجھے محسوس کرو۔پھر بولو۔"

اس کے ہاتھ شانوں سے پھسلتے ہوئے پیچھے گئے پھر اس نے دونوں بازوؤں میں اسے سمیٹ کر سینے سے لگا لیا۔

ماروی کی سانس جیسے ایک ساعت کے لیے رک گئی۔پھر وہ گہری سانسیں لینے لگی۔عدیلہ نے پوچھا۔"کیا ہوا....؟"

"پتا نہیں تم سے لگتے ہی یوں لگنے لگا ہے جیسے سہیلی سے نہیں لگ رہی ہوں۔"

"پھر کس سے لگ رہی ہو؟"

"یہی سوچتی ہوں کہ کس سے لگ رہی ہوں تو ڈر سا لگتا ہے۔حیا سی آتی ہے کئی بار سوچا کہ آئندہ نہیں لگوں گی لیکن ....."

وہ اس کے شانے پر سر رکھ کر بولی۔"لیکن میں تمہیں روک نہیں سکتی۔تم بہت اچھی لگتی ہو۔خوامخواہ ڈرنا کیوں؟ حیا کیسی؟ تم تو میری سہیلی ہو۔"

اب وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اسے سہیلی ہی سمجھتی رہے۔اسے متاثر کرنے والے ایک نہیں دو پہاڑ جیسے مرد آ گئے تھے۔وہ اپنی مردانگی سے متاثر نہ کرتی تو پتنگ کٹ کر ہاتھ سے نکل جاتی۔

وہ اس پر جھک کر کان میں بولی۔"اگر میں سہیلی نہ

رہوں۔ دوست بن جاؤں تو......"

وہ ہنس کر بولی۔ "ایسا کبھی ہو نہیں سکتا۔"

"اگر ہو جائے تو؟"

اس کا ہنستا ہوا چہرہ بجھ گیا۔ وہ بولی۔ "مجھے نہ ڈراؤ۔ تم جادو سے دوست بن جاؤ گی تو میں خوف سے چیخ پڑوں گی۔ بھاگ کر چاچی کے پاس چلی جاؤں گی۔"

عدیلہ نے بڑی آہستگی سے اپنی گرفت سے اسے آزاد کر دیا۔ مایوس ہو کر پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگی۔ ماروی نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ مجھ سے دور کیوں ہو گئیں؟"

وہ بولی۔ "میں نے تو ایک بات پوچھی تھی۔ تم ڈر گئیں۔ کیسی سہیلی ہو؟ کوئی مجھے جادو سے مرد بنا دے گا تو تم ڈر کے بھاگ جاؤ گی؟ مجھ سے محبت نہیں کرو گی؟ میں تبدیل ہونے کے بعد بھی تمہاری وہی عدیلہ رہوں گی نا؟"

"ہاں۔ وہی رہو گی لیکن میری جیسی لڑکی نہیں رہو گی۔ مجھے سوچنا ہوگا کہ تمہارے اندر مجھے اسی سہیلی کا پیار ملے گا یا نہیں؟"

"سہیلی سے بھی زیادہ پیار ملے گا۔ وہ ڈر جو تمہارے اندر ہے، اسے نکال دو۔"

ماروی جیسے چونک گئی۔ سر جھٹک کر بولی۔ "تم نے تو ایسے ہی ایک بات پوچھی تھی۔ کسی نے سچ مچ جادو نہیں کیا ہے، تم سہیلی ہو۔ الجھانے والی باتیں نہ کرو۔"

"آج تمہاری باتوں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تم کمزور سہیلی ہو۔ میرا کوئی گہرا راز ہوگا تو اسے اپنے اندر چھپا نہیں سکو گی۔"

"ایسا نہ کہو۔ تم مجھے پہلے دن سے اچھی لگتی ہو۔ سب کو بھلانے کے بعد ایک تم ہی دل میں سمائی رہتی ہو۔ مجھے آزما کر دیکھو۔ تمہاری رازدار سہیلی بن کر رہوں گی۔ جان بھی چلی جائے گی تو تمہاری کوئی بات کسی سے نہیں بولوں گی۔"

وہ قریب ہو کر اس سے لگ کر بولی۔ "میں کیسے یقین کروں کہ کسی سے نہیں بولو گی؟"

"میں خدا سے ڈرتی ہوں۔ تمہاری جو بات چھپانے کی ہوگی، وہ کسی کو نہیں بتاؤں گی۔"

وہ منہ پھیر کر بولی۔ "تمہیں بھروسا نہیں ہے تو جانے دو۔ مجھے ایسی کوئی بات نہ بتاؤ۔"

وہ اس کا رُخ اپنی طرف کرتے ہوئے بولی۔ "تم سے نہیں بولوں گی تو تمہیں رازدار نہ بنانے کا صدمہ ہوگا۔"

"تو پھر بول ہی دو۔ نہیں بولو گی تو میں بھی تمہارے متعلق تجسس میں مبتلا رہوں گی۔"

وہ اس کی گردن اور شانے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ "میں بھی تمہارے جیسی حسین لڑکی کو رازدار نہیں بناؤں گی تو دور ہی سے نظارے کرتی رہ جاؤں گی۔"

اس نے تعجب سے پوچھا۔ "اس بات کا مطلب کیا ہوا؟"

وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "مطلب چھوڑو۔ تمہارے جاننے اور سمجھنے کے لیے بہت سی باتیں ہیں۔ تمہیں بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔ پہلے وعدہ کرو، ہر حال میں میری سہیلی، میری دوست بن کر رہو گی۔"

"ہر حال میں سہیلی بن کر رہوں گی۔ کبھی تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔ یہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہہ رہی ہوں۔"

ماروی بار بار خود کو سہیلی تو کہہ رہی تھی لیکن ایک بار بھی عدیلہ کو دوست نہیں کہہ رہی تھی۔ دوست تو بنانا ہی تھا۔ عدیلہ نے اور قریب ہو کر اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ پھر کہا۔ "یہ ایسا بھید ہے۔ جسے منہ سے نہیں بولوں گی۔ تم خود ہی سمجھتی جاؤ گی۔"

وہ اس کے چہرے پر جھک گئی۔ عورت جھکے تو سانسوں کی آنچ آتی ہے۔ مرد جھکے تو سانسوں کے بھبکے لگتے ہیں۔

ماروی کو یہ بات کچھ الگ سی لگی۔ عدیلہ کے ہونٹ اس کے رخسار پر اتر گئے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی اس سے پہلے ہی لبوں نے لبوں کو جکڑ لیا۔

یکلخت ماروی کی سانس اوپر کی اوپر رہ گئی۔ حیرت سے اور خوف سے دیدے پھیل گئے۔ وہ ایسا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے اندر جیسے بجلی سی بھر گئی۔ وہ ایک زور دار جھٹکے سے خود کو چھڑا کر اس سے دور ہو گئی۔

ان لمحات میں وہ حیا سے سرخ ہو رہی تھی۔ اچانک حملہ ہونے کے باعث لرز رہی تھی۔ فوراً ہی پیچھے ہٹ کر تیزی سے بھاگتی ہوئی بیڈ کے ایک طرف سے گھوم کر دوسری طرف چلی گئی۔

عدیلہ نے پریشان ہو کر دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "پلیز شور نہ مچانا۔ تم نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر وعدہ کیا ہے، میرا بھید کسی پر ظاہر نہیں کرو گی۔"

ماروی نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "دروازہ کھولو۔"

"ابھی کھولتی ہوں۔ تم پہلے خود کو سنبھالو۔"

"میں بند کمرے میں نہیں رہوں گی۔ پہلے دروازہ کھولو۔"

وہ دروازے کے پاس جا کر اس کا لاک ہٹا کر بولی۔ "لو کھل گیا۔ اسے اور کھولنے کو نہ کہو۔ میں تم سے دور رہوں گی۔"

"رہو گی یا رہو گے......؟"

وہ غصے سے مٹھیاں بھینچ کر بولی۔ "کون ہو تم؟"

"دونوں ہوں۔"

"جھوٹ بول رہے ہو۔"

"سچ بول رہی ہوں۔ میرے لیے تمہارے دل میں جو محبت اور اپنائیت تھی۔ اسے دل سے نہ نکالو۔ مجھے تھوڑی دیر کے لیے اجنبی نہ سمجھو۔ ایک ذرا سکون سے میری بات سن لو۔ میری روداد سننے کے بعد بھی تمہیں مجھ سے ہمدردی نہ ہوئی۔ میری سہیلی اور دوست بننے پر راضی نہ ہوئیں تو میں چپ چاپ یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

وہ بیڈ کے دوسری طرف کھڑی ہوئی تھی۔ غصے سے سرخ ہو رہی تھی۔ عدیلہ نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "تھوڑی دیر کے لیے غصہ تھوک دو۔ میری بات آرام سے سن لو۔ میں دور رہوں گی تمہارے قریب نہیں آؤں گی۔ پلیز تم یہاں آرام سے بیٹھ جاؤ۔"

"نہیں۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔ سنتی رہوں گی۔ تم بولو۔"

وہ بولی۔ "یقین کرو میں بچپن سے ایسی ہی ہوں۔ لڑکا بھی ہوں اور لڑکی بھی۔"

وہ بے یقینی سے بولی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"دراصل پیدائشی لڑکا تھی۔ مام نے مجھے بیٹی بنا کر پرورش کی۔ لڑکیوں کے لباس پہناتی رہیں۔ مجھے ایسی دوائیں کھلاتی رہیں کہ میں لڑکی بن کر رہ گئی۔ لیکن قدرتی طور پر مرد ہوں۔ میری مام اور پاپا کو یہ فکر ہوئی کہ میں صرف لڑکی بن کر رہوں گا۔ شادی نہیں کروں گا اولاد نہیں ہوگی تو ہماری نسل آگے کیسے بڑھے گی؟

"ہمارے اپنے پرائے سب جانتے ہیں کہ میں عدیلہ ہوں اور میرے ایک بھائی کا نام عدیل ہے۔ جبکہ کوئی بھائی نہیں ہے میں ہی وقت ضرورت عدیل بن جاتا ہوں۔ اپنے باپ دادا کی نسل کو آگے بڑھانا ضروری تھا۔ اس لیے میں نے عدیل بن کر شادی کی۔ میری ایک بیوی تھی۔ وہ ایک برس بعد مجھے ایک بیٹی کا باپ بنا کر وفات پا گئی۔"

ماروی سن رہی تھی کہ اب اس کے سامنے کوئی سہیلی کوئی عدیلہ نہیں ہے۔ ایک بچے کا باپ بننے والا مرد کھڑا ہے۔

وہ بولی۔ "آگے اور کچھ نہ بولو۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں دھوکا کھاتی رہی اور تم دھوکا دیتے رہے۔"

"فار گاڈ سیک ماروی! میں نے دھوکا نہیں دیا ہے۔ میں بچپن سے عدیلہ ہوں۔ خدا کا واسطہ دیتا ہوں مجھے عدیلہ ہی سمجھو۔ میں تمہاری سہیلی بن کر......"

ماروی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "چپ ہو جاؤ اور یہاں سے جاؤ۔ مجھے غصہ آ رہا ہے میرا دل گھبرا رہا ہے کہ اتنے دنوں تک ایک مرد کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی رہی۔ میں نے زبان دی ہے۔ اس بات پر قائم رہوں گی کہ تمہارا کوئی سا بھی راز کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میری زبان نہ کھلے تو فوراً اسی لمحے میں یہاں سے نکل جاؤ۔ ورنہ چیخ پڑوں گی۔"

وہ اس کے بگڑتے ہوئے تیور کو سمجھ گئی تھی۔ فوراً ہی دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی ماروی نے آ کر دروازے کو اندر سے لاک کر دیا۔ پھر روتے ہوئے بستر پر آ کر گر پڑی۔

وہ اپنی پچھلی زندگی بھول گئی تھی تو کیا ہوا۔ فطری پارسائی کو نہیں بھول سکتی تھی۔ اس نے ماضی میں حتی الامکان مراد اور محبوب سے بھی فاصلہ رکھا تھا۔ اب سب کچھ بھولنے کے بعد بھی اس کی پارسائی اسے رُلا رہی تھی کہ ایک غیر مرد نے اسے چھو لیا تھا۔

عدیلہ ٹی وی لاؤنج سے اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ وہاں محبوب اور مراد کو دیکھتے ہی جل بھن گئی یہ حقیقت سمجھ میں آئی کہ ان دونوں کی موجودگی نے ماروی کو غیر شعوری طور پر متاثر کیا ہے۔ ابھی اس نے عدیل بن کر اسے آغوش میں لیا تھا۔ ایک ذرا مردانگی کا مظاہرہ کیا تھا اور وہ متاثر نہیں ہوئی تھی۔ وہ دونوں گمشدہ مرد اس کے حواس پر مسلط تھے اور آئندہ بھی غیر شعوری طور پر مسلط رہنے والے تھے۔ اس نے کہا۔ "مسٹر محبوب! ابھی پاپا نے فون کیا ہے مام کی طبیعت اچانک ہی خراب ہو گئی ہے۔ مجھے فوراً جانا ہوگا۔ ابھی جا رہی ہوں۔ کل روٹین کے مطابق آؤں گی۔"

محبوب نے فوراً ہی صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "چلو۔ میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔"

وہ بولی۔ "نو تھینکس۔ اب تو میں اپنی گاڑی میں آنے لگی ہوں۔ خود ہی چلی جاؤں گی۔"

وہ جواب سنے بغیر تیزی سے چلتی ہوئی باہر آئی۔ پھر اپنی کار میں بیٹھ کر ایک سمت جانے لگی۔ ابھی اپنے گھر نہیں جانا چاہتی تھی۔ بری طرح اَپ سیٹ تھی۔ ماروی نے اسے دھتکار دیا تھا۔ ایسی انسلٹ کے بارے میں وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

اب یہ توہین اس کے لیے چیلنج بن گئی تھی۔ وہ اندر ہی اندر تلملا رہی تھی۔ اسے منہ توڑ جواب دیے بغیر سکون سے نہیں رہ سکتی تھی۔ ابھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جواباً کیا کرے گی؟ یہ یقین تھا کہ دولت ہے، ذرائع ہیں۔ بہت کچھ کر سکے

گی۔ اسے چھوڑے گی نہیں۔ اس پر غصہ آرہا تھا اور وہ لمحات بھی یاد آرہے تھے جب اس نے بازوؤں میں اسے جکڑ لیا تھا۔ نازک سے ملائم ہونٹوں کی لطافت یاد آرہی تھی۔

وہ بری طرح الجھی ہوئی تھی۔ اس پر غصہ بھی تھا۔ اس سے نفرت بھی تھی اور اس کی طلب بھی تھی۔

اس بات پر غصہ آرہا تھا کہ اس کے عدیل ہونے کا بھید کھل گیا تھا اور ماروی نے اسے قبول نہیں کیا تھا۔ اسے تو یہی لگ رہا تھا کہ اس نے محبوب اور مراد کے مقابلے میں اسے ٹھکرا دیا ہے۔

جو ہو رہا تھا، اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ کل سے وہ علاج کرنے نہیں جائے گی تو اس کی وجہ پوچھی جائے گی۔ محبوب مراد اور معروف تجلّی عدیلہ کی حقیقت معلوم کیے بغیر اس کی ماما اور پاپا کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔

وہ چاہتی تھی سے ماروی کی پوری ہسٹری سننے کے دوران سمجھ گئی تھی کہ محبوب اور مراد دوستوں کے لیے انتہائی شریف اور دشمنوں کے لیے انتہائی خطرناک ہیں۔ وہ بھی ضدی اور ارادے کی پکی تھی ان سے ڈرنے والی نہیں تھی۔ لیکن عقل کہہ رہی تھی کہ پہلے سمجھوتے کی راہ نکالے۔ جب بات نہ بنے تو پھر عداوت ہی سہی۔

وہ سمندر کے ساحل پر پہنچ کر رُک گئی۔ اس نے ونڈ اسکرین کے پار منہ زور سہ لہروں کو آگے پیچھے دوڑتے دیکھا۔ پھر تصور میں خود کو ماروی کے پیچھے دوڑتے دیکھا پھر فون نکال کر اس کے نمبر پنچ کیے۔ وہ اس سے دور آکر بہت کچھ بولنا چاہتی تھی۔

اس نے فون کو کان سے لگایا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد آواز کٹ گئی یا کاٹ دی گئی۔ وہ اس کی کال اٹینڈ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے پھر کال کی۔ پھر آواز بند ہوگئی۔ تیسری بار اس نے اٹینڈ کیا۔ اس کی آواز سنائی دی۔ ”میں کوئی بات نہیں سنوں گی۔ تم میری آخری بات سن لو۔ میں نے اب تک کسی کو تمہاری اصلیت نہیں بتائی ہے۔ تم یہاں نہ آنے کا کیا جواز پیش کرو گے۔ کیسی باتیں بناؤ گے یا خود اپنی اصلیت ظاہر کر دو گے، یہ تم سمجھو۔“

عدیلہ نے کہا۔ ”میری صرف ایک بات کا جواب دے دو۔ تم میرے وہاں نہ آنے کی کیا وجہ بیان کرو گی؟“

”میں انجان بن کر رہوں گی۔ کل سے تم نہیں آؤ گے تو حیرانی ظاہر کروں گی کہ کیوں نہیں آرہے ہو اور خبردار یہاں آنے کی غلطی نہ کرنا۔“

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ عدیلہ اپنا فون بند کر کے سوچنے لگی۔ ”وہ میرے خلاف کچھ نہیں بولے گی۔ میرے حق میں بہتری کرے گی۔ اب مجھے کچھ ایسا کرنا ہوگا کہ بھید نہ کھلے۔ عدیلہ کی حیثیت برقرار رہے۔“

وہ کار سے باہر آکر کھلی فضا میں ٹھنڈی ہوا میں سوچنے لگی۔ پہلا خیال یہی آرہا تھا کہ فوراً یہ شہر چھوڑ دے۔ یہاں رہے گی تو معروف تجلّی، محبوب اور مراد اس کے نہ آنے کی اور علاج نہ کرنے کی وجہ دریافت کرنے اس کے گھر آجائیں گے۔

اب دانش مندی یہی تھی کہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ ماروی کے بند کمرے میں کیا ہو چکا ہے۔ یہ بات بنائی جائے کہ کسی ایمرجنسی کے باعث وہ لندن واپس جارہی ہے۔

وہ تھوڑی دیر تک اس پہلو سے سوچتی رہی پھر اس نے فون پر اپنے باپ کو مخاطب کیا۔ ”پاپا ۔۔۔! ماروی کے لیے جو ہم نے سوچا تھا، وہ نہیں ہوگا۔ وہ میری اصلیت جانتے ہی دشمن بن گئی ہے۔“

عبدالرحمان نے حیرانی سے کہا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو بیٹے! وہ جوان لڑکی ہے۔ اسے تمہارے جیسے جوان سے متاثر ہونا چاہیے۔ نفرت نہیں کرنا چاہیے۔“

”اسے اس بات کا غصہ ہے کہ میں لڑکی بن کر اس کے بدن سے لگتا رہا ہوں اسے دھوکا دیتا رہا ہوں۔“

”بیٹے! تم اسے سمجھاؤ کہ۔۔۔۔“

وہ بات کاٹ کر بولا۔ ”آپ مجھے نہ سمجھائیں۔ میں نے اس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھے ہیں۔ اگر فوراً اس کی نظروں سے دور نہ ہوتا تو وہ شور مچاتی وہاں سب کے سامنے یہ بھید کھول دیتی کہ میں عدیلہ نہیں عدیل ہوں۔

”آپ نے محبوب اور مراد کو دیکھا نہیں ہے، کیسے تگڑے جوان ہیں۔ وہ میری ہڈیاں پسلیاں توڑ کر رکھ دیتے۔ میری خیریت اسی میں ہے کہ وہ مجھے عدیلہ سمجھتے رہیں۔“

”کیا ماروی تمہاری اصلیت انہیں نہیں بتائے گی؟“

”نہیں وہ مجھے اس حد تک Favour کرے گی کہ میرے خلاف زبان نہیں کھولے گی۔ میری دوہری شخصیت سے انجان بنی رہے گی۔ لیکن اپنے سامنے میرا وجود برداشت نہیں کرے گی۔ اب میں اس کا معالج بن کر اس کے سامنے نہیں جاسکوں گا۔

”ابھی محبوب اور مراد سے یہ جھوٹ بول کر آیا ہوں کہ ماما کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے۔ اس لیے جارہی ہوں۔ کل آؤں گی۔ اب وہ کل کبھی نہیں آئے گا۔“

”وہاں علاج کرنے نہیں جاؤ گے تو بھید کھل جائے گا۔“

”نہیں کھلے گا۔ میں آج ہی بیمار ماما کا علاج کرانے

کے بہانے لندن جاؤں گا۔ آپ ابھی جا کر کسی بھی فلائٹ میں دو سیٹس او کے کرائیں۔ ڈائریکٹ لندن کی فلائٹ نہ ملے تو کسی بھی طیارے سے آج ہی ملک کے باہر چلا جاؤں گا۔

"محبوب اور مراد کو یہ یقین دلانا ہے کہ میں نام کی خاطر بہت مجبور ہو کر ماروی کا علاج چھوڑ کر چلا گیا ہوں۔"

وہ باپ بیٹے اس پہلو پر تھوڑی دیر تک بحث کرتے رہے پھر باپ نے کہا۔ "فی الحال تمہارا یہاں سے جانا ہی مناسب ہے۔ میں کسی بھی فلائٹ میں ٹکٹس او کے کرا رہا ہوں۔"

اس نے کہا۔ "ماروی نے مجھے بری طرح دھتکارا ہے۔ مجھے یہ انسلٹ برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ میں قسم کھا رہا ہوں اسے چھوڑوں گا نہیں پاپا...!"

"کیا کرو گے؟"

"جس پارسائی پر اسے ناز ہے۔ اس کی دھجیاں اُڑا دوں گا۔ دو روز بعد ہی لندن سے عدیل بن کر آ ؤں گا۔"

رحمان نے کہا۔ "برسوں کے بعد ایک مرد بیٹے کی طرح بول رہے ہو۔ میں نے ہمیشہ تمہیں مرد کے روپ میں دیکھنا چاہا۔ ماروی کو حاصل کرنے کی ضد میں میری یہ خواہش پوری کرو گے تو میں اپنے مرد بیٹے کو کسی محبوب اور مراد سے مات کھانے نہیں دوں گا۔ ان کے چھکے چھڑا دوں گا۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "سچ پاپا! آپ کیا کریں گے؟"

وہ ایک انگلی سے اپنے سر کو ٹھونکتے ہوئے بولا۔ "میں جو بے انتہا دولت کما رہا ہوں تو اس کے پیچھے ایسی ایسی دماغی کارفرمائیاں ہیں کہ سنو گے اور انہیں دیکھو گے تو باپ کو ایک نئے روپ میں پا کر حیران ہو جاؤ گے۔ کم آن بیٹے! تم میرے مرد بیٹے بنو۔ میں ماروی کو تمہاری جھولی میں لا کر ڈالوں گا۔ چلو اب گھر آ جاؤ۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ عدیلہ خوشی سے کھل گئی تھی۔ اس نے فون کو بڑے پیار سے چوم کر کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں پاپا! آج سے عدیلہ نہیں عدیل بن کر رہوں گا..."

☆☆☆

ماروی، مراد اور محبوب عام لوگوں کی طرح زندگی گزار رہے تھے۔ اپنی روزی کما رہے تھے۔ آپس میں محبتیں کر رہے تھے۔ نہ کسی کو دکھ دے رہے تھے نہ کسی سے دکھ اٹھانا چاہتے تھے۔ لیکن یہ دنیا ہے۔ یہاں خدا واسطے کا بیر رکھنے والے کم نہیں ہیں کسی سے بیر نہ رکھو پھر بھی بیری کہیں نہ کہیں سے چلے آتے ہیں۔

اب وہ تینوں حالات کے نئے موڑ پر آ گئے تھے۔ پچھلی ماروی کہیں گم ہو گئی تھی۔ ایک نئی ماروی نئے دل و دماغ کے ساتھ پیدا ہو گئی تھی۔ مراد اور محبوب اس کے لیے اجنبی ہو گئے تھے۔ انہیں نئے سرے سے اس کے دل میں جگہ بنانے کے لیے پھر سے پیار و محبت کی شروعات کرنی تھی اور اس شروعات کے ساتھ ہی عدیلہ عرف عدیل رحمان عداوت کے لیے چلا آیا تھا۔ عورت اور مرد کے دہرے بہروپ کے ساتھ کچھ نئے کھیل کھیلنے والا تھا۔

مرینہ ابھی اسپتال میں تھی۔ ذرا ابھر کر آنے والی تھی۔ موت کے بستر پر پہنچنے کے بعد زندگی کی طرف لوٹ آئی تھی۔ پھر سے تازہ دم ہو رہی تھی۔ اسپتال سے نکلتے ہی مراد سے انتقام لینے کے منصوبے بنا رہی تھی۔

وہ تینوں جیسے حالات سے گزرتے آ رہے تھے ان کا سب سے نیا خطرناک موڑ یہ تھا کہ مراد برنارڈ کو موت کے گھاٹ اتار کر بدنام زمانہ مجرموں کی نظروں میں آ گیا تھا۔

برنارڈ نے سیکرٹ ایجنٹ کی حیثیت سے ایک بڑے ملک کے لیے بڑے کارنامے انجام دیے تھے۔ وہاں کی سی آئی اے اس کی ہلاکت پر جھنجلا گئی تھی۔ برنارڈ عالمی سطح کی خطرناک تنظیموں کا بھی ایک قابل فخر ہیرو تھا۔ ایک تنظیم "سنڈیکیٹ ریڈ الرٹ" نے مراد کو قتل کرانے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ اس تنظیم کے جاسوس مراد کے متعلق معلومات حاصل کر رہے تھے اور اسے پہلی فرصت میں گولی سے اُڑا دینے والے تھے۔

سنڈیکیٹ ریڈ الرٹ کے سربراہ میکی البرٹ نے اپنے پاکستانی زرخرید ایجنٹ کو حکم دیا کہ مراد کو فوراً ہی موت کے گھاٹ اتارا جائے۔ اس ایجنٹ نے کرائے کے ایک قاتل کو مراد کی وہ تصویر دی، جو اخبارات میں شائع ہو چکی تھی۔ وہ کرائے کا شوٹر تصویر جیب میں رکھ کر ریوالور لباس میں چھپا کر مراد کی تلاش میں نکل پڑا تھا۔ پھر یہ معلوم ہوا کہ جسے قتل کرنا چاہتا ہے، وہ ابھی جیل میں ہے اسے تین دنوں کے بعد رہائی ملے گی۔ اس نے انتظار کیا۔ اس پیشہ ور قاتل کو اطمینان تھا کہ چوتھے دن وہ عدالت کے باہر مرنے کے لیے ہی آئے گا۔ کوئی نہیں جانتا کہ موت کب اور کس وقت اسے لینے آ جاتی ہے۔ جج کے چیمبر میں بیٹھے ہوئے محبوب اور معروف بھی خوش تھے کہ مراد کو رہائی مل رہی ہے اور وہ باہر آزادی کی سانسیں لیتا رہے گا اور موت کے ہرکارے کو یقین تھا کہ وہ اس کی باقی تمام سانسیں چھین کر لے جائے گا۔

خدا کو ابھی مراد کی سلامتی منظور تھی۔ وہ محبوب اور معروف کے ساتھ چیمبر سے باہر آیا تو اس شوٹر نے ایک کے بجائے دو مراد کو دیکھا۔ ایک ہی جیسی دو صورتیں یوں نظر آ رہی تھیں جیسے نشے کی حالت میں ایک کے بجائے دو دکھائی

دے رہے ہوں۔

اس نے پلکیں جھپک کر دیکھا۔ تب یقین ہوا کہ وہ دو الگ الگ ہیں۔ لیکن ہم شکل ہیں۔

پہلا سوال پیدا ہوا کسے گولی مارے؟

اُسے یا اِسے؟

اسے تو مراد نامی شخص کو گولی مارنے کا حکم دیا گیا تھا۔

ان دونوں میں سے مراد کون ہے؟

وہ اپنی کار میں بیٹھ کر جانے لگے۔ دونوں ہم شکل اگلی سیٹ پر تھے۔ معروف پچھلی سیٹ پر تھا۔ شوٹر نے اپنی بائیک پر بیٹھ کر ایک کک ماری پھر ان کے پیچھے چل پڑا۔

چلتی پھرتی واردات کے لیے موٹر سائیکل بڑی آسانیاں فراہم کرتی ہے۔ قاتل تیزی سے گولی مارتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ لیکن اُلجھن وہی تھی کہ کسے گولی مارے؟

اگر محبوب کو مار کر گزر جاتا اور مراد محفوظ رہتا تو ناکامی کے باعث شوٹر کو اس کی باقی پیمنٹ نہ ملتی۔ اسے حکم دیا جاتا کہ پہلے مراد کو ٹھکانے لگائے۔

یعنی اسے ایک ہی پیمنٹ میں دو بار واردات کرنی پڑتی اور وہ بار بار خطرات سے کھیلنا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے کار کا تعاقب کرتے ہوئے فون کے ذریعے رابطہ کیا۔ پھر کہا۔ "مجھے مراد نامی شخص کو شوٹ کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ اس کی تصویر میرے پاس ہے لیکن یہاں ایک نہیں دو مراد ہیں۔ مجھے بتانا چاہیے تھا کہ اس کا ایک ہم شکل بھی ہے۔"

وہ آگے جانے والی گاڑی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں ان کے پیچھے ہوں۔ مگر کیسے معلوم کروں کہ ان میں سے مراد کون ہے؟ مجھے جلدی بتائیں میں کیا کروں؟ کسے گولی ماروں؟"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ اس کا کوئی ہم شکل بھی ہے۔ میں ابھی باس سے بات کرتا ہوں۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ کار کے پیچھے بائیک دوڑاتا ہوا ان کی کوٹھی تک پہنچ گیا۔ اس نے دور سے ان ہم شکلوں کو کار سے اتر کر کوٹھی کے اندر جاتے دیکھا۔ شکار ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اب پتا نہیں وہ کب باہر نشانے پر آتا؟

اسی وقت فون پر اسے مخاطب کیا گیا۔ اس نے فون کا بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ "ہاں۔ میں بول رہا ہوں۔"

"یہاں کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا کوئی ہم شکل ہے۔ تمہیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ ان میں سے مراد کون ہے۔"

"وہ دونوں کوٹھی کے اندر چلے گئے ہیں۔ مجھے بہت محتاط رہ کر کسی طرح مراد کو پہچاننا ہوگا۔ اب پتا نہیں کب ان میں سے کوئی باہر آئے گا۔"

"ہاں۔ ٹائم تو لگے گا۔ ان میں سے کوئی تو باہر آئے گا۔ کسی سے اس کا نام پوچھ سکو گے۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ دل ہی دل میں بڑبڑانے لگا۔ کچھ پریشان بھی تھا۔ صبح سے اس کی بائیں آنکھ پھڑک رہی تھی۔ اس نے بارہا آزمایا تھا۔ بائیں آنکھ پھڑکتی تھی تو کسی مصیبت سے دوچار ہوتا تھا یا کسی کام میں ناکامی ہوتی تھی۔ وہ پہلی بار اپنی پلاننگ کے مطابق مراد کو ہلاک کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔ وہ کوٹھی سے ذرا دور جا کر ان دونوں کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا۔ شام کو اندھیرا پھیلنے سے پہلے محبوب باہر آ کر اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے جانے لگا۔ ایسے وقت وہ اپنی بائیک پر سوار ہو کر کافی فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کرنے لگا۔

محبوب چاہتا تھا کہ مراد اس کے ساتھ کوٹھی میں رہے لیکن وہ ساتھیں کے مزید احسانات اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس

کرپشن اور کرپٹ
لوگوں کا مؤثر علاج

صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے دور میں واہ کے آرڈی ننس کمپلیکس کی تعمیر کی گئی تو چین کے ایک وفد نے کمپلیکس کا دورہ کیا۔ عمارت کے دورے کے دوران وفد نے ایک کمرے کی چھت کو ٹپکتے دیکھا۔ میزبان نے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "عمارت ابھی نئی نئی بنی ہے، اس لیے ذرا ٹپک رہی ہے۔"

یہ سن کر چینی وفد کے ایک کارکن نے استہزائیہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

"شروع شروع میں ہماری عمارتیں بھی ٹپکتی تھیں، پھر ہم نے بدعنوانی کے مرتکب ایک ٹھیکیدار کو چوک میں کھڑا کر کے سرِعام گولی سے اڑا دیا۔ اس دن کے بعد ہماری عمارتیں نئی ہوں یا پرانی، کبھی نہیں ٹپکتیں۔"

مُرسلہ۔ محمد ندیم خان، ہائی سیکیورٹی، نیو سینٹرل جیل، ملتان

نے کہا تھا کہ وہ ایک کرائے کے مکان میں رہے گا۔ اس کے پاس لاکھوں روپے ہیں۔ وہ ٹیکسی خرید کے اسے روزگار کا ذریعہ بنائے گا۔

اس منصوبے کے مطابق وہ دوسرے دن کوٹھی سے نکل کر اپنے کام دھندے سے لگنے والا تھا۔ وہ رات اسی کوٹھی میں گزارنے والا تھا۔ شکاری کو اس کے انتظار میں کل تک بھٹکتے رہنا تھا۔

ابھی وہ محبوب کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ شیر کو اور آدمی کو گولی مارنا آسان نہیں ہوتا۔ اسے گھیر نے اور نشانے پر لانے کے لیے تجربہ کار شکاری کو ذہانت سے پلاننگ سے اور صبر و تحمل سے کام لینا پڑتا ہے۔ شوٹر بڑے صبر سے اپنے صحیح ٹارگٹ تک پہنچنے کا منتظر تھا۔

محبوب کار ڈرائیو کرتا ہوا اپنی کوٹھی کے سامنے آیا۔ وہاں دو مسلح گارڈز تھے۔ ان میں سے ایک نے بڑے آہنی گیٹ کو کھولا۔ محبوب کار ڈرائیو کرتا ہوا اندر چلا گیا۔ گیٹ بند ہوگیا۔

شوٹر دور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بائیک کو آگے بڑھاتے ہوئے گیٹ کے قریب سے گزرا۔ ایک بڑی سی جنگل کی نیم پلیٹ پر محبوب علی چانڈیو لکھا ہوا تھا۔ وہ نام پڑھتا ہوا گزر گیا۔

ایسی بھاگ دوڑ سے جھنجلاہٹ طاری ہوتی ہے۔ وہ دونوں ہم شکل کو گالیاں دینے لگا۔ نیم پلیٹ نے سمجھا دیا کہ اصل ٹارگٹ اس کوٹھی میں ہے۔ وہ پھر اسی کوٹھی کے سامنے آیا۔ وہاں سے کافی فاصلے پر رہا۔ یہ بات سمجھ میں آرہی تھی کہ مراد اس کوٹھی میں رہتا ہے۔ جیل سے چھوٹ کر آیا ہے۔ شاید آرام کرے گا۔ ابھی باہر نہیں نکلے گا۔ ابھی اسے جانا چاہیے۔

اس بار گیٹ کے باہر کھڑے ہوئے مسلح گارڈز نے اسے دیکھ کر سوچا۔ "یہ موٹر سائیکل والا ابھی ادھر تھا۔ چانڈیو صاحب گئے تو یہ بھی چلا گیا تھا۔ پھر ادھر آیا ہے۔ مجھے اس پر دھیان رکھنا ہوگا۔"

وہ وہاں سے اور دور چلا گیا تھا، اپنی بائیک سے ٹیک لگا کر کھڑا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ ایک گھنٹا گزر گیا تو گارڈ نے سوچا اسے آواز دے اور پوچھے کہ وہ کون ہے؟ اور بڑی دیر سے وہاں کس کا انتظار کر رہا ہے؟

وہ اسی وقت اپنی بائیک پر بیٹھ کر جانے لگا۔ اس نے محسوس کرلیا تھا۔ گارڈ بار بار اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ٹارگٹ کلر بہت محتاط رہتے ہیں۔ کسی کی نظروں میں مشکوک ہونے کی غلطی نہیں کرتے اور اس سے یہ غلطی ہوگئی تھی۔

☆☆☆

ماروی کئی بار صدمات سے گزرتی رہی تھی۔ وہ تمام گزرے ہوئے صدمات اس کے ذہن سے محو ہوگئے تھے۔ وہ انہیں بھول چکی تھی۔ اب نئی زندگی گزارتے ہوئے پہلی بار اسے ذہنی صدمہ پہنچ رہا تھا اور یہ سوچ سوچ کر شرم بھی آرہی تھی کہ ایک بہروپیا عورت بن کر اس کے بدن کو ہاتھ لگاتا رہا تھا۔

وہ عدیلہ کو کمرے سے نکال کر دروازہ بند کرنے کے بعد روتی رہی تھی۔ وہ فطرتاً ایسی حیا والی تھی کہ مراد کو بھی ہاتھ پکڑنے نہیں دیتی تھی۔ اب خود کو سمجھا رہی تھی کہ جو ہوگیا اسے برداشت کرنا ہوگا۔ آئندہ محتاط رہے گی۔ کسی عورت کے بدن سے بھی نہیں لگے گی۔

ڈرائنگ روم میں مراد، محبوب، چاچی اور چاچا بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں دیدار کے پیاسے تھے، اس کا انتظار کررہے تھے۔ خیال تھا کہ ڈاکٹر عدیلہ اچانک چلی گئی ہے تو وہ بھی اپنے بیڈ روم سے آجائے گی۔ ان کے پاس بیٹھ کر باتیں کرے گی لیکن کافی انتظار کے بعد بھی وہ نہیں آئی۔

مراد نے کہا۔ "چاچی! میں اتنے دنوں کی جدائی کے بعد آیا ہوں۔ وہ تو بھول ہی گئی ہے جیسے اسے ہم سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔"

محبوب نے کہا۔ "اسے یہاں آنا چاہیے۔ اپنے کمرے میں بیٹھی ہے تو یہاں بھی بیٹھ کر باتیں کرسکتی ہے۔"

چاچی دونوں کی بے قراری کو سمجھ رہی تھی۔ اس نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "جا کر دیکھتی ہوں۔ وہ آج کل بے وقت سونے لگی ہے۔ اسے دیکھتی ہوں تو عجیب سا لگتا ہے۔ ہماری بچی ہے۔ ہمیں بھولی بیٹھی ہے۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی اس کے دروازے پر آئی۔ ہینڈل کو پکڑ کر ذرا سا دباؤ ڈالا تو معلوم ہوا اندر سے بند ہے۔ اس نے دستک دیتے ہوئے آواز دی۔ "ماروی....!" وہ بیڈ پر پڑی تھی۔ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چاچی کی آواز سنائی دی۔ "کیا سو رہی ہو؟"

اس نے سوچا۔ دروازہ کھولے گی تو خواہ مخواہ عدیلہ کی کوئی بات ہوگی اور وہ اس کا نام بھی سننا نہیں چاہتی تھی یا چاچی اسے ڈرائنگ روم میں آکر محبوب اور مراد سے باتیں کرنے کو کہتی تو ادھر بھی جانے کو جی نہیں کر رہا تھا۔

اسے ان دونوں سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ لیکن ابھی ایک مرد سے دھوکا کھانے کے بعد وہ دوسرے مردوں سے بھی ذرا دور رہنا چاہتی تھی۔ وہ فی الحال ان کے قریب بھی

جانے سے اور باتیں کرنے سے کترا رہی تھی۔ ان لمحات میں اسے کوئی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ بس تنہائی اچھی لگ رہی تھی۔

اس نے بیڈ سے اتر کر دروازے کے پاس آکر آہستگی سے کہا۔ "چاچی! میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں ذرا لیٹی ہوئی ہوں۔"

"دروازہ کھولو۔ میں سر میں تیل لگاؤں گی۔ کنگھی کروں گی تو آرام آجائے گا۔"

"ابھی تیل نہیں لگواؤں گی۔ چپ چاپ لیٹی رہوں گی تھوڑی دیر بعد آؤں گی۔"

"وہ بے چارے تمہارے انتظار میں بیٹھے ہیں۔"

وہ اپنی نئی زندگی میں مرد کی چاہت نہیں جھوٹ اور فریب دیکھ رہی تھی۔ وہ کیا جانتی کہ وہ دونوں فطرتاً کیسے ہیں؟ ان کی تمام اچھائیاں اب تک صرف چاچی اور چاچا کی زبان سے سنتی آئی تھی۔

بند دروازے کے دوسری طرف خاموشی رہی۔ چاچی نے ڈرائنگ روم میں آکر کہا۔ "اس کے سر میں درد ہے۔ وہ کمرے سے نہیں نکلے گی۔"

محبوب نے کہا۔ "میں ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔ وہ ابھی آکر دوائیں دے گا۔"

"نہیں بیٹے! ڈاکٹر کو نہ بلاؤ۔ سر تو بھاری ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس نے کوئی گولی کھالی ہوگی ابھی آرام آجائے گا۔"

دونوں نے مایوس ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ چاچی یہ کہہ کر چلی گئی کہ تھوڑی دیر بعد جا کر ماروی کا حال معلوم کرے گی پھر اسے ڈرائنگ روم میں لائے گی۔ اس کے جانے کے بعد مراد نے کہا۔ "وہ اکیلی ہوگئی ہے۔ پتا نہیں اس کی یادداشت کب واپس آئے گی۔"

محبوب نے کہا۔ "یہ ایسی ہی رہے گی تو ہم اس کی نظروں میں اجنبی ہی رہیں گے۔"

مراد نے کہا۔ "چاچی نے اسے اچھی طرح سمجھایا ہے کہ ہم اس کی زندگی میں کتنی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسے چاچی کی بات پر یقین کرنا چاہیے۔ لیکن وہ کسی پر بھروسا نہیں کر رہی ہے۔ خواہ مخواہ ہمارے سامنے آنے سے کترا رہی ہے۔"

محبوب نے کہا۔ "تم تو آج آئے ہو۔ میں پچھلے چار دنوں سے یہاں دو چار گھنٹوں کے لیے آتا رہا ہوں۔ مجھ سے سامنا ہوتا ہے۔ وہ چپ چپ سی رہتی ہے میں کچھ بولتا ہوں تو جواباً بولتی ہے۔ پھر چپ ہوجاتی ہے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "وہ کیا بولے گی جب پچھلی یادیں نہیں ہیں تو باتیں کیا ہوں گی۔"

محبوب نے کہا۔ "شاید اسے یقین نہیں آرہا ہے کہ چاچی سچ کہہ رہی ہیں اور ہم تینوں ایک دوسرے کے قریب رہ چکے ہیں۔"

ماروی کی شرم و حیا کو اور اس کے مزاج کو دیکھا جائے تو جب تک وہ مراد اور محبوب کو نہ پہچانتی تب تک اس کا ذہن انہیں قبول نہ کرتا، تب تک وہ اسے اجنبی ہی لگتے رہتے۔

محبوب کے فون سے کالنگ ٹون سنائی دی۔ اس نے ننھی سی اسکرین کو دیکھا پھر بٹن دبا کر اسے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "جی معروف صاحب فرمائیں؟"

معروف نے کہا۔ "ابھی عبدالرحمان نے مجھے فون پر کہا ہے کہ اس کی وائف رخشی بیمار ہے۔ عدیلہ اپنی ماں کو علاج کے لیے آج ہی رات کی فلائٹ سے لندن لے جارہی ہے۔"

محبوب نے کہا۔ "یہ اچانک کیا ہوگیا ہے؟ عدیلہ چلی جائے گی تو ماروی کا علاج ادھورا رہ جائے گا۔"

"اس کی مجبوریاں ہیں۔ ہم اسے لندن جانے سے نہیں روک سکتے۔ وہ اپنی ماں کے علاج کے لیے جارہی ہے۔ ہمیں کسی دوسرے ڈاکٹر کی خدمات حاصل کرنی ہوں گی۔"

"یہ اچانک اس کی ماں بیمار کیسے ہوگئی؟ کیا اس کا علاج یہاں نہیں ہوسکتا؟"

معروف نے کہا۔ "میں نے یہ سوال کیا تھا۔ جواب ملا کہ اسے عورتوں سے تعلق رکھنے والی ایک بیماری ہے لندن کی ایک لیڈی ڈاکٹر اس کا علاج کرتی ہے۔"

محبوب نے پریشان ہو کر کہا۔ "ماروی عدیلہ سے اچھی طرح گھل مل گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہنستی بولتی رہتی ہے۔ بہت جلد اس کی یادداشت واپس آسکتی تھی۔ کیا ضروری ہے کہ عدیلہ ماں کو لندن لے جائے۔ باپ بھی اسے لے جاسکتا ہے۔"

"رحمان یہاں کاروباری معاملات میں معروف ہے۔ اس لیے بیٹی جارہی ہے۔ تمہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم ان کے پرسنل معاملات میں بحث نہیں کرسکیں گے۔"

"معروف صاحب! ماروی کے علاج کے لیے ڈاکٹروں کی کمی نہیں ہوگی۔ لیکن عدیلہ یہاں آتے ہی اس کی نفسیات پر حاوی ہوگئی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ آج کل میں ہی اس کی یادداشت واپس آجائے گی۔"

اس نے دوسری طرف کی باتیں سنیں پھر کہا۔ "میں عدیلہ کو روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

اس نے فون بند کیا۔ پھر عدیلہ کے نمبر پنچ کرنے لگا۔ اسی وقت ماروی کی آواز سن کر چونک گیا۔ وہ توقع کے

خلاف بیڈروم سے آگئی تھی۔ ڈرائنگ روم کے دروازے پر کھڑی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ ”اسے کال نہ کریں۔ میں علاج نہیں کراؤں گی۔“

وہ دونوں ہی اپنی معشوق کو دیکھ کر اپنی جگہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ مراد نے کہا۔ ”آؤ ماروی! ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے۔“

اس کے پیچھے ختی کھڑی تھی۔ وہ تنہا دو مردوں کے پاس آکر بیٹھنے والی نہیں تھی۔ چاچی کے ساتھ ایک صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔

محبوب نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے ماروی؟ یہ کیوں کہہ رہی ہو کہ علاج نہیں کراؤ گی؟“

وہ سر جھکا کر بولی۔ ”بس یونہی۔ میں ضروری نہیں سمجھتی۔“

چاچی نے پوچھا۔ ”کیا ضروری نہیں سمجھتیں؟ علاج نہیں کراؤ گی تو دماغی کمزوری کیسے دور ہوگی؟ پھر تمہیں پچھلی تمام باتیں کیسے یاد آئیں گی؟“

وہ بولی۔ ”آجائیں گی۔ آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو کبھی نہ کبھی سب کچھ یاد آجائے گا۔“

مراد نے کہا۔ ”دنیا کی ہر بیماری کے لیے علاج اور دوا لازمی ہوتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تمہیں پچھلی باتیں جلد سے جلد یاد آجائیں۔ جب تم ہمیں پہچاننے لگو گی تو خود کو رشتوں سے محبتوں سے بھرپور دیکھو گی یہ زندگی بہت زیادہ خوبصورت ہوجائے گی۔“

وہ جھکی جھکی نظروں سے مراد کو اور محبوب کو دیکھ رہی تھی۔ ایک بہروپیے سے دھوکا کھانے کے باوجود وہ دونوں اچھے لگ رہے تھے۔

کیوں اچھے لگ رہے تھے؟ ایک ڈھکی چھپی اور نہ سمجھ میں آنے والی قدرتی کشش ہوتی ہے۔ جو صنف نازک کو صنف قوی کی سمت کھینچتی ہے۔ پھر یہ کہ یادداشت دراصل گم نہیں ہوئی تھی‘ وہ تحت الشعور میں موجود تھی۔ کسی وقت بھی وہاں سے نکل کر شعور کے خانے میں آسکتی تھی۔

محبوب نے کہا۔ ”ہم بہت ہی تجربہ کار معروف ڈاکٹر کی خدمات حاصل کریں گے۔ پلیز تم علاج کرانے سے انکار نہ کرو۔“

ختی نے کہا۔ ”ہاں بیٹی! اب میں تمہیں کیا یاد دلاؤں کہ یہ دونوں تمہاری بہتری کے لیے کیا کچھ کرتے آئے ہیں۔ یہ تمہارا علاج ضرور کرائیں گے۔ تم انکار نہ کرو۔“

وہ نہیں چاہتی تھی کہ اب کوئی ڈاکٹر آئے اور روز اس کے ساتھ کچھ وقت گزارے۔ اس نے کہا۔ ”میں انکار نہیں کروں گی۔ لیکن ابھی کسی ڈاکٹر سے بات نہ کی جائے۔“

”تمہیں سمجھنا چاہیے کہ دماغی کمزوری تازہ ہے علاج کے سلسلے میں کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔“

ختی نے کہا۔ ”تم بیمار رہو تمہاری نہیں سنی جائے گی۔“

وہ تھوڑی دیر تک سر جھکائے چپ رہی پھر اس نے سر اٹھا کر مراد کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر رونق آگئی۔ پھر اس نے محبوب کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھی مسرتوں سے چمکنے لگیں۔

وہ نئی زندگی میں پہلی بار ان سے نظریں ملا رہی تھی۔

اس نے دونوں کو باری باری دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اگر میں اپنا علاج خود کرنا چاہوں تو کوئی ڈاکٹر ضروری نہیں ہوگا۔“

ختی نے کہا۔ ”یہ کیسی بچوں والی بات کہہ رہی ہو؟“

وہ چاچی کو نظر انداز کرکے باری باری مراد کو اور محبوب کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”میں دوائیں نہیں کھاؤں گی۔ کسی ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل نہیں کروں گی تو پیسے بھی ضائع ہوں گے۔ وقت بھی برباد ہوگا۔ اس لیے کسی ڈاکٹر کی بات نہ کریں۔ میں خود ہی آپ دونوں سے ملتی رہوں۔ پچھلی زندگی کی باتیں کرتی رہوں گی۔ یوں ہمارا ساتھ برابر رہے گا تو ضرور مجھے تمام باتیں یاد آجائیں گی۔“

وہ دونوں ایک دم سے خوش ہوگئے۔ برابر ملتے رہنے اور ساتھ رہنے والی بات سنتے ہی دل کی دھڑکنیں پاگل ہو رہی تھیں۔

مراد نے اپنے صوفے کے ہتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”اس سے اچھی بات اور کیا ہوسکتی ہے؟“

محبوب نے کہا۔ ”اس سے اچھی بات اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ ہماری سنتی رہو گی اپنی سناتی رہو گی تو یقیناً تمہاری سوئی ہوئی یادداشت رفتہ رفتہ جاگتی رہے گی۔“

مراد نے کہا۔ ”دنیا کا کوئی ڈاکٹر ایسا علاج نہیں کر سکے گا جیسا کہ تم خود ہی کرتی رہو گی۔“

ختی صوفے پر کھسک کر ماروی کے قریب آگئی۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”میری بیٹی بہت سمجھ دار ہے۔ کتنی عقل کی بات کہہ رہی ہے۔ تم تینوں ایک دوسرے سے ملتے رہو گے اور یہ تمہیں اپنا ماضی رہے گی تو میری موٹی عقل بھی کہتی ہے کہ یاد آنے والی باتیں ضرور یاد آتی رہیں گی۔“

محبوب نے کہا۔ ”ماروی! تمہیں اندازہ ہو رہا ہوگا کہ تم ماضی میں بھی کتنی ذہین تھیں۔ ابھی تم نے کتنی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔“

اپنی تعریف سن کر کون خوش نہیں ہوتا؟ وہ اندر سے خوش ہو رہی تھی۔ مراد نے کہا۔ ”یہ کوئی برداشت نہیں کرتا کہ

کسی کی لات منہ پر پڑے ایک بار ماروی نے مجھے لات کھانے سے بچایا تھا۔“

ماروی کی سوالیہ نظروں نے پوچھا۔ ”میں نے کیسے بچایا تھا؟“

وہ بولا۔ ”ایک بار میں گدھے کے پیچھے بیٹھا مٹی کھود رہا تھا۔ ایسے وقت تم نے گدھے کے بدلتے ہوئے مزاج کو سمجھ لیا۔ فوراً ہی مجھے دھکا دیا۔ ایسا نہ کرتیں تو گدھے کی لات میرے منہ پر ضرور پڑتی۔“

اس بات پر سب قہقہے لگانے لگے۔ ماحول اچانک ہی گل و گلزار ہوگیا۔ ماروی پہلی بار اتنی ہنسی‘ اتنی مسرتیں اور اتنے کھلتے ہوئے چہرے دیکھ رہی تھی۔ عدیلہ سے جو دکھ ملا تھا۔ اسے آپ ہی آپ بھولتی جا رہی تھی اور پہلی بار یہ بات دل میں سما رہی تھی کہ اس کی کھوئی ہوئی دنیا مراد محبوب چاچی اور چاچا کے درمیان ہی ملے گی۔

محبوب نے شام کی چائے پینے کے بعد کہا۔ ”کل سے مجھے آفس اٹینڈ کرنا ہے۔ میں روز دوپہر کو یہاں لنچ کرنے آؤں گا اور شام کی چائے پینے تک ماروی کے ساتھ رہوں گا۔“

مراد نے کہا۔ ”اور میں شام کو آیا کروں گا۔ رات کا کھانا ماروی کے ساتھ کھایا کروں گا۔“

اس روٹین کے مطابق محبوب شام کی چائے پی کر چلا گیا۔ وہ دونوں ہی اس ملک الموت سے بے خبر تھے جو عدالت سے ان کے پیچھے لگا ہوا تھا۔

وہ شوٹر محبوب کی کوٹھی تک اس کا تعاقب کرنے کے بعد پھر اس کوٹھی کی طرف پلٹ آیا تھا‘ جہاں مراد تھا۔ پھر یہ سوچ کر وہاں سے چلا گیا کہ اس کا شکار جیل سے آیا ہے۔ ابھی کوٹھی میں آرام کرے گا۔ کل باہر آئے گا تو کہیں بھی مناسب موقع ملتے ہی اسے گولی سے اڑا دے گا۔

مراد کو بھی روزی روٹی کی فکر تھی۔ آئندہ ماروی کے ساتھ ایک شاندار مستقبل کا خواب تھا۔ ”سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں“ کے مصداق وہ دوسرے دن ڈرائیونگ سیکھنے والا تھا۔ اسے اپنی رہائش کے لیے کہیں ایک کرائے کا مکان حاصل کرنا تھا۔ پھر چند روز میں وہ ڈرائیونگ سیکھتے ہی ایک ٹیکسی خریدنے والا تھا۔

اس نے رات کوٹھی میں گزاری۔ دوسری صبح وہاں سے جانا تھا۔ وہ اس کی زندگی کی پہلی خوبصورت رات تھی جب وہ ایک چھت کے نیچے ماروی کے ساتھ رہا۔ اس کے ساتھ کھاتا پیتا اور ٹی وی کے تفریحی پروگرام دیکھتا رہا۔

وہ ایک عرصے کے بعد ہنس بول رہی تھی۔ مراد اسے خوش کرنے والی باتیں کر رہا تھا اور محبوب کا بھی ذکر کر رہا تھا۔ وہ احسان فراموش نہیں تھا۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات نہیں تھی کہ محبوب کی غیر موجودگی سے ناجائز فائدہ اُٹھائے اور اسے کمتر اور خود کو برتر بنا کر پیش کرے۔

اور یہی محبوب کی شرافت اور دیانتداری تھی۔ وہ جب تک مراد کی غیر موجودگی میں ماروی کا محافظ بن کر رہا۔ خود کو اس نے برتر بنا کر اور مراد کو بھی کمتر کہہ کر اسے ماروی کی نظروں سے نہیں گرایا۔

بہر حال اس نے ماروی کے ساتھ وہ رات اچھی گزاری۔ دوسری صبح چاچا نے کہا۔ ”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ تمہارے ساتھ چار پیسے کمانے والا کوئی کام کروں گا۔“

چاچی نے مراد سے کہا۔ ”میں نے اسے سمجھایا ہے‘ ساری زندگی سائیں کی کوٹھی میں نہیں گزرے گی۔ ہمیں اپنا ٹھکانا بنانا چاہیے اور سنو مراد! جہاں تم رہو گے‘ وہیں ہم رہیں گے۔“

مراد نے ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنے کے بعد بائیس لاکھ روپے حاصل کیے تھے۔ اس کے پاس ایک ریوالور ایک پستول اور بلٹس کے پیکٹس تھے۔ وہ ایک بیگ میں یہ چیزیں رکھ کر انہیں چاچی کے پاس چھوڑ کر دوسری بار جیل میں گیا تھا۔

اس نے چاچی سے کہا۔ ”آج سے میں ٹیکسی چلانا سیکھوں گا اور چاچا کے ساتھ کہیں کرائے کا مکان حاصل کروں گا۔ جب چلانا سیکھ لوں گا تو ٹیکسی خریدنے کے لیے یہ رقم لے جاؤں گا۔“

وہ ایک پستول اٹھا کر اسے لوڈ کرتے ہوئے بولا۔ ”اسے لباس میں چھپا کر رکھوں گا۔“

چاچی نے اسے چھین کر پوچھا۔ ”کیوں رکھے گا؟ یہاں کون تیرا دشمن ہے؟ خدا کا شکر ہے۔ جو تھے‘ وہ فنا ہوگئے۔ وہ ایک سکھر کے اسپتال میں پڑا ہے، اب کبھی تیرے منہ نہیں لگے گی۔“

اس نے کہا۔ ”پھر بھی چاچی ہتھیار رکھنا چاہیے۔“

”کیوں رکھنا چاہیے؟ غنڈے بدمعاش خوامخواہ اسے لیے پھرتے ہیں۔ حالات نے تجھے مجبور کیا تھا تو تو مجبور ہوگیا تھا۔ اب کوئی مجبوری نہیں ہے۔“

چاچا نے کہا۔ ”ہم نے پہلے کبھی موت کے ایسے کھلونے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اس سے دور ہی رہو تو اچھا ہے۔“

وہ خالی ہاتھ چاچا کے ساتھ کوٹھی سے باہر آگیا۔ اس وقت دن کے گیارہ بجنے والے تھے۔ وہاں وہ شوٹر اس کی تاک میں نہیں تھا۔ پچھلی رات اس نے بہت زیادہ پی لی تھی۔ اس کی آنکھ دیر سے کھلی تھی۔ وہ بائیک دوڑاتا ہوا کوٹھی کی طرف آیا۔

وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس نے ایک فٹ پاتھ پر مراد کو چاچا کے ساتھ دیکھا۔ وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر جا رہا تھا۔

وہ ٹیکسی کے پیچھے چل پڑا۔ اس راستے میں اچھی خاصی گاڑیاں چل رہی تھیں۔ اسے شوٹ کرنے کے لیے گاڑیوں کے درمیان سے گولیاں چلاتے ہوئے گزرنا تھا۔

ایسے وقت ضروری نہیں ہوتا کہ جو ٹارگٹ ہے اسے گولی لگ جائے۔ اکثر نشانہ خطا ہوتا ہے یا وہ زیادہ سے زیادہ زخمی ہو جاتا ہے۔

وہ ٹیکسی کہیں رک جاتی اور گولی چلائی جاتی۔ تب ضرور اسے لگتی۔ ٹارگٹ کلر یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ پہلی گولی ضائع ہو جائے تو شکار ہوشیار ہو جاتا ہے یا پھر بچ نکلتا ہے یا جوابی فائرنگ کے ذریعے موت بننے والے کی موت بن جاتا ہے۔

یہ بات اس شوٹر کے دماغ میں تھی کہ مراد سیدھا سادا پُرامن شہری نہیں ہے۔ وہ قاتل ہے۔ قتل کے الزام میں جیل گیا تھا اور ایسا خطرناک ہے کہ اس نے عالمی سطح کے سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو گولی ماری ہے۔ بلاشبہ وہ اپنے پاس ہتھیار چھپا کر رکھتا ہوگا۔

وہ شوٹر محتاط تھا۔ چشم تصور سے مراد کے پاس اسلحہ دیکھ رہا تھا۔

وہ چاچا کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے دو بار اس شوٹر کو ٹیکسی کے قریب آتے پھر دور ہوتے دیکھا تھا۔ گاڑیاں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے لیے دائیں بائیں ہوتی رہتی ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور جب اپنی گاڑی کو آگے نکالنے کے لیے اگلی گاڑیوں کے دائیں بائیں سے گزرتا تھا تو وہ شوٹر بھی اپنی بائیک کی سمت بدلنے لگتا تھا۔

مراد نے جب دوسری بار اسے دیکھا تو اسے کوئی بات کھٹکنے لگی۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ وہ بائیک والا اسے کیوں کھٹک رہا ہے؟

اصل بات یہ تھی کہ جب وہ شوٹر ٹیکسی کے قریب آتا تھا تو اپنا ایک ہاتھ ہینڈل سے ہٹا کر اسے کمر کے پاس لے آتا تھا۔ ٹیکسی کی پچھلی کھڑکی کے پاس پہنچتے ہی وہاں سے ریوالور نکال کر گولیاں چلانے والا تھا۔ لیکن دو بار اسے موقع نہ ملا۔ ٹیکسی اگلی گاڑی کو اوورٹیک کرنے کے لیے دائیں طرف

ہوتی گئی تھی۔ شوٹر کو بھی سمت بدلنی پڑی تھی۔

یہ دنیا کیا ہے؟ بارود کا ڈھیر بھی ہے اور محبوبہ کی آغوش بھی ہے۔ وہ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ماروی کے خوش رنگ نظاروں کو دیکھ رہا تھا اور باہر بارود پھیلتی چلی آرہی تھی۔

ایک بار پھر اس کے دماغ میں بے چینی سی پیدا ہوئی۔ اس نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر دیکھا، وہ بائیک ذرا پیچھے ہوگئی تھی۔ تیزی سے ٹیکسی کے برابر دوڑنے آرہی تھی۔ قریب ہوتے رہنے کے دوران مراد نے اسے دیکھا تو آنکھیں کھل گئیں۔ شوٹر اپنا ایک ہاتھ ہینڈل سے ہٹا کر اپنی کمر کی طرف لے گیا تھا۔ پھر وہ ہاتھ قمیص کے پیچھے چلا گیا تھا۔

تب مراد کے دماغ میں دھماکا سا ہوا۔ یہ بات سمجھ میں آئی کہ وہ چھپایا ہوا ہتھیار نکال رہا ہے۔ وہ ٹیکسی کے بالکل قریب آگیا تھا۔ پچھلی کھڑکی کے برابر آتے ہی گن نکالنے والا تھا۔

مراد نے چاچا کی گردن دبوچ کر جھکاتے ہوئے کہا۔ ”سیٹ کے نیچے جھک کر بیٹھ جاؤ۔“

وہ بھی دونوں سیٹوں کے درمیان جھکتا چلا گیا۔ ایسے ہی وقت ٹیکسی ڈرائیور اوورٹیک کرنے کے لیے گاڑی کو دائیں سمت لے گیا۔ شوٹر نے اپنی بائیک کو ایک ہاتھ سے سنبھال رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے گن نکال چکا تھا۔ اگر وہ بھی دائیں طرف نہ جاتا تو ٹیکسی سے ٹکرا جاتا۔ لیکن شامت تو آگئی تھی۔ دوسری طرف سے ایک گاڑی اوورٹیک کرنے آگئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ٹیکسی اور اس گاڑی کے درمیان سینڈوچ بن گیا۔

ادھر سے ٹیکسی نے اُدھر سے اس گاڑی نے ٹکر ماری۔ ایسے میں سنبھلتے سنبھلتے ٹریگر دب گیا۔ ٹھائیں کی زوردار آواز کے ساتھ وہ بائیک جیسے کھلونے کی طرح تُڑمُڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی دوسری گاڑیاں ایک دوسری سے ٹکراتی ہوئی رکنے لگیں۔

لوگ ہر سمت سے دوڑتے ہوئے آنے لگے۔ مراد نے سیٹوں کے درمیان سے ابھر کر سر اٹھا کر کھڑکی کے باہر دیکھا۔ وہ شوٹر بائیک کے قریب سڑک پر پڑا تکلیف سے تڑپ رہا تھا۔ ٹریگر ایسے وقت دبا تھا کہ وہ اپنے ہی ریوالور سے زخمی ہوگیا تھا۔

مراد کے اندر ہلچل سی پیدا ہوگئی۔ وہ تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ وہ سڑک پر تڑپنے والا کسی اور کو نہیں اسے ہی گولی مارنا چاہتا تھا۔

اس نے سو سو کے دو نوٹ ٹیکسی ڈرائیور کے آگے

مسکراہٹیں

میڈم نے اپنی کلاس میں بچوں سے پوچھا۔ ”یقین اور وہم میں کیا فرق ہے؟“

شاگرد۔ ”میڈم آپ پڑھا رہی ہیں، یہ یقین ہے اور ہم پڑھ رہے ہیں۔ یہ آپ کا وہم ہے۔“

☆☆☆

ایک بچہ تیزی سے گھر میں داخل ہوا اور ایک بلب پر باپ کا نام لکھ کر لگا دیا۔

ماں نے پوچھا۔ ”بیٹا، یہ کیا کر رہے ہو؟“

بچے نے جواب دیا۔ ”باپ کا نام روشن کر رہا ہوں۔“

مرسلہ۔ سید اکبر شاہ، اوگی، مانسہرہ

دو بڑی حقیقتیں

1۔ مرد حضرات شادی سے پہلے جو سلوک خواتین کے ساتھ کرتے ہیں اگر شادی کے بعد بھی کریں تو ایک بھی طلاق کی نوبت نہ آئے۔

2۔ اسی طرح جو سلوک خواتین شادی کے بعد مردوں سے کرتی ہیں اگر شادی سے پہلے بھی کریں تو یقیناً ایک بھی شادی کی نوبت نہ آئے۔

مرسلہ۔ محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن، خانیوال

جب گولی لگنے کے باوجود بھی گول کیپر کھیلتا رہا

بوسنیا میں ایک فٹ بال میچ کے دوران گول کیپر نے سر میں گولی لگنے کے باوجود کھیل جاری رکھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اسے احساس بھی نہ ہوا کہ اس کے ساتھ کیا بیت چکی ہے۔ 51 سالہ گول کیپر ڈوسکو کرٹالیکا بوسنیا کے شہر سرائیوو میں میچ کھیلنے میں مصروف تھے کہ اچانک ایک گولی ان کے سر میں گھس گئی اور انہیں پتا بھی نہ چلا۔

گولی لگنے کے بعد ڈوسکو نے کھیل جاری رکھا، تاہم اس کے بازوؤں میں کمزوری اور بولنے میں دشواری ہوئی تو اسے فوری طور پر اسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے اس کے سر میں 9 ایم ایم پسٹل کی گولی موجود ہونے کا انکشاف کیا۔

پولیس نے خدشہ ظاہر کیا کہ سر میں گولی اسٹیڈیم کے قریب ہونے والی ایک تقریب میں ہوائی فائرنگ کے وقت لگی۔

مرسلہ۔ احسان سحر، میانوالی

پھینکے۔ پھر دروازہ کھول کر چاچا کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ ''نکلو یہاں سے۔ ہم آگے نہیں جائیں گے۔''

وہ چاچا کے ساتھ رُکی ہوئی گاڑیوں کے درمیان سے گزرتا ہوا سڑک پار کر کے ایک گلی میں آیا۔ وہ حادثے کا شکار ہونے والا کون تھا؟ کیوں قتل کرنے آیا تھا؟ اس سے کیا دشمنی تھی؟ یہ بعد میں سوچنے اور سمجھنے والی باتیں تھی۔ اس نے فوراً ہی فون نکال کر حماد صدیقی سے رابطہ کیا۔

برنارڈ کو ہلاک کرنے کے بعد انٹیلی جنس کے افسران سے اس کی اچھی شناسائی ہو چکی تھی۔ اس نے رابطہ ہوتے ہی کہا۔ ''حماد صاحب! کوئی مجھے قتل کرنا چاہتا تھا۔ وہ خود حادثے کا شکار ہو کر گذری کی شاہراہ پر پڑا ہے۔ آپ فوراً آئیں اسے اپنی کسٹڈی میں لے کر معلوم کریں کہ یہ کون ہے؟ یہ زخمی ہے۔ اسے بیان دینے سے پہلے نہیں مرنا چاہیے۔''

حماد نے کہا۔ ''ہم ابھی آرہے ہیں۔ تم وہاں نہ رہو۔ اس ٹارگٹ کلر کے اور بھی ساتھی تمہاری تاک میں ہوں گے۔ تم انجانے دشمنوں کی نظروں میں ہو۔ فوراً وہاں سے نکلو۔''

وہ فون بند کر کے چاچا کے ساتھ ایک چائے خانے میں آکر بیٹھ گیا۔ وہاں سے وہ شاہراہ دکھائی دے رہی تھی جہاں سے وہ جان بچا کر آیا تھا۔

☆☆☆

اپنے اپنے نصیب ہوتے ہیں۔ مراد اور محبوب کی صورتیں ایک تھیں لیکن نصیب مختلف تھے۔ ماروی کی محبت دونوں کو ایک جیسے مسائل سے دو چار کرتی رہتی تھی لیکن مسائل سے گزرنے کے راستے اور حالات مختلف ہوتے تھے۔

اس وقت بھی مراد کے حالات یہ تھے کہ موت اس سے کھیل رہی تھی۔ وہ بال بال بچا تھا لیکن بچنے سے کیا ہوتا ہے؟ جب دشمن پیدا ہو گئے تھے تو سمجھو موت بھی پیدا ہو گئی جو بار بار پلٹ کر آنے والی تھی۔

دوسری طرف محبوب جانی دشمنوں سے محفوظ تھا۔ تقدیر اس کے نام عیش و عشرت لکھتی آرہی تھی۔ وہ اس وقت اپنے ائر کنڈیشنڈ آفس میں بیٹھا معروف چچی اور سمیرا سے کاروباری معاملات میں بڑی اہم گرما گرم گفتگو میں مصروف تھا۔

وہ ایک طویل عرصے تک ماروی کے عشق میں مبتلا رہ کر اپنے بزنس کو نظر انداز کرتا رہا تھا۔ دل کے معاملے میں تو یہی ہوتا ہے۔ کاروبار کر لو یا عشق کر لو اور کنگال ہو جاؤ۔

وہ اب بھی ماروی کے عشق میں مبتلا تھا لیکن پہلے جیسی دیوانگی اس لیے نہیں تھی کہ ماروی اب اس سے دور نہیں

تھی۔ جب چاہتا وہاں جا کر اسے دیکھ لیتا تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ اب وہ بچھڑ کر کہیں نظروں سے دور نہیں جائے گی۔ اس لیے وہ کاروبار کی طرف توجہ دینے لگا تھا۔

سمیرا اور معروف اس کے واپس آجانے سے بہت خوش تھے۔ مارکیٹ میں نئے ملبوسات لانے کی پلاننگ ہو رہی تھی۔ اس سلسلے میں فیشن ڈیزائنرز کو نئے اور دلکش چونکا دینے والے آئیڈیاز پیش کرنے کے لیے بھاری معاوضے کی آفر دی گئی تھی۔

محبوب ان سے باتیں کرتے کرتے وہاں سے اٹھ گیا۔ پیچھے اٹیچڈ واش روم تھا۔ معذرت کرتے ہوئے وہاں چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی سمیرا نے خوش ہو کر معروف سے کہا۔ ''تھینکس گاڈ! محبوب صاحب ہماری دنیا میں واپس آگئے ہیں۔''

معروف نے کہا۔ ''میں بھی خدا کا شکر ادا کرتا رہتا ہوں۔ اب یہ توجہ دے رہا ہے۔ میرے سر سے بہت بھاری ذمے داریاں کم ہو گئی ہیں۔ ماشا اللہ بہت ذہین ہے اس نے چار ہی دنوں میں ہماری گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھال لیا ہے۔''

وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بولی۔ ''ماروی کسی طرح مراد کی منکوحہ بن جائے تو محبوب صاحب کے دل سے یہ عشق کا کانٹا ہمیشہ کے لیے نکل جائے گا۔''

''میرا خیال ہے کہ محبوب اب سنبھل رہا ہے۔''

''میں ایسا نہیں سمجھتی ابھی ماروی کی طرف سے کوئی خبر آئے تو یہاں کی تمام مصروفیات چھوڑ کر اُدھر بھاگیں گے۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی محبوب کے فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ دونوں نے اُدھر دیکھا۔ وہ فون خالی کرسی کے سامنے میز پر رکھا ہوا تھا۔ سمیرا اور معروف ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

ایسے ہی وقت محبوب واش روم سے باہر آگیا۔ اس نے ریوالونگ چیئر پر بیٹھتے ہوئے فون کو اٹھا کر ننھی سی اسکرین کو دیکھا پھر کہا۔ ''مراد کی کال ہے۔''

پھر اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ ''ہاں۔ مراد! بولو۔ کہاں ہو؟''

اس نے کہا۔ ''سائیں.... ! گذری روڈ کے پاس ہوں اپنی زندگی کی خیر منا رہا ہوں۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟ خیریت تو ہے؟''

''ہاں۔ خیریت نہیں تھی پر ہو گئی۔ گولی کا نشانہ بننے والا تھا۔ اللہ نے بچا لیا ہے۔''

وہ تفصیل بتانے لگا۔ اس نے کہا۔ ''میں نے حماد

صاحب کو فون کیا ہے۔ وہ جائے واردات پر پہنچنے والے ہیں۔''

''یہ تم نے اچھا کیا۔ وہاں انتظار کرو۔ میں آرہا ہوں۔''

اس نے فون بند کر کے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''مراد پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ مجھے ابھی وہاں پہنچنا ہے۔''

وہ جواب سنے بغیر تیزی سے چلتا ہوا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ سمیرا اور معروف نے ایک دوسرے کو مایوسی سے دیکھا۔ ابھی وہ خوش تھے کہ محبوب اپنی کاروباری دنیا میں لوٹ آیا ہے اور ابھی وہ آفس چھوڑ کر چلا گیا۔

مراد کی طرف جانے کا مطلب یہی تھا کہ وہ ماروی کی دلجوئی کے لیے گیا ہے۔ سمیرا نے جھنجلا کر کہا۔ ''ان کا کوئی علاج نہیں ہے۔ ماروی کینسر کی طرح انہیں لگ چکی ہے۔ ان کی نظروں میں نہ کاروبار اہم ہے اور نہ ہماری کوئی اہمیت ہے۔''

وہ مایوسی اور بے بسی سے بولا۔ ''جھنجلانے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ تو لوہے اور مقناطیس کا رشتہ ہے۔ وہ اس کی طرف کھنچتا رہے گا۔ ہم روک نہیں سکیں گے۔''

''میں جاہل عورتوں کی طرح بددعا نہیں دے سکتی کہ وہ مر ہی جائے۔ مر جائے گی تو محبوب صاحب کو صدمہ ہوگا۔ مگر اس سے جان تو چھوٹے گی۔''

''ہم تنگ آکر یہی سوچتے ہیں کہ جس سے تکلیف پہنچ رہی ہے وہ مر جائے۔ لیکن ہمارے سوچنے سے ہمارے کوسنے سے کبھی کسی کو موت نہیں آتی۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''میں نے ایک بار چاہا تھا کہ مراد کا مقدمہ کمزور کرا دوں۔ میرا وکیل اسے پھانسی کے تختے پر پہنچا سکتا تھا۔ پھر ماروی کچھ عرصہ رو دھو کر محبوب کو قبول کر لیتی۔'' اس نے سمیرا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگرچہ میری یہ پلاننگ تمہارے حق میں نہیں تھی۔ تاہم مراد کے خلاف میری سازش دھری کی دھری رہ گئی۔''

وہ بولی۔ ''بے شک تقدیر عجیب طرح ان تینوں سے کھیل رہی ہے۔ لیکن تدبیر سے ہی تقدیر بنتی ہے۔ معروف صاحب! کچھ سوچیں کوئی تدبیر کریں۔ ماروی کو ہمیشہ کے لیے ان سے دور کر دیں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ ماروی مر جائے۔ بس کسی طرح مراد کی منکوحہ بن جائے۔ وہ اس کی شریکِ حیات بن جائے گی تو محبوب صاحب رفتہ رفتہ صبر کر لیں گے۔''

وہ مایوسی سے بولا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے پھر بھی محبوب کی بہتری کے لیے کچھ نہ کچھ سوچتا ہی رہتا ہوں۔''

اس وقت سمیرا کے احساسات کو ٹھیس پہنچ رہی تھی۔ وہ اس ایئر کنڈیشنڈ آفس میں محبوب کے ساتھ بڑے ہی خوشگوار موڈ میں بیٹھی تھی۔ اچانک ہی ماروی کی کشش اسے چھین کر لے گئی۔ وہ اپنی توہین محسوس کر رہی تھی۔ پہلی بار ماروی سے نفرت ہو رہی تھی۔ وہ تملا کر سوچ رہی تھی۔ میں ہی کچھ کروں گی۔ عورت چاہے تو کیا نہیں کر سکتی؟

☆☆☆

ماروی چپ چپ سی رہتی تھی۔ اپنی عادت سے مجبور تھی۔ وہ سوچتی زیادہ بولتی کم تھی۔ چاچا اور چاچی سے مراد اور محبوب سے بڑی اپنایت اور بڑی محبتیں مل رہی تھیں۔ وہ بڑی حد تک اعتماد سے سوچنے لگی تھی کہ وہ اس کے اپنے ہیں اور اس نے پیدائش سے اب تک ان کے ہی ساتھ زندگی گزاری ہے۔ ان پر بھروسا کرنے اور انہیں اپنا مان لینے کے باوجود یاد نہیں آرہا تھا کہ ان کی صورتیں پہلے بھی دیکھی ہیں۔ وہ سب اجنبی سے تھے۔ انہیں اپنا مان لینے کے باوجود ایسا لگتا تھا کہ انجانے لوگوں کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔

اتنے دنوں میں چاچی اور چاچا کی طرف دل مائل ہو گیا تھا۔ وہ انہیں اپنا سمجھنے لگی تھی لیکن مراد اور محبوب میں سے کسی کو صرف دل دینے کی ہی بات نہیں تھی۔ اپنی ساری زندگی اپنا پورا وجود حوالے کرنے کا معاملہ تھا۔

اس وقت وہ ڈرائنگ روم میں چاچی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ چاچی متی ایک ٹی وی پروگرام کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی اور وہ مراد اور محبوب کے متعلق سوچ رہی تھی۔

متی وقتاً فوقتاً اسے ان دونوں کے متعلق بتاتی رہتی تھی۔ اس بات نے اسے کسی حد تک مراد کی طرف مائل کیا تھا کہ وہ اسے بچپن سے چاہتی ہے اور اس کی منگیتر ہے۔ یہ معلوم ہوا کہ اس نے ماروی کی خاطر وڈیرے کی بیٹی کو ٹھکرا دیا تھا۔ جھوٹے الزام میں جیل گیا تھا۔ اسے قاتل ثابت کر کے پھانسی پر چڑھانے کی سازش کی گئی تھی۔

پھر وہ ماروی کی تلاش میں جیل سے نکل کر جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔ دشمنوں نے اسے بندوق پکڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔

آج وہ سیدھا سادہ سا گدھا گاڑی چلانے والا نہیں ہے۔ وہ اتنا خطرناک شوٹر بن گیا ہے کہ اس نے ایک عالمی سطح کے مجرم برنارڈ کو گولی سے اڑا دیا ہے۔

اسے ایک عاشق کے بارے میں یہ تفصیلات معلوم ہوئی تھیں پھر چاچی نے اسے محبوب کے متعلق بتایا تھا۔

اس کی دیوانگی یہ معلوم ہوئی کہ وہ ماروی کے عشق میں اربوں روپے کے کاروبار کو بھلا بیٹھا ہے۔ وہ ایسا دیانت دار عاشق ہے کہ رقیب کی سرپرستی کرتا ہے۔ اس کا مقدمہ

لڑتا ہے۔ مراد کی غیر موجودگی میں ماروی کو عزت آبرو سے پناہ دیتا ہے۔

اس نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ اس کی دیوانگی اور پیار کی سچائی یہ تھی کہ اس نے کبھی ماروی کی عزت آبرو پر آنچ نہیں آنے دی تھی۔ وہ ماروی کی پشت پر بہت بڑی طاقت بن گیا تھا تاکہ دشمن اس تنہا لڑکی کو بھی بے یارومددگار دیکھ نہ سکے۔

اس نے دل ہی دل میں کئی بار دونوں کا موازنہ کیا۔ یہ سمجھنا چاہا کہ ان میں سے کوئی ایک تو کسی پہلو سے برتر ہوگا؟ لیکن نہیں' ان میں سے کوئی چپکے سے متاثر کرنے والا اور رازداری سے دل میں آ کر بیٹھ جانے والا نہیں تھا۔

جب وہ دل سے اور اپنایت سے سوچتی تھی تو دونوں ہی حواس پر چھا جاتے تھے۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ یادداشت کھونے سے پہلے بھی ان کے درمیان الجھی ہوئی تھی۔ مراد تو خیر منگیتر تھا اسے تو قبول کرنا ہی تھا۔ لیکن وہ رفتہ رفتہ محبوب کو بھی دل سے چاہنے لگی تھی۔

آثار نظر آ رہے تھے کہ وہی داستانِ عشق پھر نئے سرے سے شروع ہونے والی ہے۔

چاچی کے فون سے کالنگ ٹون سنائی دینے لگی۔ اس نے ٹی وی کی آواز دھیمی کر کے فون کو کان سے لگاتے ہوئے ماروی سے کہا۔ ''تمہارے چاچا کا فون ہے۔''

پھر اس نے فون پر کہا۔ ''ہاں تم کہاں ہو؟ ابھی تو گئے ہو اور ابھی فون کر رہے ہو؟ کیا بات ہے؟''

چاچا کی آواز سنائی دی۔ ''ہائے مٹی! زندگی اور موت کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ ابھی ہم مرتے مرتے بچے ہیں۔ کسی دشمن نے ہم پر گولی چلائی تھی۔''

وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''ہائے اللہ! یہ کیا کہہ رہے ہو؟ یہ میں کیا سن رہی ہوں' کس نے تم لوگوں پر گولی چلائی تھی؟ مراد کہاں ہے؟ اس سے بات کراؤ۔''

اسی وقت مراد کی آواز سنائی دی۔ وہ اُدھر چاچا کو ڈانٹ رہا تھا۔ ''چاچا! گھر میں بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ اب وہاں سب ہی پریشان ہوتے رہیں گے۔''

مٹی نے کہا۔ ''مراد سے بولو۔ مجھ سے بات کرے۔''

چند لمحوں کے بعد اس کی آواز سنائی دی۔ ''چاچی! پریشان ہونے کی بات نہیں ہے۔ ہم یہاں خیریت سے ہیں۔''

''کوئی کس نے چلائی ہے؟ کون ہے وہ دشمن؟ وہ پھر گولیاں چلائے گا تم دونوں کہاں ہو؟''

ماروی پریشان ہو کر چاچی کا منہ تک رہی تھی۔ مراد کہہ رہا تھا۔ ''آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ میں نے کہا نا ہمیں کچھ نہیں ہوا ہے۔ ہم ایک آدھ گھنٹے بعد آ رہے ہیں۔''

ماروی اپنی جگہ سے اٹھ کر چاچی کے پاس گئی۔ اس کے ہاتھ سے فون لے کر اپنے کان سے لگا کر بولی۔ ''کیا آپ سچ بول رہے ہیں؟ آپ پر گولی چلائی گئی تھی پھر آپ خیریت سے کیسے ہیں؟ ہم سے کچھ چھپا رہے ہیں۔ سچ بولیں' کچھ ہوا تو نہیں ہے؟''

وہ بولا۔ ''ماروی! تم فون پر مجھ سے بول رہی ہو' میرے لیے پریشان ہو رہی ہو۔ تمہاری اس پریشانی کے پیچھے مجھے محبتیں ہی محبتیں مل رہی ہیں۔''

''میں کہہ کچھ رہی ہوں۔ آپ بول کچھ رہے ہو۔ آپ وہاں کیوں ہیں' جہاں گولیاں چل رہی ہیں؟ کہاں ہیں آپ؟ خدا کے لیے یہاں آ جائیں۔ ابھی آ جائیں۔''

''تم بلا رہی ہو۔ میں دوڑتا ہوا آؤں گا۔ مگر میری ایک بات مانو۔ مجھے آپ نہ کہو۔ بچپن سے تم کہتی آ رہی ہو۔''

وہ حیرانی سے بولی۔ ''یا خدا...! وہاں گولیاں چل رہی ہیں اور آپ ہیں کہ آپ اور تم کی بحث کر رہے ہیں۔''

''ابھی تم کہو۔ ابھی دوڑا چلا آؤں گا۔''

''اچھی بات ہے تم آؤ۔ ابھی فوراً آؤ۔''

''اب تو سر کے بل آؤں گا۔ محبوب صاحب یہاں آنے والے ہیں۔ ان کے ساتھ آ رہا ہوں۔''

رابطہ ختم ہو گیا۔ ماروی نے مٹی کو فون دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ مراد ہیں کیسے؟ بالکل پاگل ہیں۔ اپنی جان کی ذرا پروا نہیں ہے۔ وہاں سے فوراً آنا چاہیے لیکن اپنی بات منوا رہے تھے کہ میں انہیں تم کہوں' آپ نہ کہوں۔''

مٹی نے مسکرا کر کہا۔ ''تم اسے بچپن سے تم کہتی آئی ہو۔ اب بھی کہنا چاہیے۔ اس طرح پہلے والی اپنایت قائم رہے گی۔''

وہ مراد کو تصور میں دیکھنے لگی۔ وہ اچھا لگتا تھا۔ بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ اسے پسند کرتی تھی لیکن وہ پچھلے دور والی اپنایت محسوس نہیں کرتی تھی۔ پھر بھی اس کا ذکر مٹی چاچی سے سنتے رہنا اچھا لگتا تھا۔

دماغی کمزوری نے کہیں کا نہیں رکھا تھا۔ یادداشت کی تاریکی میں نہ وہ نظر آتا تھا نہ دل مانتا تھا کہ پہلے بھی اسے دیکھا ہے اور اسے دل و جان سے چاہا ہے۔

جب تک تاریکی نہ چھٹتی' یادیں روشن نہ ہوتیں تب تک وہ کسی سے دل کا سودا کرنے والی نہیں تھی۔

☆☆☆

محبوب تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا ہوا مراد کے پاس آ گیا۔ وہ چاچا کے ساتھ گذری کی ایک گلی میں چائے خانے کے باہر بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ مراد اگلی سیٹ پر محبوب کے پاس آ گیا۔ چاچا پچھلی سیٹ پر چلا گیا پھر محبوب نے کار آگے بڑھا کر مین روڈ پر آتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ تم پر ہی گولی چلائی گئی تھی؟''

''ہاں میں نے فائرنگ سے پہلے دیکھا تھا۔ وہ اپنی بائیک پر ہماری ٹیکسی کے پیچھے آ رہا تھا۔ اس کے تعاقب کرنے کے انداز سے مجھے شبہ ہوا تھا۔''

چاچا نے پچھلی سیٹ سے کہا۔ ''بیٹے! یہ سمجھو کہ اللہ نے ہمیں بچایا ہے ورنہ ابھی ہم زندہ یہاں نہ ملتے۔''

محبوب نے پریشانی سے کہا۔ ''مراد! تم نے مرینہ کی شہ پر جیل سے نکلنے کے بعد اپنے بے شمار دشمن پیدا کر لیے ہیں۔ کیا تم اس دشمن کو پہچان سکو گے؟''

''نہیں۔ اس کی صورت ہیلمٹ میں چھپی ہوئی تھی۔ حماد صاحب اپنے سپاہیوں کے ساتھ آئے تھے۔ اس شخص کو ایمبولنس میں لے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے وہ زندہ ہے۔ ضرور اسے اسپتال لے گئے ہوں گے۔''

محبوب نے سڑک کے کنارے گاڑی روک کر حماد صدیقی کو فون پر مخاطب کیا۔ ''حماد! میں بول رہا ہوں۔ کیا مراد پر گولی چلانے والا زندہ ہے؟''

''جی ہاں۔ ہم نے اسے اسپتال پہنچایا ہے۔ یہاں ڈاکٹر اسے بچانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔''

''وہ مجرم کون ہے؟ اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟''

''یہ کرائے کا ٹٹو ہے۔ اب سے پہلے غیر ملکی ایجنسی کے لیے کام کرتا ہوا پکڑا گیا تھا۔ پھر جلد ہی چھوٹ کر باہر آ گیا تھا۔ اس کا نام پیو ملنگا ہے۔ محبوب صاحب! یہ بہت ہی سنگین معاملہ ہے۔ یہ سوچنے اور سمجھنے کی بات ہے کہ غیر ملکیوں کے لیے کام کرنے والا ملنگا مراد صاحب کو کیوں مارنا چاہتا تھا؟''

''تمہارا کیا خیال ہے؟''

اس نے کہا۔ ''برنارڈ غیر ملکی تھا۔ میں یقین سے کہتا ہوں' اسے ہلاک کرنے کے بعد مراد صاحب غیر ملکی خطرناک تنظیموں کی بلیک لسٹ میں آ گئے ہیں۔

''ابھی ملنگا زندہ رہے گا تو اسے بیان دینے پر مجبور کروں گا۔ معلوم کروں گا کہ برنارڈ سے تعلق رکھنے والی کس تنظیم نے مراد کی موت کا حکم نامہ جاری کیا ہے۔''

محبوب کے فون کا وائڈ اسپیکر آن تھا۔ مراد یہ باتیں سن رہا تھا۔ محبوب نے کہا۔ ''مراد یہاں میرے پاس ہے۔ تمہاری باتیں سن رہا ہے۔ اس سے کچھ کہنا چاہو گے؟''

اس نے کہا۔ ''مراد صاحب! آپ اندازہ لگائیں۔ مرینہ کی شیطانی حرکتوں نے آپ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے؟ آپ نے سمندر پار اپنے دشمن پیدا کر لیے ہیں۔ اگرچہ آپ نے ایک وطن کے دشمن کو ہلاک کیا تھا تاہم نتیجے کے طور پر ایک کے بعد کئی دشمن پیدا ہو رہے ہیں۔''

محبوب نے کہا۔ ''اور یہ ایسے ویسے معمولی دشمن نہیں ہیں۔ ان کے پاس دولت کی' ہتھیاروں کی اور خطرناک ذرائع کی کمی نہیں ہوگی۔''

حماد نے کہا۔ ''محبوب صاحب! خطرہ آپ کے لیے بھی اتنا ہی ہے جتنا مراد صاحب کے لیے ہے۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''میرے لیے؟''

وہ بولا۔ ''یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ آپ دونوں ہم شکل ہیں۔ مراد صاحب کے دھوکے میں دشمن آپ کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔''

محبوب نے کہا۔ ''او گاڈ! یہ اتنی بڑی بات ذہن میں نہیں آئی تھی۔ واقعی وہ تو میری صورت دیکھتے ہی مجھے گولی ماردیں گے۔ نام نہیں پوچھیں گے۔''

مراد نے پریشان ہو کر محبوب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یا خدا...! یہ کیا ہو رہا ہے؟ سائیں! میں تو آپ کے لیے مصیبت بن گیا ہوں۔ آپ دشمنوں کو جہاں بھی نظر آئیں گے' وہ آپ کو کسی شک و شبے کے بغیر مراد ہی سمجھیں گے۔''

حماد نے کہا۔ ''آپ میں سے کوئی دشمنوں کو غلطی کرنے سے نہیں روک سکے گا۔ فی الحال دانشمندی یہ ہے کہ دونوں کو چھپ کر رہنا ہوگا۔ ابھی آپ دونوں کہاں ہیں؟''

''فیروز میں ہیں۔''

''پلیز کھلی جگہ نہ رہیں۔ اپنی کوٹھی میں جائیں۔ میں پیو ملنگا سے نمٹ کر آپ کے پاس آؤں گا۔ آپ دونوں کی سیکیورٹی کے سلسلے میں ٹھوس پلاننگ کرنی ہوگی۔''

محبوب نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ ابھی ہم ماروی کے پاس کوٹھی میں جا رہے ہیں۔''

مراد نے کہا۔ ''نہیں سائیں! میں ابھی حماد صاحب کے پاس جاؤں گا۔ ان سے کچھ ضروری باتیں کروں گا۔''

حماد نے کہا۔ ''میں ابھی اسپتال میں ہوں۔ فون پر بولو مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''ابھی تو یہ چاہتا ہوں کہ سائیں اب میرے ساتھ نہ رہیں یہاں سے سیدھے گھر جائیں۔ آپ مجھ سے اور کوئی سوال نہ کریں۔ اسپتال کا نام بتائیں میں آرہا ہوں۔''

حماد نے محبوب سے کہا۔ ''ان کی یہ بات درست ہے کہ آپ ان کے ساتھ نہ رہیں۔ ابھی اسی وقت گھر کی . . . چاردیواری میں جائیں۔ انہیں میرے پاس آنے دیں۔ پھر میں ان کے ساتھ آپ کی کوٹھی میں آؤں گا۔''

حماد نے اسپتال کا نام بتایا۔ محبوب نے فون بند کرکے گاڑی آگے بڑھا دی۔ پھر کہا۔ ''مراد! یہ اچھی طرح سمجھ رہا ہوں کہ میری سلامتی کے لیے مجھ سے دور ہو رہے ہو۔ میں بھی تمہیں جانے نہ دیتا۔ یہ سوچ کر چپ ہوں کہ حماد کے پاس جا رہے ہو۔ وہاں انٹیلی جنس کے اور لوگ بھی ہوں گے۔''

''بے شک آپ کو اطمینان ہونا چاہیے۔ وہاں کوئی اور دشمن مجھ پر حملہ کرنے نہیں آئے گا۔ میں جلد ہی حماد صاحب کے ساتھ آپ کے پاس آؤں گا۔''

محبوب نے اسے اسپتال کے احاطے میں پہنچا کر کہا۔ ''میں تمہیں فون کرتا رہوں گا۔ تم یہاں حماد کے ساتھ ہی رہنا۔ خبردار . . . ! ان سے دور نہ جانا۔''

وہ تاکید کرکے چاچا کے ساتھ چلا گیا۔ مراد نے حماد کے پاس آکر پوچھا۔ ''کیا ملنگا زندہ ہے؟''

''ہاں آپریشن کامیاب رہا ہے۔ اسے اس سامنے والے کمرے میں رکھا گیا ہے۔ میں انتظار کر رہا ہوں' وہ ہوش میں آئے گا تو اس کا بیان لوں گا۔''

ملنگا کو جس کمرے میں رکھا گیا تھا' اس کے دروازے پر دو مسلح سپاہی کھڑے ہوئے تھے۔ وہاں سخت پہرا تھا۔ اس کمرے میں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔

حماد نے پوچھا۔ ''ہاں تو آپ کہہ رہے تھے' مجھ سے کچھ باتیں کرنے آئے ہیں؟''

اس نے کہا۔ ''یہ باتیں میں سائیں کے سامنے نہیں کرسکتا تھا۔ وہ کبھی اس بات پر راضی نہیں ہوں گے کہ میں یہ شہر چھوڑ کر ان سے اور ماروی سے دور چلا جاؤں۔''

''آپ درست کہتے ہیں۔ محبوب صاحب کبھی آپ کے گھر سے بے گھر ہونے پر راضی نہیں ہوں گے۔''

''میرے دماغ میں یہ بات پک رہی ہے کہ میری وجہ سے ماروی' چاچی اور چاچا کی زندگیاں بھی خطرے میں پڑ جائیں گی۔ میں ان کے ساتھ رہوں گا تو دشمن انہیں بھی نقصان پہنچائیں گے۔''

حماد نے کہا۔ ''میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ آپ جہاں رہیں گے' وہاں آس پاس رہنے والوں کی بھی شامت آجائے گی۔ آپ کو اپنے چاہنے والوں سے دور رہنا ہوگا۔''

''میں یہ شہر چھوڑ دوں گا۔ دشمنوں کو کسی بھی طرح یہ ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ میں اپنی جان بچانے کے لیے یہاں سے بھاگ گیا ہوں اور یہاں جو میرا اہم شکل ہے وہ ایک معزز بزنس مین محبوب علی چانڈیو ہے۔''

''واقعی دشمنوں کو یہ معلوم ہوگا تو وہ آپ کے پیچھے جائیں گے۔ محبوب صاحب کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔''

اس نے مراد کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''آپ بہت ہی ذہین اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔ آپ جائیں گے تو میں اس سلسلے میں آپ کی ہر ممکن مدد کرتا رہوں گا۔''

''آپ کوئی ایسی تدبیر کریں کہ دشمنوں کو میرے شہر چھوڑنے کی خبر ہو اور وہ میرے ہی پیچھے پڑے رہیں۔ محبوب صاحب کی طرف رخ نہ کریں۔''

وہ سوچنے کے انداز میں بولا۔ ''ہوں۔ میں سوچوں گا کہ دشمنوں کو صرف تمہارے ہی پیچھے کیسے لگایا جاسکتا ہے؟ اس طرح انٹیلی جنس والوں کو ان دشمنوں کا سراغ ملتا رہے گا۔''

وہ دونوں اس کمرے کے قریب کھڑے ہوئے تھے جہاں ملنگا بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے ہوش میں آنے کے بعد حماد اس سے معلوم کرنے والا تھا کہ وہ کس غیر ملکی ایجنسی کے لیے کام کر رہا ہے اور مراد کو قتل کرانے کے لیے کون اس سے کام لے رہا ہے؟

ایسے وقت ایک ڈاکٹر تیزی سے چلتا ہوا آیا۔ وہ ملنگا کے کمرے میں جانا چاہتا تھا۔ سپاہیوں نے اسے روک دیا۔ وہ ناگواری سے بولا۔ ''واٹ نان سنس۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ دیکھنا چاہتا ہوں اسے ہوش آیا ہے یا نہیں؟''

حماد نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''ویل ڈاکٹر! آپ اپنا آئی ڈی کارڈ دکھائیں۔''

اس نے کہا۔ ''سوری۔ میں اپنا کارڈ بھول آیا ہوں۔ پلیز مجھے میری ڈیوٹی کرنے دیں۔''

''آپ ڈیوٹی ضرور کریں گے لیکن ہمیں اپنی ڈیوٹی پہلے کرنے دیں۔ پہلے ہمیں مطمئن کریں۔''

وہ ناگواری سے بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں ابھی کسی دوسرے ڈاکٹر کے ساتھ آؤں گا۔''

وہ تیزی سے پلٹ کر جانے لگا۔ حماد اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ ''چلو۔ مجھے بھی ایک ڈاکٹر سے کچھ کام ہے۔''

ڈاکٹر کچھ پریشان ہوگیا۔ وہ چلتے چلتے رک گیا۔ حماد نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''مجھے یاد آگیا' میرا کارڈ باہر کار میں رکھا ہوا ہے۔ میں ابھی لاتا ہوں۔''

وہ باہر جانا چاہتا تھا' حماد نے اس کا بازو پکڑ کر کہا۔ ''جلدی نہ کریں ہم بھی ساتھ چلتے ہیں۔ آپ کی گاڑی بھی دیکھیں گے کہ کس ماڈل کی ہے؟''

وہ کچھ مرجھا سا گیا۔ بوجھل قدموں سے حماد کے ساتھ جانے لگا۔ مراد ان کے پیچھے تھا۔ یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ ڈاکٹر کوئی فراڈ ہے۔

وہ تینوں اسپتال سے باہر آئے۔ احاطے میں اس کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا کار کے پاس آیا۔ ''میں اوپر والوں سے شکایت کروں گا۔ ایک معزز ڈاکٹر پر اس طرح شبہ کرکے اسے مریضوں سے دور نہیں کرنا چاہیے۔''

وہ دروازہ کھول کر آدھا اندر آدھا باہر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے ڈیش بورڈ کو کھولا تو اچانک ہی سچویشن بدل گئی۔ اس نے ڈیش بورڈ سے پستول نکال کر حماد کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ''خبردار . . . . مجھے فرار ہونے سے روکو گے تو گولی مار دوں گا۔''

وہ آدھا باہر تھا۔ پوری طرح اندر ہو کر اسٹیئرنگ سنبھالنا چاہتا تھا۔ ایسے ہی وقت مراد نے دروازے کو ایک زور کی لات ماری۔ یہ حملہ توقع کے خلاف تھا۔ اس کی ایک ٹانگ باہر تھی۔ دروازہ زور سے آکر لگا تو وہ تکلیف کی شدت سے تڑپ گیا۔ اس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ گیا۔

مراد نے کھڑکی سے آدھا اندر گھس کر پستول کو اٹھا لیا۔ حماد نے کہا۔ ''مراد! باہر آؤ۔ میں اس سے نمٹ لوں گا۔''

وہ کھڑکی سے باہر آگیا۔ حماد نے اس سے پستول لے کر جعلی ڈاکٹر کے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ پھر پستول کی نال اس کے سینے پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟ فوراً بولو کس کے لیے کام کر رہے ہو؟''

موت اس کے سینے پر آکر ٹھہر گئی تھی۔ وہ سہم کر بولا۔ ''م۔ میں نہیں جانتا۔ فون پر ڈیلنگ ہوئی تھی۔ مجھ سے کہا گیا تھا' یہ ملنگا کو بیان دینے سے پہلے ختم کردو۔ مجھے تگڑا معاوضہ مل رہا تھا۔ میں ڈاکٹر بن کر یہاں آگیا۔''

حماد نے اس کے منہ پر ایک الٹا ہاتھ رسید کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم یہاں اکیلے ہو؟''

اس کے جواب دینے سے پہلے ہی اسپتال کے اندر سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ حماد نے اچھل کر کہا۔ ''او گاڈ! وہ ملنگا تک پہنچ گئے ہیں۔''

مراد نے کہا۔ ''آپ جائیں' میں اسے پکڑ کر رکھوں گا۔''

وہ فوراً ہی دوڑتا ہوا اسپتال کے اندر چلا گیا۔ اسی وقت . . . . فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ معاملہ سنگین تھا۔ مجرموں سے کاؤنٹر فائرنگ ہو رہی تھی۔

مراد نے سوچا' کیا کرے؟ ایسے وقت پتھر کی طرح ایک ہی جگہ نہیں رہنا چاہیے۔ اس نے جعلی ڈاکٹر کو دیکھا۔ اس کی ایک ٹانگ زخمی ہوئی تھی۔

اس نے دوسری ٹانگ کو پکڑ کر باہر کی طرف کھینچا۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ مراد نے اس کی زخمی ٹانگ پر ایک زور کا گھونسا مارا تو اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ وہ تکلیف کے باعث کمزور پڑ گیا تھا۔ مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

مراد نے دوسری ٹانگ کو باہر کھینچ کر دروازے کو زور سے بند کیا تو وہ چیخیں مارتا ہوا تڑپتا ہوا سیٹوں کے نیچے گر پڑا۔ اس نے پوچھا۔ ''کون ہے میرا دشمن؟ بولو کس کے لیے کام کر رہے ہو؟''

وہ کار کے ایک طرف سے گھوم کر دوسری طرف کے اگلے دروازے پر آیا۔ اسے کھول کر اس کا ایک ہاتھ باہر کھینچتے ہوئے بولا۔ ''میرے دشمن کا نام پتا ٹھکانا بتاؤ۔ ورنہ تم پر اسی طرح قیامت ٹوٹتی رہے گی۔''

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔ ''میں سچ کہتا ہوں' میں اس باس کہلانے والے کو نہیں جانتا۔ میرا ساتھی جانتا ہے۔ وہ اسپتال کے اندر گولیاں چلا رہا ہے۔''

اسپتال میں فائرنگ کے باعث بھگدڑ مچ گئی تھی۔ مرد عورتیں اور بچے بھاگتے ہوئے باہر آرہے تھے۔ اس وقت تھوڑی دیر کے لیے فائرنگ رک گئی تھی۔ مراد نے سوچا پتا نہیں وہاں حماد صاحب کے ساتھ کیسے حالات پیش آرہے ہیں؟ اس کمبخت کو اپاہج بنا کر مجھے وہاں جانا چاہیے۔ اس نے اسے دو پیروں سے معذور کرنے کے بعد اس کا ہاتھ باہر کھینچ کر اسے بھی دروازے سے کچل دیا۔

وہ ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح چلاتے ہوئے پھڑپھڑانے لگا۔ وہ اسے پوری طرح بے دست و پا بنانے کے بعد وہاں چھوڑ کر جانا چاہتا تھا۔ اس نے بڑی بے رحمی سے دوسرے ہاتھ کو بھی باہر کھینچ کر اسے دروازے سے کچل دیا۔ اس کی حالت قابلِ دید تھی۔ اب وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا تھا۔

مراد نے کار کے دونوں طرف کے دروازے بند کر دیے پھر وہاں سے حماد کے پاس جانا چاہتا تھا۔ ایسے ہی وقت ایک شخص فائر کرتا ہوا اسپتال سے باہر آرہا تھا۔ مراد فوراً ہی کار کے پیچھے آگیا۔

وہ چھپنے والوں پر گولیاں نہیں چلا رہا تھا۔ جو نظر آ رہے تھے ان کی طرف فائر کر رہا تھا۔ پھر وہ ایک موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کرنے لگا۔ اس پر فائر کرنے والے اور اسے گرفتار کرنے والے اسپتال کے اندر تھے' پتا نہیں کیوں باہر نہیں آ رہے تھے۔

وہ موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے احاطے کے باہر جا رہا تھا۔ ایسے وقت ایک موٹر سائیکل والا اندر آ رہا تھا۔ فرار ہونے والے نے اس کی طرف گولی چلائی۔ وہ بچ گیا لیکن بوکھلا کر گاڑی سے گر پڑا۔ وہ ایک طرف گیا۔ گاڑی دوسری طرف جا کر گری وہ فرار ہونے والا رفتار بڑھاتا ہوا آگے نکل گیا۔

مراد ایک دم سے چھلانگیں مارتا ہوا گری ہوئی موٹر سائیکل کے پاس آیا۔ پھر اسے اٹھا کر اس پر سوار ہو کو کک ماری۔ دوسری کک پر وہ اسٹارٹ ہو گئی۔ اسے لے کر آگے بڑھ گیا۔ آگے وہ بہت دور تھا۔ مراد رفتار بڑھانے لگا۔ وہ ہتھیار سے خالی تھا اور ہتھیار والے کا تعاقب کر رہا تھا۔ یہ سراسر نادانی تھی۔ نہتا رہ کر اسے پکڑ نہیں سکتا تھا۔

اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اس سے دور ہی دور رہ کر یہ معلوم کرے گا کہ وہ کہاں جاتا ہے اور کن لوگوں سے ملتا ہے۔ شاید اس کا خفیہ اڈا معلوم کر سکے گا۔ وہ آگے جانے والا مراد سے بے خبر تھا۔ حالانکہ بہت محتاط تھا۔ یہ سمجھ رہا تھا کہ حماد صدیقی کے مسلح آدمی پیچھا کر رہے ہوں گے لیکن ٹریفک کے ہجوم میں تعاقب کرنے والوں کو پہچاننا تقریباً... ناممکن ہوتا ہے۔

وہ آگے جا کر ایسی سڑک پر آ گیا جہاں گاڑیاں کم چل رہی تھیں۔ مراد اس سے بہت دور تھا۔ قریب ہوتا تو وہ فرار ہونے والا اسے پہچان لیتا۔ ان تمام دشمنوں کے پاس اس کی تصویریں پہنچائی گئی ہوں گی۔ تب ہی ملنگا اسے پہچان کر گولی مارنے آیا تھا۔

مراد نے طے کر لیا کہ اسے اب کیا کرنا ہے؟ اس نے خطرے سے کھیلنے کے لیے اپنی بائیک کی رفتار بڑھا دی۔ آگے جانے والے نے ریوالور کو لباس میں رکھ لیا تھا۔ وہ ہاتھ میں نظر آتا تو ٹریفک پولیس والے اس کے پیچھے پڑ جاتے۔ یوں مراد کو اندیشہ نہیں تھا کہ قریب پہنچتے ہی... فائر کرے گا۔ لباس سے ہتھیار نکالنے میں کچھ تو وقت لگے گا۔ وہ بہت بڑا خطرہ مول لے رہا تھا۔

یہ نادانی سہی۔ وہ تیز رفتاری کے باعث اس کے قریب پہنچ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے برابر آ رہا تھا۔ ان کے آگے پیچھے گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔ جب وہ اس کے برابر آیا تو اس نے سر گھما کر دیکھا پھر ایک دم سے گھبرا گیا۔ جس کی تصویر دکھائی گئی تھی۔ جسے گولی مارنے کا حکم دیا گیا تھا وہ مراد خود ہی اس کے بالکل قریب آ گیا تھا۔

اس نے پھرتی سے لباس کے اندر ہاتھ ڈال کر ریوالور کو نکالا۔ مراد نے اس سے زیادہ پھرتی دکھائی۔ اپنی سیٹ سے اچھل کر اسے ایک لات ماری۔ وہ لات ایسی تھی کہ لاتوں کے بھوت بھی پناہ مانگتے۔ موٹر سائیکل اس کے نیچے سے نکل گئی۔ وہ فضا میں اچھل کر سڑک کے کنارے گیا۔ مراد بھی اپنی بائیک سے گر کر لڑھکتا ہوا ذرا دور گیا۔ پھر بڑی پھرتی سے اٹھ کر دوڑتا ہوا اُدھر پہنچا' جدھر وہ ریوالور پڑا ہوا تھا۔

آگے پیچھے دوڑنے والی گاڑیاں رک رہی تھیں۔ وہ دشمن کراہتا ہوا زمین سے اٹھ رہا تھا اور سہمی ہوئی نظروں سے مراد کے ہاتھ میں اپنا ریوالور دیکھ رہا تھا۔ لوگ اپنی گاڑیوں سے اتر کر ان کی طرف آنا چاہتے تھے۔ مراد نے ایک ہوائی فائر کیا تو سب جہاں تھے' وہیں رک گئے۔ اس نے کہا۔ ''یہاں کوئی بھیڑ نہ لگائے۔ اپنے راستے جائے۔ جو رکے گا وہ گولی کھائے گا۔''

وہ وہاں سے جانے لگے۔ مراد نے اس سے کہا۔ ''میں تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کروں گا۔ اپنی گاڑی اٹھاؤ اور اسٹارٹ کرو۔''

اس نے حیرانی سے مراد کو دیکھا۔ وہ ڈانٹ کر بولا۔ ''جلدی کرو۔ میں نہیں چاہتا پولیس والے آ جائیں۔''

وہ دوڑتا ہوا اپنی ہنڈا اسپیڈ کے پاس آیا پھر اسے اٹھا کر اس پر بیٹھ کر اسٹارٹ کرنے لگا۔ وہ دو چار لاتیں کھا کر اسٹارٹ ہو گئی۔ مراد نے پیچھے آ کر بیٹھتے ہوئے اسے حکم دیا۔ ''نیشنل ہائی وے کی طرف چلو۔''

گاڑی حالات کے نئے موڑ پر چل پڑی۔

وہ کہاں جا رہا تھا....؟

جس طرح کسی کہانی کی سچویشن بدلتی ہے اسی طرح اب اس کی زندگی کی سچویشن بدل رہی تھی۔ نہ پولیس والے سوچ سکتے تھے نہ محبوب نہ ماروی توقع کر سکتے تھے اور نہ ہی اس کے لہو کے پیاسے دشمنوں کے خواب و خیال میں تھا کہ وہ سر پھرا کہاں جانے والا ہے اور کیا کرنے والا ہے؟

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردشِ ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

اپنا گھر

تنویر ریاض

بعض اوقات انسان کو اپنے ہی گھر میں اجنبی بن کر رہنا پڑ جاتا ہے... اور کبھی پرائے گھروں میں اتنی اپنایت ملتی ہے کہ انسان اپنا گھر بھول جاتا ہے مگر... یہ سب حالات پر منحصر ہوتا ہے۔ وہ بھی بے خبری میں اپنے ہی گھر میں غیروں کی طرح رہتی آئی تھی لیکن ایک روز اچانک... سوئے ہوئے ادراک نے جیسے چٹکی کاٹی... پھر کوئی راز، راز نہ رہا اور ہر انکشاف اسے حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن کرتا رہا۔

خون کے رشتوں کے درمیان ایک خونی واردات کا لرزہ خیز ماجرا

سونیا گھبراہٹ کے عالم میں بس سے اتری۔ اس نے لمحہ بھر رک کر سڑک کا جائزہ لیا۔ تیز تیز قدموں سے گھر کی جانب چل دی۔ اس سے پہلے وہ کبھی اس طرح اسکول سے بھاگ کر نہیں آئی تھی۔ اس لیے اسے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں اسکول والوں نے اس کی گمشدگی کی اطلاع پولیس کو نہ دے دی ہو اس نے ایک بار پھر نظریں دوڑائیں لیکن اسے دور تک کہیں پولیس کار نظر نہیں آئی۔ عام طور پر وہ نظم و ضبط کی پابند تھی اور اس نے کبھی کسی کے لیے کوئی پریشانی کھڑی نہیں کی۔ وہ اپنی نانی کی بہت عزت کرتی تھی جو گزشتہ چار برس سے اس کی سرپرست تھی۔ اسکول میں بھی اس کا رویہ سب کے ساتھ بہت اچھا تھا لیکن جب راکیل نے اسے بتایا کہ وہ لوگ عنقریب یہاں سے جانے والے ہیں تو وہ پریشان ہو گئی۔ وہ سولہ سال کی ہو گئی تھی اور اسکول میں بہت سے لڑکے اس کی ذات میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ اس لیے وہ یہاں سے نہیں جانا چاہتی تھی لیکن نانی اس کی بات کہاں مانتی۔ اس نے غصے میں آ کر اپنا پاؤں زمین پر مارا، پھر اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ دوڑ



گئی جیسے کہہ رہی ہو کہ جہنم میں جاؤ۔

اسے یہ دیکھ کر بہت سکون محسوس ہوا کہ راکیل کی کار گھر میں نہیں تھی اور اب اسے نانی کے الٹے سیدھے سوالوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ ویسے بھی اسے امید نہیں تھی کہ نانی اس وقت گھر پر ہوگی۔ وہ ایک اسٹور میں کام کرتی تھی اور اکثر اس کی واپسی اندھیرا پھیلنے کے بعد ہوا کرتی تھی۔ اس نے دروازے میں چابی لگائی، تیزی سے اندر داخل ہوئی اور دروازہ بند کردیا۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی جیسے کوئی اس کا تعاقب کررہا ہو۔ اس نے ابھی تک کتابوں کو سینے سے لگا رکھا تھا اور اس کا سانس تیزی سے چل رہا تھا۔

اس نے چابیاں سائڈ ٹیبل پر رکھیں اور ہال سے گزرتے ہوئے اپنے بیڈروم میں چلی گئی جو مکان کے عقبی سمت میں تھا۔ اسے گھر کی ہر چیز اجنبی اجنبی سی لگ رہی تھی حالانکہ سب کچھ وہی تھا لیکن اس روز وہ وقت سے پہلے ہی گھر آگئی تھی۔ اسی لیے اس کی آنکھیں اس ماحول سے مانوس نہیں ہو پا رہی تھیں۔ اس نے کتابیں بستر کے سرہانے رکھیں۔ جوتے اتارے اور بستر پر دراز ہوگئی۔ اس کا کمرا نسبتاً تاریک تھا کیونکہ نانی کی ہدایت تھی کہ کسی بھی وقت کھڑکی کا پردہ نہ ہٹایا جائے، چند لمحے وہ اسی طرح لیٹی رہی اور جب اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ محفوظ ہے تو اس نے اپنی کامیابی پر ہنسنا شروع کردیا۔

وہ جانتی تھی کہ بالآخر اسکول والوں کو اس کی غیر حاضری کا علم ہوگیا ہوگا اور اب وہ اس کی نانی سے رابطہ کریں گے اور وہ اس کی گھر میں موجودگی کی تصدیق کردے گی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر اسے کوئی سزا ملی تو نانی اس معاملے میں کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔ اس نے کبھی اسکول میں کسی میٹنگ میں شرکت نہیں کی اور نہ اس کے دوستوں سے ملنے میں دلچسپی ظاہر کی۔ اس کا خیال تھا کہ سونیا کو اپنے معاملات خود دیکھنے چاہئیں۔

گو کہ چند سالوں سے وہ اس کی سرپرستی میں تھی لیکن ابھی تک ان دونوں کے درمیان حقیقی قربت قائم نہیں ہوسکی تھی۔ راکیل کا رویہ دیکھ کر کبھی کبھی سونیا کو شک ہونے لگتا کہ کیا یہ عورت واقعی اس کی نانی ہے۔ اس نے راکیل کے چہرے پر ہمیشہ ایک عجیب طرح کی سختی دیکھی تھی۔ اس میں وہ نرمی اور شفقت مفقود تھی جس کی وہ توقع کرتی تھی۔

سونیا جانتی تھی کہ اس کی نانی اندر سے سخت نہیں ہے اور اسے صرف یہ ڈر ہے کہ کہیں سونیا بھی اپنی ماں کے نقش قدم پر نہ چلے۔ اسی لیے وہ اس پر بے جا روک ٹوک کرتی تھی۔ سونیا نے اپنی ماں کی تصویریں دیکھی تھیں۔ وہ ایک لمبے قد کی سنہری بالوں والی عورت تھی اور ہر تصویر میں مسکراتی یا قہقہے لگاتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ کئی تصویروں میں سونیا بھی اس کے ساتھ تھی۔ ایک تصویر میں وہ ایک مرد کے گھٹنوں پر بیٹھی ہوئی تھی جو یقیناً اس کا باپ ہوگا۔

اس نے بستر سے چھلانگ لگائی اور کچن کی طرف چل دی۔ جانے سے پہلے اس نے کمرے کی لائٹ جلائی۔ اس نے سوچا کہ کھڑکی کا پردہ ہٹا دے لیکن اگر نانی جلدی آگئی تو وہ ناراض ہوں گی۔ اس نے فریج کھول کر اپنے لیے ایک جوس کا ڈبا نکالا اور وہیں کھڑے کھڑے نلکی کی مدد سے جوس پینے لگی، پھر اس نے جینز کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا سیل فون نکالا۔ اس کا ارادہ اپنے کلاس فیلوز سے بات کرنے کا تھا لیکن یہ دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی کہ سیل فون کی بیٹری بھی ڈاؤن ہوچکی تھی۔ اس نے فون کاؤنٹر پر رکھا اور سنک کے اوپر لگا ہوا پردہ ہٹانے لگی۔

کچن کی کھڑکی سے باہر کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ اس نے ایک کار کو آتے دیکھا جو آدھے بلاک کے فاصلے پر ایک ٹیلی فون کے کھمبے کے پاس جا کر ٹکرا گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ہلکی سی آواز آئی اور گھر کی لائٹ جل گئی۔ سونیا نے دیکھا کہ کار سے دو جوان آدمی اترے اور کیڑوں کی طرح رینگتے ہوئے جنگل کی جانب بڑھنے لگے پھر ان کی چال میں تیزی آگئی اور وہ لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

تھوڑی ہی دیر میں پولیس کی گاڑیاں اس طرف آتی نظر آئیں۔ ان میں سے کئی پولیس والے اترے اور کار سے نکل کر جانے والوں کو تلاش کرنے لگے تاہم وہ اس ڈرامے کے انجام سے بے خبر تھی البتہ کئی بار حیرت سے اس کا منہ کھلا اور بند ہوگیا۔ اسی لمحے شدت سے اس کے دل میں خواہش ابھری کہ وہ کسی کو ٹیلی فون کرکے اس دلچسپ منظر کے بارے میں بتائے لیکن بیٹری ڈاؤن ہونے کی وجہ سے وہ اس خواہش کو عملی جامہ نہ پہنا سکی۔ اس نے سوچا کہ فیس بک کے ذریعے کسی سے رابطہ کرے۔ وہ تیزی سے اپنے کمرے کی جانب لپکی لیکن اسے ایک بار پھر مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے کمپیوٹر بھی کام نہیں کررہا تھا۔ اس کے پاس آئی پیڈ یا لیپ ٹاپ نہیں تھا۔ اسی لیے وہ کسی سے رابطہ نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور میز پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ”شٹ!“

اسی لمحے دروازے کی گھنٹی بجی... وہ چونک گئی اور سوچنے لگی کہ کیا اس نے دروازہ اندر سے لاک کردیا تھا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے کہ جنہیں پولیس تلاش کررہی تھی کہیں وہ اندر نہ آجائیں۔ پھر اس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ وہ یہاں آنے کی جرأت نہیں کرسکتے۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ مرکزی دروازے پر پہنچی۔ دھندلے شیشے سے اس نے جھانک کر دیکھا۔ وہاں ایک چوڑے شانوں اور سیاہ گھنگرالے بالوں والا ایک نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ اس نے تھوڑا سا دروازہ کھولا اور خود پیچھے ہٹ گئی... نوجوان... نے اس کی طرف دیکھا۔

”معاف کرنا خاتون۔ میرا خیال تھا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔“

سونیا بس اتنا ہی کہہ سکی۔ ”تم کون ہو؟“

وہ تھوڑا سا آگے بڑھا تاکہ وہ اس کی یونیفارم اور بیج دیکھ سکے پھر بولا۔ ”پولیس، مجھے افسوس ہے کہ تم میری وجہ سے ڈر گئیں۔“

”اندر آجاؤ۔“

”ہم اس علاقے کے مکانات چیک کررہے ہیں۔“ اس نے وضاحت کی۔ ”تم نے دیکھا ہوگا کہ پولیس چوروں کا تعاقب کررہی تھی لیکن ان کی گاڑی ٹیلی فون کے کھمبے سے ٹکرا گئی اور وہ بھاگ گئے۔ ہم صرف یہ اطمینان کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کسی دوسرے گھر میں تو داخل نہیں ہوئے اور سب کچھ ٹھیک ہے نا۔“

سونیا حیرت سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”سب کچھ ٹھیک ہے نا؟“ اس نے اپنی بات دہرائی۔

سونیا اپنی مسکراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ”ہاں، سب ٹھیک ہے۔“

اس نے مسکراتے ہوئے دروازے کی طرف قدم بڑھایا تو سونیا بولی۔ ”سوائے اس کے کہ ہمارے گھر میں لائٹ نہیں ہے اور میرے فون کی بیٹری ڈاؤن ہوگئی ہے۔ اس لیے تھوڑا سا گھبرائی ہوئی ہوں۔ اگر وہ واپس آگئے تو میں کیا کروں گی۔ ہمارے گھر میں تو فون بھی نہیں ہے۔“

پولیس آفیسر نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا اور بولا۔ ”تم اسکول نہیں گئیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”ہاں، مجھے فلو ہوگیا تھا۔“ اس نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

”اور اس وقت تم گھر پر اکیلی ہو؟“

سونیا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اگر تم چاہو تو میرا فون استعمال کرسکتی ہو۔ ماں سے کہو کہ وہ جلدی گھر آجائے۔“ یہ کہہ کر اس نے جیب سے اپنا سیل فون نکالا۔

”نہیں۔ وہ اپنا کام چھوڑ کر نہیں آسکتی۔ دوسرے یہ کہ وہ میری ماں نہیں بلکہ نانی ہے۔ میں اپنی نانی کے ساتھ رہتی ہوں۔ ماں مجھے چھوڑ کر جاچکی ہے۔“

”اوہ۔“ نوجوان پولیس آفیسر تھوڑا سا پریشان نظر آنے لگا۔ ”ٹھیک ہے، تم محتاط رہو اور میرے جانے کے بعد دروازہ اندر سے بند کرلینا۔“

”ٹھیک ہے۔“ سونیا نے کہا اور بولی۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”جیسن۔ پٹرول مین جیسن گورگا سالی۔“

”گورگا سالی۔“ سونیا نے بڑی احتیاط سے دہرایا اور بولی۔ ”یہ کچھ مختلف نام لگتا ہے۔“

”ہاں، یہ جارجین ہے۔“

”لیکن تم لہجے سے تو جارجین نہیں لگتے۔“ سونیا بولی۔

”میرے آباء و اجداد کا تعلق جارجیا سے ہے لیکن میں یہیں پیدا ہوا اور پلا بڑھا۔ ممکن ہے کہ میں نے بھی تمہارے ہی اسکول میں تعلیم حاصل کی ہو۔“ اس نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا پھر بولا۔ ”اب مجھے چلنا چاہیے۔ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی لیکن تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔“

”سونیا، سونیا پارک۔“ سونیا نے شرماتے ہوئے کہا۔

”خوب صورت نام ہے۔“ اس نے کہا اور دروازہ بند کرکے اس جانب بڑھ گیا جہاں اس کی پٹرول کار کھڑی ہوئی تھی۔

سونیا چند لمحے خاموش کھڑی رہی پھر اس نے دروازہ بند کرکے اندر سے چٹخنی چڑھائی اور ایک بار پھر اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس نے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا کہ شاید دل بہلانے کا کوئی سامان نظر آجائے لیکن وہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی۔ اس کی میز پر چند فیشن میگزین پڑے ہوئے تھے جنہیں وہ کئی بار پڑھ چکی تھی۔ اسے اپنے قیمتی دن کے ضائع ہونے کا افسوس ہورہا تھا۔ وہ سرد آہ بھرتے ہوئے اپنے چھوٹے سے کمرے سے نکلی اور ہال سے گزرتے ہوئے راکیل کے کمرے کے باہر کھڑی ہوگئی۔ وہ اس کمرے میں نانی کی موجودگی اور اجازت کے بغیر نہیں جاسکتی تھی۔ اس نے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ وہ لاک تھا۔ گھر میں اندھیرا ہوجانے کی وجہ سے وہ چابیاں تلاش نہیں کرسکتی تھی چنانچہ وہ کچن میں گئی اور ایک چھوٹا سا چاقو اٹھا کر لے آئی۔ اس نے ایک دفعہ نانی کو اس چاقو کی مدد سے دروازہ کھولتے دیکھا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی، اس چاقو سے دروازہ کس طرح کھلے گا

لیکن اس نے سوچا کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ اس نے چاقو کی نوک تالے کے سوراخ میں ڈالی اور اسے دائیں بائیں گھمانے لگی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد تالا کھل گیا۔

راکیل کا کمرا نسبتاً بڑا تھا لیکن بے ترتیبی کی وجہ سے اس میں زیادہ گنجائش نظر نہیں آرہی تھی۔ راکیل کا بستر کھڑکی کے نیچے تھا اور اس پر ایک میلی سی چادر بچھی ہوئی تھی۔ اس کے برابر میں دیوار کے ساتھ ایک سوٹ کیس رکھا ہوا تھا۔ سونیا کی طرح وہ بھی گتے کے خالی ڈبوں میں میلے کپڑے رکھا کرتی تھی۔ بستر کے ساتھ ہی ایک الماری تھی۔ اس نے جھک کر بستر کے نیچے ہاتھ ڈالا جیسے کچھ تلاش کررہی ہو لیکن اسے کچھ نہ ملا۔ اس نے اپنا ہاتھ باہر نکالا اور جینز سے رگڑ کر صاف کرنے لگی پھر وہ سوٹ کیس کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کے چھوٹے خانے میں ذاتی استعمال کی اشیا مثلاً ٹوتھ برش، ٹوتھ پیسٹ، کنگھا اور ایک چھوٹا تولیا رکھا ہوا تھا۔ اس نے سوٹ کیس کھولا۔ اس میں راکیل کے کپڑے بڑے سلیقے سے تہ کیے ہوئے رکھے تھے۔ لگتا تھا جیسے وہ کہیں جانے کی تیاری کررہی ہو۔ اس نے سارے کپڑے اسی ترتیب سے واپس رکھے اور سوٹ کیس بند کردیا۔ وہ کمرے سے باہر جانے لگی تو اس نے صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ سوٹ کیس پوری طرح بند ہوگیا ہے، ایک دفعہ پھر ڈھکنا اٹھا کر دیکھا تو اسے اس کی اندرونی سطح کچھ ابھری ہوئی محسوس ہوئی جس پر اس نے پہلے غور نہیں کیا تھا۔ وہاں ایک اور خانہ تھا۔ اس نے زپ کھول کر اندر ہاتھ ڈالا تو اندر ایک موٹا لفافہ رکھا ہوا تھا۔ سونیا نے اسے باہر نکالا اور کھڑکی کے پاس چلی گئی پھر اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا تاکہ سورج کی روشنی میں اس میں رکھے ہوئے کاغذات پڑھ سکے۔ اس میں کچھ پرانے اخباری تراشے رکھے ہوئے تھے جو کافی بوسیدہ ہوگئے تھے نہیں۔۔۔بے پروائی سے کاٹا گیا تھا کہ اکثر پر اخبار کا نام اور تاریخ بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

ان میں زیادہ تر مضامین اور تصاویر ایک چھوٹے سے مکان کے بارے میں تھے۔ سونیا نے غور سے دیکھا یہ ان مکانات سے مختلف تھا جن میں وہ اور راکیل کئی برسوں تک رہتی رہی تھیں۔ اگلے صفحے پر بھی اسی مکان کی تصویر تھی جس میں اسے شعلوں میں گھرا ہوا دکھایا گیا تھا۔ اس پر جلی حروف میں لکھا تھا کا سٹین میں پولیس مقابلہ اور نیچے درج تھا۔ پانچ ہلاک۔ یرغمالیوں کو بچالیا گیا۔" ایک اور تراشے میں بھی تقریباً ایسی ہی تصویر تھی لیکن اس کا کیپشن مختلف تھا۔ "چیپلز لبریشن آرمی کا صفایا۔" اس میں پانچ گوریلا ٹائپ جنگجو لوگوں کی تصاویر تھیں جن میں دو مرد اور تین عورتیں تھیں۔ سیاہ فام شخص کو فیلڈ مارشل دانتے کے نام سے شناخت کیا گیا جبکہ سفید فام شخص لمبے بالوں اور گھنی مونچھوں کی وجہ سے خوفناک نظر آرہا تھا، دو عورتوں نے اپنے ساتھیوں کی طرح سر پر ٹوپیاں پہنے ہوئی تھیں اور ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا جبکہ تیسری عورت کا چہرہ دیت نام اسٹائل ہیٹ میں چھپ گیا تھا اور صرف چہرے کا نچلا حصہ نمایاں نظر آرہا تھا جس میں اس کی مضبوط ٹھوڑی نمایاں تھی۔

تیسرے تراشے پر اخبار کا نام سان فرانسسکو کرانیکل اور تاریخ 7 فروری 1975ء درج تھی۔ یہ ایک بینک ڈکیتی کے بارے میں تھا۔ جس میں بینک کے محافظ اور ایک کسٹمر کو یرغمال بنالیا گیا تھا، جبکہ ایک سپاہی ڈاکوؤں کی گولی سے ہلاک ہوگیا تھا۔ وہ ڈاکو اپنا تعلق چیپلز لبریشن آرمی سے بتا رہے تھے جو ایف بی آئی کے مطابق کئی سرکاری عمارتوں پر بم پھینکنے اور ایک سیاست دان پر حملے میں ملوث تھی۔ یہ تصاویر بینک میں نصب کیمروں سے لی گئی تھیں۔ جن سے پتا چلتا تھا کہ انقلابیوں نے خودکار رائفلوں کے ذریعے بینک کے عملے اور وہاں موجود گاہکوں کو یرغمال بنایا۔ تین عورتوں نے کیش اکٹھا کرنا شروع کردیا جبکہ سیاہ فام داخلی دروازے پر پہرا دیتا رہا۔ اس تصویر میں لمبے بالوں اور گھنی مونچھوں والا سفید فام نظر نہیں آرہا تھا شاید وہ بینک کے باہر گاڑی میں بیٹھا اپنے ساتھیوں کا انتظار کررہا ہوگا۔ عینی شاہدین نے بتایا کہ ڈاکو ایک عورت اور اس کی چھوٹی بچی کو ساتھ لے گئے یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ عورت مقتول سپاہی کی بیوی تھی یا کسی کام سے بینک میں آئی تھی۔ پولیس یہ جاننے کی کوشش کررہی تھی کہ کیا مرنے والا سپاہی شادی شدہ اور ایک بچی کا باپ تھا۔ کچھ وجوہات کی بنا پر اس کا نام صیغہ راز میں رکھا گیا۔

سونیا کو اس نامعلوم شخص سے ہمدردی ہونے لگی۔ یہ کیسے لوگ تھے جنہوں نے غیر مسلح گاہکوں پر بندوق تان لی تھی۔ پھر اسے پہلے مضمون کا خیال آیا جس میں بتایا گیا تھا کہ یرغمالیوں کو بچالیا گیا تو کیا وہ عورت اور بچی بھی ان میں شامل تھی؟

وہ تراشے اتنی خستہ حالت میں تھے کہ سونیا کو انہیں سنبھالنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ اس نے غور سے اخبار کا تراشا پڑھا جس سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ عورت اسی مقتول سپاہی کی بیوی تھی۔ سپاہی کا نام ٹریوس وہیلر اور عورت کا نام شیری تھا جبکہ بچی کو ملیسا کے نام سے شناخت کیا گیا تھا۔ ماں نے اپنی جان بچانے کی کوشش کی اور جلتی عمارت سے اپنی

بچی کو بازوؤں میں اٹھائے وہاں سے بھاگی جبکہ دونوں جانب سے گولیوں کا تبادلہ ہورہا تھا۔ صفحے کے نیچے والے حصے میں ایک اور تصویر تھی جس میں ایک عورت نے خوفزدہ بچی کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔

سونیا کو وہ کمرا گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے اپنی ماں کی بچپن کی تصویریں دیکھی تھیں۔ اس لیے اسے بچی کو پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی اور وہ عورت بلاشبہ راکیل تھی۔ کئی برس گزر جانے کے باوجود بھی اس کے نقوش میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ سونیا نے ایک بار پھر ان کے نام غور سے پڑھے۔ شیری، ملیسا، وہیلر لیکن اس کی نانی کا نام راکیل اور ماں کا نام سینڈی تھا جبکہ اس نے وہیلر کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ تاہم اسے تصویر میں اپنی ماں اور نانی کو پہچاننے میں کوئی غلطی محسوس نہیں ہوئی سونیا کو یقین تھا کہ یہی دونوں ماں بیٹیاں بینک سے اغوا کی گئی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ راکیل نے یہ اخباری تراشے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔

ان اخباری تراشوں کو دیکھنے کے بعد پہلی بار سونیا کو اپنی ماں اور نانی سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ اسے چیپلز لبریشن آرمی سے نفرت ہونے لگی کیونکہ ان لوگوں نے اس کے خاندان کی خوشیاں چھین لی تھیں۔ انہی کی وجہ سے ماں اسے نانی کے پاس چھوڑ کر چلی گئی اور وہ آج تک اپنے بارے میں نہیں جان سکی۔

اس نے اپنی آنکھوں میں نمی محسوس کی پھر اس کی زبان سے چیپلز لبریشن آرمی کے لیے ایک گندی گالی نکلی۔ اس نے تمام تراشے دوبارہ لفافہ میں رکھ دیے۔ سورج غروب ہونے والا تھا اور دن کی روشنی مدھم ہوتی جارہی تھی۔ اس نے جلدی جلدی اپنا کام مکمل کیا اور لفافہ واپس راکیل کے سوٹ کیس میں رکھ دیا۔ اچانک ہی اس کے کانوں میں ایک آواز آئی۔ "تمہارا کام ختم ہوگیا؟"

سونیا نے گھوم کر دیکھا۔ راکیل دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔

سونیا نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔ "کیا؟"

اس کی نانی نے غصے سے سر ہلایا اور سوٹ کیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "پڑھ کر مزہ آیا؟"

"میں سمجھی نہیں۔ تم کیا کہہ رہی ہو؟" سونیا نے انجان بننے کی کوشش کی۔

راکیل نے چند قدم آگے بڑھائے اور بولی۔ "مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو میں یہاں پانچ منٹ سے کھڑی ہوئی ہوں۔"

سونیا نے سر جھکالیا اور بولی۔ "ہاں لیکن تم نے یہ سب کیوں نہیں بتایا؟ کیا مجھے یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے تھا؟" اس میں نہ جانے کہاں سے اتنی ہمت آگئی تھی۔ "جو کچھ تمہارے اور مما کے ساتھ گزری، اس سے میں بھی متاثر ہوئی ہوں۔ اگر یہ باتیں پہلے سے معلوم ہوتیں تو میں تم دونوں کو بہتر طور پر سمجھ سکتی تھی۔"

راکیل نے اپنی نواسی کی طرف دیکھا اور بولی۔ "تم ایسا سوچ سکتی ہو لیکن تمہیں اس کمرے میں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

سونیا اپنی جگہ پر مضبوطی سے خاموش کھڑی رہی۔

راکیل نے اس کے موڈ کو سمجھ لیا اور بولی۔ "چلو کافی پیتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ کچن کی طرف چل دی۔ سونیا بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ راکیل نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور خود کافی بنانے لگی۔ اس نے سونیا سے پوچھا۔ "گویا تم نے وہ تمام تراشے پڑھ لیے؟"

"ہاں!" سونیا نے اقرار کرتے ہوئے کہا۔ "پہلے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم نے یہ تراشے کیوں سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں لیکن جب میں نے اس بچی اور عورت کی تصویر دیکھی تو سمجھ گئی۔"

"کیا؟" راکیل اسے گھورتے ہوئے بولی۔

"یہی کہ بینک میں جو عورت بچی کے ساتھ تھی، وہ تم اور میری ماں ہو۔ البتہ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ہم لوگ اتنی جلدی جلدی گھر کیوں بدلتے رہے۔ کیا وہ پولیس کے ہاتھوں نہیں مارا گیا تھا۔ کیا تمہیں یہ ڈر تھا کہ کہیں ان کے دوسرے ساتھی تمہارے خلاف انتقامی کارروائی نہ کریں۔"

راکیل کی طنزیہ مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔ سونیا نے کہا۔ "کیا یہی بات ہے کہ کوئی اب بھی ہمارا پیچھا کررہا ہے؟"

"نہیں۔" راکیل نے جواب دیا۔ "وہ سب مارے جاچکے ہیں اور تمہاری نانی بھی۔ دراصل اسے میں نے ہی مارا تھا۔"

سونیا کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ وہ سمجھی کہ اس سے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ وہ چونکتے ہوئے بولی۔ "کیا؟"

"جب اس عمارت میں آگ لگی تو میرا صرف ایک ساتھی زندہ بچا تھا۔ ہم بری طرح گھر چکے تھے اور ہمیں اپنے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ لڑائی ختم ہوچکی تھی لیکن دانتے شکست تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ ہمارے پاس یہ عورت اور بچی ہے۔ ان کے بدلے ہم سودے بازی کرسکتے ہیں۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے سوچا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی احمقانہ

بات کہتا، میں نے ماتھے کا نشانہ لے کر اسے گولی ماردی۔"

سونیا کو لگا جیسے اس کی کرسی آگے پیچھے ہل رہی ہے لیکن وہ مضبوطی سے جم کر بیٹھ گئی اور اپنی نظریں راکیل کے چہرے پر جمادیں، وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"پھر میں نے تمہاری نانی کو بھی گولی ماردی۔ وہ قد اور وزن میں میرے برابر ہی تھی اور اس کے بال بھی میری طرح سنہری تھے۔ میں جانتی تھی کہ اس کا شوہر مر چکا ہے۔ ہم نے اسے مزاحمت کے دوران ماردیا تھا۔"

سونیا شکستہ لہجے میں بولی۔ "گویا تم میری نانی نہیں ہو؟"

"پوری بات سن لو۔ میں نے اس کے سر میں گولی ماری اور اس کے لباس سے اپنے کپڑے تبدیل کر لیے بلکہ اپنی رائفل بھی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ تمہاری ماں اس وقت چار سال کی تھی، وہ بری طرح رو رہی تھی۔ میں نے اسے گود میں اٹھایا اور باہر کی طرف بھاگی۔ مجھے بچ نکلنے کی امید نہیں تھی لیکن تمہاری ماں کو میری گود میں دیکھ کر وہ مجھ پر گولی نہ چلا سکے۔ میں ان کے درمیان سے گزرتی چلی گئی۔ وہ مجھے حیرانی سے دیکھ رہے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ شیری اور ملیسا پہلے ہی مر چکی ہیں۔ اچانک ہی انہوں نے نعرے لگانا شروع کردیے۔ ان میں سے کسی نے بھی شیری کو نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے وہ غلط فہمی کا شکار ہوگئے۔ میری چال کامیاب رہی اور جیسے ہی سوال، جواب کا سلسلہ ختم ہوا، میں وہاں سے چلی آئی۔ میں تمہارے خاندان میں جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ شیری اور ملیسا زندہ ہیں تو وہ ہماری تلاش میں لگ گئے اور اس کے لیے انہوں نے پرائیویٹ سراغ رسانوں کی خدمات حاصل کرلیں۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ کبھی ایف بی آئی والے میری حقیقت سے واقف ہوگئے تو میں بری طرح پھنس جاؤں گی۔ اسی لیے ہم لوگ کسی ایک جگہ مستقل قیام نہیں کرتے تھے اور تھوڑے عرصے بعد گھر تبدیل کرلیا کرتے تھے۔"

سونیا کا پورا جسم پسینے میں بھیگ گیا اور وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "تم نے میری نانی کو ماردیا؟"

"تم کبھی بھی عقل مند نہیں ہوسکتیں۔" راکیل نے ناگواری سے کہا۔ "بالکل اپنی ماں کی طرح احمق ہو۔ جب میں نے تمہیں وہ تراشے پڑھتے دیکھا تو سمجھ گئی کہ اب تم اس کے بارے میں بات کروگی۔ تمہارے جارحانہ انداز کو دیکھتے ہوئے لگتا ہے کہ تم اپنی زبان بند نہیں رکھ سکوگی۔"

سونیا کرسی سے چھلانگ لگا کر بھاگنا چاہ رہی تھی لیکن اسے لگا کہ اس کے جسم میں جان نہیں رہی۔ راکیل کی بنائی ہوئی کافی نے اپنا کام دکھا دیا تھا۔ سونیا کے ہونٹوں سے رال بہنے لگی اور وہ بڑی مشکل سے اتنا ہی کہہ پائی۔ "میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

"ہاں تم کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گی۔" راکیل نے کہا اس نے اپنے بازو میز پر پھیلا دیے... سونیا ایک جھٹکے کے ساتھ فرش پر جا گری اور... بے ہوش ہوگئی۔ اس نے اپنے آپ کو آسمانوں کی طرف اڑتا ہوا محسوس کیا۔ اسے اپنے چاروں طرف گرمی کا احساس ہوا۔ پھر تپش بڑھتی گئی۔ دھوئیں سے اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس کے سر میں دھماکے ہو رہے تھے پھر اس کے کانوں میں آوازیں آنے لگیں یوں لگا جیسے کوئی اس کا نام لے کر پکار رہا ہے۔ اس نے اپنا سر گھما کر جواب دینے کی کوشش کی لیکن اس کے ہونٹ ہلنے سے قاصر تھے۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی آنکھیں کھولنے کے قابل ہوگئی تو اس نے اپنے اوپر کسی کو جھکے ہوئے پایا۔ وہ جیسن تھا۔ وہی پولیس والا جو اسے محتاط رہنے کی تاکید کرکے گیا تھا اور ایک بار پھر اسے دیکھنے کے لیے چلا آیا تھا۔

اخبارات نے تفصیل سے اس واقعے کو شائع کیا اور بتایا کہ پیپلز لبریشن آرمی کی آخری بچ جانے والی عورت ایک بار پھر جلتا ہوا مکان چھوڑ کر فرار ہوگئی تاہم سونیا کی مدد سے پولیس کو یہ معلوم ہوگیا کہ یہ وہی عورت تھی جسے پولیس اور وہیلر خاندان تلاش کر رہا تھا۔ سونیا کو ایک ہفتہ اسپتال میں رہنا پڑا۔ اس دوران اس کے بے شمار انٹرویو لیے گئے۔ جیسن نے اسے جلنے سے بچایا تھا اور وہ اس وقت بہت مسرور نظر آرہی تھی۔ جب ان دونوں کو ایک ساتھ ٹیلی وژن پر دکھایا جارہا تھا۔ سونیا نے اپنے انٹرویو میں اسے فرشتہ قرار دیا جس نے عین وقت پر اسے بچالیا۔ میڈیا کو یہ ٹائٹل اتنا پسند آیا کہ انہوں نے بھی جیسن کو یہی لقب دے دیا اور اس کے ساتھی آفیسر بھی اسے اسی نام سے پکارنے لگے۔ اس کی تصویر والے کارڈ تیزی سے فروخت ہونے لگے اور اسکول میں لڑکیاں سونیا کو جیسن فرشتہ، کا نام لے کر چھیڑنے لگیں۔

وہیلر خاندان کے لوگ پہلے ہی تین افراد کا صدمہ برداشت کرچکے تھے لہٰذا وہ وقت ضائع کیے بغیر سونیا کو لینے آگئے گو کہ سونیا کو اپنے پولیس آفیسر کو خدا حافظ کہتے ہوئے تکلیف ہورہی تھی لیکن ساتھ ہی اس بات کی خوشی تھی کہ وہ اپنے گھر جارہی ہے جو اس کا اصلی ٹھکانا ہے اور اب کسی اور جگہ نہیں جانا پڑے گا۔



پہلی بیوی

منظر امام

بیوی پہلی ہو یا دوسری اصل کارنامہ اس کے مقدر کا ہوتا ہے... کچھ غیب کی باتیں چھپی ہوئی اچھی رہتی ہیں... جن کے ظاہر ہونے سے نہ صرف یہ کلی زندگی کی سمت بدل دیتی ہے بلکہ بےیقینی پیروں میں لرزش بھی پیدا کردیتی ہے۔ ایسے میں نہ منزل قریب آتی ہے نہ رستہ ختم ہوتا ہے... نہ ارادوں کا پتا چلتا ہے نہ وعدوں کا پاس رہتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی دوراہے پر کھڑے گمشدہ منزل کا نشاں ڈھونڈ رہے تھے جنہیں... اگلے پل کی کچھ خبر نہ تھی۔

ٹوٹے اعتماد، بکھرے خوابوں کی کرچیاں سمیٹنے والوں کی روداد

بہت بُرا حال ہورہا تھا اس لڑکی کا۔ کار کے انتہائی بھیانک حادثے نے اس کے جسم کو بری طرح کچل دیا تھا۔ ڈاکٹرز اسے تقریباً مردہ قرار دے چکے تھے۔

خرم اس وقت اپنے باپ نفیس کے ساتھ اسپتال کی کوریڈور سے گزر رہا تھا۔ جب انہوں نے کئی افراد کو بری طرح روتے ہوئے دیکھا جو ایک دوسرے کو تسلیاں دے رہے تھے۔

"بیٹے، کون لوگ ہیں؟" خرم کے باپ نفیس نے خرم سے پوچھا۔

"بابا، یہ اس لڑکی کے گھر والے ہیں، جس بے چاری کا اتنا بھیانک ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔"

"اوہ۔" نفیس نے اپنا بریف کیس بند کر لیا، اس کے پیشانی پر رگیں ابھر آئی تھیں، وہ چند لمحوں تک اسی طرح کھڑا رہا۔ پھر آنکھیں کھول کر ان لوگوں کی طرف بڑھ گیا۔

"دیکھیں۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔" نفیس نے ان لوگوں کو مخاطب کیا۔ "آپ لوگ جس لڑکی کے لیے رو رہے ہیں۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔"

وہ اپنا رونا دھونا بھول کر اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

"جناب، آپ کون ہیں؟" لڑکی کے باپ نے نفیس سے پوچھا۔

"آپ اسے رہنے دیں کہ میں کون ہوں۔" نفیس نے کہا۔ "لیکن جو میں نے آپ کو بتایا ہے، بالکل اسی طرح ہونا ہے۔ اس لڑکی کو کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

ان سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا خرم یہ سب سن رہا تھا۔ اسے کبھی کبھی اپنے باپ سے خوف بھی محسوس ہونے لگتا تھا۔ اس کی کہی ہوئی باتیں حیرت انگیز طور پر بالکل درست ثابت ہوتی تھیں۔ لیکن اس وقت صورت حال بہت مختلف تھی۔

اسی دوران آپریشن تھیٹر سے دو ڈاکٹر باہر نکل آئے، وہ دونوں اس گھرانے کے قریب آ گئے تھے، لڑکی کا باپ بڑی بے تابی سے ان کی طرف بڑھا تھا۔

"حیرت انگیز!" ایک ڈاکٹر نے کہا۔ "پیشنٹ کی حالت کچھ بہتر ہو رہی ہے۔ اس کے جسم نے نیا خون قبول کرنا شروع کر دیا ہے۔"

ڈاکٹر تو اتنا کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ لیکن اب وہ گھرانا نفیس کے پاس چلا آیا تھا۔ "جناب، آپ کون ہیں۔ آپ نے کس طرح اتنی بڑی بات کہہ دی تھی۔" وہ پوچھ رہے تھے۔

"کچھ نہیں۔ بس میرا تجربہ۔" نفیس نے مسکرا کر کہا۔ پھر خرم کا ہاتھ تھام لیا۔ "چلو بیٹے۔"

☆☆☆

یہ ایک پڑھا لکھا گھرانا تھا۔

نفیس کی شادی اس وقت ہوئی تھی، جب وہ بیس بائیس برس کا تھا، اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ اسے بحری جہازوں سے شروع سے دلچسپی رہی تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میں ایک نہ ایک دن کسی بحری جہاز کا کیپٹن ضرور بنوں گا۔ سائنس سے گریجویشن کرنے کے بعد اس نے میرین اکیڈمی جوائن کر لی تھی۔ وہاں وہ ابھی فارغ ہی ہوا تھا کہ خاندان کی ایک اچھی لڑکی افشاں سے اس کی شادی کر دی گئی۔ اس کے والدین کا بہت اچھا کاروبار تھا۔ انہیں اس بات کی پروا نہیں تھی کہ ان کا بیٹا کچھ کماتا ہے یا نہیں۔ گھر میں سب کچھ تھا۔ شادی کے چار سالوں میں دو بچے بھی پیدا ہو گئے، خرم اور ماہا۔

اس دوران ایک بحری جہاز پر اسے نائب کپتانی کا چانس مل گیا۔ اس کے گھر والوں نے اسے روکنے کی کوشش کی تو اس نے جواب دیا۔ "اتنے برسوں کے بعد تو میرا یہ خواب پورا ہونا ہے۔ میں اسے کیسے چھوڑ دوں۔"

گھر والے اسے سمجھاتے رہے، لیکن وہ ایم وی پیڈرو پر نائب کپتان کی حیثیت سے روانہ ہو گیا۔ اس وقت خرم صرف تین سال کا تھا اور ماہا ایک سال کی۔

پھر یہ ہوا کہ اس جہاز کو سمندری طوفان کا حادثہ پیش آ گیا۔ ریسکیو ذرائع کے مطابق اس جہاز کا کوئی مسافر زندہ نہیں بچا تھا۔

اس حادثے نے گھر میں کہرام برپا کر دیا۔

افشاں نے ابھی زندگی کی خوشیاں بھی نہیں دیکھی تھیں کہ قدرت نے ان خوشیوں سے محروم کر دیا۔ دونوں بچوں سے باپ کی شفقت دور ہو گئی تھی۔ اس جہاز میں عملے کے علاوہ ستر آدمی تھے۔ وہ سب کے سب ڈوب گئے تھے۔ افشاں کو عدت کے لیے بٹھا دیا گیا تھا۔ لیکن عدت کی مہلت ختم ہونے سے ایک ہفتے پہلے اچانک نفیس کا خط آ گیا۔ اس نے اپنے زندہ ہونے کی اطلاع دی تھی کہ کچھ دنوں کے بعد وطن واپس آئے گا۔

یہ خط اس نے جنوبی افریقا کے شہر ڈربن سے روانہ کیا تھا اور تحریر کیا تھا کہ وہ کسی کام کے سلسلے میں افریقا کے اندرونی علاقوں کی طرف جا رہا ہے۔

اتنا ہی بہت تھا کہ وہ زندہ ہے اور خیریت سے ہے۔ جس گھر میں ماتم کی فضا تھی، اس گھر میں قہقہے گونجنے لگے تھے۔ شکرانے کی نمازیں پڑھی گئیں۔ مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔ ایک ہفتہ بعد نفیس کا فون بھی آ گیا۔ اس نے ایک دوسرا جہاز جوائن کر لیا تھا اور چند دنوں کے لیے وطن واپس آ رہا تھا۔ اس نے واپس آ کر بہت عجیب کہانی سنائی تھی۔ وہ جہاز ڈوب جانے کے بعد بہت دیر تک سمندر میں تیرتا رہا۔ شاید دو تین گھنٹوں تک۔ اس کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

پھر ایک بحری جہاز نے اس کی جان بچائی جو ساؤتھ افریقا جا رہا تھا۔ ڈربن پہنچ کر اسے کچھ ایسے لوگ ملے جو جنگلی کھالوں کی تجارت کرتے تھے، انہوں نے نفیس کو اپنے ساتھ کام کرنے کی پیشکش کی۔ وہ ان کے ساتھ ہو لیا۔

پھر کیا ہوا، اس نے کس طرح یہ کام کیا ہوگا۔ اس کے بارے میں وہ خاموش رہا تھا۔ بہرحال اس کے بعد بھی اس کا

ساؤتھ افریقا آنا جانا ہوتا رہا تھا۔ وہ واپس آیا تو اپنے ساتھ اچھی خاصی رقم لے کر آیا تھا۔

یہاں اس نے کاروبار شروع کیا۔ اس دوران اس کے بچے بڑے ہو چکے تھے اور نفیس کچھ دنوں سے ایک بار پھر واپس ساؤتھ افریقا جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔

☆☆☆

خرم کو اکثر خیال آتا کہ نہ جانے اس کے بابا میں ایسی کون سی قوت آ گئی تھی کہ وہ جب بھی کسی کے بارے میں کچھ کہتا۔ وہ بات سچ ثابت ہو جاتی۔ اس کی ماں بتایا کرتی کہ نفیس میں پہلے ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن افریقا سے واپس آنے کے بعد اس میں یہ کمال پیدا ہو گیا تھا۔

اس کا احساس اس دن پہلی بار ہوا جب خرم کی خالہ اپنی بیٹی کی شادی کے لیے مدد مانگنے اپنی بہن کے پاس آئی۔ اس وقت ڈرائنگ روم میں سب ہی جمع تھے۔ نفیس، خرم، افشاں اور خرم کی بہن ماہا۔

اچانک ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے نفیس نے اپنی سالی یعنی خرم کی خالہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "زبیدہ، تمہیں پیسوں کی کیا ضرورت ہے؟ تم تو بہت دھوم دھام اور شاندار طریقے سے عالیہ کی شادی کر سکتی ہو۔"

"بھائی صاحب، ہماری اتنی حیثیت کہاں ہے کہ ہم شاندار طریقے سے شادی کر سکیں۔"

"حیثیت تو ہے، اگلے ہفتے تمہارے پاس دولت آ جائے گی۔" نفیس نے کہا۔

"کہاں سے آئے گی دولت؟"

"پرائز بانڈ سے۔" نفیس نے بتایا۔ "شاید تم نے کوئی پرائز بانڈ خرید کر رکھا ہوا ہے، اگلے ہفتے اس پر ایک بڑا انعام نکلنے والا ہے۔"

اس وقت نفیس کی یہ بات ہنسی میں ٹال دی گئی تھی۔ ٹھیک ایک ہفتے بعد جب انعام نکل آیا تو سب ہی حیران رہ گئے تھے۔ نفیس نے یہ بات اتنے وثوق سے کس طرح کہہ دی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ یہ حسن اتفاق ہو۔ لیکن اس کے بعد ایک اور ایسا واقعہ ہوا جس نے خرم کو ہلا کر رکھ دیا۔

خرم کا ایک دوست تھا، جبران، وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا جا رہا تھا۔ وہ خرم سے ملنے آیا تھا۔ دونوں دوست ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اتفاق سے اس وقت نفیس بھی ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ جبران نے نفیس کو سلام کیا۔ نفیس چند لمحوں تک اس کی طرف دیکھنے کے بعد کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس پر ایک اضطراری کیفیت طاری تھی۔ اس کی دونوں کنپٹیوں پر کوئی ٹھوکریں مار رہا تھا۔ وہ زور زور سے اپنے سر کو جھٹک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب خرم اس کے کمرے میں آیا تو نفیس نے پوچھا۔ "بیٹا کیا تمہارا یہ دوست امریکا جا رہا ہے؟"

"جی بابا۔ اگلے ہفتے کی فلائٹ ہے۔" خرم نے بتایا۔

"بیٹا۔ اس کے گھر والوں سے کہو کہ وہ اس کی آخری رسومات کی تیاری کریں۔" نفیس نے کہا۔ "اس بے چارے کی زندگی کا سفر ختم ہونے والا ہے۔"

خرم نے یہ بات کسی سے نہیں کہی لیکن جب چار دنوں بعد جبران کی ایک کار ایکسیڈنٹ میں موت واقع ہو گئی تو اسے اپنے بابا سے خوف محسوس ہونے لگا۔

یہ انتہائی بھیانک صورت حال تھی۔ اس کا باپ ایک پراسرار قوت کا مالک بن چکا تھا۔ خرم کو دو بار اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

سمندر نہ جانے کتنی کہانیاں اپنے وسیع و عریض سینے میں رکھتا ہے۔ وہ نہ جانے کتنے رازوں کا امین ہوتا ہے۔ اس وقت بھی ایک جوان اور خوبصورت لڑکی اس کی آغوش میں پناہ لینے کے لیے آہستہ آہستہ آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ لہریں اس کے گھٹنوں تک آ چکی تھیں۔ اس کے اور موت کے درمیان بس تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا تھا کہ اچانک کسی نے اسے پیچھے کی طرف کھینچ لیا۔

اس کو کھینچنے والی ایک عورت تھی جو جوانی اور ادھیڑ عمری کی سرحد پر تھی۔ "کیا پاگل ہو گئی ہو۔" اس عورت نے اسے زور سے پکڑتے ہوئے کہا۔ "دو قدم آگے بڑھاؤ گی تو ڈوب جاؤ گی۔"

"چھوڑو مجھے۔" لڑکی نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی۔ "میں ڈوبنے ہی کے لیے جا رہی ہوں۔"

"اوہ..... تو یہ بات ہے۔" اس عورت نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ "ٹھیک ہے۔ میں تمہیں خودکشی کرنے سے نہیں روکوں گی۔ جو خود ہی مرنا چاہتا ہو، اسے کون روک سکتا ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ تم دو چار دن رک جاؤ۔ جان دینا کوئی اتنا مشکل نہیں ہے۔ جان دے دو گی۔ پھر تمہیں پچھتانے کا بھی موقع نہیں ملے گا۔" عورت نے اسے مزید پانی سے دور کھینچ لیا تھا۔ "تم آؤ میرے ساتھ۔ ہو سکتا ہے کہ ... میں تمہارے کسی کام آ سکوں، یا کم از کم تم مجھ سے باتیں کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکو۔ آؤ۔"

لڑکی جیسے ٹرانس میں آ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ اس عورت نے سڑک پر آنے کے بعد کہا۔ "گھبراؤ نہیں۔ میں

ایک اسکول ٹیچر ہوں آجاؤ میرے ساتھ۔ میں یہاں سے قریب ہی رہتی ہوں۔"

لڑکی خاموشی سے اس کے ساتھ چلتی رہی۔ اس کے بدن پر ہلکی سی کپکپی طاری ہوگئی تھی۔

"بہت سردی لگ رہی ہوگی۔" اس عورت نے چلتے چلتے پوچھا۔

"جی ہاں۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"بے وقوف لڑکی۔ مرنے کے لیے اس موسم کا انتخاب کیوں کیا؟ گرمیوں میں یہ سوچا ہوتا۔"

پہلی بار اس لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ وہ دونوں پیدل ہی چل رہی تھیں۔ ساحل کا یہ علاقہ بڑے بڑے خوبصورت مکانوں کا تھا لیکن ان ہی مکانوں کے درمیان غریبوں کی ایک کالونی بھی آباد تھی۔

وہ عورت ایک چھوٹے سے مکان کے دروازے پر آکر رک گئی۔ "یہ میرا گھر ہے۔" اس نے بتایا۔ "اگرچہ یہ بہت چھوٹا ہے لیکن تمہیں یہاں بہت سکون ملے گا۔"

دستک کے جواب میں دروازہ کھول دیا گیا۔ دروازہ کھولنے والی سترہ اٹھارہ برس کی خوبصورت نقش نگار والی ایک لڑکی تھی اور اس کے پیچھے نو دس برس کا ایک بچہ بھی کھڑا تھا۔

"آؤ، اندر آجاؤ۔" عورت نے اس لڑکی سے کہا جس کو اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ لڑکی کچھ جھجکتی ہوئی اندر آگئی۔

"اماں! یہ کون ہیں؟" دروازہ کھولنے والی لڑکی نے سوال کیا۔

"یہ تمہاری آپی ہیں۔" عورت نے بتایا۔ "اور جہاں تک ان کے نام کا سوال ہے تو خود انہی سے پوچھ لو۔"

"میرا نام فروزاں ہے۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"واہ۔" دوسری لڑکی اچھل پڑی۔ "کتنا خوبصورت نام ہے فروزاں اور میں نیلم ہوں۔"

فروزاں پھر مسکرا دی۔

"اور میرا نام شاہین ہے۔" بچے نے آگے بڑھ کر بتایا۔

"حالانکہ میں کہیں سے بھی شاہین نہیں لگتا۔"

فروزاں کو ان کی یہ باتیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ اس خاتون نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ان کے گھر میں سکون ہی سکون ہے۔ یہ بہت محبت کرنے والا گھرانا معلوم ہوتا تھا۔

اب فروزاں ان کے ساتھ ہی قیام پذیر ہونے والی تھی۔

☆☆☆

وہ دونوں پہلے تو ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے، پھر ان کے درمیان گہری دوستی ہوگئی تھی۔ اس لڑکی کا نام شاہ بانو تھا۔ ایک امیر گھرانے کی خوبصورت لڑکی جس کے پاس اپنی ذاتی گاڑی بھی تھی اور اپنا ایک مکان تھا جو اس کے امیر باپ نے اسے تحفے کے طور پر دیا تھا۔ شاہ بانو اپنی فطرت میں اچھی لڑکی تھی۔ خرم نے اس کی دولت اور اس کی صورت دیکھ کر اسے پسند نہیں کیا تھا بلکہ شاہ بانو... کی عادت اسے اچھی لگی تھی۔ وہ ایک اصول پسند لڑکی تھی۔

پہلی ملاقات میں ہی دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کرلیا تھا۔

خرم نے یہ سوچ لیا تھا کہ وہ شاہ بانو ہی کو اپنا جیون ساتھی بنائے گا۔

ایک دن شاہ بانو نے اس سے کہا۔ "خرم۔ یہ بتاؤ آج تم کہیں میرے ساتھ چل سکتے ہو۔"

"میں تمہارے ساتھ ہر وقت چلنے کو تیار ہوں۔" خرم مسکرا کر بولا۔ "لیکن جانا کہاں ہے؟"

"ایک ایسی جگہ جہاں شاید جانا پسند نہ کرو۔"

"اور وہ جگہ کون سی ہے؟" خرم نے پوچھا۔

"نیلم کالونی ایک غریب بستی۔" شاہ بانو نے کہا۔ "میں اپنے کپڑے نیلم کالونی میں جاکر سلواتی ہوں۔"

"کمال کی بات ہے۔ نیلم کالونی تو ایک پس ماندہ علاقہ ہے۔ تمہارا تعلق کلفٹن اور ڈیفنس جیسے پوش علاقوں سے ہے۔ یہاں کے ہزاروں ٹیلرز اور بوتیکس کو چھوڑ کر تم وہاں کیوں جاتی ہو؟"

"وہاں ایک خاتون ہیں۔" شاہ بانو نے بتایا۔ "بہت خوددار لیکن ضرورت مند۔ بہترین سلائی کرتی ہیں۔ کسی زمانے میں انہوں نے مجھے اسکول میں پڑھایا بھی تھا۔ اس طرح ان کی مدد بھی ہوجاتی ہے اور میرا کام بھی ہوجاتا ہے۔"

"خیر۔ یہ تو تم نیک کام کررہی ہو۔" خرم نے بتایا۔ "مجھے تمہاری یہی باتیں تو پسند ہیں۔"

دونوں کچھ دیر میں نیلم کالونی پہنچ گئے تھے۔

"ان کی زندگی بھی ہماری زندگی سے کتنی مختلف ہوتی ہے۔" خرم نے تبصرہ کیا۔

"ہاں، مختلف بھی اور پرسکون بھی۔" شاہ بانو نے کہا۔ "تم ذرا ان کے چہروں کی طرف دیکھو۔ کتنے مطمئن دکھائی دیتے ہیں۔"

اس نے مطلوبہ مکان کے آگے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ "بس، میں ابھی دس منٹ میں پے منٹ دے کر آتی ہوں۔"

شاہ بانو کے جانے کے بعد خرم نے آس پاس کا جائزہ

لینا شروع کردیا۔ آتے جاتے لوگ اسے تجسس بھری نگاہوں سے دیکھتے جارہے تھے۔

کچھ ہی دیر میں شاہ بانو کی واپسی ہوگئی۔ آتے ہی اس نے پھر خالہ اور ان کے بچوں کی تعریفیں شروع کردیں۔

"ان کی ایک بچی ہے۔" شاہ بانو نے بتایا۔ "اس کی طرف سے مجھے ڈر لگا رہتا ہے۔ اس کے خواب بہت اونچے اور غیر حقیقی ہیں۔ مجھے یہی خوف ہوتا ہے کہ وہ کہیں ٹھوکر نہ کھا جائے۔ ویسے وہ بہت اچھی ہے، بہت شرارتی قسم کی۔"

"کیا ان کے ساتھ اور کوئی نہیں رہتا؟"

"نہیں۔ کوئی مرد نہیں ہے۔" شاہ بانو نے بتایا۔ "ہاں یاد آیا آج میں نے ان کے گھر میں ایک لڑکی دیکھی ہے۔ شاید رشتہ دار ہو۔ میں نے اس کے بارے میں پوچھا نہیں۔ ویسے وہ بھی اچھی تھی۔"

"خیر...... یہ بتاؤ، اب کیا کرنا ہے۔ کہاں چلنا ہے؟"

"کہیں نہیں۔ یہ کام تو ختم ہوا۔ اب تم جہاں کہو اسی طرف چلتے ہیں۔"

"تو پھر سمندر کی طرف لے لو۔" خرم نے کہا۔

ساحل وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ چند منٹ کے بعد ان کی گاڑی سی ویو کی طویل سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

☆☆☆

سمندر کی لہریں شور کررہی تھیں لیکن نفیس دنیا سے بے نیاز آنکھیں بند کیے اپنی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ بھی سمندر ہی تھا۔ جو اسے اپنے ساتھ بہاتا ہوا نہ جانے کس طرف جارہا تھا۔ اس نے اپنے ہوش قائم رکھے تھے۔ ورنہ اپنے ساتھیوں کی طرح نہ جانے کسی وقت ڈوب چکا ہوتا۔ ہر طرف گھور اندھیرا تھا اور اس اندھیرے میں صرف ایک احساس قائم تھا کہ وہ سمندر میں ہے اور اسے اپنی زندگی بچانے کے لیے بہت جدوجہد کرنی ہے پھر تھک جانے کے بعد اپنے آپ کو موجوں کے حوالے کردینا ہے...... لیکن ابھی نہیں۔ نہ جانے وہ کب تک جدوجہد کرتا رہا پھر اس کے بازو شل ہوگئے اس کا جسم شل ہوگیا اور اس پر غشی طاری ہوگئی۔

اسے کچھ نہیں معلوم کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ وہ ایک جہاز کے کیبن میں تھا اور کچھ لوگ اس پر جھکے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔

"تم ہوش میں آگئے۔" ایک نے اسے بیدار دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے اپنی گردن ہلا دی اور آنکھیں بند کرلیں۔ کچھ دیر تک اس کی یہی کیفیت رہی۔ پھر آہستہ آہستہ سب کچھ یاد آتا چلا گیا۔ اس کے جہاز کی تباہی، اس کا سمندر میں گرنا۔ "میں اس وقت کہاں ہوں؟" اس نے آنکھیں کھول کر پوچھا۔

"ایم وی نگارا پر۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "میرا نام ولیم ہے۔ میں اس جہاز کا کیپٹن ہوں۔ ہم نے تمہارے جہاز کو ڈوبتے ہوئے دیکھ لیا لیکن افسوس کہ ہم تمہارے علاوہ کسی کو نہیں بچا سکے۔"

نفیس نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔ اسے اپنے ساتھیوں کے ڈوب جانے کا افسوس ہورہا تھا۔

"ہم جنوبی افریقا جارہے ہیں۔" ولیم نے کہا۔ "تم کہاں جارہے ہو؟"

"ظاہر ہے، اسی طرف جاؤں گا۔" نفیس نے جواب دیا۔ "میری کمپنی کا ایک آفس۔ ڈربن میں بھی ہے۔"

"پھر تو تمہیں کاغذات وغیرہ کی آسانی ہوجائے گی۔"

اس طرح نفیس جنوبی افریقا پہنچ گیا۔ اس کے دفتر والوں نے فوری طور پر اس کے کاغذات تیار کروادیے۔ اس کے لیے نئے پاسپورٹ اور ویزا وغیرہ کا بندوبست کردیا گیا اور جب وہ اپنے وطن واپس آنے ہی والا تھا کہ اس کی ملاقات کاسی سے ہوگئی۔ کاسی ایک سیاہ فام لڑکی تھی۔ بہت خوبصورت، بہت پرکشش اور بہت پراسرار۔

نفیس اس وقت ایک ریستوران میں بیٹھا کچھ کھا رہا تھا کہ وہ اس کے سامنے والی کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔ وہ بہت غور سے نفیس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نفیس کچھ گڑبڑا سا گیا تھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" کاسی نے پوچھا۔

"نفیس۔" نفیس نے جواب دیا۔ "کیوں، میرا نام پوچھنے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

"اس لیے کہ میں ادم کلوکلو کے نور کو تمہارے چاروں طرف دیکھ رہی ہوں۔" کاسی نے کہا۔ "تم شاید جہاز راں ہو۔ تمہارا جہاز ڈوب گیا تھا۔ تم کو ایک دوسرے جہاز نے بچالیا اور تم اپنے وطن واپس جانا چاہ رہے ہو۔"

"ہاں لیکن تم نے حیرت انگیز طور پر سب کچھ سچ بتایا ہے۔" نفیس نے کہا۔ "میں کل کی فلائٹ سے چلا جاؤں گا۔"

"اور یہ بھی سچ ہے کہ تم کل نہیں جاسکو گے۔" اس لڑکی نے کہا۔ "بلکہ کئی مہینوں تک نہیں جاسکو گے۔"

"وہ کیوں؟" نفیس نے حیران ہوکر پوچھا۔

"اس لیے کہ ادم کلوکلو کو ماننے والے اپنی کچھ طاقت تمہارے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔" اس نے بتایا۔

نفیس کو بھی اس کی بے سروپا باتوں میں مزہ آرہا تھا۔ "چلو۔ پہلے یہ بتادو کہ تمہارا نام کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میرا نام کاسی ہے۔" اس نے بتایا۔

''اور میں نفیس ہوں۔ چلو اب یہ بتادو کہ کس کے پجاری اپنی طاقت میرے حوالے کریں گے۔''

''اوم کلوکلوکے۔'' کاسی نے کہا۔

''کیوں، مجھ پر اتنی مہربانی کس لیے؟''

''اس لیے کہ تم چاند کی آخری رات کو سمندر کے پانیوں سے لڑتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہو۔'' کاسی نے کہا۔ ''اور ہم جانتے ہیں کہ جو اس طرح موت سے بچ کر نکل آئے۔ اس میں کچھ قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک قوت یہ ہے کہ وہ بہت آسانی سے اور بہت جلد، ہمارے پجاریوں کی خفیہ طاقتیں حاصل کرسکتا ہے اس لیے میں نے تم کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔''

''بہت خوب۔'' نفیس مسکرا دیا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم میں بھی کچھ خفیہ قوتیں ہیں۔''

''ہاں۔'' کاسی نے جواب دیا۔

''بہرحال۔ مجھے تو کل صبح ہی یہاں سے روانہ ہو جانا ہے۔'' نفیس نے کہا۔

کاسی مسکرا دی۔ ''مسٹر نفیس۔ جو میں نے تم سے بات کی ہے۔ وہی ہونے والا ہے۔ یہ بات لکھ لو۔''

نفیس نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا۔

پھر اپنے ہوٹل کی طرف پیدل واپس آتے ہوئے خود اپنی ہی غلطی سے اسے ٹھوکر لگی اور اس کے ایک پاؤں میں فریکچر ہو گیا۔

اسے لوگوں نے اسپتال پہنچا دیا تھا۔ جہاں اس کے ٹوٹے ہوئے پیر پر پلاستر چڑھا دیا گیا۔ اب وہ کہیں بھی جانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اسپتال کے بستر پر لیٹا ہوا وہ یہی سوچ رہا تھا کہ کیا یہ محض اتفاق ہے یا کچھ اور۔

کیا اس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ صرف ایک حادثہ تھا یا اس حادثے کی جڑیں کہیں اور تھیں۔ اس لڑکی نے کتنے وثوق سے کہا تھا کہ وہ کہیں نہیں جاسکے گا کیونکہ اس کا مقدر کچھ اور ہو چکا ہے۔

شام کے وقت وہی لڑکی اسے دیکھنے کے لیے اسپتال آ گئی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ ''دیکھا میں نے کہا تھا نا کہ تم نہیں جاسکو گے......''

کاسی نے کہا۔ ''اب اس سے یہ مت سمجھ لینا کہ تمہیں روکنے کے لیے وہ حادثہ ہم ہی نے کروایا تھا۔''

''تو اور کیا سمجھوں؟''

''ایسا اس لیے ہوا کہ تمہارے ساتھ یہی ہونا تھا۔'' کاسی نے کہا۔ ''اب تم چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

''کہاں؟'' نفیس نے بوکھلا کر پوچھا۔

''ہمارے پجاریوں کے پاس جو یہاں سے تین سو کلو میٹر کے فاصلے پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

''تم کیسی بات کر رہی ہو۔ میں چار قدم نہیں چل سکتا۔ ڈاکٹرز نے پندرہ دنوں تک اسی طرح لیٹے رہنے کے لیے کہا ہے۔''

''تم اس کی فکر مت کرو۔'' لڑکی نے کہا۔ ''ہمارے پجاری بہت طاقت ور ہیں۔ وہ تمہیں بہ آسانی یہاں سے لے جائیں گے۔''

''لیکن کیوں۔ میں کیوں جاؤں ان کے پاس۔''

''اس لیے کہ تمہارا جانا تمہارا مقدر ہو چکا ہے۔'' لڑکی نے کہا۔ ''تم اس کے علاوہ اور کچھ کر نہیں سکتے اور تمہارا یہ مقدس سفر آج رات ہی کو ہوگا۔''

''پلیز۔ تم جاؤ یہاں سے۔ تم نے تو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔''

کاسی مسکراتی ہوئی چلی گئی تھی اور اس رات نفیس کا ایک پراسرار سا سفر شروع ہو گیا۔ اس کا یہ سفر کسی چھکڑے پر تھا۔ اسے اچھی طرح یاد ہے کہ رات کا کھانا کھاتے ہی اس پر گہری نیند کا غلبہ ہو گیا تھا۔ اسے ہوش اس طرح آیا تھا کہ کچھ لوگ چھکڑے کے ساتھ ساتھ کچھ گاتے ہوئے چل رہے تھے۔

گیت کا آہنگ بہت خوبصورت تھا۔ لیکن وہ زبان کون سی تھی، وہ نفیس کے فرشتے بھی سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ اس نے بے ساختگی میں اٹھ بیٹھنے کی کوشش کی لیکن پلاستر کی وجہ سے اس سے اٹھا نہیں گیا۔

اسی وقت کاسی کی آواز سنائی دی۔ ''لیٹے رہو۔ تم ابھی اس قابل نہیں ہو۔''

''یہ کیا ڈراما ہے۔'' وہ غصے سے بولا۔ ''یہ تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔''

''گھبراؤ نہیں۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔'' کاسی نے کہا۔ ''ہم تمہیں وہیں لے جا رہے ہیں جہاں تمہیں بلایا گیا ہے۔''

''یہ کیا زبردستی ہے۔ میں نہیں جانتا تم لوگوں کو تم لوگ مجھے کیوں اغوا کر رہے ہو۔ میرا کسی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ مجھے واپس جانے دو۔''

وہ چیختا چلاتا رہا لیکن کاسی ہنستی رہی، چھکڑے کے ساتھ چلنے والے گیت گاتے رہے۔

نہ جانے کب تک یہ سفر جاری رہا تھا۔

نفیس کئی بار سویا اور جاگا۔ نہ جانے کتنے لوگ تھے جو اس کے ساتھ چل رہے تھے۔ جبکہ کاسی ایک جیپ پر سفر کر رہی تھی۔ راستے میں جب یہ کارواں رکتا تو وہ اپنی جیپ سے اتر کر اس کے پاس آجایا کرتی۔

''تم لوگ مجھے کب تک قید میں رکھو گے؟'' ایک بار

نفیس نے کاسی سے پوچھا۔

''قید!'' کاسی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کس نے کہہ دیا کہ تم قید میں ہو۔ تم صرف پندرہ دنوں کے بعد واپس آجاؤ گے اور اتنا ہی نہیں بلکہ تمہاری ٹوٹی ہوئی ٹانگ بھی صحیح ہو جائے گی۔''

نفیس اس کے بعد کیا پوچھتا، خاموشی اختیار کر گیا۔ اب جو مقدر میں ہو وہ سامنے تو آنا ہی تھا۔

☆☆☆

فروزاں اس گھر میں ساجدہ، نیلم اور شاہین کے ساتھ رہ رہی تھی۔

یہ پورا گھرانا بہت ہمدرد اور پرخلوص تھا۔ انہوں نے فروزاں کو اپنوں کی طرح اپنے سینے سے لگا لیا تھا اور ایک بار بھی اس کا پس منظر جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔

رفتہ رفتہ اس کی خوبیاں سامنے آتی جا رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں بے پناہ ذائقہ تھا۔ بہت اچھے کھانے بنایا کرتی۔ اس نے بتایا تھا کہ اس نے باقاعدہ کوکنگ سیکھ رکھی ہے۔

وہ بہت پڑھی لکھی بھی تھی۔ اس کی انگلش بہت اچھی تھی۔ اس نے نیلم اور اس کے بھائی شاہین کو پڑھانا بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے ان لوگوں کے لیے سودمند ثابت ہو رہی تھی۔

نیلم اس سے بہت زیادہ مانوس ہو گئی تھی۔ وہ اپنی ہر بات اس سے شیئر کیا کرتی۔ ایک دن اس نے فروزاں کو بتایا۔ ''فروزاں باجی۔ آج کل میں بہت پریشان ہوں۔''

''وہ کیوں؟''

''فروزاں باجی۔ اس محلے کا ایک غنڈا ہے جو مجھے تنگ کرتا رہتا ہے۔'' نیلم نے بتایا۔ ''کل اس نے مجھے دھمکی بھی دی ہے کہ اگر میں نے اس سے دوستی نہیں کی تو وہ مجھے اٹھوا لے گا۔''

''بے وقوف لڑکی۔ ایسی بات ہو گئی اور تم چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔'' فروزاں نے کہا۔ ''اب ایک کام کرو۔ تم خالہ کو کچھ مت بتانا۔ تم بس دور سے مجھے اس کی شکل دکھا دینا۔''

''ارے نہیں فروزاں باجی۔'' نیلم جلدی سے بولی۔ ''وہ ایک خطرناک آدمی ہے۔''

''تم اس کی پروا مت کرو۔ بھروسا کرو۔ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔''

''تو پھر شام کو چلیں۔ آپ اس کو خود دیکھ لیجیے گا۔''

''بلکہ ایک کام اور کرو۔'' فروزاں نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''تم اس سے اکیلے جا کر ملو۔''

''کیسی بات کر رہی ہیں فروزاں باجی، میں اس سے اکیلے ملوں؟''

''بات تو سنو۔ تم اس سے کہو کہ تمہیں ساحل کی سیر کرنی ہے اور تم نے ولیج ریسٹورران تو دیکھا ہوگا نا۔''

''ہاں، ہاں۔ وہ تو بالکل آخر میں ہے۔'' نیلم نے کہا۔

''بس۔ اس سے بھی کچھ آگے لے جانا اس کو اور تم ذرا بھی فکر مت کرنا۔ میں تمہارے آس پاس ہی رہوں گی۔''

''لیکن خود آپ کیسے پہنچیں گی؟''

نیلم نے کہا۔ ''میں تم سے پہلے وہاں پہنچی ہوں گی۔ تم میری فکر مت کرو۔ اور مجھ پر بھروسا رکھو۔ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔'' فروزاں کے حوصلہ دلانے پر نیلم کو بھی حوصلہ ہو گیا۔

اس نے وہی کیا جو فروزاں نے اس سے کہا تھا۔ اس کی جب اس غنڈے ہاشو سے ملاقات ہوئی تو اس نے بھرپور اداکاری کا مظاہرہ کیا۔

''دیکھو ہاشو، میں اس محلے میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی۔ خوامخواہ بدنام ہو جاؤں گی۔''

''تو پھر کہاں لے چلوں تم کو؟''

پھر نیلم نے تجویز پیش کی۔ ''کیوں نہ ہم ولیج سے آگے کی طرف نکل جائیں، اس طرف لوگوں کا آنا جانا بھی بہت کم ہوتا ہے۔ ہم بہت اطمینان سے باتیں کرسکیں گے۔''

ہاشو تو اس تجویز پر خوش ہی ہو گیا تھا۔ ''بالکل ٹھیک۔ تو پھر کل کس وقت؟''

''پانچ بجے شام۔''

ہاشو نے بتا دیا کہ وہ پانچ بجے شام کو کہاں مل سکے گا۔

نیلم جس وقت ہاشو کے پاس پہنچی، اس وقت وہ خوف سے کانپ رہی تھی۔

''چلو وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔'' ہاشو نے ایک طرف اشارہ کیا۔

''نہیں، نہیں، میں یہیں ٹھیک ہوں۔'' نیلم خود کو سمیٹتے ہوئے بولی۔

''پاگل ہو گئی ہو۔ یہاں کون سی بیٹھنے کی جگہ ہے آؤ۔''

ہاشو نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور ٹھیک اسی وقت فروزاں کسی طرف سے نکل کر سامنے آ گئی۔ ''ارے بابا۔ کیا ہو رہا ہے یہ سب۔'' اس کے انداز میں بہت بے پروائی تھی۔

''کون ہو تم؟'' ہاشو نے نیلم کا ہاتھ چھوڑ کر پوچھا۔

''یہ جو لڑکی ہے نا، یہ میری چھوٹی بہن ہے۔'' فروزاں نے بتایا۔ ''اور میں اس لیے اس کی نگرانی کرتے ہوئے یہاں تک آئی ہوں تاکہ تمہاری زیادہ بے عزتی نہ ہو۔''

"کیا بکواس کررہی ہے۔" ہاشو دہاڑا۔ "جانتی ہے، میں کون ہوں؟"

"ہاں، جانتی ہوں۔" فروزاں نے حقارت سے کہا۔ "نیلم کالونی کی گلیوں کا کتا۔"

ہاشو نے جھلا کر فروزاں پر حملہ کردیا لیکن اس کی حسرت اس کے دل ہی میں رہ گئی تھی۔ نیلم آنکھیں پھاڑے اس جنگ کو دیکھ رہی تھی۔

فروزاں نے ذرا سی دیر میں ہاشو کو مار مار کر نڈھال کردیا تھا۔ فلائنگ ککس، گھونسے، نہ جانے کس کس انداز سے وہ ہاشو کی ٹھکائی کررہی تھی۔ ہاشو زیادہ دیر اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہ سکا تھا۔

☆☆☆

نفیس کو جہاں لے جایا گیا تھا، وہ ایک عجیب جگہ تھی۔ اونچے درختوں کے درمیان مٹی کے گھر بنے ہوئے لیکن ایک ترتیب اور سلیقے کے ساتھ۔ درمیان میں ایک بڑا سا معبد جس کو وہ اوم کلوکلو کا گھر کہتے تھے۔ وہ پراسرار لوگ اس گھر میں اپنا گیان اور دھیان کیا کرتے تھے۔

نفیس کو بہت عزت اور احترام کے ساتھ وہاں پہنچایا گیا تھا۔ بڑا پجاری بہت اچھی انگریزی جانتا تھا اس لیے نفیس کو ان سے باتیں کرنے میں آسانی ہوگئی تھی۔ اس کے علاوہ کاسی اس کے ساتھ ہی تھی۔

پجاری نے پہلے تو اس کی ٹانگ کا پلاسٹر کھولا۔ پھر نہ جانے کس تیل کی مالش کی گئی۔ ایک ہی مالش کے بعد نفیس کو اچھا خاصا آرام محسوس ہونے لگا تھا۔

کھانے کے طور پر اسے پھلوں کا عرق دیا گیا تھا اور نفیس کے پوچھنے پر پجاری نے بتایا۔ "مہمان، ان پندرہ دنوں تک تمہیں صرف پھلوں کے عرق دیے جائیں گے۔ تم اناج استعمال نہیں کرو گے۔"

"وہ کیوں؟"

"اناج تمہارے ذہن اور تمہاری روح کو بوجھل کردیتے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "تم کو ریاضت کے دوران بہت ہلکا پھلکا رکھنا ہے۔"

"لیکن جناب۔ میں کیوں ان چکروں میں پڑوں۔ میں تو ایک سیدھا سادا جہاز راں ہوں۔ مجھے ان باتوں سے کیا لینا دینا۔"

"اس لیے کہ یہ سعادت تمہارے مقدر میں ہے۔" پجاری نے کہا۔ "ہم لاکھوں کروڑوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس سے ریاضت کروائی جاتی ہے اور جب وہ واپس جاتا ہے تو اس کے پاس ایسی قوت آچکی ہوتی ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔"

نفیس نے جان لیا تھا کہ ان لوگوں سے اس کی جان نہیں چھوٹ سکتی اس لیے اس نے خود کو ان کی مرضی کے حوالے کردیا۔

اس کی تربیت اور ریاضت کا مرحلہ شروع ہوگیا۔

بہت ہی خطرناک قسم کی تربیت تھی۔ رات رات بھر کا مراقبہ، جسم و روح کی پریکٹس اور نہ جانے کیا کیا۔ اسے صرف جوس دیا جاتا۔ وہ بھی چوبیس گھنٹوں میں صرف دوبار۔

شروع شروع میں اسے ایسی دقت ہوتی کہ اس کا جی چاہتا کہ یہ سب چھوڑ کر بھاگ جائے لیکن صرف ایک ہفتے بعد اسے لطف آنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹنے لگے تھے۔ وہ کچھ اور ہوتا جارہا ہو۔ وہ جسمانی طور پر تو کمزور ہورہا تھا لیکن اس کے وجود میں توانائی کا خزانہ جمع ہوتا جارہا تھا۔ ٹھیک پندرہ دنوں کے بعد اسے کاسی نے خبر سنائی۔ "مسٹر نفیس۔ تمہاری تربیت مکمل ہوچکی ہے۔ اب تم اپنے وطن واپس جاسکتے ہو۔"

پجاری بھی اسے مبارکباد دینے اس کے پاس آگیا۔ "مسٹر نفیس۔ اب تم پر آنند کے دروازے کھل چکے ہیں۔"

نفیس کو وہ لوگ خود ہی ڈربن چھوڑ آئے تھے۔

یہاں اس نے پہلی بار اپنی اس قوت کا مظاہرہ بھی دیکھ لیا۔ اس نے ایک آدمی کو دیکھا جو چند لمحوں بعد ہارٹ فیل سے مرنے والا تھا۔

وہ آدمی اس کی جہاز راں کمپنی کے دفتر میں موجود تھا۔

اس کی طویل باتوں نے نفیس کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

وہ فخریہ انداز میں بتا رہا تھا کہ اس کے پاس جو گھوڑے ہیں۔ پوری دنیا میں ان کا جواب نہیں ہے۔ اور اسے امید ہے کہ ڈربن میں ہونے والی ریس میں اسی کے گھوڑے ساری پوزیشن لے جائیں گے۔

نفیس تجربے کے طور پر اپنی آنکھیں بند کرکے اس کے چہرے کو اپنے دھیان میں لایا تو اس نے اس شخص کو اسی دفتر کی اسی کرسی پر مردہ حالت میں دیکھا جس پر وہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بوکھلا کر اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس نے سوچا کہ وہ سب کو بتادے۔ پھر یہ خیال آیا کہ ہوسکتا ہے ایسا نہ ہو لیکن ٹھیک دو منٹ کے بعد ایسا ہی ہوا۔ اس آدمی کو دل کا دورہ پڑا اور وہ اس کرسی پر بیٹھے بیٹھے مرگیا۔

☆☆☆

خرم اور شاہ بانو نے ایک دن یہ فیصلہ کرلیا کہ اب انتظار

فضول ہے۔ ان دونوں کو اپنے والدین سے شادی کی بات کرلینی چاہیے۔

"ٹھیک ہے جناب۔ میں بابا سے بات کرتا ہوں۔" خرم نے کہا۔

خرم نے جس وقت نفیس سے یہ بات کی۔ اس وقت نفیس اپنے لان میں پودوں کو پانی دینے میں مصروف تھا۔ خرم کی اس بات پر اس نے پائپ ایک طرف رکھتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

خرم بے چینی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا بابا نہ جانے کیا کرنے لگا تھا۔ چند لمحوں بعد نفیس نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بہت الجھا ہوا اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

"کیا ہوا بابا۔ خیریت تو ہے نا؟" خرم نے پوچھا۔

"بیٹے۔ اب کیا بتاؤں، میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔" نفیس نے کہا۔ "میں تو پریشان ہوگیا ہوں۔"

"کچھ تو بتائیں۔"

"تم لوگوں نے یہ دیکھا ہوگا کہ میں کسی کے بارے میں جو کہتا ہوں وہ پورا ہوجاتا ہے۔"

"ہاں۔ ہم کئی بار دیکھ چکے ہیں۔ اور ہمیں آپ کی اس قوت سے خوف بھی محسوس ہوتا ہے۔" خرم نے اعتراف کیا۔

"بیٹے۔ اسی قوت نے مجھے یہ بتایا ہے کہ شادی کے ایک مہینے بعد تمہاری بیوی مرجائے گی۔" نفیس نے بتایا۔

"کیا......!" خرم یہ سن کر سکتے میں رہ گیا۔ "بابا۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں بیٹا۔ ایسا ہی ہونے والا ہے۔" نفیس نے کہا۔ "بیوی مرجائے گی، صرف ایک مہینے بعد۔"

نفیس کی اس پیش گوئی نے اس گھر میں ایک کہرام سا برپا کردیا تھا۔ نفیس کی بیوی، خرم کی ماں نے ایک ہنگامہ مچا کر رکھ دیا۔ "یہ کیسی بدفال نکالی ہے آپ نے۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔"

"افشاں، تم یہ اچھی طرح جانتی ہو کہ میں اس قسم کی کئی باتیں کہہ چکا ہوں اور وہ سچ ثابت ہوتی رہی ہیں۔"

"ہم خدا کا نام لے کر شادی کردیتے ہیں۔" افشاں نے کہا۔ "کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

"نہیں ماما۔ میں شاہ بانو کی زندگی کے ساتھ کوئی رسک نہیں لے سکتا۔" خرم جلدی سے بولا۔ "یہ میں کیسے گوارا کرسکتا ہوں کہ میری بیوی بنتے ہی اسے موت آجائے۔"

"کاش...... کاش۔ مجھ میں ایسی کوئی صلاحیت نہیں ہوتی۔" نفیس نے ایک گہری سانس لی۔ "اب احساس ہورہا ہے کہ بے خبری کتنی بڑی نعمت ہے۔"

"ماما۔ میں شاہ بانو کو ساری سچویشن بتادیتا ہوں۔" خرم نے کہا۔ "اگرچہ اس وقت میرا دل رو رہا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ ساری زندگی گزارنے کا خواب دیکھا تھا۔ لیکن اب...... اب مجھے اس سے الگ ہونا ہی پڑے گا۔ اس کی خاطر ورنہ اسے کچھ ہوگیا تو میں زندگی بھر خود کو معاف نہیں کرسکوں گا۔"

خرم نے جب شاہ بانو کو یہ بتایا تو وہ بھڑک اٹھی۔ "یہ کیا حماقت ہے۔ اس دور میں بھی تم ایسی باتوں پر یقین رکھتے ہو؟"

"شاہ بانو میں اس لیے یقین رکھتا ہوں کہ میں نے بابا کی یہ صلاحیتیں کئی بار دیکھی ہیں۔" خرم نے بتایا۔ "وہ جو کہتے ہیں، وہ ہوجاتا ہے۔"

"میں اس بات کو نہیں مانتی۔ اس کی کوئی لاجک نہیں ہے۔"

"میں نہیں جانتا کہ اس کی کوئی لاجک ہے یا نہیں۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ایسا ہی ہوتا ہے۔" خرم نے بتایا۔

"اچھا چلو۔ کیا وہ میرے سامنے اپنی اس صلاحیت کا مظاہرہ کسی اور طرح کرسکتے ہیں؟" شاہ بانو نے پوچھا۔

"کیوں کہہ رہی ہو ایسا؟" خرم نے کہا۔

"اس لیے کہ تمہارا یہ بھونڈا بہانہ مجھ سے ہضم نہیں ہورہا۔ اپنے بابا سے کہو کہ وہ اس قسم کا مظاہرہ کرکے مجھے بتائیں تب شاید مجھے یقین آجائے گا۔"

خرم نے جب نفیس سے یہ بات کی تو نفیس ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "بے وقوف لڑکی ہے۔ مگر اپنی جگہ بالکل صحیح بھی ہے۔ کس کو یقین آئے گا۔" نفیس نے کچھ دیر بعد اپنی بند آنکھیں کھول دیں۔ "بیٹا۔ جاؤ شاہ بانو سے کہہ دو کہ وہ کل رات اپنے کمرے میں نہ گزارے۔ اس کے کمرے کے ساتھ ایک حادثہ پیش آنے والا ہے۔ اگر وہ اس کمرے میں رہی تو خود اس کو بھی نقصان پہنچے گا۔"

خرم نے جب شاہ بانو سے یہ کہا تو وہ بہت دیر تک ہنستی رہی۔ "خدا کے بندے۔ کیا ہوگیا ہے تمہارے بابا کو؟ وہ کس قسم کی باتیں کرنے لگے ہیں۔ خود سوچو کمرے کے ساتھ کیا ہوسکتا ہے؟"

"شاہ بانو پلیز۔ خدمت کرو۔ مان لو۔ تمہارا کیا نقصان ہوگا اگر ایک رات تم اپنے کمرے میں نہ گزارو۔" خرم نے کہا۔ "ایک ہی رات کی تو بات ہے۔ اگر تمہارا دل نہیں مان رہا تو میرے کہنے پر ایسا کرلو۔"

"مجھے یقین تو نہیں ہے لیکن تمہاری خاطر یہ بھی کرلوں گی۔"

اور دوسری رات اس کمرے کے ساتھ ایک حادثہ پیش آچکا تھا۔ ایک بے قابو ٹرک نے پہلے تو لان کی دیوار توڑی۔ پھر

اس دیوار کو ٹکر ماردی جو دیوار شاہ بانو کے کمرے کی تھی۔ یہ کمرا لان کی طرف تھا اس لیے ٹرک سیدھا اس کمرے میں گھس گیا تھا۔

اس ٹرک سے کمرے کی دیواریں گر گئی تھیں اور پوری چھت نیچے آ گئی تھی۔

☆☆☆

فروزاں نے ایک رات ساجدہ سے کہا۔ ”خالہ! آپ نے ابھی تک نہیں پوچھا کہ میں کون ہوں، کیا ہوں..... بس اپنے سینے سے لگا کر رکھ لیا۔“

”ضرورت ہی کیا تھی۔“ ساجدہ نے کہا۔ ”تم جب مناسب سمجھتیں تو خود ہی بتا دیتیں۔“

”اس لیے میں بتا رہی ہوں۔“ فروزاں اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ”میری کہانی میری بدنصیبی کی کہانی ہے خالہ۔ میرا تعلق ایک اچھے گھرانے سے ہے۔ میرے ماں باپ بہت اچھے تھے، روشن خیال اور مجھ سے بے پناہ پیار کرنے والے۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔

”انہوں نے مجھے بہت اچھی تعلیم دلوائی۔ مارشل آرٹ میرا بچپن کا شوق تھا۔ میں نے باقاعدہ اس کی ٹریننگ لی۔ پھر وہی ہوا جو ہوا کرتا ہے۔ یعنی اچھے لوگ زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہتے، وہ بھی نہیں رہے اور ایک حادثے میں دونوں مر گئے۔ میں اس بھری دنیا میں تنہا رہ گئی۔ اور اس وقت مجھے پتا چلا کہ بدنصیبی کیا ہوتی ہے۔ میرے والدین کے پاس اپنا مکان تھا گاڑی تھی جو ظاہر ہے میرے پاس آ گئی۔

زندہ رہنے کا ہر وسیلہ تھا میرے پاس سے لیکن ماں باپ نہیں تھے اور میں اس بے رحم دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔ اس لیے پہلے مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ خاندانی سازشیں کیا ہوتی ہیں۔ لالچ انسان کو کتنا بے رحم بنا دیتا ہے۔

نہ جانے کہاں کہاں سے رشتے دار آنے شروع ہو گئے۔ اپنا حق جتانے کے لیے۔ جیسے میری کوئی حیثیت نہیں تھی، جو کچھ تھے بس وہی تھے۔

لیکن میں ان کے سامنے کسی دیوار کی طرح جم کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس وقت ایک نوجوان نے مجھے سہارا دیا۔ وہ اسی محلے کا ایک شریف نوجوان تھا، تابش۔ میں نے کسی زمانے میں اس سے ٹیوشن پڑھی تھی۔ اس کے والدین سفید پوش لوگ تھے۔

مختصر یہ کہ تابش نے میرا ساتھ دینا شروع کر دیا اور ... میں نے یہ اعلان کر دیا کہ میں تابش سے شادی کرنے جا رہی ہوں۔ میرے اس اعلان میں خود تابش اور اس کے گھر والوں کی مرضی بھی شامل تھی۔ میرا یہ اعلان ہی اس بے چارے کی موت کا سبب بن گیا۔ اور میرے بے رحم رشتے داروں نے اس کا خون کروا دیا۔“ فروزاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

”لعنت ہو ایسے لوگوں پر۔“ ساجدہ نے کہا۔

”جی خالہ! وہ مر گیا اور میں پھر تنہا ہو گئی۔ اب تو میرا ساتھ دینے والا بھی کوئی نہیں رہا۔ پھر خاندان ہی کے ایک صاحب نے اپنے دو کوڑی کے صاحب زادے کو میرے سامنے پیش کر دیا کہ میں اس سے شادی کر لوں۔ وہ ایک نکارہ اور اوباش قسم کا نوجوان تھا۔ میں نے انکار کر دیا۔“

”اچھا کیا تم نے۔“ ساجدہ نے کہا۔

”خالہ۔ اس کے بعد ہی مجھ پر قاتلانہ حملے شروع ہو گئے۔ میرا مارشل آرٹ کا ہنر گولیوں کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا۔ میں دو بار بال بال بچی لیکن تیسری بار مجھے ایک گولی لگ ہی گئی جس کے بعد میں کئی ہفتوں تک بستر پر رہی۔ اس حادثے کو ڈکیتی کا نام دے دیا گیا کہ کسی راہزن نے مجھے مارنے کی کوشش کی تھی لیکن میں جانتی ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔“

”لیکن بیٹا۔ تمہاری موت کے بعد ان کم بختوں کا فائدہ کیا ہوتا؟“ ساجدہ نے پوچھا۔

”وہ میری موت کے بعد قانونی طور پر میری جائداد اور دولت کے وارث ہو سکتے تھے۔“ فروزاں نے بتایا۔ ”خالہ پھر اس کے بعد یہ ہوا کہ مجھے اس دنیا اور اس زندگی سے ہی وحشت ہو گئی۔ یہ کیسی بے رحم دنیا ہے۔“

”لعنت بھیجو سب پر۔“ ساجدہ نے کہا۔ ”اب تم ہماری بچی ہو۔“

”اس میں کیا شک ہے خالہ۔ آپ ہی لوگ ہیں ہمارے لیے۔“

ساجدہ کو اس پر پہلے بھی پیار آتا تھا۔ اب اس کی کہانی سن لینے کے بعد اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اس لڑکی کو اب اپنے گھر سے نہیں جانے دے گی۔ اپنے ہاتھوں سے اس کی شادی کرے گی۔

☆☆☆

نفیس سمندر سے مخاطب تھا۔

اس کے ساتھ یہی ہوا کرتا۔ جب بھی وہ ڈپریس ہوتا تو سمندر کنارے آ کر کھڑا ہو جاتا اور سمندر سے باتیں کرتا رہتا۔ اس وقت بھی وہ سمندر سے باتیں کر رہا تھا۔

”خود سوچو۔ ایسی پراسرار صلاحیت کو پانے کے بعد میں کتنے عذابوں میں آ گیا ہوں، میں کیا نہیں جانتا؟ اپنے بارے میں، اپنی بیوی کے بارے میں اور اپنے بیٹے کے

بارے میں۔

میں خود اپنے بیٹے کی خوشیوں کی راہ میں دیوار بن گیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ شادی کے بعد اس کی بیوی کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

آخر یہ جان لینے کا عذاب میں کب تک برداشت کرتا رہوں۔

میرے خدا! مجھ سے میری صلاحیت واپس لے لے۔ مجھ میں اتنا ظرف نہیں ہے۔ میں برداشت نہیں کر پاتا۔ میں دوسروں کے بارے میں نہیں جاننا چاہتا۔ میں ایک کمزور انسان ہوں، بہت کمزور۔“

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بہت دیر سے سمندر کو دیکھتا رہا تھا۔ اس لیے اس کی بند آنکھوں کے پیچھے سمندر ہی لہریں لے رہا تھا۔ اس کے تصور میں حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا سمندر تھا۔ پھر اس سمندر نے ایک کروٹ لی۔ لہریں بلند ہوئیں اور تیزی سے نیچے آتی چلی گئیں۔ ان لہروں کی آغوش میں کسی کا جسم ہلکورے لے رہا تھا۔ وہ کسی لاش کی طرح تھا۔ پھر لہریں اس جسم کو اچھالتی ہوئی ساحل تک لے آئیں اور ایک طرف پھینک دیا۔ نفیس کے پیروں کے پاس۔ اس نے بوکھلا کر آنکھیں کھولیں۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے ساحل پر آوارہ گردی کرتے کچھ لوگوں اور سامنے پھیلے ہوئے سمندر کے۔ اور کچھ بھی نہیں تھا۔

نفیس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یہ کون ہو سکتا تھا؟

اسے ایسا منظر دکھانے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا ایسا کوئی واقعہ رونما ہونے والا ہے؟ لیکن کب...... اس کی خفیہ صلاحیت نے یہ نہیں بتایا تھا۔ وہ کچھ دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ شاید ایسی کوئی بات ہو جائے۔ شاید لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔

پھر دوسرے دن بھی کچھ نہیں ہوا۔

البتہ تیسری شام جب اس نے دھیان دیا تو اس بار لہروں نے اس جسم کو واضح کر دیا تھا۔ وہ عورت تھی بلکہ لڑکی...... اور نفیس اس چہرے کو پہچان گیا تھا، وہ شاہ بانو تھی۔

☆☆☆

خرم اور شاہ بانو ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔

ان دونوں کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ اور شاید کچھ بھی نہیں تھا۔ نفیس کی پیش گوئی حیرت انگیز طور پر سچ ثابت ہوئی تھی اور اس سچ نے دونوں ہی کو آئندہ کے لیے خوفزدہ کر دیا تھا۔

”خرم۔ آخر یہ سب کیا ہے۔“ شاہ بانو نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”پہلے تو میں نے اس پر یقین نہیں کیا تھا لیکن اب یقین آتے ہی خوفزدہ ہو گئی ہوں۔“

”میرا بھی یہی حال ہے شاہ بانو۔“ خرم دھیرے سے بولا۔

”سنو۔ میں یہ جان لینے کے باوجود تم سے شادی کے لیے تیار ہوں۔“ شاہ بانو نے کہا۔ ”موت تو ایک لازمی امر ہے۔ وہ تو آنی ہے۔ چاہے ایک مہینے کے بعد آئے یا بیس سال بعد آئے۔ مرنا تو ہے تو کیوں نہ اپنی محبت کی تکمیل کر کے مرا جائے۔“

”نہیں شاہ بانو۔ میں یہ نہیں کر سکتا۔“ خرم نے کہا۔ ”ابھی تم نے زندگی میں دیکھا ہی کیا ہے اور تمہارا کیا خیال ہے کہ تمہاری موت کے بعد میں آرام سے رہ سکوں گا۔ نہیں، ایسا نہیں ہو سکے گا۔ میں بھی بے چین رہوں گا زندگی بھر کے لیے۔“

”تو پھر کوئی راستہ نکالو خرم۔“

”میں کیا راستہ نکال سکتا ہوں۔“ خرم نے کہا۔

”تم اپنے بابا سے کیوں نہیں پوچھتے؟ ان سے معلوم کرو شاید وہ کچھ بتا سکیں۔ شاید وہ جانتے ہوں کہ درمیان کی کوئی راہ نکالی جا سکتی ہو۔“

”چلو، دونوں ساتھ چلتے ہیں۔“ خرم نے مشورہ دیا۔ ”ہو سکتا ہے ہم دونوں کی صورتِ حال دیکھ کر وہ ہماری خاطر گیان اور دھیان میں جا کر کوئی راستہ نکال سکیں۔ کوئی بات ان کے ذہن میں آ جائے۔“

دونوں نفیس کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ ان دونوں کو دیکھ کر نفیس کے ہونٹوں پر ایک غمناک سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

”انکل! پلیز، ہمارے لیے کوئی راستہ نکالیں۔“ شاہ بانو نے کہا۔

”بیٹا۔“ نفیس کی آواز لرز رہی تھی۔ ”کیا راستہ نکالوں؟ مقدر ہمارے لیے کبھی کبھی بہت بے رحم ہو جاتا ہے۔“

”بابا۔ پھر بھی! ہر مشکل کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوتا ہے۔“ خرم نے کہا۔ ”سوچیں بابا۔“

نفیس نے آنکھیں بند کر لیں۔

دونوں اسی کی اولاد تھی۔ خرم تو خیر اس کا ہی بیٹا تھا لیکن وہ شاہ بانو سے بھی محبت کرتا تھا۔ وہ بہت اچھی تھی۔ بہت پرخلوص لیکن کیا کیا جائے۔ وہ اس کے بیٹے کے مقدر ہی میں نہیں تھی۔

اور اچانک ہی ایک راستہ نکل آیا۔

یہ راستہ اس طرح نکلا تھا جیسے اندھیرے میں روشنی کی کوئی کرن پھوٹ پڑے۔ یہ راستہ پہلے اس کی سمجھ میں کیوں نہیں آیا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اب اس کے ہونٹوں پر ایک اطمینان بھری مسکراہٹ تھی۔

"کیا ہوا بابا؟" خرم نے بے تابی سے پوچھا۔ "کچھ سمجھ میں آیا۔"

"ہاں بیٹا۔ ایک راستہ تو ہے لیکن بہت بے رحمانہ۔" اس نے کہا۔ "اس راستے پر چلنے کے لیے ہمیں خود غرض بننا ہوگا۔"

"بتائیں انکل۔ کیا راستہ ہے۔" شاہ بانو بھی بے چین ہونے لگی تھی۔

"وہ راستہ یہ ہے کہ خرم کی شادی کسی اور لڑکی سے کرائی جائے۔" نفیس نے کہا۔ "میرے گیان اور علم کے مطابق اس کی پہلی بیوی کو موت آجائے گی۔ اس کے بعد اس کی شادی تم سے ہوسکتی ہے۔ پھر کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔"

"یعنی ہم اس لڑکی کو ٹوٹکے کے طور پر استعمال کریں گے؟" خرم نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا۔ یہ مقدر ہے۔" نفیس نے گہری سانس لی۔ "تمہاری پہلی بیوی کی قسمت میں موت لکھی ہے۔"

☆☆☆

اس دن پہلی بار فروزاں کو احساس ہوا کہ وہ چاہے کچھ بھی کرلے وغیرا اپنے نہیں ہوسکتے۔ نیلم نے اس کا دل توڑ کر رکھ دیا تھا۔

ایک شام اس نے نیلم کو قریب کے ایک ریستوران میں ایک ایسے نوجوان کے ساتھ دیکھ لیا جس کے بارے میں فروزاں کی رائے اچھی نہیں تھی۔ وہ ایک لوفر قسم کا نوجوان تھا۔ نیلم نے فروزاں کو نہیں دیکھا تھا۔

نیلم کی واپسی بہت دیر بعد ہوئی تھی۔ فروزاں اسے اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔ "میرے ساتھ آؤ۔ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"جی باجی!" وہ اس کے ساتھ کمرے میں آگئی۔

"میں نے کل تمہیں ایک ایسے لڑکے کے ساتھ دیکھا ہے کہ مجھے افسوس ہونے لگا کہ تم کس کے چکر میں ہو۔"

"باجی۔ کیا آپ میرا پیچھا کرتی رہتی ہیں۔" نیلم نے پوچھا۔

فروزاں کو اس کا لہجہ اجنبی سا محسوس ہوا۔ یہ اس نیلم کا لہجہ تو نہیں تھا جس کے ساتھ وہ رہتی آئی تھی اور جس کو اس نے اپنی چھوٹی بہن سمجھ رکھا تھا۔ یہ تو شاید کوئی اور اجنبی لڑکی تھی۔

"نیلم۔ میں نے تمہارا پیچھا نہیں کیا۔ میں نے اتفاقاً تمہیں کسی کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔"

"دیکھیں نیلم باجی۔ یہ میرا اپنی ذاتی معاملہ ہے۔" نیلم نے کہا۔ "آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ ہمارے معاملات میں دخل دیں۔"

"یہ حق مجھے اس گھر اور تم لوگوں نے دیا ہے۔"

"اماں نے دیا ہوگا۔" نیلم بے پروائی سے بولی۔ "میرا معاملہ اور ہے۔ پلیز! اپنے کام سے کام رکھا کریں۔"

اس وقت فروزاں کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ اس گھر اور ان لوگوں کے لیے غیر ہے۔ اگر نیلم کی جگہ اس کی اپنی چھوٹی بہن ہوتی تو وہ اس کا منہ توڑ کر رکھ دیتی لیکن افسوس وہ کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی۔

پھر بھی اس نے ساجدہ کو یہ بات بتا ہی دی۔

وہ یہ سب سن کر ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر اس نے تیز لہجے میں کہا۔ "فروزاں۔ میں نے تمہیں اپنی بیٹی سمجھا ہے۔ تم نیلم کی بڑی بہن ہو۔ تو کیا یہ تمہارا فرض نہیں تھا کہ اسی وقت بالوں سے گھسیٹتے ہوئے یہاں لے آتیں۔"

"خالہ! میں نہیں چاہتی تھی کہ محلے میں کسی قسم کا ہنگامہ ہو۔" فروزاں نے کہا۔ "آپ نیلم کو سمجھا دیں کہ وہ اس سے نہ ملے۔ اگر میں نے آئندہ سے دونوں کو ایک ساتھ دیکھ لیا تو نیلم کو تو ماروں گی ہی۔ اس لڑکے کی بھی ہڈیاں توڑ کر رکھ دوں گی۔ اور یہ بات نیلم بھی جانتی ہے کہ میں ایسا کرسکتی ہوں۔"

جب نیلم کو یہ سب معلوم ہوا تو اس نے ایک ہنگامہ کھڑا کرکے رکھ دیا تھا۔

"اماں آپ نے اپنی اولاد کو ایک طرف رکھ دیا اور کسی اور کو اپنے سر آنکھوں پر بٹھا رہی ہیں۔ اس کی ہر بات مان رہی ہیں۔ اس کو اختیار دے دیا ہے کہ وہ میرے ساتھ جو جی چاہے کرے۔"

"ہاں۔ اور یہ سب اس لیے کیا ہے کہ وہ تم سے زیادہ اس گھر کی ہمدرد ہے۔" ساجدہ نے کہا۔ "تم سے زیادہ سمجھدار ہے۔ وہ تمہیں سچائی اور بھلائی کا راستہ دکھا رہی ہے۔"

"رہنے دو اماں۔ وہ تمہیں مجھ سے الگ کردینا چاہتی ہے۔"

نیلم غصے سے اپنے کمرے میں آگئی۔ اسے اپنی ماں سے زیادہ فروزاں پر غصہ تھا۔ وہ ایک بے سہارا لڑکی تھی جو خودکشی کرنے جارہی تھی اور اس کی ماں اسے اپنے پاس لے آئی تھی اور وہی بے سہارا لڑکی اب اس گھر کی مالک بن کر بیٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

شاہ بانو پر ایک بات واضح ہوگئی تھی کہ موت خرم کی پہلی بیوی کے نصیب میں ہے اور جب وہ خرم کی دوسری بیوی بن کر اس کے گھر میں جائے گی تو پھر سب ٹھیک ہوجائے گا۔

شاہ بانو کو اب ایک ایسی لڑکی کی تلاش تھی، جس کا دامن خرم کے ساتھ باندھ سکے۔ لیکن ایسی لڑکی کہاں سے لائی جاتی؟ اس نے جب اس بارے میں خرم سے بات کی تو وہ بھڑک اٹھا۔ "نہیں شاہ بانو۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔ ہم کیوں کسی کو جانتے بوجھتے ہوئے موت کے منہ میں دھکیل دیں۔"

"خرم۔ تم شاید ایک اور پہلو پر غور نہیں کررہے ہو۔" شاہ بانو نے کہا۔

"اور وہ پہلو کون سا ہے؟"

"بہت سامنے کا ہے۔" شاہ بانو نے کہا۔ "فرض کرو۔ اگر تم اس طرح سوچتے رہے کہ شادی کے بعد تمہاری پہلی بیوی مرجائے گی تو پھر کیا ہوگا۔ پھر تو تم ساری زندگی کسی سے شادی نہیں کروگے۔"

"یہ بات نہیں۔ کم از کم تم سے تو نہیں کروں گا۔"

"تم جس سے بھی کرو۔" شاہ بانو نے کہا۔ "وہ بھی ایک جیتی جاگتی حقیقت ہوگی۔ جس کو تم شادی کے بعد ایک لاش میں تبدیل ہوتا ہوا دیکھ لوگے۔"

"تو پھر بتاؤ کیا کروں میں؟"

"شادی کرلو۔" شاہ بانو نے مشورہ دیا۔ "کسی لڑکی کو اپنی پہلی بیوی بنالو۔ اس کے بعد مجھ سے شادی کرلینا۔ تمہارے بابا نے بھی یہی کہا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن ایسی لڑکی کہاں سے لاؤں۔ کہاں سے تلاش کروں؟"

"بے فکر رہو۔ میں نے ایسی لڑکی تلاش کرلی ہے۔" شاہ بانو نے بتایا۔ "تمہیں یاد ہے۔ میں ایک بار تمہارے ساتھ نیلم کالونی اپنی استانی ساجدہ کے گھر گئی تھی۔" شاہ بانو نے یاد دلایا۔

"ہاں یاد ہے مجھے۔ اوہ اب سمجھا۔ تم شاید ان کی لڑکی کی بات کررہی ہو؟"

"نہیں، لڑکی کی نہیں فروزاں کی بات کررہی ہوں۔" شاہ بانو نے کہا۔ "میں نے یہ بتایا تھا کہ انہوں نے کسی بے سہارا لڑکی کو پناہ دی تھی۔ جو اب ان کے ساتھ ہی رہتی ہے۔"

"ہاں" بتایا تھا تم نے۔"

"میں اسی کی بات کررہی ہوں۔" شاہ بانو نے کہا۔ "میں جب تمہارا رشتہ لے کر جاؤں گی تو مجھے امید ہے کہ نہ تو ساجدہ آنٹی کو اعتراض ہوگا اور نہ ہی اس لڑکی کو۔"

کچھ دیر سوچنے کے بعد خرم نے ہاں کردی تھی۔

☆☆☆

نیلم اور وہ لوفر نوجوان ایک ہوٹل میں بیٹھے تھے۔

ان دونوں کی یہ ملاقات بہت دور ایک ہوٹل میں ہوئی تھی جہاں نیلم کو امید تھی کہ فروزاں اس طرف نہیں آئے گی۔

اس نے محلے ہی میں ذرا سی دیر کے لیے راشد سے مل کر یہ کہہ دیا تھا کہ وہ کل شام فلاں ہوٹل میں پہنچ جائے۔ اس سے بہت ضروری بات کرنی ہے اور نیلم ہی کے کہنے پر یہ ملاقات ہورہی تھی۔

"راشد۔ ہم ایک ہوسکتے ہیں۔" نیلم نے کہا۔ "لیکن ہمارے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔"

"تم حکم دو۔ اس رکاوٹ کو دور کردیتے ہیں۔ کون ہے وہ؟"

"میرے گھر میں جو لڑکی ہے۔ جس کو اماں نے پناہ دی ہوئی ہے۔ اس نے ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کردیے ہیں۔" نیلم نے بتایا۔

"اوہ۔ لیکن تم تو اس سے بہت پیار کرتی ہو۔"

"پیار کرتی تھی لیکن اب نہیں۔ اب اس نے اپنا حق جتانا شروع کردیا ہے۔" نیلم نے بتایا۔ "وہ میری دشمن بنتی جارہی ہے۔ اسی نے اماں کو تمہارے خلاف بھڑکایا ہے کہ تم ایک نمبر کے بدمعاش اور غنڈے ہو۔ محلے میں دو کوڑی کی حیثیت ہے تمہاری۔"

"اس کی تو ایسی کی تیسی۔" راشد بھنا گیا تھا۔ "میں دیکھ لوں گا اس کو۔"

"بہت مشکل ہے۔" نیلم اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ "وہ جوڈو کراٹے کی ماہر ہے۔ اس نے ذرا سی دیر میں ہاشو کو مار مار کر دنبہ بنا دیا تھا۔"

"فکر مت کرو۔ ٹی ٹی اس کے سینے پر رکھ دی نا تو سب جوڈو کراٹے بھول جائے گی۔ اسلحے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔"

"پھر میں ہمیشہ کے لیے تمہاری ہوجاؤں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔" نیلم نے کہا۔

"بس تو مجھے یہ بتادو کہ وہ کس وقت گھر سے نکلتی ہے اور کہاں جاتی ہے۔ اس کے بعد تم میرا کمال دیکھنا۔ ارے تمہارے لیے تو میں کچھ بھی کرسکتا ہوں۔"

☆☆☆

شاہ بانو نے براہ راست فروزاں سے بات کرلی تھی۔

شاہ بانو اکثر اس گھر میں آیا کرتی۔ اس لیے فروزاں سے بھی اس کی دوستی ہوگئی تھی۔ ایک دن شاہ بانو نے اس سے کہا۔ ”فروزاں۔ کیا تم کچھ وقت میرے ساتھ گزار سکتی ہو؟ تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“

شاہ بانو اسے اپنے ساتھ ایک اچھے ہوٹل میں لے آئی تھی۔

”کیا وہ بات ایسی تھی کہ ہم گھر پر نہیں کر سکتے تھے؟“ فروزاں نے پوچھا۔

”ہاں۔“ شاہ بانو نے جواب دیا۔ ”بات ایسی ہی ہے۔“

”ہوں، کیا بات ہے۔ میں سن رہی ہوں۔“

دونوں نے کافی اور سینڈوچ منگوا لیے تھے۔

”دیکھو فروزاں، میں تمہیں زیادہ تو نہیں جانتی اور نہ ہی تمہارے بیک گراؤنڈ سے واقف ہوں لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ تم اچھی بلکہ بہت ہی اچھی لڑکی ہو۔“

”شکریہ تمہارے اس اعتماد کا۔“

”تم یہ بتاؤ۔ کیا تم کہیں انگیج ہو؟“ شاہ بانو نے پوچھا۔

”نہیں تو۔“ شاہ بانو نے ایک گہری سانس لی۔ ”اگر تم میرے بیک گراؤنڈ کے بارے میں کچھ بھی جانتی ہو تو تمہیں یہ معلوم ہوگا کہ میں کن حالات میں اس گھر تک آئی ہوں۔ اس لیے اس طرف دھیان دینے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔“

”اگر میں یہ کہوں کہ میں تمہارے لیے ایک رشتہ لے کر آئی ہوں تو کیا تمہیں حیرت ہوگی؟“

”ہاں حیرت تو ہوگی۔ لیکن یہ ایک عام سی بات ہے۔“ فروزاں نے کہا۔ ”رشتے تو آیا ہی کرتے ہیں لیکن کس کے رشتے کی بات کر رہی ہو؟“

”خرم کے۔“ شاہ بانو نے بتایا۔ ”وہ بہت ہی اچھا ہے۔ بہت محبت کرنے والا۔ بہت خیال رکھنے والا۔ وہ ایسا ہے کہ کوئی بھی لڑکی اسے حاصل کر کے خود کو خوش قسمت محسوس کرے گی۔“

”اگر ایسا ہے تو خود اسے کیوں نہیں حاصل کر لیتیں؟“ فروزاں نے پوچھا۔

”کاش۔ میں اسے حاصل کر سکتی۔“ شاہ بانو نے ایک گہری سانس لی۔ ”لیکن بدقسمتی سے میرے اور اس کے خاندان کے درمیان ایسی دشمنیاں نکل آئی ہیں۔ ایسے مسائل سامنے آگئے ہیں کہ ہم چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے نہیں ہو سکتے۔ اور اگر ہم نے یہ کوشش کی تو نہ جانے کتنے لوگ مارے جائیں گے۔“

”اوہ، یہ تو بہت برا ہے۔“ فروزاں نے کہا۔

”ہاں، اس لیے میں چاہتی ہوں کہ خرم کو بکھرنے سے بچا لوں۔ اسے سمیٹ کر رکھ لوں۔ کوئی ایسا ہو جو اس پر بھرپور توجہ دے۔ اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھے اور یہ کام صرف تم ہی کر سکتی ہو۔“

”تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا کہ میں اس شخص کو سمیٹ سکتی ہوں؟“ فروزاں نے پوچھا۔

”تم کو دیکھنے کے بعد ہی یہ احساس ہو گیا تھا۔“ شاہ بانو نے کہا۔ ”تم میں ایسی خوبیاں ہیں جو مجھے پہلے دن ہی اچھے ہونے کا احساس دلا گئی تھیں۔ تم میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو مجھ میں ہیں اس لیے میں یہ سمجھتی ہوں کہ خرم کے لیے تم سے بہتر انتخاب اور کوئی نہیں ہو سکتا۔“

”تمہارا کیا خیال ہے کہ خرم تمہاری یہ بات مان لے گا؟“

”ہاں مان لے گا۔“ شاہ بانو نے کہا۔ ”کیونکہ میں اس سے کہوں گی۔ پلیز فروزاں! تم بچا لو اس کو۔ وہ بہت ہی اچھا ہے۔ وہ کہیں بھی اپنا رشتہ بھیجے تو اسے قبول کر لیا جائے گا۔ تم ایک بار اس سے مل لو۔ پھر تمہیں خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔“

”اور تم...... تم کیا کرو گی؟“

”میرے گھر والوں نے میرا رشتہ خاندان ہی میں طے کر دیا ہے۔“ شاہ بانو اداس سا چہرہ بنا کر بولی۔ ”معاملہ وہی خاندانی ہے۔ جس کے آگے میں مجبور ہو چکی ہوں۔“

فروزاں سوچ میں پڑ گئی تھی۔

اسے شادی تو کرنی ہی تھی۔ آج نہیں تو کل۔ چاہے خرم ہو یا کوئی اور ہو اور اب تو نیلم کے رویے کے بعد وہ بھی محسوس کرنے لگی تھی کہ شاید ساجدہ کے گھر میں وہ زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکے گی۔

اسے ایسی سچویشن سے پہلے اس گھر سے نکل جانا چاہیے۔ اس کے لیے شادی سے بہتر اور کیا وسیلہ ہو سکتا تھا۔

”کس سوچ میں پڑ گئی ہو؟“ شاہ بانو نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ مجھے تمہاری بات کا کیا جواب دینا چاہیے۔“ فروزاں نے کہا۔ ”تم ایسا کرو۔ ساجدہ خالہ سے بات کر لو۔“

”ان سے تو میں بات کر ہی لوں گی۔ لیکن اس سے پہلے مجھے تمہاری رضامندی درکار تھی۔“

☆☆☆

راشد صرف نیلم کو جانتا تھا۔ اس نے سن تو رکھا تھا کہ نیلم کے گھر میں کوئی اور لڑکی بھی رہتی ہے لیکن وہ چونکہ بہت کم دکھائی دیتی تھی اس لیے راشد کو اس کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں

کچھ نہیں معلوم تھا۔

پھر جب اس نے نیلم کے کہنے پر فروزاں کو دیکھا تو اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ یہ لڑکی تو نیلم سے کہیں زیادہ اچھی تھی۔

اس نے سوچا کہ کاش اس کی دوستی نیلم کی جگہ اس لڑکی سے ہوتی تو کتنا بہتر ہوتا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ فروزاں سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکے گا جبکہ نیلم اس کے لیے کھلے ہوئے دروازے کی طرح تھی۔

اس نے کرائے کے تین آدمی حاصل کر لیے۔ ان آدمیوں نے کراچی سے کئی لڑکیاں اغوا کر کے فروخت کر دی تھیں۔ اس کے عوض انہیں اتنے پیسے مل جاتے تھے کہ کئی مہینے عیش سے گزر جاتے۔

راشد نے انہیں یہ بتا دیا تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی بھی ثابت ہو سکتی ہے لیکن ان لوگوں کو اپنے ہتھیاروں پر بھروسا تھا جنہوں نے ہر معرکے میں ان کا ساتھ دیا تھا۔

فروزاں اس دن گھر سے نکل کر قریبی مارکیٹ کی طرف جا رہی تھی جب ان میں سے دو نے اسے گھیر لیا۔ جبکہ تیسرا ان سے کچھ فاصلے پر اپنی گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ کالے شیشوں والی یہ گاڑی انہی وارداتوں کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔

فروزاں آگے جا رہی تھی۔ وہ دونوں اس کے تعاقب میں تھے۔ ان کا ارادہ فروزاں کو ایک ایسی گلی میں گھیرنے کا تھا جو عام طور پر سنسان ہوا کرتی۔ اس گلی سے گزرنے کے بعد ہی مارکیٹ آیا کرتی تھی۔

فروزاں اس گلی میں داخل ہوئی اور اچانک ایک باوقار سا آدمی اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ”لڑکی! میرے ساتھ ساتھ چلو، تیز تیز۔“ اس نے کہا۔ ”اس گلی میں تمہارے لیے خطرہ ہے۔ گلی سے نکلو۔ جلدی۔“

فروزاں نے حیرت سے اس آدمی کی طرف دیکھا۔ ”میں نہیں سمجھی۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”بیٹا۔ جو میں کہہ رہا ہوں وہ بالکل سچ ہے۔ دو آدمی تمہارا تعاقب کر رہے ہیں اور وہ دونوں تمہیں اغوا کرنا چاہتے ہیں۔ تم اس گلی سے نکل کر بھیڑ میں شامل ہو جاؤ تو یہ کچھ نہیں کر سکیں گے۔ جلدی کرو۔“

فروزاں اس آدمی کو نہیں جانتی تھی لیکن اس پر بھروسا کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس گلی میں دو آدمی موجود تھے جو شاید اسی مقصد کے لیے آ رہے ہوں گے۔

”جلدی کرو۔“ اس آدمی نے کہا۔ ”ان دونوں کے پاس اسلحہ ہے۔ یہ جھنجلا کر کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“

فروزاں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ دونوں ان کے پیچھے آتے آتے رک گئے تھے۔

”جناب۔ آپ کو کیسے پتا چلا کہ وہ دونوں مجھے اغوا کرنا چاہتے ہیں؟“ فروزاں نے آگے چلتے ہوئے پوچھا۔

”بیٹا۔ یہ بہت لمبی کہانی ہے۔ یہ سمجھو کہ کچھ لوگوں میں خاص قسم کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ایسی ہی ایک صلاحیت مجھ میں بھی ہے۔ چلو۔“

”حیرت ہے کہ مجھے اغوا کرنے کی کوشش کرنے والے کون ہو سکتے ہیں۔“ فروزاں بڑبڑا رہی تھی۔

”یہاں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔“ اس آدمی نے کہا۔ ”کون جانے کس کے دل میں کیا چھپا ہوا ہے۔ چلو میں تمہیں گھر تک پہنچا دوں۔ کیا کوئی دوسرا راستہ ہے؟“

”جی ہاں کئی راستے ہیں۔“ فروزاں نے کہا۔ ”لیکن آپ زحمت نہ کریں۔ میں چلی جاؤں گی۔“

”زحمت تو کرنی ہوگی۔“ آدمی مسکرا دیا۔ ”ویسے میرا نام نفیس ہے اور تمہارا نام کیا ہے؟“

”فروزاں۔“ فروزاں نے بتایا۔

دونوں باتیں کرتے ہوئے اس گلی تک آ گئے تھے جس گلی میں ساجدہ اور نیلم کا مکان تھا۔ ”بس جناب شکریہ۔“ فروزاں نے کہا۔ ”میں اپنی گلی تک آ گئی ہوں۔ اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے بیٹی۔ مجھے اجازت دو۔“ نفیس نے کہا۔ ”میری گاڑی کچھ دور کھڑی ہوئی ہے۔“

فروزاں اسے خدا حافظ کہہ کر اپنے گھر میں داخل ہو گئی۔ نیلم سامنے ہی کھڑی ہوئی تھی۔

جب سے فروزاں نے اسے سمجھایا تھا۔ اس دن سے نیلم نے اس سے بات چیت بند کر دی تھی۔ فروزاں کا دھیان اس وقت اس آدمی کی طرف لگا ہوا تھا۔ وہ کون ہو سکتا تھا۔ کتنی مٹھاس تھی اس کے لہجے میں۔ وہ کتنے پیار سے فروزاں کو بیٹی کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ وہ اس مہربان شخص کے تصور میں کھوئی ہوئی تھی۔

گاڑی میں انتظار کرتے ہوئے خرم نے نفیس کو واپس آتے دیکھا تو گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ ”کیا بات تھی بابا۔ آپ گاڑی رکوا کر اچانک کہاں چلے گئے تھے۔“

اس وقت نفیس کے ساتھ خرم بھی گاڑی میں تھا۔ دونوں سی ویو کی طرف جا رہے تھے۔ گاڑی خرم ہی چلا رہا تھا۔ جب اچانک نفیس نے گاڑی رکوانے کے لیے کہا اور گاڑی کے رکتے ہی وہ گاڑی سے اتر کر تیزی سے ایک طرف چلا گیا تھا۔

’’بتائیں بابا۔کیا بات ہے؟‘‘ واپسی پر خرم نے پوچھا۔ ’’کیا آپ کسی کو دیکھ کر آ رہے تھے؟‘‘

’’ہاں، ایک ایسی لڑکی کو، جس کو دیکھ کر میرے تصور میں آیا کہ مجھے اس کی مدد کرنی چاہیے۔ میں اس کی مدد کے لیے اس کے پاس گیا تھا۔‘‘

’’کون تھی وہ لڑکی؟‘‘ خرم نے پوچھا۔

’’میں نہیں جانتا۔ لیکن وہ کسی اچھی فیملی کی معلوم ہوتی تھی۔‘‘ نفیس نے بتایا۔

’’اوہ!‘‘ خرم ہونٹ سکیڑ کر رہ گیا۔

☆☆☆

شاہ بانو نے ساجدہ سے بات کرلی تھی۔

ساجدہ کو شاہ بانو پر پورا بھروسا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ شاہ بانو ایک اچھی لڑکی ہے اور جب یہ کسی کا رشتہ لے کر آئی ہے تو یقیناً اچھا ہی ہوگا۔ نیلم کے ساتھ ساتھ اب فروزاں بھی اس کی ذمے داری ہوگئی تھی اس لیے یہی مناسب تھا کہ پہلے اس کو رخصت کردیا جائے پھر نیلم کی طرف توجہ دی جائے۔

شاہ بانو پہلے ہی فروزاں سے بات کرچکی تھی۔ اس لیے جب ساجدہ نے فروزاں سے بات کی تو اس نے کہا۔ ’’خالہ امی۔ میں اس رشتے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن اس سے پہلے میں ایک بار اس شخص سے ملنا چاہتی ہوں۔‘‘

شاہ بانو کو اس پر کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ وہ تو خود یہی چاہتی تھی کہ ان دونوں کی ملاقات ہوجائے تاکہ فروزاں خرم سے متاثر ہوکر اس رشتے کے لیے اپنے آپ کو مضبوط کرلے۔

یہ ملاقات شہر کے ایک مشہور ریستوران میں طے ہوئی تھی۔

یہ ایک صاف ستھرا ریستوران تھا۔ جس کا ماحول، اس قسم کی ملاقاتوں کے لیے بہت مناسب خیال کیا جاتا تھا۔ خرم کو بھی وہ لڑکی اچھی لگی تھی۔

ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ فروزاں کو سب کچھ صاف صاف بتادے۔ پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ اس طرح پھر کوئی اس کی پہلی بیوی نہیں بن سکے گی۔ اور شاہ بانو کو حاصل کرنے کا خواب صرف خواب ہی رہے گا۔ بہرحال وہ راضی ہوگئی تھی۔

☆☆☆

نفیس ایک اچھا انسان تھا۔ اس لیے اس نے جب یہ سنا کہ خرم کا رشتہ کسی لڑکی سے طے ہوگیا ہے تو پریشان ہوکر رہ گیا۔ نہ جانے وہ کون ہوگی۔ وہ جانتا تھا کہ آنے والی کا مستقبل کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک مہینا، اور اس کے بعد موت۔ اس کی کہانی ایک ہی مہینے میں ختم ہوجائے گی اور وہ کچھ نہیں کرسکے گا۔

اس لیے جب لڑکی کو دیکھنے کی بات آئی تو اس نے جانے سے انکار کردیا۔ ’’نہیں بیٹے۔ میں نہیں جاسکتا۔ میں اس آنے والی کے چہرے پر موت کے سائے منڈلاتے ہوئے نہیں دیکھ سکوں گا بلکہ میں تو شاید اس شادی میں بھی شریک نہ ہوسکوں۔‘‘

’’یہ تو اچھی بات نہیں ہوگی بابا۔ لوگ کیا کہیں گے۔‘‘

’’کہنے دو لوگوں کو۔‘‘ نفیس نے کہا۔ ’’میرا خدا مجھے معاف کرے۔ میں صرف اپنی اولاد کے لیے اتنا بڑا گناہ کرنے جارہا ہوں۔‘‘

یہ مشورہ افشاں کا تھا کہ ان دونوں کی شادی اپنے گھر میں نہ ہو بلکہ کہیں اور ہوجائے اور شادی کے بعد خاموشی سے اس لڑکی کو اس گھر میں لے آیا جائے۔ کسی کو پتا ہی نہیں لگنے دیا جائے کہ فروزاں خرم کی بیوی ہے۔ ایک مہینے کے بعد تو یہ کہانی خود ہی ختم ہوجائے گی۔ اس کے بعد پوری دھوم دھام کے ساتھ شاہ بانو سے شادی کردی جائے۔ یہ تجویز بہت مناسب تھی۔

خرم نے ساجدہ اور فروزاں کو یہ کہہ کر مطمئن کردیا تھا کہ اس کے بابا اگرچہ ابھی ناراض ہیں لیکن شادی کے بعد وہ خود ہی ٹھیک ہوجائیں گے ان کا مزاج کچھ اسی قسم کا ہے۔

ساجدہ اور فروزاں کو اس پر کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ شاہ بانو ساتھ تھی اس لیے کسی گڑبڑ کا امکان بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

نفیس اس شام بہت بے چین تھا۔

اس کے بیٹے خرم کی آج شادی تھی۔ عجیب شادی تھی جس پر موت کے سائے منڈلا رہے تھے۔ اس وقت نکاح ہورہا ہوگا اور وہ ساحل پر بیٹھا سمندر کی لہروں کو دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اس کا دل رو رہا تھا۔ اس کے اندر کا انسان اس سے کہہ رہا تھا کہ جاؤ جاکر اس بدنصیب لڑکی کو اس شادی کے لیے منع کردو۔ اس سے کہہ دو کہ یہ شادی نہیں تمہاری موت کا پیغام ہے، تم مرجاؤ گی۔

اس نے اپنے دھیان میں ایک بار سمندر کی لہروں کے ساتھ ساتھ جو شاہ بانو کو دیکھا تھا۔ اس کی کوئی کڑی ابھی تک اس کے سامنے نہیں آئی تھی۔ اس نے لہروں پر اپنی نگاہیں مرکوز کردیں۔ ذرا سی دیر کے لیے۔ وہ ان لہروں کو اپنے تصور میں اتار لینا چاہتا تھا۔

اور اچانک اس کے دھیان کے پردے پر پھر ایک لاش لہروں میں پھنسی اور بہتی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے اس لاش پر اپنی نگاہیں مرکوز کردیں۔ ایک بار پھر شاہ بانو کی لاش اس کے سامنے تھی۔

وہ کانپ کر رہ گیا۔ اس نے جلدی سے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ سمندر کی سرد ہواؤں کے باوجود اس کا پورا جسم پسینے سے بھیگ رہا تھا۔

’’میرے خدا۔ یہ مجھے کیا دکھایا جارہا ہے، کیوں دکھایا جارہا ہے؟ خرم کی شادی تو کسی اور سے ہورہی ہے۔ پھر یہ شاہ بانو کی لاش میرے دھیان میں کیوں آرہی ہے؟‘‘

اس نے موبائل نکال کر خرم کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے خرم بتا رہا تھا۔ ’’بابا۔ ہمارا نکاح ہوگیا ہے۔ ابھی ہم کچھ دیر بعد ہی گھر پہنچنے والے ہیں۔‘‘

نفیس نے ایک گہری سانس لی۔ سب کچھ تو ویسا ہی ہورہا تھا جیسا سوچا گیا تھا۔ پھر درمیان میں یہ سب کیوں ہونے لگا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کا دھیان اس کو غلط تصویریں دکھانے لگا ہے...... لیکن کیوں؟...... اسے ساحل پر بیٹھے جب بہت دیر ہوگئی تو بوجھل دل سے گھر واپس آگیا۔ گیٹ کے اندر شاہ بانو، خرم اور خرم کے دوستوں کی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ خرم اپنی دلہن کو لے کر واپس آگیا ہے۔ وہ آہستہ قدموں سے لاؤنج کی طرف آیا جہاں سے لوگوں کے ہنسنے اور بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ خرم بہترین قسم کے سوٹ میں ملبوس اس کے سامنے کھڑا تھا۔ شاہ بانو بھی اس کے ساتھ ہی تھی اور بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔

’’بابا مشن مکمل ہوگیا۔‘‘ خرم نے بتایا۔ ’’دیکھ لیں۔ اپنی بہو کو۔‘‘

اور جب نفیس نے خرم کی دلہن کو دیکھا تو اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرے چھانے لگے۔ یہ وہی لڑکی تھی جس کو اس نے اغوا ہونے سے بچایا تھا۔

☆☆☆

نیلم اور راشد ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔

’’چلو، شادی کے بعد تمہارے راستے کی رکاوٹ تو دور ہوگئی۔‘‘ راشد نے کہا۔

’’تم یہ بتاؤ۔ اس دن تم لوگوں کو کیا ہوگیا تھا؟‘‘ نیلم نے پوچھا۔

’’ہم اسے تقریباً گھیر چکے تھے کہ اچانک ایک آدمی ہمارے درمیان آگیا۔‘‘ راشد نے بتایا۔

’’کون آدمی؟‘‘

’’یہ میں نہیں جانتا۔‘‘ راشد نے کہا۔

نیلم سوچ میں پڑ گئی تھی۔

’’آخر اب تمہیں کیا پریشانی ہے؟‘‘ راشد نے پوچھا۔

لڑکی۔ ’’I Love You‘‘

لڑکا لڑکی کے سر پر دوپٹا دے کر ہاتھ پکڑتا ہے اور کہتا ہے۔ ’’بہنا 5 وقت کی نماز پڑھا کرو، پیار میں کچھ نہیں رکھا۔‘‘

لڑکے کے جانے کے بعد لڑکی اپنے ہاتھ میں پکڑی پرچی کھولتی ہے تو لکھا ہوتا ہے۔ ’’عقل کی اندھی مروائے گی کیا؟ پیچھے میری بیوی تھی، بعد میں فون پر بات کریں گے۔‘‘

***

سردار۔ اپنے ایک سال کے بچے کی آواز ریکارڈ کر رہا تھا۔

دوست۔ ’’یہ کیوں کر رہے ہو؟‘‘

سردار۔ ’’یہ جب بڑا ہوگا اس سے اس کا مطلب پوچھوں گا۔‘‘

***

سردار۔ ’’سوچ رہا ہوں ملائیشیا گھوم آؤں۔ کتنے پیسے لگ جائیں گے؟‘‘

دوست۔ ’’کچھ بھی نہیں۔‘‘

سردار۔ ’’وہ کیسے؟‘‘

دوست۔ ’’سوچنے کے پیسے نہیں لگتے۔‘‘

***

دوستوں سے پرابلم شیئر کرنا اچھا ہوتا ہے، اس لیے نہیں کہ وہ اسے سولو کرتے ہیں بلکہ کمبخت ایسے، ایسے مشورے دیتے ہیں کہ بندہ پرابلم ہی بھول جاتا ہے۔

***

سردار نے روڈ پر کھڑی کار کے نیچے کتے کو لیٹا ہوا دیکھا تو کتے کو دم سے کھینچا اور کہا۔ ’’یار! میری گاڑی بھی دیکھ لو اسٹارٹ نہیں ہورہی۔‘‘

***

سردار کو کوئی موبائل پہ تنگ کرتا تھا۔ سردار نے نئی سم خریدی اور تنگ کرنے والے کو میسج کیا۔ ’’میں نے وہ نمبر بند کردیا ہے اب تیرا باپ بھی مجھے تنگ نہیں کرسکتا۔‘‘

مرسلہ۔ رضوان تنولی کریزوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

"اب تو وہ تمہارے گھر سے چلی گئی ہے نا۔ اس کی کہانی تو ختم ہو گئی ہے۔"

"کہانی ختم نہیں ہوئی ہے راشد! شروع ہوئی ہے۔" نیلم نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"میں یہ کیسے برداشت کرلوں کہ میرے گھر میں پرورش پانے والی بہت اچھی جگہ چلی جائے۔ اس کو بہت اچھا شوہر مل جائے۔ بہت اچھی زندگی ہو اس کی۔ نہیں، میں یہ برداشت نہیں کرسکتی۔"

"تو یہ کہو نا کہ تم اس سے جلنے لگی ہو۔"

"ہاں۔ میں اس سے جلنے لگی ہوں۔" نیلم نے کہا۔ "میں اس کو کامیاب نہیں دیکھ سکتی۔"

"تم ایک بات بتاؤ۔ کیا اس نے تمہارا کوئی نقصان کیا ہے؟" راشد نے پوچھا۔

"نہیں، نقصان تو کوئی نہیں کیا۔" نیلم نے اعتراف کرلیا۔

"تو پھر جانے دو اس کو۔ کیوں اس کے پیچھے پڑی ہو۔" راشد نے کہا۔ "اب تم اپنے اور میرے بارے میں سوچو۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اس کی حمایت میں کیوں بول رہے ہو۔"

"حمایت میں نہیں بول رہا۔ بڑے سے بڑے آدمی کی زندگی میں ایک لمحہ ایسا ضرور آتا ہے جب وہ حق کی بات کرنے لگتا ہے۔ اس لڑکی کے سلسلے میں یہی بات ہے۔ اس کو دیکھ کر تو اب مجھے یہ احساس ہونے لگا ہے کہ تم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں کیونکہ قدرت اس کا ساتھ دے رہی ہے۔"

"میں نہیں مانتی ایسی باتوں کو۔"

"تمہاری مرضی۔" راشد نے کہا۔ "خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ اب تم کیا چاہتی ہو؟"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں۔" نیلم جھلائی ہوئی تھی۔ "وہ تو کہیں اور جا کر آباد ہوچکی ہے۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ پیچھا چھوڑو اس کا اور میری طرف دھیان دو۔"

"تمہاری طرف کیا دھیان دوں۔" نیلم نے کہا۔ "دیکھو راشد۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں تم سے ملتی رہی ہوں۔ ہم نے دوستی بھی کی ہے لیکن میں صرف دوستی کے لیے تمہارے ساتھ رہی تھی، صرف دوستی۔ پھر فروزاں کا معاملہ ہوگیا اور اس وقت میں نے قسم کھائی کہ اگر تم نے اس کو برباد کردیا تو پھر میں واقعی تمہارے ساتھ ہی رہوں گی لیکن تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے اور وہ ایک شاندار زندگی کی طرف چلی گئی۔"

"وہی تو...... پوچھ رہا ہوں کہ اب تم کیا چاہتی ہو؟"

"اب...... جب سے میں نے فروزاں کے شوہر خرم کو دیکھا ہے۔ اس دن سے انگاروں پر لوٹ رہی ہوں۔ مجھے یا تو وہی خرم چاہیے اپنے جیون ساتھی کے طور پر یا ان جیسا کوئی اور۔ معاف کرنا راشد! میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گی۔"

☆☆☆

فروزاں اس مہربان اجنبی کو اپنے سسر کے روپ میں دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ اس کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ اس کو غنڈوں سے آگاہ کرنے والا خرم کا بابا ہوگا۔ اسے یہ لوگ بہت پسند آئے تھے۔ خرم کی ماں افشاں بھی بہت اچھی تھی۔ خود خرم بہت اچھا تھا اور اب خرم کے بابا سامنے آگئے تھے۔

نفیس اس کی طرف ویران نگاہوں سے دیکھتا رہتا تھا۔ کچھ کہنا چاہتا۔ پھر خاموش ہوجاتا۔ ایک دن اس نے فروزاں سے پوچھا۔ "بیٹی۔ اتنا تو معلوم ہے کہ تم ساجدہ کی بیٹی ہو جو شاہ بانو کی استانی ہوا کرتی تھیں لیکن مجھے اب تک تمہارے والد کے بارے میں پتا نہیں چلا۔ کیا وہ حیات ہیں؟"

"نہیں بابا۔" فروزاں نے ایک گہری سانس لی۔ "ویسے یہ عجب بات ہے کہ اس شادی کے سلسلے میں کسی نے بھی میرا بیک گراؤنڈ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ شاہ بانو نے رشتہ لگایا اور آپ لوگوں نے فوراً قبول کرلیا جیسے کہ آپ سب کو اس شادی کی بہت جلدی تھی۔"

اس وقت وہ سب لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ نفیس نے معنی خیز نگاہوں سے خرم کی طرف دیکھا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ سب کو اس شادی کی جلدی تھی، خاص طور پر خرم اور شاہ بانو کو۔

"اب میں بتاتی ہوں بابا کہ میں جس گھر میں رہتی ہوں، اس گھر سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔" فروزاں نے کہا۔ "ان لوگوں نے مجھے پناہ دی تھی اور میں ایک بے سہارا لڑکی ہوں۔"

"اوہ!" نفیس نے ہونٹ سکیڑے۔ "پھر بھی تمہارے والدین کون تھے، کہاں رہتے تھے؟"

"میرے بابا ایک بہت بڑے بزنس مین تھے۔" فروزاں نے بتایا۔ "آپ نے حیات انڈسٹری کا نام تو سنا ہوگا۔"

"حیات انڈسٹری!" نفیس چونک پڑا۔ "بابر حیات سے تمہارا کیا رشتہ تھا؟"

"وہی تو میرے بابا تھے۔" فروزاں نے بتایا۔

"کیا؟" نفیس ایک دم سے کھڑا ہوگیا۔ "میرے خدا!

تم بابر کی بیٹی ہو۔"

"جی ہاں بابا۔ میں انہی کی بیٹی ہوں۔"

"میں نے سنا تھا کہ بابر کی موت کے بعد اس کی بیٹی پر رشتے داروں نے یلغار کردی ہے۔ پھر وہ اپنا سب کچھ کسی رشتے داروں کو دے کر غائب ہوگئی۔ میں نے بہت کوشش کی تمہیں تلاش کرنے کی لیکن تم مجھے نہیں مل سکیں۔ حالانکہ میں تمہیں نہیں پہچانتا تھا لیکن بابر سے میرا رشتہ ایسا تھا کہ مجھے ہر حال میں تمہیں تلاش کرنا تھا اور میں نے تمہارے بچپن میں اس سے جو وعدہ کیا تھا، اسے پورا کرنا تھا۔"

"کیسا وعدہ بابا۔" فروزاں نے پوچھا۔

"میں نے اس سے کہا تھا کہ میں اپنے بیٹے کی شادی اس کی بیٹی سے کروں گا۔" نفیس نے بتایا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا سر تھام لیا تھا۔

☆☆☆

نفیس آج پھر سمندر سے مخاطب تھا۔ اس کی آواز میں شکوہ بھی تھا، غصہ بھی اور بے چارگی بھی۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "یہ کیا تماشا ہے۔ مجھے کس قسم کے امتحان سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ فروزاں تو ہر لحاظ سے میرے بیٹے کی بیوی ہے۔ اس وقت بھی جب میں نے اس کے باپ سے اس کو اپنانے کی بات کی تھی اور اس وقت بھی جب خرم اس کو بیاہ کر گھر لایا ہے۔ تو کیا صرف اس لیے کہ ایک مہینے کے بعد ہی وہ موت کی آغوش میں چلی جائے۔

کیا دنیا کو اور وسیع نہیں کیا جاسکتا تھا؟ یہ سارے لوگ، یہ سارے رشتے، یہ سارے واقعات ایک ہی جگہ کیوں آکر مل جاتے ہیں۔

ہر راستہ ایک ہی جیسا کیوں ہوتا ہے۔ کیا ضروری تھا کہ فروزاں ہی میرے دوست کی بیٹی ہوتی۔ کیا ضروری تھا کہ مجھے ایسا منظر دکھایا جاتا جب میرے بیٹے کی پہلی بیوی کی موت ہونے والی ہو، آخر ایسا تماشا کیوں ہوتا ہے۔"

اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ وہ رو رہا تھا لیکن آنسوؤں کا سمندر باہر نہیں، اس کے تصور کی سطح پر رواں تھا۔

اس نے پھر ایک منظر دیکھا۔ اپنے بیٹے خرم کو۔ اور اس کے ساتھ ہی لہروں میں بہتی ہوئی شاہ بانو کی لاش۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

خدایا، یہ سب کیا ہے۔ یہ بار بار اس کی لاش مجھے کیوں دکھائی جاتی ہے۔ میری بہو تو فروزاں ہے۔ پھر شاہ بانو کی لاش کیوں سامنے آتی ہے اور اچانک ہی ایک اور خیال اس کے ذہن میں آگیا۔ کہیں ایسا تو نہیں......

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

فروزاں اور خرم لان میں بیٹھے تھے۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اتنے دنوں میں خرم فروزاں سے بہت مانوس ہوگیا ہے۔ اس نے کئی بار رات کے وقت خرم کو بے چینی سے لان میں ٹہلتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

شاید اس لیے کہ خرم کو فروزاں کا انجام معلوم تھا۔ یہی بات اسے بے چین رکھتی ہوگی۔ وہ دونوں نفیس کو دیکھ کر اس کے پاس آگئے۔ اس نے ایک محبت بھری نگاہ فروزاں پر ڈالتے ہوئے خرم سے کہا۔ "بیٹے، ذرا میرے کمرے میں آنا۔ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

کچھ دیر بعد خرم اس کے سامنے کھڑا ہوا اس سے پوچھ رہا تھا۔ "جی بابا۔ بتائیں، آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔"

"خرم۔ میں تم سے جو کچھ پوچھنے والا ہوں، اس کا بالکل ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔ مجھ سے شرمانے یا کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"پوچھیں بابا۔ کیا پوچھنا ہے۔"

"تم نے شاہ بانو سے شادی تو نہیں کی ہے۔" اس نے پوچھا۔

"شاہ بانو سے شادی؟" خرم نے حیران ہوکر اس کی طرف دیکھا۔ "نہیں تو بابا۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

"گھر والوں سے چھپ کر کورٹ میرج یا اسی قسم کی کوئی اور بات۔" وہ اس سے زیادہ کھل کر نہیں پوچھ پا رہا تھا۔

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا بابا۔" خرم نے کہا۔ "آپ خود سوچیں، میں شاہ بانو کی زندگی کو کس طرح خطرے میں ڈال سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" نفیس نے ایک گہری سانس لی۔ "تم سے یہی پوچھنا تھا، اب تم جاؤ۔"

خرم کے جانے کے بعد وہ پھر الجھ گیا تھا۔ کیوں، پھر اس کے دھیان میں ایسی باتیں کیوں آرہی تھیں۔

☆☆☆

نیلم نے راشد کو ٹھکرا دیا تھا۔

راشد جیسے انسان کے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ کوئی لڑکی اس کی توہین کرجائے۔ اس کے منہ پر تھوک کے چلی جائے۔

اس وقت تو اس نے نیلم سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن بعد میں نیلم کے لیے سوچتا رہا تھا۔ اب اسے کسی اور سے نہیں بلکہ نیلم ہی

سے بدلہ لینا تھا۔ وہ بہت اونچے خواب دیکھنے لگی تھی۔ اس کو خرم جیسا دولت مند چاہیے تھا۔ راشد نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ نیلم کو خرم ہی جیسے کسی دولت مند کے ہاتھوں فروخت کردے گا اور اس سے کہے گا کہ اب خوش ہوجا کیونکہ تیرے خواب کی تعبیر تجھے مل چکی ہے۔

اس نے بہ ظاہر نیلم کی باتوں کا برا نہیں مانا بلکہ اس کے ساتھ پہلے ہی کی طرح پیش آتا رہا۔ اس نے نیلم سے یہ کہا کہ جس وقت نیلم کو کوئی مناسب رشتہ مل گیا۔ وہ خود اس کے راستے سے ہٹ جائے گا کیونکہ اسے تو نیلم کی خوشیاں عزیز ہیں۔

اس کی باتوں سے متاثر ہوکر نیلم نے پھر اس سے ملنا شروع کردیا تھا۔ راشد اب اس سے بالکل مختلف انداز کی باتیں کیا کرتا۔ اس کے گھر کے بارے میں اس کی پڑھائی کے حوالے سے اور اس کے مستقبل کی باتیں۔

نیلم نے اب اس پر پورا بھروسا کرلیا تھا۔

ایک دن اسے ایک ایسا آدمی مل ہی گیا جو نیلم کے عوض اسے اچھی خاصی رقم دے سکتا تھا۔ یہ راشد کی لائن نہیں تھی۔ وہ اس کام کو گھٹیا سمجھا کرتا تھا لیکن اس نے نیلم سے بدلے کے لیے کم از کم صرف ایک بار اس کام کو کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔

وہ ایک اوباش قسم کا دولت مند انسان تھا۔

اس آدمی سے راشد کی ملاقات اسی لائن کے ایک ایجنٹ نے کروائی تھی۔ ایجنٹ نے اپنے طور پر معلوم کرنے کی بہت کوشش کی تھی کہ راشد کس لڑکی کا سودا کروانا چاہتا ہے۔ لیکن راشد نے اس سے صرف اتنا کہا تھا۔ ''یار۔ تو اس بندے سے ملواتا ہے یا میں کسی اور کو تلاش کروں۔''

''چل ملوادوں گا لیکن یہ بتا میرا کیا فائدہ ہوگا؟''

''اگر دس لاکھ مل گئے تو اس میں سے دو لاکھ تیرے۔''

''دس لاکھ تو وہ کبھی نہیں دے گا۔'' ایجنٹ نے کہا۔ ''زیادہ سے زیادہ پانچ میں سودا ہوگا۔''

''چل۔ پانچ میں سے ایک لاکھ تیرے۔''

''اب تم معاملے کی بات کرو۔ کب لانا ہے اس لڑکی کو؟''

''کل ہی رات۔'' راشد نے بتایا۔ ''میں کل ہی رات اسے لے کر سی ویو کی طرف آجاؤں گا۔ تیسرے کیبن کے سامنے۔ وہ ذرا ویران جگہ بھی ہے۔ پھر ہم آسانی سے اسے اٹھا کرلے جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' ایجنٹ نے رضامندی ظاہر کردی۔ ''میں اس سے بھی کہہ دیتا ہوں کہ وہ بھی نوٹوں کا انتظام کرلے۔''

راشد نے اسی شام کسی طرح نیلم سے ملاقات کرلی تھی۔

''نیلم۔ میں کل کچھ وقت تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔''

''بہت مشکل ہے۔ اماں ٹیوشن پڑھانے جاتی ہیں۔ شاہین گھر میں اکیلا ہوتا ہے۔ میں وقت نہیں نکال سکتی۔'' نیلم نے بتایا۔

''لیکن کچھ وقت تو نکالنا ہی ہوگا کیونکہ پھر میری تم سے ملاقات نہیں ہوسکے گی۔ میں پرسوں دبئی جارہا ہوں۔''

''تم دبئی جارہے ہو؟''

''ہاں ایک ایجنٹ کے ذریعے مجھے دبئی میں کام مل گیا ہے۔'' راشد نے بتایا۔

''چلو۔ یہ تو بہت اچھی بات ہوئی۔'' نیلم نے کہا۔

''اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ آخری بار آکر مل لو ورنہ نہ جانے زندگی پھر موقع دے یا نہ دے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کل آجاؤں گی۔''

راشد نے آٹھ بجے شام کا وقت دیا تھا اور خود پونے آٹھ بجے ہی جاکر کھڑا ہوگیا تھا۔ وہ ایجنٹ اور راشد کے دو مسلح آدمی کچھ فاصلے پر ایک بند وین لیے کھڑے تھے۔ راشد کی طرف سے سارے انتظامات مکمل ہوچکے تھے۔ صرف نیلم کے آنے کی دیر تھی۔

اسی وقت ایک موٹر سائیکل تیزی سے اس کے برابر سے گزری۔ پھر آگے جاکر رک گئی۔ راشد چوکنا ہوگیا تھا۔ موٹر سائیکل نے ایک لمبا چکر لگایا اور راشد کے سامنے ہی آکر رک گئی۔

اس بائیک پر دو آدمی سوار تھے اور راشد ان دونوں کو پہچانتا تھا۔ ان میں سے ایک دلشاد تھا اور دوسرا کریم۔ ان دونوں سے پچھلے مہینے راشد کا ایک بھیانک جھگڑا ہوچکا تھا۔

''آخر مل ہی گئے نا راشد استاد۔'' دلشاد نے آواز لگائی۔

اس سے پہلے کہ راشد خود کو سنبھال سکتا، دلشاد اور کریم نے اس پر گولیاں برسادی تھیں۔ گولیاں اس کے پیروں اور بازوؤں پر لگی تھیں۔ وہ ایک کربناک چیخ کے ساتھ ڈھیر ہوگیا تھا جبکہ کچھ فاصلے پر وین میں انتظار کرتا ہوا ایجنٹ اور اس کے دونوں ساتھی موقعے کو نازک دیکھ کر فرار ہوچکے تھے۔

☆☆☆

ساجدہ کو آج واپسی میں دیر ہوچکی تھی۔

وہ عام طور پر عشا سے پہلے ہی ٹیوشنز سے فارغ ہوکر گھر لوٹ جایا کرتی لیکن اس رات ایک ہوم ورک اٹک گیا تھا۔ جس کو مکمل کرانے میں اس کو اچھی خاصی دیر ہوگئی تھی۔

اس کا راستہ وہی تھا۔ سی ویو والی طویل اور ویران سڑک پر دو بیچ سے آگے جانے کے بعد اسے چنگ چی رکشا کے انتظار

میں کھڑا ہونا پڑتا۔ کبھی کبھی تو یہ انتظار بہت طویل ہوجاتا۔ اور کبھی فوراً ہی نیلم کالونی کے لیے سواری مل جایا کرتی۔

اس وقت بھی وہ وہیں سے آگے ایک سنسان مقام سے گزر رہی تھی کہ اس نے سڑک سے ذرا ہٹ کر کسی کو گرا ہوا دیکھا۔ اس نے اپنی رفتار تیز کردی۔ وہ جلد سے جلد گزر جانا چاہتی تھی۔

لیکن پھر کراہنے کی آواز نے اسے روک لیا۔

وہ جو بھی تھا، زندہ ہی تھا۔ کیا وہ کسی زخمی کو چھوڑ کر آگے جاسکتی تھی؟ اس نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں کہ شاید کوئی گاڑی وہاں سے جاتی ہوئی دکھائی دے تو اسے روک کر مدد کی درخواست کرے۔ لیکن اس وقت اس روڈ پر کوئی بھی نہیں تھا۔

حالانکہ یہ وہ سڑک تھی جو رات گئے تک آباد رہتی۔ لیکن آج کل حالات ایسے تھے کہ لوگوں نے گھروں سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔

وہ بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اس بے ہوش ہوئے انسان کے پاس آگئی۔ اسی وقت کسی کار کی روشنی ذرا سی دیر کے لیے اس شخص پر پڑی لیکن اس ذرا سے لمحے میں ساجدہ نے اسے پہچان لیا تھا۔

وہ اسی کے محلے کا لوفر تھا، راشد۔ وہ شخص جو اس کی نیلم پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ ایسے شخص کو تو پڑا ہی رہنے دیا جائے تو بہتر ہے۔ اس نے سوچا لیکن پھر اس کے اندر کی عورت جاگ اٹھی۔ وہ ایک استانی تھی اور علم دینے والوں کو تو کسی ڈاکٹر ہی کی طرح مہربان ہونا چاہیے۔

راشد بے ہوش ہوچکا تھا۔

اول نگاہ میں ساجدہ کو وہ مردہ محسوس ہوا لیکن اس کے سینے کا اتار چڑھاؤ یہ بتا رہا تھا کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ اس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور ایک ٹیکسی اس کے پاس آکر رک گئی۔

شاید خدا کی مدد اس کے لیے اور اس لوفر کے لیے آپہنچی تھی۔

''کیا بات ہے اماں؟'' ٹیکسی ڈرائیور نے کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا۔

''بیٹا۔ اس زخمی کو اسپتال پہنچانا ہے۔'' ساجدہ نے کہا۔ ''میں اِدھر سے گزر رہی تھی کہ میں نے اس کو یہاں زخمی حالت میں پڑا ہوا دیکھ لیا۔''

''رہنے دو اماں۔ کن چکروں میں پڑی ہو۔'' ٹیکسی والے نے کہا۔ ''خوامخواہ کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔ پولیس کیس معلوم ہوتا ہے۔''

''میں جانتی ہوں کہ یہ پولیس کیس ہے۔'' ساجدہ نے کہا۔ ''لیکن میں اسے اس طرح نہیں چھوڑ سکتی۔ تم چاہے ساتھ دو یا نہ دو۔ میں اس کو اسپتال لے کر جاؤں گی۔ میں ایک ٹیچر ہوں اور کتابوں نے مجھے یہی سکھایا ہے۔''

شاید اس کی بات ڈرائیور کے دل کو لگ گئی تھی۔ ''چلو اماں۔ تم بھی کیا یاد کرو گی، میں اس کو اٹھاتا ہوں لیکن میں اسپتال پہنچا کر چلا جاؤں گا۔ رکنے والا کام نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم چلے جانا، میں تمہیں نہیں روکوں گی۔''

ڈرائیور نے بے ہوش اور زخمی راشد کو اٹھا کر ٹیکسی کی پچھلی نشست پر رکھ دیا۔ ساجدہ اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی۔ ٹیکسی جناح اسپتال کی طرف روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

نیلم کے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔

ساجدہ ابھی تک ٹیوشن پڑھا کر واپس نہیں آئی تھی اور نیلم کو راشد سے ملنے کے لیے جانا تھا۔ گھر میں شاہین اکیلا تھا اور وہ اسے چھوڑ کر نہیں جاسکتی تھی۔ اب وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اگر ساجدہ اور کچھ دیر تک واپس نہیں آئی تو وہ کسی پڑوسن کو شاہین کا خیال رکھنے کا کہہ کر گھر سے نکل جائے گی۔

اس نے پڑوسن کو بلانے کے لیے گھر سے باہر قدم نکالا ہی تھا کہ فروزاں دروازے پر کھڑی دکھائی دے گئی۔ نیلم اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ اس کے دل میں فروزاں کے خلاف ابھی تک کدورت موجود تھی۔ شاہین اندر سے دوڑتا ہوا آکر فروزاں سے لپٹ گیا تھا۔

''اماں گھر پر نہیں ہیں۔'' نیلم نے برا سا منہ بنا کر بتایا۔

''تو کیا ہوا تم تو ہو، شاہین تو ہے۔'' فروزاں نے کہا۔ ''کیا میں تم دونوں سے ملنے نہیں آسکتی۔''

نہ چاہتے ہوئے بھی نیلم کو واپس گھر میں آنا پڑا تھا۔ ''خالہ جان کہاں ہیں؟'' فروزاں نے دریافت کیا۔

''تم تو جانتی ہو کہ وہ اس وقت ٹیوشنز پڑھانے جاتی ہیں۔'' نیلم نے کہا۔

''ہاں جانتی ہوں۔ لیکن وہ اس وقت تک تو واپس بھی آجاتی ہیں۔''

''اب میں یہ نہیں جانتی۔'' نیلم نے جھلا کر کہا۔

''تم شاید اس وقت کہیں جا رہی تھیں۔'' فروزاں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

اس سے پہلے کہ نیلم کوئی جواب دیتی، دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی۔ نیلم نے دروازہ کھولا تو محلے کا ایک نوجوان دروازے پر کھڑا تھا۔

''کیا ہوا؟'' نیلم نے غصے سے پوچھا۔

''نیلم باجی۔ میں ابھی اماں کو لے کر جناح اسپتال گیا تھا۔'' لڑکے نے بتایا۔ ''وہاں میں نے ساجدہ خالہ کو دیکھا۔ وہ ایک لاش کے ساتھ کھڑی تھیں اور پولیس والے بھی تھے۔''

''کیا؟'' نیلم چکرا کر رہ گئی تھی۔ ''کیا بکواس کر رہے ہو۔''

''سچ کہہ رہا ہوں۔ اماں نے بھی دیکھا تھا۔ جاؤ ان سے جا کر پوچھ لو۔ ہم تو چپکے سے نکل آئے لیکن تم کو بتا رہا ہوں۔''

نیلم سر تھام کر بیٹھ گئی۔

فروزاں نے سہارا دیا۔ ''گھبراؤ نہیں۔ چلو چل کر دیکھتے ہیں۔ کیا معاملہ ہے۔''

☆☆☆

اگر راشد ہوش میں آکر بیان نہیں دیتا تو ساجدہ کو اپنی جان چھڑانی مشکل ہوجاتی۔

پولیس اطلاع ملتے ہی پہنچ گئی کہ اسپتال میں ایک ایسا شخص لایا گیا ہے جس کو گولیاں لگی ہیں۔ اور لانے والی ایک عورت ہے۔

ساجدہ کے لیے پولیس والوں کے تیکھے اور ترش سوالوں کے جواب مشکل ہوگئے تھے۔ اس نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود اس کو شک بھری نگاہوں سے دیکھا جا رہا تھا۔

اگر راشد مرجاتا تو شاید ساجدہ کے لیے قیامت ہوجاتی۔ لیکن وہ نہ صرف ہوش میں آگیا تھا بلکہ اس کی حالت بھی بہت بہتر تھی۔

گولیوں نے اس کے بازوؤں اور ایک ٹانگ کو زخمی کیا تھا۔

اس کو جب بتایا گیا کہ اس کو زخمی حالت میں اٹھا کر اسپتال تک لانے والی ایک خاتون ہے تو اس نے اس خاتون سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور جب ساجدہ اس کے سامنے آئی تو وہ لرز کر رہ گیا۔

اس سے شکریہ بھی ادا نہیں کیا جا رہا تھا۔ اس نے اسی مہربان عورت کی بیٹی کے اغوا کا منصوبہ بنایا تھا۔ وہ اس عورت کی بیٹی کو کسی کے ہاتھ فروخت کرنے والا تھا۔

ساجدہ اس سے کہہ رہی تھی۔ ''بیٹا۔ میں جب ٹیوشن پڑھا کر واپس آرہی تھی تو میں نے تمہیں زخمی حالت میں دیکھ لیا۔ میں نے تمہیں پہچان لیا تھا۔ اس کے باوجود میرا دل نہیں مانا کہ میں تمہیں اس حالت میں چھوڑ جاؤں۔ بس میں تمہیں کسی نہ کسی طرح اٹھا کر یہاں تک لے آئی ہوں۔''

راشد کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ وہ صرف روئے جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد فروزاں اور نیلم بھی اسپتال پہنچ چکے تھے۔

☆☆☆

شاہ بانو نے دن گننے شروع کردیے تھے۔

خرم اور فروزاں کی شادی کو پندرہ دن گزر چکے تھے۔ ان پندرہ دنوں میں ابھی تک ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی تھی جس سے یہ ظاہر ہو کہ فروزاں موت کی طرف جا رہی ہے۔

اس نے ایک دن خرم سے اپنے اس خدشے کا اظہار بھی کردیا۔ ''خرم۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے بابا کی پیش گوئی غلط ثابت ہوجائے اور فروزاں کو کچھ بھی نہ ہو۔''

''وہ ایک دوسری بات ہے شاہ بانو۔ لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ ہم اپنی خوشی کے لیے کسی کی موت کی خواہش کر رہے ہیں۔''

''وہ ایک دوسری بات ہے۔'' شاہ بانو نے کہا۔ ''ہماری خوشی کا اظہار تو اسی بات پر ہے نا کہ فروزاں زندہ رہتی ہے یا نہیں۔''

''ہاں۔'' خرم نے ایک گہری سانس لی۔ ''ہماری خوشی کسی اور کی موت سے بندھی ہوئی ہے۔''

''دیکھو خرم۔ میں اتنی خود غرض اور بے رحم نہیں ہوں لیکن محبت نے مجھے ایسا کردیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ یہ اپنی بقا کا مسئلہ ہے۔ اگر میں رہتی ہوں تو پھر وہ نہیں رہتی۔ اگر وہ رہتی ہے تو میں نہیں رہتی۔ اس لیے خدا سے معافی مانگتی رہتی ہوں۔ تم یہ بتاؤ۔ ہمارے پاس اور کیا راستہ ہے۔''

''یہ بھی سچ ہے۔'' خرم نے ایک گہری سانس لی۔ ''ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ وہ میری پہلی بیوی بن چکی ہے اور موت اس کا مقدر ہے۔ میں نے بابا کی بات آج تک غلط ہوتے نہیں دیکھی۔''

''چلو۔ اگر تم کو اپنے بابا کی بات پر اتنا ہی یقین ہے تو پندرہ دن تو ہو ہی چکے ہیں، پندرہ اور سہی۔ اس کے بعد دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔''

مزید پانچ دن گزر گئے۔

اس دوران بھی سب ٹھیک ہی رہا۔ فروزاں اب اس گھر میں پوری طرح ایڈجسٹ ہوچکی تھی۔ خرم اور اس کی ماں دونوں ہی اسے پسند بھی کرنے لگے تھے۔

ایک دن افشاں نے نفیس سے کہا۔ ''ایک بار اور ذرا دھیان تو کریں۔ ہوسکتا ہے کہ اس بار آپ کی پیش گوئی غلط ثابت ہوجائے۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔ لیکن خرم کی پہلی بیوی کی موت مقدر ہوچکی ہے۔ میں اس کے بعد بھی کئی بار دھیان کرچکا ہوں اور ہر بار ایک ہی جواب آتا ہے، موت اور صرف موت۔''

افشاں خاموش ہوگئی۔

شاہ بانو اب تقریباً روزانہ اس گھر میں فروزاں کو دیکھنے آیا کرتی تھی۔ وہ خود بھی فروزاں سے مانوس ہوگئی تھی۔ فروزاں بہت اچھی لڑکی تھی۔ وہ اسے خرم کی دوسری بیوی کے طور پر بھی

قبول کرنے کو تیار تھی لیکن قسمت تو کچھ اور کہہ رہی تھی۔

ایک دن اس نے خرم سے کہا۔ ''ہمیں ایک ساتھ کہیں گئے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں۔''

''ہاں۔فروزاں کے آنے کے بعد اس کا موقع ہی نہیں ملا۔''

''چلو۔تو پھر آج چلتے ہیں۔''

''کہاں؟''

''ساحل کی طرف۔وہی اپنا پرانا مشغلہ۔پانی میں پتھر پھینکنا۔'' شاہ بانو نے کہا۔''اس مشغلے سے اعصابی تناؤ میں کمی محسوس ہونے لگتی ہے۔''

''فروزاں کو بھی ساتھ لے لیں۔''

شاہ بانو نے ٹھٹک کر خرم کی طرف دیکھا۔''کیوں، اس کی کیا ضرورت ہے یا پھر یہ کہ تم اس کے اتنے عادی ہو چکے ہو کہ اس کے بغیر کہیں جانا نہیں چاہتے؟''

''نہیں بھئی۔ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' خرم ہنس دیا۔ ''میں نے تو یوں ہی ایک بات کہہ دی تھی۔''

''مت کیا کرو ایسی باتیں، صرف ہم دونوں کو جانا ہے۔''

''او کے، چلو۔''

دونوں ساحل پر پہنچ گئے۔سمندر کی وہی کیفیت تھی۔ وہی ہمیشہ والی، پرشور لہروں کا تماشا۔ان دونوں میں اس بات کا مقابلہ ہوا کرتا تھا کہ کون زیادہ دور تک پتھر پھینکتا ہے۔

پہلا پتھر خرم نے پھینکا تھا۔شاہ بانو نے ایک پتھر اٹھاتے ہوئے کہا۔''اب تم دیکھنا۔میرا پتھر کتنی دور تک جاتا ہے۔''

وہ پتھر دور تک پھینکنے کے لیے پانی میں کچھ اور آگے بڑھ گئی اور اسی وقت ایک بپھری ہوئی لہر نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔''شاہ بانو!'' خرم چیختا ہوا اس کی طرف دوڑا۔شاہ بانو نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن واپس جاتی ہوئی لہر اور بھی تند تھی۔وہ شاہ بانو کو اپنے ساتھ بہاتی ہوئی لے گئی تھی۔

شاہ بانو کی کہانی ختم ہو چکی تھی۔

☆☆☆

نفیس ایک بار پھر ایک طویل سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔

اس کا یہ سفر اپنی تسلی کے لیے تھا۔ذہن میں اٹھتے ہوئے سوالوں کے لیے تھا۔وہ میں سے ایک بات اسے غلط کیوں دکھائی گئی تھی۔

وہ شاہ بانو کی لاش کو سمندر کی لہروں پر دیکھ رہا تھا۔یہ تو بالکل ٹھیک تھا، ایسا ہی ہوا تھا۔دو گھنٹوں کے بعد شاہ بانو کی لاش سمندر سے نکال لی گئی تھی۔نفیس بھی تو یہی دیکھتا آیا تھا لیکن پہلی بات غلط کیوں ہوئی تھی۔

خرم کی پہلی بیوی فروزاں تو زندہ تھی۔اس نے ایک ہی مہینے کو اپنے دھیان میں دیکھا تھا۔لیکن اب تو کئی مہینے ہو چکے تھے۔بس انہی سوالوں کے جواب کے لیے اس نے ایک بار پھر جنوبی افریقا کا سفر اختیار کیا تھا۔

اسے اپنے راستے یاد تھے۔

کہاں سے جانا ہے، کس قسم کے مزدوروں اور سواریوں کو ڈربن سے ہائر کرنا ہے۔یہ سب اس کے ذہن میں تھا۔اس نے ڈربن میں کاسی کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اسے نہیں مل سکی تھی۔

بہر حال اس نے ایک بار پھر انہی راستوں کو اختیار کیا تھا۔جہاں سے وہ پہلے گزر چکا تھا۔اس کا پچھلا سفر دوسری نوعیت کا تھا۔پہلی بار وہ لے جایا گیا تھا جبکہ اس بار اپنی مرضی سے جا رہا تھا۔

کئی دنوں کے سفر کے بعد وہ اس بستی میں پہنچ ہی گیا تھا جو پراسرار لوگوں کی سرزمین تھی، جہاں نہ جانے کیسے خفیہ علوم تقسیم کیے جاتے تھے۔اس بستی کے پرانے پجاریوں نے اسے پہچان لیا تھا۔بلکہ وہ سب اس طرح کھڑے تھے جیسے اس کے ہی استقبال کے لیے کھڑے ہوں۔

''ہمیں معلوم تھا کہ تم اس طرف آرہے ہو۔'' اس بڑے پجاری نے کہا جس نے نفیس کو ٹریننگ دی تھی۔

نفیس کو اس بات پر حیرت نہیں ہوئی تھی۔

''تو پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں نے اتنی دور کا سفر کیوں کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''اچھی طرح معلوم ہے۔'' پجاری مسکرا دیا۔

''تو پھر ایسا کیوں ہوا، موت کسی اور کو کیوں آگئی؟'' اس نے پوچھا۔

''بے وقوف ہو تم۔موت اسی کو آئی ہے جو اس کی پہلی بیوی ہے۔'' پجاری نے کہا۔''بے وقوف انسان۔محبت کا رشتہ کاغذ پر لکھا ہوا قانون کا رشتہ نہیں ہوتا۔بلکہ دو دل جب ایک دوسرے سے عہد و پیمان کرتے ہیں، تو وہ اسی وقت ذہنی طور پر ایک دوسرے کو میاں بیوی قبول کر چکے ہوتے ہیں۔باقی باتیں تو کاغذی یا رسمی ہوا کرتی ہیں۔اسی لیے مرنے والی تمہارے بیٹے کی پہلی بیوی تھی۔پہلی محبت، پہلی بیوی، اب تو سمجھ گئے نا۔''

''ہاں، اب سمجھ گیا ہوں۔'' نفیس نے گردن جھکا لی، وہ رو رہا تھا۔اب وہ اپنے بیٹے کی پہلی بیوی کی موت پر رو رہا تھا۔

سفر چاہے جسمانی ہو یا روحانی... شوق ہو تو منزل کی دوری، دوری نہیں رہتی نہ صرف یہ بلکہ مشکلات کی مجبوری بھی پیروں کی بیڑیاں نہیں بنتیں... اور کچھ انسانوں کے پیروں میں اللہ تعالیٰ اتنا سفر لکھ دیتا ہے کہ کوئی ایک جگہ ان کی شناخت نہیں رہتی بلکہ ہر جگہ ان کے قدموں کے نشانات ثبت ہوتے جاتے ہیں۔آپ کا شمار بھی ایسے ہی ولیوں میں ہوتا ہے جن کی کرامات کسی ایک مخصوص جگہ کے لیے نہیں بلکہ زمین کے مختلف حصوں میں رہنے والے آپ کے علم سے فیض یاب ہوتے رہے۔

بستی بستی، نگری نگری گشت کرنے والے ایک کامل ولی کی روداد

جہانیاں جہاں گشت

ضیا تسنیم بلگرامی



اوچ (بہاول پور) میں سیدوں کے خاندان کو ایک خاص شہرت حاصل تھی۔اس خاندان میں سید جلال بخاری نے مشہور بزرگ حضرت زکریا ملتانی سے بیعت کی اور خرقۂ خلافت حاصل کرلیا۔یہ ملتان سے اوچ واپس تشریف لے گئے۔وہیں شادی کی اور اللہ اللہ میں زندگی بسر کرنے لگے۔یہیں ان کے تین فرزند پیدا ہوئے۔سید احمد کبیر، سید بہاء الدین اور سید محمد۔ سید احمد کبیر نے اپنے باپ کی سجادگی حاصل کی۔ان سے دو لڑکے پیدا ہوئے۔سید جلال الدین حسین بخاری اور سید صدر

الدین راجو قتال اور یہ دونوں فرزند شہرت اور ناموری میں غیر معمولی ثابت ہوئے۔

ان دنوں بہاء الدین زکریا ملتانی کے مرید شیخ جمال خجندی کو بزرگی میں بڑی شہرت حاصل تھی۔ جلال الدین حسین کو سات سال کی عمر میں شیخ جمال خجندی کی خدمت میں پیش کیا گیا اور باپ نے ان سے درخواست کی کہ اس بچے کے حق میں دعا کی جائے۔

جمال خجندی نے جلال الدین بخاری کو غائر نظروں سے دیکھا اور سید کبیر احمد کو جواب دیا۔ "بابا سید احمد! تو کس کے حق میں دعا کی درخواست کر رہا ہے؟ کیا تو نے اپنے بیٹے کو اب تک نہیں پہچانا؟"

باپ نے جواب دیا۔ "حضرت! میں ناچیز کسی کو کیا پہچانوں گا، یہ بات تو منجانب اللہ حاصل ہوتی ہے۔"

جمال خجندی نے فرمایا۔ "بابا سید احمد! تو ذرا دم لے۔ دیکھ میں کیا تماشا دکھاتا ہوں۔ تو خاموش دیکھتا رہ اور کچھ نہیں۔"

سید احمد کبیر نے عرض کیا۔ "حضرت! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ میری کیا مجال جو دم بھی ماروں۔"

جمال خجندی نے اپنے ایک مرید کو حکم دیا۔ "ارے یہ تو لوگوں کی شکلیں کیا دیکھ رہا ہے، یہ ہمارے معزز مہمان ہیں۔ ذرا بھاگ کے جا اور ان کے لیے کھجوریں تو لے آ۔"

مرید فوراً ہی تراث ہو گیا...... اور کھجوروں سے لبریز طباق لے آیا اور اسے آپ نے حاضرین میں تقسیم کر دیا۔ جمال خجندی نے حاضرین کو حکم دیا۔ "اب آپ لوگ کھجوریں کھانا شروع کر دیں، تکلف نہ فرمائیں۔"

اجازت پاتے ہی لوگوں نے کھجوریں کھانا شروع کر دیں۔ جمال خجندی نے پوچھا۔ "حضرات! کھجوروں کا ذائقہ پسند آیا؟"

لوگوں نے تقریباً بیک آواز جواب دیا۔ "جناب والا! آپ کوئی چیز مرحمت فرمائیں اور وہ بے مزہ ہو، ایسا نہیں ہو سکتا۔"

کھانے والوں نے کھجور کی گٹھلیاں اپنے آگے رکھ لی تھیں۔ شیخ جمال الدین خجندی نے خادم کو حکم دیا کہ گٹھلیاں پھینک دی جائیں۔ خادم نے سب کے آگے سے گٹھلیاں سمیٹ لیں مگر سات سالہ بچے جلال الدین کے آگے گٹھلیاں نہیں تھیں۔ خادم نے آپ سے پوچھا۔ "میاں صاحبزادے! آپ کی گٹھلیاں کہاں ہیں؟"

جلال الدین نے معصومیت سے جواب دیا۔ "کھا گیا۔"

خادم نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا فرمایا آپ نے؟ آپ گٹھلیاں کھا گئے...... میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

جلال الدین نے جواب دیا۔ "جناب! میری بات کا ایک ہی مطلب ہے اور وہ مطلب یہ ہے کہ میں نے گٹھلیاں کھالیں۔"

حاضرینِ مجلس بھی یہ دلچسپ گفتگو سن رہے تھے۔

خادم نے مزید پوچھا۔ "حضرت! آپ نے کھجوریں کھائیں یا گٹھلیاں؟ کیا آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا مفہوم جانتے ہیں؟"

جلال الدین نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ "جناب! میرا حافظہ اتنا خراب نہیں ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں، میں نے جو کچھ کیا ہے، اسے بھول جاؤں۔ میں تمہیں بار بار یہ بتا رہا ہوں کہ میں کھجوریں گٹھلیوں سمیت کھا گیا۔"

شیخ جمال الدین خجندی نے ہاتھ کے اشارے سے سات سالہ جلال الدین کو اپنے پاس بلایا۔ وہ چلے گئے۔ شیخ جمال نے مسکرا کر دریافت کیا۔ "ہاں میاں صاحبزادے! گٹھلیوں کی بابت آپ کیا کہہ رہے تھے؟"

جلال الدین نے جواب دیا۔ "حضرت! میں بار بار یہ بتا رہا ہوں کہ میں کھجوریں گٹھلیوں سمیت کھا گیا لیکن آپ کا خادم میری یہ سیدھی سادی بات بھی نہیں سمجھ پا رہا۔"

شیخ جمال الدین نے فرمایا۔ "لیکن صاحبزادے! گٹھلیاں تو کوئی بھی نہیں کھاتا۔ تم کیوں کھا گئے؟"

جلال الدین نے سادگی سے جواب دیا۔ "حضرت! یہ کھجوریں مجھے آپ کے دستِ مبارک سے عطا ہوئی تھیں۔ پھر میں ان کی گٹھلیاں کس طرح پھینک دیتا۔ میرے لیے تو کھجور کی ہر چیز متبرک تھی۔"

شیخ جمال اس بات سے بہت خوش ہوئے، بولے۔ "جلال الدین! تو وہ شمع ہے جس کی روشنی قیامت تک رہے گی اور اس میں تیرے خاندان کا نام روشن رہے گا۔"

باپ نے بیٹے کے بارے میں یہ بشارت جو سنی تو خوشی کی انتہا نہ رہی۔ بڑی دیر تک بیٹے کو پُرشوق نظروں سے دیکھتے رہے۔

شیخ جمال نے سید احمد کبیر سے کہا۔ "تم ذرا سی دیر کے لیے باہر چلے جاؤ۔"

باپ، بیٹے کو چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ شیخ جمال نے آہستہ سے کہا۔ "بیٹے جلال الدین! تم ذرا اور قریب آ جاؤ۔"

جلال الدین ان سے اور قریب آ گئے۔

شیخ جمال نے پوچھا۔ "صاحبزادے! میں تمہارے حافظے کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ سنتا ہوں تمہیں اپنے بچپن کی باتیں اس طرح یاد ہیں گویا آج کل میں ہی پوری ہوں۔"

جلال الدین نے جواب دیا۔ "ہاں مجھے اپنے بچپن ہی کی نہیں، شیر خوارگی کی باتیں بھی یاد ہیں۔"

شیخ جمال نے کہا۔ "مثلاً کوئی ایک بات؟ کوئی ایک واقعہ؟"

جلال الدین نے جواب دیا۔ "جب میں چھ دن کا تھا تو جس عورت نے مجھے نہلا کر کپڑے پہنائے تھے، میں اس کو آج بھی پہچان سکتا ہوں۔"

شیخ جمال نے حیرت سے کہا۔ "اچھا تو بتاؤ کہ وہ عورت کون سا اور کس رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھی؟"

جلال الدین نے آنکھیں بند کیں اور حافظے پر ذرا سا زور دے کر جواب دیا۔ "وہ عورت گلابی لباس پہنے ہوئے تھی اور اس کا رنگ گندمی اور قد ذرا لمبا تھا۔"

شیخ جمال کو بچے کی باتوں میں مزہ بھی آ رہا تھا اور حیرت بھی ہو رہی تھی۔ پوچھا۔ "اور کچھ؟"

جلال الدین نے جواب دیا۔ "میری ماں نے اس کا نام حبیبہ بی کہہ کر لیا تھا۔"

یہ ایسی باتیں تھیں کہ ان پر کسی کو مشکل ہی سے یقین آ سکتا تھا۔ لیکن شیخ جمال کو بچے کی ایک ایک بات پر پورا یقین تھا۔

شیخ جمال نے سید احمد کبیر کو اندر بلا لیا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ کہا...... "بابا سید احمد کبیر! میں تم سے چند باتیں پوچھوں گا۔ وہ باتیں سات سال پیچھے کی ہیں۔ تم حافظے پر زور دے کر جواب دو۔ شاید یاد آ جائیں۔"

سید احمد کبیر نے عاجزی سے جواب دیا۔ "حضرت! آپ سوال کیجیے، میں یاد کر کے صحیح جواب دینے کی کوشش کروں گا۔"

شیخ جمال نے کہا۔ "بابا! چھٹی کے دن جلال الدین کو نہلایا کس نے تھا؟"

سید احمد کبیر نے ذہن پر ذرا سا زور دے کر جواب دیا۔ "ہاں مجھے یاد آیا۔ اس دن اتفاق سے دائی نہیں آئی تھی۔ اس نے اپنی چھوٹی بہن حبیبہ بی کو بھیج دیا تھا۔"

شیخ جمال نے پوچھا۔ "شاید یہ پوچھنا لاحاصل ہو کہ اس دن حبیبہ بی نے لباس کس رنگ کا پہن رکھا تھا کیونکہ اتنی سی بات کو کون یاد رکھ سکتا ہے۔"

سید احمد کبیر نے جواب دیا۔ "نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ حبیبہ بی کو گلابی رنگ بہت پسند تھا۔ اس کا رنگ گندمی تھا اور اس رنگ پر گلابی رنگ کھل جاتا تھا۔ اس لیے وہ اکثر گلابی رنگ کے کپڑے پہنتی تھی۔"

شیخ جمال نے جلال الدین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بابا سید کبیر! میں تم سے سچ کہتا ہوں، تمہارا بیٹا جلال الدین تمہارے خاندان کا نام قیامت تک کے لیے روشن کر دے گا۔"

سید احمد کبیر نے بیٹے سے تخلیے میں کی جانے والی باتوں کی بابت جاننا چاہا لیکن شیخ جمال نے کچھ بھی نہ بتایا۔ کچھ نہ جاننے کے باوجود باپ کو شیخ جمال کی باتوں پر اتنا یقین تھا کہ وہ اس کا لفظوں میں اظہار نہیں کر سکتے تھے۔

☆☆☆

جلال الدین کی تعلیم و تربیت شیخ جمال خجندی اور شیخ بہاء الدین قاضی اوچ کے سپرد ہوئی۔ ان دونوں نے جس لگن اور دل سوزی سے یہ فرائض انجام دیے، اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی تھی۔ اس دوران قاضی بہاء الدین کا انتقال ہو گیا اور جلال

الدین کو ملتان جانا پڑا۔ ملتان میں بہاء الدین زکریا ملتانی کے پوتے شیخ رکن الدین سجادہ نشینی کے فرائض انجام دے رہے تھے اور آپ کے تبحر علمی اور بزرگی کا شہرہ بیرونِ ہند تک پہنچ چکا تھا۔ دہلی کا بادشاہ آپ کا بے حد احترام کرتا تھا اور شیخ رکن الدین کو حضرت نظام الدین اولیاء پر ترجیح دیتا تھا۔ جب جلال الدین، شیخ رکن الدین کی خدمت میں پہنچے تو انہوں نے جلال الدین کو غیر معمولی تپاک سے لیا۔ اس وقت خانقاہ میں بہت سے مرید اور ارادت مند موجود تھے۔ شیخ رکن الدین نے جلال الدین کو اپنے پاس بٹھالیا اور حاضرین سے فرمایا۔ ''حضرات! یہ جلال الدین حسین بخاری ہیں۔ جلال بخاری کے پوتے۔ یہ یہاں تعلیم حاصل کرنے آئے ہیں۔''

حاضرین نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ شیخ رکن الدین طلبا کو خانقاہ میں ٹھہرایا کرتے تھے لیکن جلال الدین کو انہوں نے مدرسے میں ٹھہرایا۔ طالب علموں کو کھانا خانقاہ سے دیا جاتا تھا لیکن جلال الدین کو گھر سے بھیجا جاتا تھا۔

جلال الدین نے ان سے ایک سال تک تعلیم حاصل کی۔ ایک سال بعد انہیں اوچ واپس جانے کی اجازت دے دی گئی۔ شیخ رکن الدین نے ان کے لیے خاص کشتی کا انتظام کیا۔ جلال الدین اوچ واپس پہنچے اور کچھ دن قیام فرما کر اساتذہ اور مشائخ کی تلاش میں سفر اختیار کیا۔ جلال الدین کے لیے ہر شیخ قابلِ تعظیم اور لائقِ صحبت تھا، خواہ وہ کسی بھی مسلک کا ہو۔ اس سیر و سیاحت میں آپ نے تین سو سے زیادہ اہلِ کمال سے شرفِ ملاقات حاصل کیا اور ان سے کچھ نہ کچھ حاصل بھی کیا۔ یہاں تک کہ بیت اللہ تشریف لے گئے۔ وہاں سید عبداللہ یافعی شافعی سے گہرے مراسم ہو گئے اور دونوں میں بڑی صحبت و موانست رہی۔

جلال الدین انہیں ساتھ لے کر کعبے کا طواف کیا کرتے تھے۔ اسی طرح سید عبداللہ یافعی بھی انہیں ساتھ لے کر طوافِ کعبہ کے لیے چلے جاتے اور پھر دونوں ایک ساتھ یہ فرض انجام دیتے۔

انہی ملاقاتوں اور باتوں کے دوران سید عبداللہ نے جلال الدین کو حضرت نصیر الدین کی صاحبِ کمال شخصیت اور کرامات کے متعلق بہت کچھ بتایا۔

جلال الدین نے دریافت کیا۔ ''سیدی! کیا ہند میں نصیر الدین محمود کے علاوہ اس پایہ کا کوئی اور نہیں ہے؟''

سید عبداللہ یافعی نے جواب دیا۔ ''نہیں، ان سے پہلے ایک موجود تھے لیکن اب وہ نہیں رہے۔ ان کی تاثیر اور برکت نصیر الدین محمود میں آگئی ہے۔ وہ دہلی کے چراغ کہلاتے ہیں۔''

ان باتوں نے جلال الدین میں بے انتہا اشتیاق پیدا کر دیا اور وہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی سے ملنے کے لیے بے چین رہنے لگے۔



جلال الدین ہندوستان واپس آئے اور سیدھے ملتان واپس پہنچے۔ وہاں شیخ رکن الدین کی خدمت میں حاضری دی۔ شیخ رکن الدین اوپر کی منزل میں تشریف رکھتے تھے۔ جلال الدین کی آمد کی خبر سنتے ہی آپ اوپر سے اترنے لگے۔ جلال الدین زینے پر لیٹ گئے اور عرض کیا۔ ''حضرت! آپ کو اترنے میں زحمت ہوگی اس لیے بہ آسانی اترنے کے لیے آپ میرے سینے پر پاؤں رکھ کر اتریے۔''

شیخ رکن الدین دم بخود انہیں دیکھتے رہ گئے، کچھ دیر بعد بولے۔ ''اے سید! یہ تو نے کیا کیا؟ بابِ نبوت تو مسدود ہو چکا ہے اس لیے وہاں کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ ہاں مرتبۂ ولایت کہیں نہیں گیا، وہ تجھے مل جائے گا۔''

اس ارشاد کے بعد شیخ رکن الدین نے آپ کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور وہ کچھ عطا کر دیا جس کی انہیں تمنا تھی۔

اس کے بعد آپ نے دہلی کوچ کیا کیونکہ چراغ دہلی سے ملنا بہت ضروری تھا۔ نصیر الدین محمود چراغ دہلی نے بڑے شوق سے انہیں اپنی صحبت میں بٹھایا۔ یہاں جلال الدین نے چراغ دہلی سے بیعت کیا اور ان کی مریدی کے بعد ان سے خلافت حاصل کی۔ اس طرح انہوں نے چودہ خانوادوں سے خلافت حاصل کی تھی۔ کچھ عرصہ چراغ دہلی کی صحبت میں رہ کر یہ ملتان واپس چلے گئے۔ عید ملتان ہی میں منائی اور نمازِ عید کے بعد آپ نے بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے مزار پر حاضری دی۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد ادب سے عرض کیا۔ ''بابا زکریا ملتانی! ایک بے نوا اور بے سہارا آپ کے پاس آیا ہے، عید کا دن ہے۔ کیا

میں یہاں سے عیدی لیے بغیر چلا جاؤں؟''

اسی وقت آپ نے ایک آواز سنی، کوئی کہہ رہا تھا۔ ''جلال الدین! جا اب تو مخدوم جہانیاں ہو گیا اور اس نام سے تُو شہرت پائے گا۔''

جلال الدین یہاں سے زکریا ملتانی کے بڑے صاحبزادے صدر الدین کے مزار پر تشریف لے گئے اور وہاں بھی یہی مطالبہ کیا کہ میں آپ سے عیدی لینے آیا ہوں اور عیدی لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔

یہاں بھی ایک آواز سنائی دی۔ ''جلال الدین! میرے والد زکریا ملتانی نے تجھ کو مخدوم جہانیاں کا خطاب دیا ہے۔ کیا اس سے تجھے اختلاف ہے؟ بہرحال وہی عیدی میں دے رہا ہوں۔ اب تو مخدوم جہانیاں ہے۔''

آپ یہاں سے باہر نکلے تو راستے میں جو بھی ملا، اس نے آپؒ کو مخدوم جہانیاں کہہ کر ہی مخاطب کیا۔

اب آپ کہیں سے کہیں پہنچ چکے تھے۔ انہی دنوں بنگال میں شیخ علاؤ الدین چشتی بنگالی قطب کی طبیعت خراب ہوئی اور زندگی کے آثار جاتے رہے تو انہوں نے اپنے مریدوں کو وصیت کی۔ ''دوستو! یہ میری وصیت ہے کہ میری نمازِ جنازہ جلال الدین مخدوم جہانیاں پڑھائیں گے۔ ان کے علاوہ کوئی نمازِ جنازہ نہ پڑھائے ورنہ میں بہ روزِ قیامت دامن گیر ہوں گا۔''

مرید آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ ایک نے کہا۔ ''بھائی اپنی سمجھ میں تو یہ بات آتی نہیں کہ جو شخص پنجاب میں بمقام اوچ رہتا ہے، وہ پیر و مرشد کی نمازِ جنازہ کس طرح پڑھائے گا۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ بنگال تک پلک جھپکتے پہنچیں گے کس طرح؟''

کسی دوسرے مرید نے سرگوشی میں کہا۔ ''کہیں اپنے پیر و مرشد حالتِ ہذیان میں تو نہیں تھے؟''

پیر و مرشد نے ان دونوں کو جواب دیا۔ ''لوگو! ان دونوں سے کہہ دو کہ میرا دماغی توازن خراب نہیں ہوا اور میں اپنے ہوش و حواس میں ہوں۔ رہا یہ سوال کہ مخدوم جہانیاں میری نمازِ جنازہ کس طرح پڑھائیں گے تو یہ فکر تمہیں نہیں مجھے ہونی چاہیے اور میں نے اس کا انتظام کر لیا ہے۔ مخدوم جہانیاں ہی میری نمازِ جنازہ پڑھائیں گے کسی کو فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

چند گھنٹوں بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اب کوئی مرید یا کوئی اور شخص ان کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھا سکتا تھا۔ وہ لوگ بڑی بے چینی سے کسی بات کا انتظار کر رہے تھے۔ آخر ان سب نے ایک طرف سے مخدوم جہانیاں کو آتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ جنازے کے قریب گئے اور لوگوں سے کہا۔ ''لوگو! میں ان کی خواہش پر نمازِ جنازہ پڑھانے آگیا ہوں۔ ذرا اپنی صفیں تو درست کر لو تم سب!''

لوگ ان کی تشریف آوری پر حیران تھے لیکن مخدوم جہانیاں ان کے سامنے موجود تھے اس لیے وہ ان کی موجودگی پر شک و شبہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

لوگوں نے صفیں درست کیں۔ آپ نے شیخ علاؤ الدین چشتی کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور اپنے وطن اوچ واپس چلے گئے۔ لوگوں کی نظر میں یہ سب کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔

ایک اور بزرگ خواجہ شرف الدین احمد منیری نے آپ کے پاس اپنی جوتی بھیجی۔ آپ نے اس کے جواب میں نہایت عاجزی اور انکساری سے دستار بھیج دی۔ مریدوں نے پوچھا۔ ''حضرت! خواجہ شرف الدین نے آپ کو اپنی جوتی کیوں بھیجی تھی...... اس کا مطلب کیا تھا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اس کا مطلب یہ تھا کہ خواجہ شرف الدین نے ازراہِ انکساری جوتی بھیج کر یہ کہلایا تھا کہ میں آپ کے پیر کی جوتی ہوں لیکن میں نے جواباً اپنی دستار روانہ کر دی جس کا مطلب یہ تھا کہ آپ ازراہِ انکساری جو کچھ فرما رہے ہیں، اس سے میں شرمندہ ہوں۔ آپ میرے پاؤں کی جوتی نہیں، سر کا تاج ہیں۔''

آپ کی شادی ہو چکی تھی۔ آپ کا بچہ چار سال کا ہو چکا تھا۔ آپ نہایت خشوع و خضوع سے نماز پڑھ رہے تھے اور آپ کا لڑکا مصلے کے چاروں طرف چکر لگا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد آپ نے سلام جو پھیرا تو دیکھا کہ ایک طرف ایک عزیز شمس الدین بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ نے شمس الدین سے پوچھا۔ ''تم کب آئے؟''

شمس الدین نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں تو بہت دیر سے یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔ کیوں، کوئی خاص بات ہوگئی؟“

آپ نے فرمایا۔ ”نہیں، کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی۔“ پھر اپنے چار سالہ بیٹے کی طرف اشارہ کیا۔ بولے۔ ”تم نے اس لڑکے کی حرکات دیکھیں، یا یہ بھی نہیں دیکھ سکے؟“

شمس الدین نے جواب دیا۔ ”ہاں، اس کی حرکات تو میں بڑی دیر سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ کبھی مصلے کے پاس جاتا ہے اور کبھی کسی جانور کو پکڑ کر مصلے کے پاس لے آتا ہے۔ بس یہی حرکت میں دیکھ رہا ہوں اتنی دیر سے۔“

آپ نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”افسوس کہ یہ لڑکا زیادہ دن نہیں جیے گا۔“

شمس الدین نے دریافت کیا۔ ”یہ بات آپ کو کس طرح معلوم ہوئی؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اس طرح کہ ابھی جب میں نماز پڑھ رہا تھا تو میں نے عین نماز میں اس بچے کی طرف جو رجوع کیا تو بڑی مایوسی میں مبتلا دیکھا۔ اس کے آس پاس کوئی بھی نہ تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اس کے انتقال کی خبر دی جارہی ہے۔ ابھی تک میں اس خبر پر یقین نہیں کرسکا لیکن اب حالتِ بیداری میں صاف صاف اس لڑکے کی تکفین و تدفین دیکھ کر اس کی موت کی خبر دے رہا ہوں۔“

اس دن آپ بہت خاموش رہے۔ شام تک افسردگی طاری رہی۔ شام سے ذرا پہلے بچہ بخار میں مبتلا ہوگیا اور بخار اتنا تیز چڑھا کہ لڑکے کی حالت ہذیان آمیز ہوگئی۔ وہ معلوم نہیں کیا کچھ بکنے لگا۔ رات سے پہلے پہلے لڑکے کا اچانک انتقال ہوگیا۔ آپ کو اس کی موت کا افسوس تو بہت ہوا لیکن مشیتِ ایزدی میں کسی کو کیا دخل؟

آپ اپنی خانقاہ میں بیٹھے مریدوں اور ارادت مندوں سے باتیں کررہے تھے کہ گھاس کی گٹھری میں آگ لگ گئی۔ یہ گٹھری یہاں کئی دن سے رکھی ہوئی تھی۔ آپ ذرا بھی نہیں گھبرائے۔ آپ نے زمین سے مٹی اٹھائی اور کہا..... یاغوث الاعظم شیخ عبدالقادر محی الدین جیلانی میری مدد فرمائیں اور مشکل آسان کردیں۔

اتنا کہہ کر مٹی کو آگ کے شعلے پر پھینکا۔ آگ فوراً ہی بجھ گئی۔ آپ نے غوث الاعظم سے عالم رویا میں مدد جو مانگی تو فوراً ہی قبول ہوئی اور آگ بجھ گئی۔

آپ کے پاس بادشاہ کا وزیر خان جہاں مرزا ملاقات کے لیے آیا۔ آپ ان سے بڑے تپاک سے ملے اور اس کی ضرورت سے زیادہ عزت کرتے رہے۔

کسی نے کہا۔ ”حضور والا! ہم سب درویش ہیں اور بادشاہوں سے ہمارا کیا واسطہ؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”بابا تم لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہو، حالانکہ خدا نے جہاں خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا ہے وہیں اپنے امیر کی اطاعت پر بھی زور دیا ہے۔ اب اگر میں بادشاہ یا اس کے وزیر کو دھتکار دوں گا تو یہ لوگ کہاں اور کس کے پاس جائیں گے؟ اگر یہ لوگ ہماری طرف سے مایوس ہوکر اپنے گھر واپس جائیں تو پھر ان کی کون مدد کرے گا؟ میں انہیں بھی مایوس نہیں کرسکتا۔“

وزیر یہ باتیں سن رہا تھا۔ اس نے فرطِ خوشی میں آپ کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ آپ نے ہاتھ کھینچ لیا اور کہا۔ ”یہ بری بات ہے۔“

اس کے بعد وزیر نے اپنی ایک خواہش بیان کی۔ آپ نے آنکھیں بند کیں اور معلوم نہیں کیا کچھ دیکھتے رہے۔ پھر اپنی دونوں آنکھیں کھول دیں اور وزیر سے کہا۔ ”ایک بات سچ سچ بتا؟“

وزیر نے کہا۔ ”پوچھیے، میں ضرور بتاؤں گا۔“

آپ نے پوچھا۔ ”تیرے قیدیوں میں کوئی لڑکا بھی ہے؟“

وزیر نے ذہن پر زور دیا اور کہا۔ ”ہاں حضرت! ایک لڑکا اس وقت بھی میری قید میں ہے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”وہ بے گناہ ہے۔ تو نے اسے کیوں قید کر رکھا ہے؟“

وزیر نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں نے تو اس کو خطا کار سمجھ کر ہی قید کیا تھا لیکن اگر آپ یہ فرماتے ہیں کہ وہ بے گناہ ہے تو میں اس کو فوراً ہی رہا کردوں گا۔“

آپ نے ذرا اور سختی سے کہا۔ ”ہاں اور یہ سمجھ لے کہ اگر تُو نے اسے نہ چھوڑا تو تیرے دوسرے کام بھی بگڑ جائیں گے۔ وہ لڑکا بے گناہ ہے۔“

وزیر نے واپس جاکر لڑکے کو رہا کردیا۔

اوچ کے قصبات میں سے ایک میں ملا وجیہہ الدین نامی ایک شخص رہتا تھا۔ یہ شخص اپنے کسی کام سے اپنے عزیز مولانا نصیر الدین ابوالمعالی کے پاس گیا۔ کھانا کھاکے ملا وجیہہ الدین قیلولے کی غرض سے وہیں لیٹ گیا۔ لیٹے لیٹے نیند آگئی اور خواب میں دیکھا کہ وہ ایک ایسی جگہ پر پہنچ گیا ہے جہاں لوگوں کا مجمع لگا ہوا ہے اور اس مجمع سے ایک شخص مخاطب ہے۔ اس شخص نے کیا کچھ کہا، ساری باتیں تو یاد نہیں رہیں۔ ہاں ایک بات یاد رہ گئی۔ یہ بزرگ کہہ رہے تھے۔ ”لوگو! جو شخص کارِ دنیا کو کارِ دین پر مقدم رکھتا ہے، اس کے دونوں کام خاک میں مل جاتے ہیں۔ اس لیے کارِ دین کو کارِ دنیا پر مقدم رکھو۔“

ملا وجیہہ الدین جس غرض سے اپنے عزیز کے پاس گیا تھا، وہ کارِ دنیا تھا جس کو دین پر ترجیح دی جارہی تھی۔ ملا نے جاگنے کے بعد اپنے عزیز مولانا نصیر الدین ابوالمعالی سے پوچھا۔ ”حضرت! قرب و جوار میں کوئی بزرگ وعظ فرماتے ہیں؟“

مولانا نے جواب دیا۔ ”ہاں، کیوں؟ ان سے کوئی کام؟“

ملا نے پوچھا۔ ”ان کا نام کیا ہے؟“

مولانا نے جواب دیا۔ ”سید جلال الدین حسین بخاری۔ یہ اوچ میں وعظ فرماتے رہتے ہیں۔“

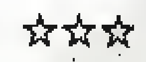
ملا نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ ”حضرت! میں نے ان بزرگ کا نام ہی آج سنا ہے۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔“

مولانا نے جواب دیا۔ ”ان سے ملنا کوئی مشکل کام تو نہیں ہے۔ آپ اوچ شریف چلے جائیں۔ وہاں آپ کی ملاقات ہوسکتی ہے۔“

ملا وجیہہ الدین پر اس جملے کا اتنا اثر ہوچکا تھا کہ اپنے کام ہی کو بھلا دیا اور احرام باندھ کر اوچ روانہ ہوگئے۔ اوچ کے کسی شخص نے انہیں جلال الدین کی خدمت میں پہنچا دیا۔ آپ کی صورت دیکھتے ہی ملا نے پہچان لیا کہ یہی وہ بزرگ ہیں جو خواب میں وعظ کرتے ہوئے نظر آئے تھے۔ ملا کی فرطِ جذبات سے حالت ہی غیر ہوگئی۔ بے اختیار آپ کے قدموں میں گر گئے۔

جلال الدین نے انہیں اٹھایا اور فرمایا۔ ”دنیا کا کام عقبیٰ پر مقدم نہیں رکھنا چاہیے۔“

ملا وجیہہ الدین کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ جب طبیعت قابو میں آگئی تو آپ کے مریدوں میں شامل ہوگئے اور آپ ہی کے پاس رہنا شروع کردیا۔



آپ کے پاس دور دور سے لوگ آنے لگے تھے۔ مسجد میں درویشوں کا ہجوم رہتا جو ہر وقت آپ کو گھیرے رہتے۔ وہ رمضان کے دن تھے۔ آپ مسجد میں معتکف ہوچکے تھے۔ آپ کے قریب ہی درویش موجود رہتے۔ والیٔ اوچ سومرو کو بھی آپ سے ملنے کا اشتیاق ہوا۔ وہ مسجد پہنچا لیکن وہاں درویشوں کا ہجوم دیکھ کر مشتعل ہوگیا۔ اس نے ایک درویش سے کہا۔ ”یہ تم لوگوں نے یہاں ہجوم کیوں لگا رکھا ہے؟“

درویش نے جواب دیا۔ ”ہم لوگ سید کی بارگاہ میں ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ تجھ کو اس پر کیوں اعتراض ہے؟“

والیٔ اوچ سومرو کو اپنے حاکم ہونے کا شدید احساس تھا، غصے میں حکم دیا۔ ”بکواس بند کر اور میں جو حکم دوں اس کی تعمیل کر۔ ورنہ تو یہ جانتا ہی ہوگا کہ حاکم کی حکم عدولی کا کیا انجام ہوسکتا ہے۔“

درویش نے بھی تنک مزاجی سے جواب دیا۔ ”تو حاکم ہے تو ہوا کرے، یہاں کسی کی حکومت نہیں چلتی۔ یہ سید جلال الدین کا دربار ہے اور یہاں انہی کی حکومت ہے۔“

سومرو نے سختی سے کہا۔ ”میں سید صاحب سے ملنے آیا ہوں، درویشوں سے کہہ باہر چلے جائیں۔ جب میں مل کر واپس چلا جاؤں، وہ مسجد میں دوبارہ واپس آسکتے ہیں۔“

درویش نے ٹکا سا جواب دیا۔ ”تیرے حکم سے ایک درویش بھی باہر نہیں جائے گا۔ تجھے ملنا ہے تو ان درویشوں کے

درمیان سے گزر کر جا اور پیر و مرشد کی زیارت کر لے۔"

سومرو کے ساتھ اس کے سپاہی بھی آئے تھے جو اس کے پیچھے ہی موجود تھے۔ سومرو نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا اور درویش سے کہا۔ "کیا تو ان سپاہیوں کو نہیں دیکھ رہا؟ اگر میں انہیں حکم دے دوں تو یہ تیرے درویشوں کو مسجد سے اٹھا کر باہر پھینک دیں۔"

درویش نے جواب دیا۔ "میرے پاس تمہاری بے کار باتوں کا کوئی جواب نہیں۔"

یہ کہہ کر درویش سومرو کے پاس سے چلا گیا۔ سومرو نے اس کے جاتے ہی اپنے ایک سپاہی کو حکم دیا کہ وہ مسجد میں اعلان کر دے کہ والیِ اوچ سومرو سید جلال الدین بخاری سے ملنے آیا ہے۔ اس لیے مسجد میں موجود جملہ درویش فوراً باہر چلے جائیں اور اس وقت تک باہر کھڑے رہیں جب تک کہ والیِ اوچ ان کی زیارت سے فارغ نہ ہو جائے۔

والی کے اعلان کرنے والے نے یہ اعلان بہ آوازِ بلند کر دیا۔ درویشوں نے جو یہ اعلان سنا تو حیرت زدہ اپنی جگہ پر جس حالت میں تھے، اسی حالت میں رہ گئے۔ سومرو کچھ دیر تک اپنے حکم کی تعمیل کا انتظار کرتا رہا لیکن درویش ٹس سے مس نہ ہوئے۔

آخر سومرو نے اپنے سپاہیوں کی طرف دیکھا اور حکم دیا۔ "تم لوگ درویشوں کی ڈھٹائی دیکھ رہے ہو؟ انہیں چند لمحے اور دو۔ اگر اس کے بعد بھی یہ لوگ مسجد میں موجود رہیں تو انہیں دھکے دے کر باہر نکال دیا جائے۔"

اعلان کرنے والوں نے اعلان کیا۔ "درویشو! والیِ اوچ کی طرف سے چند لمحوں کی مہلت دی جا رہی ہے۔ اگر تم لوگ اس کے بعد بھی مسجد سے نہ نکلے تو تمہیں جبراً نکال باہر کیا جائے گا۔"

اندر حجرے میں سید جلال الدین بخاری بھی اعلان سن رہے تھے۔ آپ خاموش رہے حالانکہ آپ تفصیل جاننے کے لیے بہت بے چین تھے۔ باہر درویشوں میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی .... وہ سومرو کے سپاہیوں کا مقابلہ کر سکتے تھے لیکن مرشد کی اجازت کے بغیر یہ نہیں کر سکتے تھے۔

سومرو نے جب یہ دیکھا کہ کافی دیر گزر جانے کے باوجود درویشوں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تو وہ غصے میں پاگل ہو گیا۔ اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "سپاہیو! تم کھڑے کس بات کا انتظار کر رہے ہو؟ آگے بڑھو، مسجد میں داخل ہو کر ایک ایک درویش کو نکال کر باہر پھینک دو۔"

تندرست اور زور آور سپاہیوں نے مسجد میں داخل ہو کر درویشوں کو اٹھا اٹھا کر باہر پھینکنا شروع کر دیا۔ شور و غل اور چیخ پکار سے قیامت کا منظر پیدا ہو گیا۔ اندر حجرے میں آپ بے حد بے چین اور مضطرب تھے اور بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ جب درویشوں کو مسجد سے نکال دیا گیا تو سومرو فاتحانہ شان سے اندر داخل ہوا اور آپ کے حجرے میں جا کر آپ کے روبرو جا بیٹھا اور ہنس ہنس کر باتیں کرنا چاہیں۔ آپ بڑے غصے میں تھے، پوچھا۔ "سومرو! یہ تو نے کیا کیا؟"

سومرو نے جواب دیا۔ "حضرت! اس دنیا میں دو نظام رائج ہیں، ایک روحانی، دوسرا مادی۔ روحانی دنیا کی حکومت آپ کے ذمے ہے اور مادی دنیا میں، میں حاکم ہوں۔ ایک حاکم دوسرے حاکم سے ملنے آیا تو حشرات الارض خواہ مخواہ اس کا راستہ روکنے لگے۔ میں نے جو کچھ کیا، بدرجہ مجبوری کیا۔ آپ خود ہی بتائیں کہ اگر میں یہ نہ کرتا تو کیا کرتا؟"

مخدوم جہانیاں نے کہا۔ "تو کیا کہہ رہا ہے میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کون حاکم...... کہاں کا حاکم...... کس کا حاکم؟ سومرو! میرا خیال ہے تو دیوانہ ہو چکا ہے اور ساری باتیں پاگل پن میں کر رہا ہے۔"

سومرو نے سکوت اختیار کیا، آنکھیں بند کیں، زور کی جھرجھری لی اور بے ساختہ حجرے سے نکل گیا۔ باہر نکلتے ہی چیخا۔ "سپاہیو! تم سب کہاں مر گئے؟ ادھر آؤ، دیکھو میں تمہارا حاکم ہوں۔ اوچ ہی کا حاکم نہیں، دہلی کا بادشاہ، پورے ملک کا بادشاہ۔ دہلی کا بادشاہ باغی ہے جو باغی بن کر میرے تخت و تاج پر قبضہ کر بیٹھا ہے۔ میں اپنی فوج کے ساتھ دہلی پر حملہ کروں گا اور اس غاصب اور باغی کو قتل کر کے دوبارہ قبضہ کر لوں گا۔"

سومرو کے سپاہیوں نے یہ حیرت انگیز مگر دیوانگی کی باتیں سنیں تو پریشان ہو گئے۔ سومرو نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "سپاہیو! دہلی کی طرف کوچ کرنے کی تیاری کرو۔ اب میں مزید برداشت نہیں کروں گا۔"

سپاہیوں نے آپس میں کہا۔ "یہ اس کو کیا ہو گیا؟"

دوسرے سپاہی نے جواب دیا۔ "شاید دماغ خراب ہو گیا۔"

ایک اور سپاہی بولا۔ "حضرات! اس سے دور رہو کیونکہ اس کے تیور بتا رہے ہیں کہ یہ ہم پر حملہ بھی کر سکتا ہے۔"

چوتھے سپاہی نے جواب دیا۔ "دیوانگی میں ہم پر حملہ کرے گا تو مار بھی کھائے گا۔ کم از کم میں تو اس کو معاف نہیں کروں گا۔"

پانچویں نے کہا۔ "یہ ہمارا حاکم ہے۔ ہم اس پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔"

چوتھے سپاہی نے جواب دیا۔ "یہ ہمارا حاکم اس وقت تک تھا جب تک اس کا دماغ نہیں خراب ہوا تھا۔ اب تو یہ اوچ کا والی بھی نہیں رہا کیونکہ کوئی پاگل والی کے منصب پر کس طرح فائز رہ سکتا ہے؟"

سومرو نے پھر حکم دیا۔ "سپاہیو! تمہیں دہلی کی طرف کوچ کرنا ہے۔ یہ تم کن فضول مباحث میں پڑ گئے۔ دہلی چلنے کی تیاری کرو۔ اگر دہلی کا تاج و تخت واپس مل گیا تو میں تمہیں نواز دوں گا۔"

سپاہیوں کو بالکل یقین ہو گیا کہ سومرو پاگل ہو چکا ہے۔ یہ پاگل کیوں ہوا؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ سپاہی اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے اور سومرو دیوانہ وار اِدھر اُدھر کے چکر لگانے لگا۔ اس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور سر پر خاک ڈال کر چیخنے چلانے لگا کہ میں دہلی کا بادشاہ ہوں، میں ہندوستان کا سچا حکمران ہوں۔ دہلی کا موجودہ بادشاہ غدار اور غاصب ہے۔ میں اس کے خلاف لشکر کشی کروں گا اور اس کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر دم لوں گا۔

سومرو کے بزرگوں نے جب یہ باتیں سنیں تو بہت گھبرائے اور آپس میں صلاح مشورے کرنے لگے۔ وہ سب اس پر متفق تھے کہ اگر یہ باتیں دہلی کے بادشاہ کے کانوں تک پہنچیں تو وہ بغاوت کے جرم میں اس خاندان پر عتاب نازل کر سکتا ہے۔ چنانچہ یہ تجویز طے پائی کہ پہلے سومرو کو گھر واپس لایا جائے۔ اس کے بعد کوئی اور قدم اٹھایا جائے۔

یہ لوگ باتفاقِ رائے سومرو کو بلانے گئے۔ اس وقت وہ بازار میں ننگ دھڑنگ شور کرتا پھر رہا تھا۔ سومرو کے بزرگوں نے اسے آواز دی۔ "سومرو! یہ تجھے ہو کیا گیا ہے؟"

سومرو نے انہیں غور سے دیکھا اور پوچھا۔ "تم لوگ کون ہو اور میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "سومرو! ہمیں پہچان، ہم تیرے بزرگ ہیں۔ تو اپنے گھر چل۔"

سومرو زور زور سے ہنسنے لگا۔ بولا۔ "خوب، تو تم سب میرے بزرگ ہو اور مجھے لینے آئے ہو؟" پھر ایک دم چپ ہو گیا۔ ذرا دیر بعد ایک دم سنجیدہ ہو گیا اور پھر انہیں ڈانٹنے لگا، بولا۔ "بھاگ جاؤ۔ میں تم سب کو خوب پہچانتا ہوں۔ تم لوگوں کو دہلی کے بادشاہ نے میرے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ تم سب دھوکے سے مجھے اس کی قید میں پہنچا دو۔ لیکن میں تمہارے داؤ میں نہیں آؤں گا۔ ہرگز ہرگز نہیں آؤں گا۔" اس کے بعد اس نے اپنے سپاہیوں کو آواز دی۔ "ارے سپاہیو! تم سب کہاں مر گئے؟ تمہارے بادشاہ کو لوگ گرفتار کرنے آئے ہیں اور تم سب منہ چھپائے پھر رہے ہو۔ آؤ، بھاگ کر آؤ اور میرے دشمنوں کا مقابلہ کرو۔"

لیکن سپاہی کہاں تھے جو آتے۔ بزرگوں نے ایک بار پھر آپس میں مشورہ کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ سومرو کو زبردستی گھر لے جانا چاہیے۔ ورنہ یہ پورے خاندان کی تباہی کا باعث بن جائے گا۔

ایک طاقتور بزرگ نے سومرو کو اپنی گرفت میں لینا چاہا تو سومرو نے اسے دھکا دے کر گرا دیا جس سے اس شخص کا سر پھٹ گیا اور خون جاری ہو گیا۔ سومرو نے اس کو دبا لیا اور اس کی مکوں اور لاتوں سے مرمت کرنے لگا۔ دوسرے بزرگوں نے سومرو کو دبا لیا اور بڑی پھرتی سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے بے بس کر دیا۔ وہ بے بس ہونے کے باوجود چیخے جا رہا تھا۔ "ذلیلو! مجھے چھوڑ دو۔ تم نے مجھ سے میری حکومت چھین لی اور اب مجھے قید میں ڈال دینا چاہتے ہو۔ میں تم سب کا خون پی لوں گا۔"

وہ لوگ سومرو کو باندھ کر گھر لے گئے۔ سومرو کی ماں بیٹے کو بندھا ہوا دیکھ کر بے چین ہو گئی۔ اس نے روتے ہوئے پوچھا۔ "میرے بیٹے کا یہ حال کس نے کیا؟ اسے کس کی نظر لگ گئی؟"

اس دوران ایک سپاہی بھی سومرو کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے اعلان کیا۔ ''میں جانتا ہوں کہ میرے مالک کا دماغ کیوں خراب ہوگیا اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کا علاج کیا اور کہاں ہے۔''

غمزدہ ماں نے فوراً ہی حکم دیا۔ ''اس سپاہی کو اسی وقت میرے روبرو حاضر کیا جائے۔''

لوگوں نے سپاہی کو سومرو کی ماں کے پاس پہنچا دیا۔ ماں نے واقعے کی تفصیل پوچھی تو سپاہی نے شروع سے آخر تک سب کچھ بتا دیا اور کہا۔ ''جہاں تک میرا خیال ہے، یہ جو کچھ ہوا بابا جہانیاں جہاں گشت کی بددعا کا نتیجہ ہے۔''

ماں نے کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو میں اسی وقت ان کی خدمت میں جاؤں گی اور ان سے اپنا بیٹا واپس مانگوں گی۔''

سپاہی خاموش ہوگیا۔ ماں نے اسی وقت جانے کی تیاری شروع کی اور مخدوم جہانیاں کی خدمت میں پہنچ گئی۔ حجرے کے باہر قنیس رکھ دی گئی اور آپ کو حجرے میں مطلع کر دیا گیا۔

آپ نے فرمایا۔ ''یہ عورت مجھ سے کیا لینے آئی ہے؟''

جب اس سے یہ پوچھا گیا تو اس نے کہا۔ ''پیر و مرشد سے میں خود بات کروں گی۔''

آپ نے اس کو براہِ راست مخاطب کیا۔ ''مائی! تو کیا چاہتی ہے؟''

سومرو کی ماں نے جواب دیا۔ ''حضرت! یہ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ میں کیا چاہتی ہوں؟ آپ خوب جانتے ہیں کہ میں کیا چاہتی ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''مائی! تیرا بیٹا تو اوچ کا حاکم تھا۔ اس کے بقول میں روحانی حاکم ہوں اور وہ مادی حاکم تھا۔ اس نے میری مرضی کے خلاف طاقت کا مظاہرہ کیا اور میرے درویشوں کو اپنے سپاہیوں کے ذریعے اس مسجد سے زبردستی نکلوا دیا۔ میرے پاس نہ تو سپاہی ہیں اور نہ ہی فوج۔ میں نے تو اس سے یہ کہا تھا کہ سومرو! میرا خیال ہے تو دیوانہ ہو چکا ہے۔ چنانچہ اس نے واقعی دیوانہ بن کے دکھا دیا۔''

ماں نے روتے ہوئے کہا۔ ''حضرت! اب میں کیا کروں؟ آپ کے نزدیک تو یہ ذرا سی بات تھی لیکن میرے بیٹے کی تو زندگی ہی برباد ہوگئی۔ میں تباہ ہوگئی۔ میں اب کیا کروں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''مائی جا اور صبر سے کام لے...... میں کیا کر سکتا ہوں۔''

ماں نے کہا۔ ''آپ میرے بیٹے کو پچھلی حالت میں لا سکتے ہیں۔ اس کو صحیح الدماغ کر سکتے ہیں۔''

آپ نے کہا۔ ''مائی! صبر کر، میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔''

ماں پردے سے باہر آگئی اور آپ کے قدموں میں گر گئی، روتے ہوئے کہا۔ ''حضرت! آپ اچھی طرح سن لیجیے۔ میں آپ کے قدموں میں اس وقت تک پڑی رہوں گی جب تک کہ آپ میرے بیٹے کو واپس نہیں کر دیں گے۔''

جب آپ نے ماں کو اس قدر بضد اور بے چین دیکھا تو فرمایا۔ ''اچھا! اسے میرے پاس لے آ۔ پھر میں بتاؤں گا، اس کا علاج کس طرح کیا جائے کہ وہ صحیح الدماغ ہو جائے۔''

ماں فوراً واپس گئی اور زنجیروں میں جکڑے ہوئے بیٹے کو لے کر آپ کی خدمت میں پہنچ گئی۔

جب سومرو کو آپ کے روبرو پیش کیا گیا تو وہ آپ کو دیکھتے ہی زار و قطار رونے لگا، بولا۔ ''اے بادشاہ! میں بادشاہی کے دعوے سے باز آیا۔ تو خدا کے لیے مجھے معاف کر کے رہائی دے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میرے نادان! بادشاہی صرف خدا کو زیب دیتی ہے۔ اب تو نادم ہے تو تیرا علاج بھی ہو جائے گا اور قیدِ جنوں سے رہائی بھی مل جائے گی۔''

اس کے بعد آپ نے سورۂ فاتحہ پڑھی اور اس پر دم کر کے فرمایا۔ ''جاؤ، اسے غسل دے کر نئے کپڑے پہناؤ۔ اس کے بعد اسے جمال خجندی کے مزار پر لے جاؤ۔ اللہ نے چاہا تو وہاں شفائے کامل حاصل ہو جائے گی۔''

سومرو کی ماں نے کہا۔ ''حضرت! اس کو غسل دلوانا کوئی معمولی بات تو نہیں۔ یہ تو زور آزمائی شروع کر دے گا اور ڈر ہے کہ کہیں فرار نہ ہو جائے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے اس پر دم کر دیا ہے جس سے اس کی سرکشی دور ہو چکی ہے۔ اب

یہ زور آزمائی نہیں کرے گا۔''

ماں نے سومرو کو گھر واپس لے جا کر نہلوایا اور نیا لباس پہنایا۔ سومرو نے کوئی ہنگامہ نہ کیا۔ اس کے بعد اس کو شیخ جمال خجندی کے مزار پر لے جایا گیا۔ وہاں کھڑے ہوتے ہی سومرو اپنی اصل حالت میں آگیا۔ اپنے آس پاس لوگوں کو دیکھ کر پوچھا۔ ''آپ بھی یہیں موجود ہیں...... یہ تماشا کیا ہے؟ یہ معاملہ کیا ہے؟''

ماں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''بیٹے سومرو! اس وقت میں جتنی خوش ہوں تُو اس کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ گھر واپس چل۔ وہیں چل کر سب کچھ بتا دوں گی۔''

سومرو نے بڑی پریشانی اور حیرت سے اپنے چاروں طرف دیکھا اور مزار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''ماں! یہ کس کا مزار ہے؟''

ماں نے جواب دیا۔ ''شیخ جمال خجندی کا۔''

سومرو نے کچھ اور نہیں پوچھا۔ ماں اس کو ساتھ لے کر واپس آگئی اور وہاں بیٹے کو سب کچھ بتا دیا اور کہا۔ ''تُو نے یہ دوسری زندگی پائی ہے اور اس زندگی پر مخدوم جہانیاں جہاں کا جتنا بھی شکریہ ادا کرو کم ہے۔ میں تو ان کی خدمت میں ایک بار پھر جاؤں گی اور ان کا شکریہ ادا کروں گی۔''

سومرو نے کہا۔ ''ماں! آپ کے ساتھ میں خود بھی چلوں گا اور اپنی زیادتی کی معافی چاہوں گا۔''

ماں بیٹے کو ساتھ لے کر جہانیاں کی خدمت میں پہنچ گئی اور سومرو کو آگے بڑھا کر عرض کیا۔ ''حضرت! آپ کا غلام حاضر ہے۔ اس کو معاف کر دیجیے۔''

آپ نے مسکرا کر سومرو کو دیکھا۔ ''آ، اوچ کے حاکم خوش آمدید!''

سومرو آپ کے قدموں میں گر گیا اور کہا۔ ''حضرت! اوچ کا حاکم نہیں آپ کا خادم۔ میں اپنی گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔''

سومرو کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ آپ نے جواب دیا۔ ''سومرو! میں تو تجھے کب کا معاف کر چکا۔ اگر میں نے معاف نہ کیا ہوتا تو تو اس وقت میرے پاس معافی مانگنے نہ آتا۔''

ماں نے کہا۔ ''بس مخدوم جہانیاں جی، مجھے یقین آگیا ہے کہ آپ نے معاف کر دیا ہے۔''

آپ نے سومرو سے کہا۔ ''سومرو! اب کسی کی دل آزاری نہ کرنا اور حکومت میں کسی کو حقیر اور ذلیل نہ سمجھنا۔''

سومرو نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں تو توبہ کر چکا۔ مجھے اس دربار سے جو سبق ملا ہے اس کو زندگی بھر یاد رکھوں گا۔ اب میں پہلے والا سومرو نہیں رہا، میں دوسرا سومرو ہوں جو آپ کی نوازش سے دھل دھلا کر پاک ہوگیا۔''

دونوں ماں بیٹے آپ سے رخصت ہو کر گھر واپس آگئے اور اب وہ اتنے نرم دل اور دوسروں کے کام آنے والے بن چکے تھے کہ دوسروں کو ان کی سادگی اور بھلائی کا یقین نہیں آتا تھا۔

☆☆☆

آپ کو شیخ الاسلام کا منصب عطا ہوا اور سلطنتِ دہلی میں آپ کا اعزاز و احترام اتنا بڑھا کہ بادشاہ آپ کی قدم بوسی کو باعثِ عزت سمجھنے لگا۔ اس دوران آپ نے ایک بار پھر سفرِ حج کی تیاری شروع کر دی۔ یہ آپ کا چھٹا اور آخری حج تھا۔ دوسرے درویشوں کے ساتھ ملا شمس الدین بھی ہم رکاب تھے۔ آپ ان سب کے ساتھ بحری جہاز میں بیٹھے اور جہاز اپنے سفر پر روانہ ہوگیا۔ راستے میں جہاز ہی پر درویشوں نے اپنے دلوں میں سوچا کہ اگر مچھلی میسر آجاتی تو کتنا اچھا ہوتا لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جہاز میں مچھلی کہاں مل سکتی ہے۔

آپ جہاز کے ایک گوشے میں بیٹھے اللہ اللہ میں مشغول تھے۔ دفعتاً آپ نے درویشوں سے پوچھا۔ ''کیا تم نے قرآن پاک کے اس وعدے کو یاد رکھا ''**لاتقنطوا من رحمة الله**'' (اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا)''

درویشوں نے یک آواز جواب دیا۔ ''ہم اللہ کے اس وعدے کو کس طرح بھلا سکتے ہیں؟''

آپ نے فرمایا۔ ''دیکھو غلط بیانی سے کام نہ لو جبکہ اصل بات یہ ہے کہ تم سب خدا کی رحمت سے ناامید ہو چکے ہو اور

اس کے بے حد بے حساب کرم کا خیال ذہنوں سے نکل چکا ہے۔"

ایک درویش نے عاجزی سے جواب دیا۔ "شاید آپ بجا فرما رہے ہیں۔"

آپ نے بڑے جوش اور جذبے سے فرمایا۔ "کیا مچھلی اس جہاز پر میسر نہیں آسکتی؟"

اب لوگوں کو احساس ہوا کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے یک آواز جواب دیا۔ "ہم اس کی نوازشوں اور کرم فرمائیوں کو بھلا کر جا بھی کہاں سکتے ہیں اور یہ درست ہے کہ اس وقت ہم سب مچھلی کھانے کی خواہش میں بھی حیران و پریشان ہو رہے تھے اور مایوسی سے یہ سوچ رہے تھے کہ جہاز پر مچھلی کہاں مل سکتی تھی۔"

آپ نے فرمایا۔ "جہاز پر مچھلی کیوں نہیں مل سکتی؟"

کسی درویش نے جواب دیا۔ "مچھلی بازاروں میں مل سکتی ہے، دکانوں پر مل سکتی ہے، ساحل پر مل سکتی ہے لیکن بیچ سمندر اور بیچ جہاز میں کہاں اور کیسے ملے گی؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

آپ نے جواب دیا۔ "وہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ تم اپنی عبودیت میں جو دعویٰ چاہو کرو، لیکن یہ دعویٰ نہیں کرسکتے کہ تم اللہ کی رحمت اور مہربانی سے مایوس نہیں ہوئے ہو۔"

درویشوں نے دبی آواز میں کہا۔ "آپ نے درست فرمایا۔ ہم سب کے دلوں کی جو کیفیت تھی اس سے آپ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم سب اللہ کی رحمت اور نوازش سے کسی حد تک مایوس ضرور ہیں۔"

ایک درویش نے عرض کیا۔ "اور اس مایوسی کا بنیادی سبب بھی تو ہے، بھلا اس سمندر میں مچھلی کہاں سے ملے گی؟ شکار محال، دکان مفقود، خشکی غائب پھر مچھلی آئے گی کہاں سے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "لیکن خدا کی قدرت لامحدود اور بے حد بے حساب ہے۔ اس کے اکرام و انعام کے لیے اسباب کی موجودگی ضروری نہیں۔ وہ اپنے انعام و اکرام کے اسباب پیدا کرسکتا ہے۔"

یہ گفتگو جاری ہی تھی کہ سمندر کی موجیں اونچی اونچی اٹھنے لگیں۔ یہ موجیں ایک طرف سے اٹھتیں اور جہاز کی دوسری طرف نکل جاتیں۔ درویشوں کا مارے ڈر کے برا حال ہوگیا۔ انہوں نے آپ سے درخواست کی۔ "حضرت! خدا سے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں ان موجوں سے محفوظ و مامون رکھے۔ ورنہ اگر دیر تک یہ صورت قائم رہی تو جہاز کی تباہی کا خطرہ پیدا ہوجائے گا۔"

آپ نے مطمئن لہجے میں جواب دیا۔ "نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ جہاز تباہ نہیں ہوگا بلکہ اس میں بھی کوئی خدا کی مصلحت ہے۔ تم لوگ فکر نہ کرو۔"

اچانک لوگوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے جہاز پر مچھلیوں کو تڑپتے پھڑکتے دیکھا۔ وہ مچھلیوں پر جھپٹے اور انہیں پکڑنے لگے۔ انہیں حیرت تھی کہ یہ مچھلیاں کہاں سے آگئیں۔ آپؒ نے فرمایا۔ "کیا میں نے تمہیں سمجھایا نہیں تھا کہ اللہ جب کرم اور مہربانی کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے اسباب کی موجودگی ضروری نہیں ہوتی بلکہ وہ اسباب خود پیدا کردیتا ہے۔ چنانچہ اس نے پیدا کردیے۔ دوسری بات یہ کہ تم سب موجوں کی یورش سے خوفزدہ اور پریشان تھے جبکہ یہی موجیں تمہارے حق میں مفید ثابت ہوئیں۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ جسے تم مصیبت سمجھ رہے تھے، اس میں تمہاری بھلائی موجود تھی۔"

درویشوں نے فرطِ جذبات میں نعرہ لگایا۔ "بے شک، بے شک...... پیرومرشد نے بجا فرمایا۔"

ان مچھلیوں کو درویشوں نے پکایا اور مزے لے لے کر کھایا۔ آپ نے مریدوں سے کہا۔ "درویشو! خدا کا شکر ادا کرو جس نے تمہاری خواہش پوری کردی، جو تمہارے قیاس اور عقل میں نہیں آئی تھی۔"

درویشوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

جہاز نے انہیں جدہ میں اتار دیا۔ یہاں سب حضرت حوا کی قبر کی زیارت کی غرض سے چل پڑے۔ آپ نے جملہ درویشوں کے ساتھ قبر کی زیارت کی۔ اس وقت کچھ لوگ ایک جنازہ لائے اور اسے حضرت حوا کی قبر کے پاس دفن کرنا چاہا۔ آپ نے معلوم نہیں کیا محسوس کیا کہ جنازہ لانے والوں کے پاس پہنچ گئے اور ان سے پوچھا۔ "جناب! یہ کس کا جنازہ ہے؟"

ایک شخص نے جواب دیا۔ "بابا! یہ ایک بہت بڑے آدمی کا تابوت ہے۔"

آپ نے پوچھا۔ "میں اس کا تعارف چاہتا ہوں کیونکہ شاید میں آپ لوگوں کی کوئی مدد کرسکوں۔"

جنازے میں شریک دوسروں نے بھی آپ کی باتیں سن لیں۔ ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہا۔ "حضرت! آپ کون ہیں اور کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میرا نام سید جلال الدین حسین بخاری ہے اور مجھے دو بزرگوں نے عالمِ ارواح سے مخدوم جہانیاں کا لقب دیا ہے۔ لیکن میں نے چونکہ سیر و سیاحت بہت کی ہے، اس لیے خلائق میں جہانیاں جہاں گشت کہلاتا ہوں۔"

اس شخص نے کہا۔ "تو آپ مجھ سے مرحوم کا تعارف سنیے۔ یہ تابوت شیخ بدرالدین یمنی کا ہے۔ مرحوم تیس برس سے حرمین الشریفین میں مجاور رہے ہیں۔ کل مکہ معظمہ سے جدہ تشریف لائے تھے اور قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول تھے کہ پیمانۂ عمر لبریز ہوگیا۔"

آپ نے سب کچھ سن کر سکوت اختیار کیا پھر آنکھیں بند کرلیں اور مراقبے میں چلے گئے۔ لوگ آپ کی حرکات و کیفیات کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد آپ نے آنکھیں کھول دیں اور سر اٹھاتے ہوئے فرمایا۔ "لوگو! انہیں دفن نہ کرنا کیونکہ ان کا انتقال نہیں ہوا۔ یہ زندہ ہیں اور مرضِ سکتہ میں مبتلا ہیں۔"

لوگوں کو آپ کی باتوں پر حیرت ہوئی، کسی نے پوچھا۔ "مگر ہمیں کس طرح یقین آئے کہ شیخ مرے نہیں، سکتے میں مبتلا ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "آپ لوگ شیخ کا تابوت مسجد تک لے چلیں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے، اس کا یقین بھی دلا دوں گا اور آپ لوگ یقین بھی اسی وقت کریں گے جب یہ ثابت ہوجائے گا کہ شیخ سکتے میں مبتلا ہیں۔"

آپ کی خواہش پر شیخ کا تابوت مسجد لے جایا گیا۔ آپ نے تابوت کو مسجد کے حجرے میں رکھوا کر سب کو حجرے سے باہر نکال دیا اور خود حجرے کا دروازہ اندر سے بند کرکے بیٹھ گئے۔ اس کے بعد آپ نے تابوت کھولا اور شیخ کو تابوت سے باہر نکالا۔ حجرے میں ایک بوریا بچھا ہوا تھا۔ آپ نے شیخ کے جسمِ مدہوش کو اس بوریے پر لٹا دیا۔ اس کے بعد دو رکعت نماز ادا کی اور پھر تلاوتِ قرآن پاک میں مشغول ہوگئے۔ آپ نے فرمایا۔ "حیی الذی لا یموت" (تو زندہ ہے مردہ نہیں)

اسی وقت شیخ بدرالدین یمنی کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور کچھ دیر بعد وہ اٹھ بیٹھے۔ اپنے سامنے حجرے میں آپ کو دیکھ کر پوچھا۔ "حضرت! آپ کون ہیں اور یہاں کیا کررہے ہیں؟"

آپ نے مختصراً اپنا تعارف کرادیا اور کہا۔ "بدرالدین! آج اگر میں یہاں نہ آگیا ہوتا تو تجھے زندہ دفن کردیا جاتا۔ میرا آنا تو تیرے حق میں آبِ حیات ثابت ہوا جو تجھے زندہ رکھے ہوئے ہے۔ ورنہ تو آج جیتے جی قبر کے ایک گوشے میں محوِ خواب ہوتا اور سکتے سے ہوش آنے پر تیرا دم گھٹ جاتا۔"

بدرالدین یمنی نے عقیدت سے آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور شکریہ ادا کیا۔ باہر لوگ خیریت معلوم کرنے کے لیے بے چین تھے۔ انہوں نے باتوں کی جو آواز سنی تو زور زور سے چلانا شروع کردیا، پوچھا۔ "کیا شیخ کو ہوش آگیا؟"

آپ نے حجرے کا دروازہ کھلوا دیا۔ دروازے کے کھلتے ہی لوگوں نے آپ کو گھیر لیا۔ بدرالدین یمنی حیران و پریشان ایک ایک کی صورت دیکھ رہے تھے۔ مخدوم جہانیاں نے انہیں جامۂ خاص مرحمت فرمایا اور خواہش کی کہ شیخ بدرالدین امامت فرمائیں۔ وہ خود اپنے درویشوں کے ساتھ ان کی اقتدا میں نماز ادا فرمائیں گے۔

یہ عصر کا وقت تھا، مسجد کا دروازہ ہر ایک کے لیے کھل گیا اور یہ اعلان کردیا گیا کہ شیخ بدرالدین یمنی امامت فرمائیں گے۔ ان کی امامت میں جو بھی نماز پڑھنا چاہے، پڑھ لے۔

جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ جس شیخ کو انہوں نے مرحوم سمجھ لیا تھا، وہ زندہ ہے تو انہیں بڑی حیرت ہوئی اور مسجد میں داخل ہوکر عصر کی نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ اس وقت دونوں طرف کے آدمی نمازِ عصر ایک ساتھ ادا کررہے تھے۔ حضرت جہانیاں جہاں بھی آپ کے پیچھے کھڑے ہوگئے اور شیخ کی امامت میں نمازِ عصر پڑھی... یہاں سے فارغ ہوکر آپ بدرالدین یمنی کے ساتھ ہی کعبۃ اللہ میں تشریف لے گئے اور سعادتِ طواف سے مشرف ہوکر شیخ ہی کے ہمراہ مدینہ منورہ

روانہ ہوگئے۔

مدینے میں آپ نے حضور ﷺ کے روضۂ مبارک پر جا کر سلام عرض کیا...... ''السلام علیکم یا جداہ۔''

اسی وقت آپ کو اندر سے جواب ملا۔ ''وعلیکم السلام یا ولدی۔''

☆☆☆

اب تو آپ کا یہ حال تھا کہ جس کسی کے گلے ملتے، گلے سے لگتے ہی آپ اس کی ساری ریاضت کھینچ لیتے اور وہ کھکھ کا کھکھ ہو جاتا۔ ایک دن آپ نے ایک بزرگ کو جوشِ جذبات میں اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ شخص مخدوم جہانیاں کے سینے سے الگ ہوتے ہی اپنے آپ کو خالی خالی محسوس کرنے لگا۔ اس کا سینہ سوز سے خالی ہو چکا تھا۔

اس نے بہت پریشان ہو کر شرمندگی سے کہا۔ ''حضرت! یہ کیا بات ہے کہ میں اب کچھ بھی نہیں رہا۔ آپ کے سینے سے لگتے ہی میں نے اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ یہ کیا بات ہے؟''

آپ نے تبسم فرمایا۔ بولے۔ ''ہاں بابا! تو سچ کہتا ہے۔ اب تو اپنا یہ حال ہو گیا ہے کہ میرے سینے میں مقناطیسیت سی آگئی ہے۔ میں جس سے بھی گلے ملوں گا، اس کا کمال چھین لوں گا۔ اس لیے لوگوں کو میرا مشورہ ہے کہ وہ مجھ سے گلے نہ ملیں۔''

بزرگ نے عاجزی سے درخواست کی۔ ''حضرت! میرا سوز واپس فرما دیجیے۔ میں تو کہیں کا بھی نہیں رہا۔''

آپ نے دوبارہ گلے لگ کر اس سے جو کچھ بھی لیا تھا، واپس کر دیا۔

آپ کو غیر شرعی رسوم سے نفرت تھی۔ یہاں تک کہ غیر شرعی تعظیم تک ناپسند تھی۔ ایک مرید نے آپ کی تعریف میں ایک نظم لکھی اور اس میں آپ کو سید السادات لکھ دیا۔ آپ نے اس کو منع فرمایا۔ ''بابا! میں سید السادات نہیں گدائے عالم ہوں۔ یہی تم بھی لکھ لو۔''

سلطان فیروز شاہ تغلق کو آپ سے بڑی عقیدت تھی۔ آپ دہلی تشریف لے جایا کرتے تھے۔ جب بھی جاتے، بادشاہ استقبال کے لیے دوڑا ہوا آپ کے پاس جاتا۔ خود بادشاہ بھی آپ کی قیام گاہ پر ملاقات کے لیے جایا کرتا تھا۔

آپ کو کسی عزیز نے خط لکھا۔ آپ نے اپنے کسی مرید کو حکم دیا کہ اس کا جواب فوراً روانہ کیا جائے۔ مرید نے عرض کیا۔ ''حضرت! جواب میں اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اگر تجھے کوئی شخص سلام کرے تو، تو اس کا جواب فوراً دے گا یا تاخیر سے...... یا جب جی میں آئے گا؟''

مرید نے کہا۔ ''سلام کا جواب تو میں فوراً دوں گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''بس پھر اسی طرح خط کا جواب بھی فوراً ہی دے دے کیونکہ سلام اور جوابِ سلام اور خط اور جوابِ خط میں کوئی فرق نہیں۔''

مرید نے اسی وقت خط کا جواب لکھ دیا۔ اس طرح اگر آپ کے پاس کوئی ہدیہ لاتا تو آپ ہدیہ کے عوض کچھ نہ کچھ مرحمت ضرور فرماتے۔ آپ اپنے مریدوں کو نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی تمہارے لیے ہدیہ لائے تو تمہیں بھی اس کا بدلہ دینا چاہیے اور اگر تمہارے پاس دینے کے لیے کچھ بھی نہ ہو تو لانے والے کے حق میں دعائے خیر ہی کر دو۔

آپ اٹھتر سال تک زندہ رہے اور آپ کی ذات سے لوگوں کو بے انتہا فیض پہنچا۔ آخر 10 ذی الحجہ 785 ہجری بروز عیدِ قربان 3 فروری 1384ء بروز بدھ وصال فرمایا۔ آپ کا مزار آج بھی اوچ (بہاول پور) میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ دروازے پر درج ذیل تاریخِ وفات ثبت ہے۔

تاریک گشت جملہ جہاں بے جمال شاہ
تاریخ بود ہفت صد ہشتاد و پنج سال

ماخذات الطبقات الکبریٰ، علامہ عبدالوہاب الشعرانی۔ روضتہ الریاحین، ابی محمد عبداللہ سفینۃ الاولیاء، شہزادہ دارا شکوہ۔ تذکرۃ الاولیاء، شیخ فرید الدین عطار

شمع عباس

چال

یوں تو مشکل گھڑیوں میں ہر کوئی تدبیریں آزماتا ہے لیکن تدبیروں سے مشکل کو آسانی میں کوئی کوئی بدل پاتا ہے... اگرچہ وہ بھی اس ہنر سے واقف تو نہ تھا مگر ایک تیر تھا جو ٹھیک نشانے پر لگا اور تدبیر کی ایک چھوٹی سی چال سے تقدیر کا چلن ایک دم سنبھل گیا۔

پردیس سے درآمد شدہ مجرمانہ سرگرمیوں کا احوال

بار کے دروازے پر کھڑے ہو کر جیراللہ نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ کار ایک بلاک کے فاصلے پر رک گئی تھی اور اس میں دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ تیزی سے بار میں داخل ہو گیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ وہ جمعرات کی رات تھی لیکن ویک اینڈ نہ ہونے کے باوجود وہاں خاصا رش تھا۔ اس علاقے میں ایسے بار بہت کم تھے جہاں کوئی عورت تنہا یا اپنے کسی دوست کے ساتھ جا سکے لیکن اس بار میں اسے عورتیں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے کچھ اکیلی اور باقی اپنے دوستوں

کے ہمراہ تھیں۔ اس نے ہال کا جائزہ لیا اور اس کی نظریں ایک لڑکی پر جا کر رک گئیں جو ایک چھوٹی سی میز پر تنہا بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے سامنے ایک خالی گلاس رکھا ہوا تھا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی سے ملنے نہیں آئی کیونکہ نہ تو وہ بار بار اپنا میک اپ ٹھیک کر رہی تھی اور نہ ہی اس کی نظریں کسی کے انتظار میں دروازے کا طواف کر رہی تھیں۔

جبر اللہ سیدھا کاؤنٹر پر گیا۔ اس نے اپنے لیے وائن کا گلاس بنوایا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس لڑکی کے قریب آ کر بولا۔ ”ہائے۔“

اس کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے لڑکی کو وہاں دیکھ کر اسے حیرت ہوئی ہو۔ اس لڑکی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کی نظریں جبر اللہ کے چہرے پر جم گئیں۔ جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور بے تکلفی سے بولا۔ ”تم اب بھی یہاں آتی ہو۔ میرا خیال تھا کہ تمہیں یہ جگہ کچھ زیادہ پسند نہیں۔“

”ایکسکیوزمی!“

”گزشتہ بار تم نے کہا تھا کہ تمہیں یہ جگہ پسند نہیں۔ اس لیے میں یہی سوچ رہا تھا کہ تم کبھی یہاں نہیں آؤ گی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے ایکسکیوزمی کیوں کہا حالانکہ تم صاف صاف کہہ سکتی تھیں کہ میں کیسی باتیں کر رہا ہوں۔“

اس لڑکی کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ قدرے پُرسکون نظر آنے لگی۔ اسے یہ شخص دلچسپ لگا جو باتونی ہونے کے ساتھ ساتھ خوش مزاج بھی تھا۔ جبر اللہ عورتوں کو متاثر کرنے کا فن جانتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ شائستہ انداز میں گفتگو کرتا تھا اور اس کے چہرے پر مکاری یا عیاری کے بجائے خلوص کی جھلک نظر آتی تھی۔ ایک گرل فرینڈ نے ایک مرتبہ اسے بتایا تھا کہ وہ دیکھنے میں انتہائی بے ضرر، نرم اور ٹھنڈے مزاج کا نظر آتا ہے کہ لڑکیاں اس سے خوف زدہ نہیں ہوتیں۔

”میں اتنی بداخلاق اور بدتمیز نہیں ہوں کہ تم سے براہ راست دفع ہو جانے کے لیے کہہ دیتی۔“ وہ لڑکی مسکراتے ہوئے بولی۔ ”اس لیے میں نے ایکسکیوزمی کہا تھا۔“

”لگتا ہے کہ تم کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہو اور تم نے کسی اچھے اسکول میں پڑھا ہے، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“

اس کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ وہ ان لڑکیوں سے مختلف لگ رہی تھی جو فوراً ہی مردوں سے بے تکلف ہو جاتی ہیں۔ اس کے چہرے کی معصومیت سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ عام لڑکیوں سے مختلف ہے۔ بادامی آنکھیں، خوب صورت ہونٹ، گالوں میں بڑے ڈمپل، اس کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہے تھے۔ وہ شوخ لہجے میں بولی۔ ”اگر تم میرا نام جاننا چاہ رہے ہو تو سنو، مجھے کیرن کہتے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ میرا اندازہ درست تھا۔ کیا تم اب بھی یہی کہو گی کہ ہم تین چار ماہ پہلے اس جگہ پر نہیں مل چکے ہیں؟ جبکہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ہم آدھ گھنٹے تک باتیں کرتے رہے تھے۔“

”واقعی، کیا کوئی لڑکی تم سے تیس منٹ تک بات کر سکتی ہے؟“

وہ یہ سن کر مسکرا دیا لیکن جیسے ہی موسیقی کی دھن تبدیل ہوئی۔ اس کا موڈ بھی خراب ہو گیا اور بولا۔ ”مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ ایسی واہیات جگہ ہے۔“

”کیا ہوا؟“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

اس نے دیوار کے پیچھے رکھے ہوئے اسپیکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے سنا نہیں یہ نورا جونز کی آواز ہے۔“

”کیوں؟ کیا تم اسے پسند نہیں کرتے؟“

”نہیں کیونکہ جب وہ گانے کے دوران لمبی لمبی سانسیں لیتی ہے تو گانے کا سارا تاثر ختم ہو جاتا ہے۔“

کیرن نے زوردار قہقہہ لگایا اور جبر اللہ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ اس سے پہلے اس نے کسی عورت کو اتنی جلدی ہنسایا تھا۔ اسے یہ سب کچھ بہت آسان لگ رہا تھا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔

جبر اللہ نے بے تکلف ہوتے ہوئے کہا۔ ”ہم ایک دوسرے کے کام کے بارے میں بات نہیں کریں گے کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تمہارا اگلا سوال یہی ہو گا کہ تم کیا کام کرتے ہو۔ اس کے بجائے ہمیں ایسی باتیں کرنی چاہئیں جن میں دونوں کی دلچسپی ہو۔“

”کیا تمہیں لگتا ہے کہ میں اس گفتگو کو طول دینے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ٹھیک ہے تم بتاؤ کہ اب تک تم نے سب سے اچھی چھٹیاں کہاں گزاریں؟“

یہ کہہ کر کیرن نے اپنی ہی بات کی نفی کر دی۔ اسے خود بھی جبر اللہ سے گفتگو کرنے میں مزہ آ رہا تھا۔ جبر اللہ کو اندازہ ہو گیا کہ وہ ان عورتوں میں سے نہیں تھی جو کسی پُرہجوم بار میں مردوں سے بے تکلف ہو جائیں۔ وہ خوب صورت ضرور تھی لیکن لگتا نہیں تھا کہ وہ اس کے ساتھ رات

گزارنے پر آمادہ ہو جائے۔ ایسی لڑکیاں زیادہ سے زیادہ کسی مرد کے ساتھ پارک میں چہل قدمی کر سکتی ہیں، لنچ پر جا سکتی ہیں، ساحل کے ساتھ ساتھ لمبی ڈرائیو پر جا سکتی ہیں اور پھر گرجا میں جا کر شادی کر لیتی ہیں۔

ایک لمحہ جبر اللہ کے دل میں خیال آیا کہ شاید اس سے غلطی ہو گئی۔ یہ وہ لڑکی نہیں تھی جس کے ساتھ وہ کچھ وقت گزار سکتا تھا۔ وہ اٹھنے ہی والا تھا کہ اس کی نظر دروازے پر گئی۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ وہ دونوں آدمی بار میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ لمبے قد کے تھے اور انہوں نے اس گرم موسم میں جیکٹ پہن رکھی تھی تاکہ جو کچھ ان کے پاس تھا، وہ کسی کو نظر نہ آ سکے۔ ان کی نظریں ہال کا جائزہ لے رہی تھیں پھر اس پر آ کر جم گئیں۔

جبر اللہ نے اٹھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور کیرن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم بہترین تعطیلات کی بات کر رہی تھیں۔ اب تک میں نے سب سے اچھی چھٹیاں بہاماس میں گزاری ہیں۔“

”ظاہر ہے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”وہ جگہ ہی ایسی ہے۔“

”پہلے میری پوری بات سن لو۔ میرا کالج کا تیسرا سال تھا۔ میں نے گرمیوں کی چھٹیوں میں کام کر کے کچھ پیسے کمائے تھے چنانچہ میں واپس جانے کے بجائے بہاماس چلا گیا کیونکہ مجھے آرام کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے وہاں سب سے سستے ہوٹل میں قیام کیا۔ اس کے باوجود وہ پیسے تین دن میں ختم ہو گئے۔ وہ بہت خوب صورت جگہ تھی اور میں اتنی جلدی واپس آنا نہیں چاہتا تھا۔ چوتھے روز میں تین ہوٹلوں میں گیا اور مجھے ایک ہوٹل میں کام مل گیا۔ اس کے علاوہ میں کچن میں بھی کام کر لیا کرتا تھا۔ گو کہ یہ میرے لیے بہت مشکل تھا لیکن وہاں بہت بڑی تعداد میں سیاح آئے ہوئے تھے اور مجھے اچھی خاصی ٹپ مل جاتی تھی۔ خاص طور پر خواتین اس معاملے میں بہت فیاض تھیں۔ میں وہاں تین مہینے رہا اور اپنے آپ کو وہیں کا باشندہ سمجھنے لگا۔ سیاحت کے لیے آنے والی خواتین بھی مجھے مقامی باشندہ سمجھتیں۔ میں انہیں مختلف مقامات پر لے جاتا اور ان کا گائیڈ بن کر ٹھیک ٹھاک کمائی کر لیتا۔ اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ وہ میری زندگی کی بہترین تعطیلات تھیں۔“

”واقعی، اس لحاظ سے بہترین چھٹیاں تھیں کہ تم نے وہاں کام کر کے اپنے اخراجات اٹھائے۔“

”میں نے تو تمہیں سب کچھ بتا دیا۔ تم اپنے بارے میں کیا کہتی ہو؟“

جبر اللہ دوسری کرسی پر بیٹھ گیا تاکہ دروازے پر کھڑے ہوئے دونوں آدمی اسے ٹھیک طرح نہ دیکھ سکیں۔ وہ دونوں بھی دروازے کے قریب ہی ایک میز پر بیٹھ گئے اور سر گھما کر اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھنے لگے۔

کیرن نے مایوسی سے سر ہلایا اور بولی۔ ”بہتر ہوتا کہ تم مجھ سے یہ سوال نہ پوچھتے۔ مجھے یہ موضوع نہیں چھیڑنا چاہیے تھا۔ میں صرف ایک مرتبہ چھٹیاں منانے گئی ہوں۔ جب میں صرف بارہ سال کی تھی اور ہماری فیملی کا جھیل کنارے ایک کیبن تھا۔“

وہ اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے چہرے پر بچپن کی یادوں کا عکس جھلک رہا تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا کہ کیرن کا بچپن آج کے مقابلے میں بہتر تھا۔ یقیناً وہ ایک پاکباز لڑکی تھی۔ جبر اللہ کو وہاں سے جانے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اس نے کہا۔

”سنو کیرن، میں تمہارے پاس بیٹھ کر مزید کچھ دیر باتیں کرتا لیکن ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔“ یہ سن کر کیرن کی آنکھیں سکڑ گئیں اور اس نے کرسی کی پشت سے کمر ٹکا لی۔ جبر اللہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”دروازے کے پاس دو آدمی بیٹھے ہیں، تم ان کی طرف مت دیکھنا۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ مجھے ان کے باس کا قرضہ دینا ہے اور یہ سب ایک غلط فہمی کی وجہ سے ہوا ہے لیکن......“

”اور اب تمہیں چھپنے کے لیے جگہ چاہیے؟“ کیرن اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

وہ صحیح سمجھ رہی تھی۔ پہلے اس کا منصوبہ یہی تھا کہ وہ لڑکی کی آڑ لے کر اس کے گھر چلا جائے اور جیکٹ والے دونوں آدمی اسے وہیں ڈھونڈتے رہیں لیکن اب اس کا ارادہ بدل گیا تھا۔ اسے ان لوگوں سے نمٹنے کے لیے کوئی اور طریقہ ڈھونڈنا تھا۔ اس نے کیرن کو مطمئن کرنے کے لیے کہا۔

”نہیں، میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ یہاں رک کر مزید باتیں نہیں کر سکتا۔“

کیرن اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں معلوم ہے، میں یہاں اکیلے نہیں آئی تھی۔“

جبر اللہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، تمہاری دوست بار کے آخری سرے پر کھڑی ایک باڈی بلڈر سے باتیں کر رہی ہے۔ میں نے ایک گلاس پر لپ

اسٹک کے نشان دیکھے ہیں۔"

جبراللہ کہنا چاہ رہا تھا کہ امید ہے دوبارہ پھر تم سے ملاقات ہوگی لیکن اسے جھوٹی آس دلانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اب وہ دونوں آدمی ان کی جانب نہیں دیکھ رہے تھے اور نہ ہی آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ پینے کے عادی نہیں ہیں کیونکہ وہ بہ مشکل تمام مشروب حلق میں اتار رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی نہیں رہے تھے، یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اجنبی کسی مقصد کے تحت اکٹھے ہوگئے ہیں۔ جبراللہ کو اب یہاں سے نکلنا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں خیال آیا، اس نے کیرن سے کہا۔

"کیا میں ایک سیکنڈ کے لیے تمہارا فون لے سکتا ہوں؟"

کیرن یہ سن کر حیران رہ گئی۔ وہ ابھی تک اس پر شک کر رہی تھی۔ تاہم اس نے اپنا آئی پیڈ اسے دے دیا۔ جبراللہ نے ایک نمبر ملایا اور اس کی جیب میں رکھا ہوا فون بجنے لگا۔ اس نے کیرن کا فون واپس کرتے ہوئے کہا۔ "اب تمہارے پاس میرا نمبر آگیا ہے۔"

"اور تمہیں میرا نمبر مل گیا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "خداحافظ کیرن۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ کیرن کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ جبراللہ کے دل میں ایک عجیب سی خواہش ابھری، کاش وقت یہیں رک جائے اور وہ اسی طرح اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے کھڑا رہے لیکن عملاً یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا بار سے باہر چلا گیا۔ وہ میزوں کے درمیان سے ہوتا ہوا جیکٹ والوں کے عقب سے اس طرح گزرا کہ وہ اسے نہ دیکھ سکیں۔ جبراللہ نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس نے دوڑ کر سڑک پار کی اور پارکنگ لاٹ میں داخل ہوگیا۔۔۔ وہاں پہنچ کر ایک بار پھر مڑا اور ایک منٹ تک دیکھتا رہا لیکن بار سے کوئی شخص باہر نہیں آیا۔ اس نے سوچا کہ شاید جیکٹ والوں کے کچھ ساتھی یہاں موجود ہوں لیکن وہ جگہ بالکل خالی نظر آرہی تھی۔ جبراللہ دوڑتا ہوا پارکنگ عبور کر کے دوسری جانب سے باہر نکل گیا جہاں اس کی کار ایک بغلی سڑک پر کھڑی ہوئی تھی۔ اب تک کسی نے اس کا تعاقب نہیں کیا تھا گویا جبراللہ کا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ اس کا پیچھا نہیں کر رہے تھے۔

کئی میل چلنے کے بعد اسے یقین آگیا۔ اس نے ایک جگہ گاڑی کھڑی کی اور کئی سیکنڈ تک سر جھکائے کار میں بیٹھا رہا پھر اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور کار سے باہر آگیا۔ اس نے اندھیری سڑک پر تیزی سے چلنا شروع کر دیا۔ اس کے لیے یہی مناسب تھا کہ جتنی جلدی ممکن ہو وہ اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوجائے۔

انجیلا نے اسی وقت لباس تبدیل کیا تھا۔ وہ بلاؤز کے بٹن بند کر رہی تھی جب وہ اندر داخل ہوا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی اور دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ انجیلا کی اس ادا پر جی جان سے فریفتہ ہوجاتا لیکن نہ جانے کیوں اس وقت وہ اس کے انداز میں گھٹیا پن محسوس کر رہا تھا۔ انجیلا اس کی سردمہری محسوس کر کے الگ ہوگئی اور کرسی کے بازو پر ٹانگ پھیلا کر بیٹھ گئی۔ اس کے لمبے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ اس وقت بھی پورے میک اپ میں تھی۔ جبراللہ نے بے زاری سے اسے دیکھا اور اسے یقین نہیں آیا کہ وہ ایسی عورت کا انتخاب کر سکتا ہے۔

ان دونوں کی ملاقات ایک اسٹور میں ہوئی تھی اور ایک گھنٹے کے اندر ہی وہ آپس میں گھل مل گئے تھے۔ انجیلا کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ اس کی منزل کون سی ہے جبکہ جبراللہ نے پہلی نظر میں ہی سوچ لیا کہ وہ اس کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر سکتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے پاس قربان کرنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ انجیلا کے لیے فلاڈیلفیا دنیا میں سب سے زیادہ خطرناک جگہ تھی لہٰذا وہ یہ جگہ چھوڑنے پر مجبور ہوگئی تھی لیکن اب اسے اپنی رقم کے لیے واپس آنا پڑ گیا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ کوئی بھی اس کی تلاش میں نہ ہوگا لیکن وہ غلطی پر تھی، اس سے پہلے کہ وہ اپنی رقم حاصل کر پاتی، وہ اور جبراللہ دوسرے دن ہی نظروں میں آگئے۔

انجیلا اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس نے اپنے بلاؤز کے بٹن بند کیے اور اس کے گلے میں باہیں ڈال کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو کیا رہا؟

"میں ان سے پیچھا چھڑا کر آگیا۔" جبراللہ نے فخریہ انداز میں کہا۔

"کیسے؟ تمہارے اندر جیمز بانڈ والی کوئی بات نظر نہیں آتی۔"

"وہ میرا پیچھا کرتے ہوئے ایک بار تک آگئے تھے جہاں میں نے ایک عورت سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔"

"کون تھی وہ؟"

"پتا نہیں، بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ ایک لڑکی تھی اور تھوڑی بہت تم سے مل رہی تھی۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "واقعی؟"

"کم روشنی کی وجہ سے مجھے ایسا لگا۔ تمہیں یاد ہے کہ دو دن پہلے جب میں کار میں سوار ہو رہا تھا تم کافی شاپ سے نکل رہی تھیں تو شاید انہوں نے میری تصویر اتار لی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ تمہیں نہیں پہچانتے۔ انہیں صرف تمہارا حلیہ بتایا گیا ہے لہٰذا وہ انتظار کر رہے تھے کہ میرے ذریعے تم تک پہنچ سکیں۔"

"وہ اس لڑکی کو تمہارے ساتھ دیکھ کر یہی سمجھے ہوں گے کہ وہی انجیلا ہے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا لیکن وہ دل ہی دل میں یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ اس کی وجہ سے وہ لڑکی کسی پریشانی میں مبتلا نہ ہوجائے اور وہ دونوں آدمی اسے میرے ساتھ دیکھ کر انجیلا نہ سمجھ بیٹھے ہوں۔ اس خیال کے آتے ہی وہ مضطرب ہوگیا اور اس نے سوچا کہ کیرن کو فون کر کے اسے محتاط رہنے کے لیے کہے۔ اسی اثنا میں انجیلا اس کی جانب بڑھی اور اس کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے بولی۔

"یہ تو بہت اچھا ہوا۔ وہ اس لڑکی کا پیچھا کرتے رہیں گے، اس دوران میں اپنا کام کر سکتی ہوں۔ میں اپنی رقم لینے جا رہی ہوں۔ تم یہیں رک کر میرا انتظار کرو۔ میں دو گھنٹے میں واپس آجاؤں گی۔"

"جہنم میں جاؤ۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ اس لمحے اسے انجیلا سے کراہیت محسوس ہونے لگی۔ وہ کتنی خودغرض اور موقع پرست عورت تھی۔ انجیلا نے اس سے کار کی چابیاں لیں اور دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ باہر نکلنے سے پہلے اس نے پلٹ کر دیکھا اور مسکرا دی۔ نہ جانے کیوں اسے لگا کہ اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گی۔ شاید اسے جبراللہ کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

وہ انجیلا کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس عورت کی خاطر وہ جان ہتھیلی پر لیے پھر رہا تھا اور وہ اتنی خودغرض ثابت ہوئی کہ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا کہ اس کی وجہ سے کسی دوسری لڑکی کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اس نے جبراللہ کو یہ بھی نہیں بتایا کہ اس نے وہ رقم کہاں چھپا رکھی ہے۔ وہ صرف اس کے ساتھ رہ کر موقع کا انتظار کر رہی تھی اور جب اسے یقین ہوجاتا کہ جبراللہ تعاقب کرنے والوں کو چکمہ دینے میں کامیاب ہوگیا ہے تو وہ وقت ضائع کیے بغیر وہاں سے چل دے گی۔ شاید اب اسے کسی محافظ کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

کتے کی دس صفات

حیوان اپنے مالک کا زیادہ وفادار ہوتا ہے جبکہ انسان اپنے پروردگار کا اتنا وفادار نہیں ہوتا۔ کسی نے کیا خوب فرمایا ہے...... کہ کتے کے اندر دس صفات ایسی ہیں کہ اگر ان میں سے ایک صفت بھی انسان کے اندر پیدا ہوجائے تو وہ اللہ کا پسندیدہ بندہ بن جائے فرماتے ہیں کہ

☆ کتے کے اندر قناعت ہوتی ہے جو مل جائے یہ اسی پر قناعت کر لیتا ہے راضی ہوجاتا ہے۔ یہ قانعین یا صابرین کی علامت ہے۔

☆ کتا اکثر بھوکا رہتا ہے، یہ صالحین کی نشانی ہے۔

☆ کوئی دوسرا کتا اس پر زور کی وجہ سے غالب آجائے تو یہ اپنی جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ چلا جاتا ہے، یہ راضیین کی علامت ہے۔

☆ اس کا مالک اسے مارے بھی تو یہ اپنے مالک کو چھوڑ کر نہیں جاتا، یہ صادقین کی نشانی ہے۔

☆ اگر اس کا مالک بیٹھا کھانا کھا رہا ہو تو یہ باوجود طاقت اور قوت کے اس سے کھانا نہیں چھینتا، دور سے ہی بیٹھ کر دیکھتا رہتا ہے، یہ مساکین کی علامت ہے۔

☆ جب مالک اپنے گھر میں ہو تو یہ دور جوتے کے پاس بیٹھ جاتا ہے، ادنیٰ جگہ پہ راضی ہوجاتا ہے، یہ متواضعین کی علامت ہے۔

☆ اگر اس کا مالک اسے مارے اور یہ تھوڑی دیر کے لیے چلا جاتا ہے اور پھر مالک اسے دوبارہ ٹکڑا ڈال دے تو دوبارہ آکر کھا لیتا ہے اس سے ناراض نہیں ہوتا، یہ خاشعین کی علامت ہے۔

☆ دنیا میں رہنے کے لیے اس کا اپنا کوئی گھر نہیں ہوتا، یہ متوکلین کی علامت ہے۔

☆ رات کو یہ بہت کم سوتا ہے، یہ محبین کی علامت ہے۔

☆ جب مرتا ہے تو اس کی کوئی میراث نہیں ہوتی، یہ زاہدین کی علامت ہے۔

غور کریں کہ کیا ان صفات میں سے کوئی صفت ہم میں بھی موجود ہے؟

مرسلہ۔ طالب حسین طلحہ،
ہائی سیکیورٹی نیو سینٹرل جیل، ملتان

جیراللہ نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ انجیلا اس کی کار لے کر جارہی تھی۔ کچھ دور جا کر اس نے موڑ کاٹا اور کار کی پچھلی بتیاں نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔ جیراللہ نے کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ یہ ایک آراستہ اپارٹمنٹ تھا جسے انجیلا نے ایک ہفتے کے لیے کرائے پر لیا تھا۔ انجیلا نے اسے یقین دلایا تھا کہ رقم ملتے ہی وہ دونوں یہ شہر چھوڑ دیں گے۔ اس نے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر جھانکا... جہاں اسے کوئی نقل و حرکت نظر نہیں آئی۔ اسے یقین ہوگیا کہ اس کا تعاقب نہیں کیا جارہا اور وہ اس کی وجہ بھی سمجھ گیا۔ وہ لوگ درحقیقت اس کا نہیں بلکہ انجیلا کا پیچھا کررہے تھے اور کیرن کو انجیلا سمجھنے کے بعد انہیں کسی مزید تعاقب کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

اس نے جیب سے فون نکال کر کیرن کا نمبر ملایا۔ پہلی گھنٹی پر کوئی جواب نہیں ملا تو اس کے دل میں اندیشے سر اٹھانے لگے۔ کہیں کیرن ان کے قبضے میں تو نہیں ہے؟ اگر ایسا ہے تو یقیناً وہ جاننا چاہیں گے کہ انہیں فون کرنے والا کون ہے۔ شاید وہ جان چکے ہوں گے کہ وہ غلطی سے انجیلا کے بجائے کسی دوسری لڑکی کو اٹھا لائے ہیں۔

چوتھی گھنٹی پر کیرن کی آواز سنائی دی۔ اس کے لہجے میں لرزش نمایاں تھی۔ "جیراللہ!"

"اس آدمی کو فون دو جس نے تمہیں پکڑ رکھا ہے۔"

اس نے کوئی بحث نہیں کی۔ چند سیکنڈ بعد ایک کرخت آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ "بولو۔"

"تمہیں احساس ہوگیا ہوگا کہ غلط لڑکی کو پکڑ لائے ہو۔"

"وہ بھی یہی کہہ رہی ہے لیکن عام طور پر لوگ اپنی جان چھڑانے کے لیے ایسا ہی کہتے ہیں۔"

"لیکن تمہارا باس اس مطلوبہ لڑکی کو پہچانتا ہے۔ کیا اس نے ابھی تک اسے نہیں دیکھا؟"

"وہ پہنچنے ہی والا ہے۔"

"جب اسے معلوم ہوگا کہ تم غلط لڑکی کو اٹھا لائے ہو اور اس کے چکر میں تم نے مجھے نکل جانے کا موقع دے دیا تو تمہاری شامت آجائے گی۔"

دوسری طرف خاموشی رہی۔ جیراللہ نے اپنی بات جاری رکھی۔ "تم چاہو تو اس کا غصہ ٹھنڈا کرسکتے ہو۔ اسے یقین دلا دو کہ تم مجھے تلاش کرلو گے۔ میں تمہیں وہ جگہ بتادوں گا جہاں میں تمہیں مل سکتا ہوں۔"

"تم ایسا کیوں کرو گے؟"

"مجھے انجیلا کی نیت ٹھیک نہیں لگی۔ میرا خیال ہے کہ وہ ساری رقم خود ہی ہڑپ کرجائے گی اور مجھے کچھ نہیں ملے گا۔"

"میں نے اس کے بارے میں یہی سنا ہے۔ وہ دھوکے باز عورت ہے۔ اس نے باس کو بھی دھوکا دیا۔ اسی لیے وہ اسے تلاش کررہا ہے۔"

"میں اس کا پتا بتاسکتا ہوں بشرطیکہ تمہارا باس مجھے معقول معاوضہ دینے کا وعدہ کرے۔"

"تم کیا معاوضہ لو گے؟" اس کی آواز میں ہلکا سا خوف تھا اور جیراللہ سمجھ گیا کہ باس اس کے قریب پہنچ چکا ہے۔

"میں تمہیں اپنا پتا بتادوں گا لیکن تم اس لڑکی کو ساتھ لے کر آؤ گے۔ یہ اس سودے کا ایک حصہ ہے۔"

"کیوں؟ وہ ہمارے ساتھ ساتھ تمہارے لیے بھی غیر اہم ہے۔"

"وہ بے قصور ہے اور اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔"

"ہاں اور یہ سب تمہاری غلطی کی وجہ سے ہوا۔"

جیراللہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "دیکھو، تم اسے ساتھ لے کر آؤ گے۔ ورنہ ہمارے درمیان کوئی ڈیل نہیں ہوگی۔ میں تمہیں اس جگہ کے بارے میں بتاتا ہوں جہاں تمہیں پہنچنا ہے لیکن اس وقت تک سامنے نہیں آؤں گا جب تک اس لڑکی کو اس کی کار سمیت نہ دیکھ لوں۔"

یہ کہہ کر اس نے پتا سمجھایا اور ٹیلی فون بند کردیا۔ اس شخص کے ساتھ گفتگو کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا جس کے پاس کوئی اختیار ہی نہ تھا۔ ایک مرتبہ باس وہاں پہنچ کر یقین کرلیتا کہ انجیلا دو لاکھ ڈالرز سمیت اپارٹمنٹ میں موجود ہے تو اس کے پاس جیراللہ کی شرط مان لینے کے علاوہ کوئی راستہ نہ ہوتا۔

وہ بیس منٹ تک اس چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں ٹہلتا رہا پھر اس نے ان غلطیوں کے بارے میں سوچنا شروع کردیا جو اس سے سرزد ہوئی تھیں۔ سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے انجیلا کا ساتھ دینا قبول کرلیا تھا جس کا نتیجہ اس کے حق میں اچھا نہیں نکلا۔ اب اسے اس غلطی کی تلافی کرنا تھی۔ یہ سوچ کر وہ نیچے اترا اور ایک چبوترے کے پیچھے چھپ گیا تاکہ اسے کوئی نہ دیکھ سکے۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور مضطرب انداز میں سامنے والے چوراہے کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ انہیں وقت دے دیتا تاکہ اسے انتظار کی اذیت برداشت نہ کرنا پڑتی اور انہیں بھی کچھ سوچنے یا منصوبہ بندی کرنے کے لیے وقت نہ ملتا۔ تاہم انہوں نے وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے چوراہے پر دو گاڑیاں نظر آئیں۔ ان میں سے ایک سیاہ اور دوسری ہلکے نیلے رنگ کی تھی۔ جیراللہ کو یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ دوسری کار کیرن کی تھی۔

اس کار میں سے دو آدمی برآمد ہوئے۔ ان میں سے ایک قدرے لمبا جبکہ دوسرا گنجے سر کا تھا۔ وہ کچھ پریشان اور خوف زدہ لگ رہے تھے۔ کار کے گرد چکر لگاتے ہوئے ان کے کندھے ٹکرا گئے اور انہوں نے ایک دوسرے کو ناراضی سے دیکھا۔ چند لمحوں بعد سیاہ کار سے ایک طویل قامت شخص برآمد ہوا۔ اس نے سرمئی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے متلاشی نگاہوں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور نیلی کار کا پچھلا دروازہ کھول کر کیرن کو باہر نکال لیا۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں تھے اور نہ ہی وہ زخمی نظر آرہی تھی۔ البتہ اس کے چہرے سے خوف عیاں تھا۔ اس کے باوجود اس نے جھٹکا دے کر اپنے آپ کو اس آدمی کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش کی۔

ایک لمحے کے بعد سیاہ کار کا اگلا دروازہ کھلا اور اس میں سے چوتھا شخص برآمد ہوا جو یقیناً ان کا باس تھا۔ اس نے لمبی آستینوں والی زرد قمیص اور سرمئی پتلون پہن رکھی تھی اس کے بال سلیقے سے جمے ہوئے تھے۔ کافی فاصلہ ہونے کے باوجود جیراللہ دیکھ سکتا تھا کہ اس کے ناخن بھی تراشیدہ تھے۔ وہ دیکھنے میں خاصا ہوشیار لگ رہا تھا اور اب جیراللہ کو یہ سوچنا تھا کہ کیرن کو اس کے چنگل سے کیسے آزاد کروایا جائے۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ "تم جو کوئی بھی ہو، سامنے آجاؤ۔"

"لڑکی کو جانے دو۔" جیراللہ نے کہا۔ "جب وہ اپنی کار میں سوار ہوکر چلی جائے گی تو میں تمہیں انجیلا کا پتا بتادوں گا۔"

باس نے گردن موڑ کر تحقیر آمیز انداز میں کیرن کو دیکھا اور بولا۔ "ہم نے پہلے ہی معلوم کرلیا ہے کہ یہ کہاں رہتی ہے اور کہاں کام کرتی ہے۔ ہم نے اس کی کار کا نمبر بھی نوٹ کرلیا ہے لہٰذا فضول شرطیں عائد کرنے سے بہتر ہے کہ سامنے آکر مردوں کی طرح مجھ سے بات کرو۔"

جیراللہ کے پاس اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ چبوترے سے باہر آگیا اور اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر ان کی جانب چل دیا۔ جیکٹ والوں نے فوراً اپنے ہاتھ جیبوں میں ڈال لیے تاکہ ہتھیار نکال کر جیراللہ کو اپنے نشانے پر رکھ سکیں لیکن باس صرف جیراللہ کو آتے ہوئے دیکھ رہا تھا جو اس کے سامنے آکر رک گیا۔ انہوں نے پہلے کبھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے باس کو یقین نہیں آیا کہ ایسا شخص بھی اسے چیلنج کرسکتا ہے۔

جیراللہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "اب تم اس لڑکی کو جانے دو اور مجھے بتاؤ کہ انجیلا کو تمہارے حوالے کردوں تو مجھے کیا معاوضہ ملے گا؟"

"دس فی صد۔"

جیراللہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ باس بولا۔ "اس سے زیادہ نہیں مل سکتا یہ لے لو ورنہ ہم اپنا طریقہ اختیار کریں گے۔"

جیراللہ جانتا تھا کہ باس اس سے سودے بازی کررہا ہے لیکن اسے یقین نہیں تھا کہ وہ اس سے مخلص ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ اگلے دو منٹ میں اسے مار دیا جائے۔ اس لیے وہ چاہ رہا تھا کہ پہلے کیرن یہاں سے چلی جائے۔

"لڑکی کو جانے دو۔" جیراللہ نے دوبارہ کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا تو جیراللہ نے کہا۔ "پھر تم مجھ سے کچھ معلوم نہیں کرسکتے۔"

"بے وقوف مت بنو۔" طویل قامت شخص نے کیرن کا بازو مروڑتے ہوئے کہا اور دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ کیرن کے حلق سے چیخ نکلی اور اس کی آنکھیں وحشت سے پھیل گئیں۔

"تم سے نمٹنے سے پہلے ہم اسے ختم کریں گے۔" اس تنومند شخص نے غضب ناک لہجے میں کہا۔

جیراللہ نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "دیکھو، انجیلا بہت جلد جانے والی ہے۔ تم چاہے پورے علاقے میں گھر گھر تلاشی لو یا مجھ پر تشدد کرو۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تب تک وہ بہت دور جا چکی ہوگی۔ تمہارے پاس چند منٹ ہی ہیں۔ تم جانتے ہو کہ وہ وقت ضائع نہیں کرتی۔"

باس چند سیکنڈ تک اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر اس نے تنومند شخص کو سر سے اشارہ کیا جس نے کیرن کا بازو چھوڑ دیا اور وہ لڑکھڑاتے قدموں سے چلتی ہوئی اس سے دور ہوگئی۔

''تم مجھے انجیلا کا پتا بتاؤ۔'' باس نے کہا۔ ''اس کے بعد یہ لڑکی میرے لیے کسی کام کی نہ ہوگی اور میں اسے جانے دوں گا لیکن جب تک مجھے انجیلا نہیں مل جاتی، تم دونوں کو یہیں رکنا ہوگا۔''

جیر اللہ مڑا اور اس نے سڑک کی دوسری ایک عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ تمہیں اس عمارت کے اپارٹمنٹ نمبر چار میں ملے گی۔ وہ کسی وقت بھی واپس آسکتی ہے۔ انجیلا بہت محتاط ہے، وہ دروازے پر پانچ مرتبہ دستک دے گی۔ یہ رہی چابی، اس عمارت میں لفٹ نہیں ہے۔''

باس مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ایسی گندی جگہوں پر لفٹ نہیں ہوتی۔''

یہ کہہ کر وہ مڑا اور تنومند شخص کو کوئی اشارہ کیا جس نے سیاہ کار کا اگلا دروازہ کھول کر کیرن کو اس میں دھکیل دیا۔

''یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' جیر اللہ چلایا لیکن کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ باس نے جیکٹ والوں سے کہا۔ ''ان دونوں کو کار میں بٹھا دو اور تم بھی ان کے ساتھ رہو۔ میں پہلے انجیلا سے مل لوں۔ اس وقت تک انہیں مت چھوڑنا جب تک میں تمہیں اشارہ نہ کروں اور مجھے یہ اطمینان ہو جائے کہ اس نے سچ بولا ہے۔'' پھر اس نے ان دونوں آدمیوں کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس مرتبہ کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔''

یہ کہہ کر باس تنومند شخص کو لے کر سڑک پار کرنے لگا جو سیڑھیوں کے ذریعے چوتھی منزل تک جانے کا سوچ کر ہی ناخوش نظر آرہا تھا لیکن باس کا حکم ماننا اس کی مجبوری تھی۔ اس دوران لمبے قد والے نے دھکا دے کر جیر اللہ کو سیاہ کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا اور گنجے سر والا کیرن کے ساتھ ہی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا جو سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس نے جیر اللہ کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ وہ اس سے معذرت کرنا چاہ رہا تھا لیکن جانتا تھا کہ یہ سن کر وہ مزید بھڑک اٹھے گی۔

وہ دونوں آدمی بالکل خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے آپس میں کوئی بات کی اور نہ ہی اپنے قیدیوں سے کچھ کہا۔ وہ دونوں اپنی ہی سوچوں میں گم تھے۔ انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ایک ایسے کام میں پھنس گئے ہیں جہاں غلطی کی سزا صرف موت ہے۔ جیر اللہ کو یاد آگیا کہ یہ دونوں بار میں بھی بات نہیں کر رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ آپس میں ساتھی نہیں ہیں بلکہ انہیں الگ الگ اس کام کے لیے کرایہ پر لیا گیا تھا۔ جیر اللہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا اور اس کے ذہن میں ایک منصوبہ پروان چڑھنے لگا۔ اس نے یکایک اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے زور زور سے قہقہے لگانا شروع کر دیے۔

''یہ کیا مذاق ہے؟'' اس کے برابر بیٹھا ہوا لمبا آدمی بولا۔

''وہ تمہیں ہماری نگرانی کے لیے چھوڑ گئے ہیں، ہم دونوں کو۔''

''اس میں ہنسنے والی کون سی بات ہے؟''

''کیونکہ میں تم دونوں میں سے ایک کو خرید چکا ہوں۔'' جیر اللہ نے لمبے آدمی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا جو حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ ایک سیکنڈ بعد جیر اللہ نے کہا۔ ''اسے سنبھالو۔''

لمبا آدمی اپنے آپ کو نہ روک سکا اور اس کا سر اگلی سیٹ سے جا ٹکرایا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا پستول بھی ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اگلی نشست پر بیٹھا ہوا شخص اسے دیکھ رہا تھا۔ جیر اللہ نے دوسرے زاویے سے پیچھے والے شخص کی کمر پر زوردار ضرب لگائی۔ لمبے آدمی کو سنبھلنے کا موقع نہ مل سکا پھر جیر اللہ نے پے در پے اس کے جبڑے اور ٹھوڑی کے نیچے کئی زوردار گھونسے مارے۔ وہ یہ ضربات نہ سہہ سکا۔ اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی اور وہ پچھلی سیٹ پر ڈھیر ہوگیا۔

کیرن نے پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لمبے آدمی کا پستول اٹھا لیا۔ اسے اپنے برابر بیٹھے ہوئے شخص پر گولی چلانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ پہلے ہی لمبے آدمی کے بے آواز پستول کا نشانہ بن چکا تھا۔ جیر اللہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کے اکسانے پر لمبے آدمی نے اپنے ساتھی پر گولی چلائی تھی یا غیر ارادی طور پر اس سے پستول چل گیا تھا۔

وہ دونوں کار سے باہر آگئے۔ پچھلی سیٹ والا آدمی زور زور سے کراہ رہا تھا پھر اس نے آخری ہچکی لی اور خاموش ہوگیا۔ وہ دونوں کیرن کی کار کی طرف دوڑ پڑے۔ جیر اللہ نے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔ ''کیا انہوں نے کار کی چابی لگی چھوڑ دی تھی؟''

''نہیں۔ چابی میں نے نکال لی تھی۔'' کیرن نے کہا۔

جیر اللہ نے گاڑی اسٹارٹ کی اور پوری رفتار سے اسے بھگانے لگا۔ وہ باس کے آنے سے پہلے اس جگہ سے بہت دور نکل جانا چاہ رہا تھا۔ کیرن نے اسٹیئرنگ وہیل پر

اپنا ہاتھ رکھا اور بولی۔ ''کار کی رفتار قابو میں رکھو، ایسا نہ ہو کہ حادثہ پیش آجائے اور ہم اس دنیا سے رخصت ہو جائیں۔''

جیر اللہ چند لمحے تک کچھ نہ بول سکا۔ کیرن کے ہاتھ کا لمس سرد اور نرم تھا۔ انجیلا کے ساتھ کئی دن گزارنے کے باوجود اسے یوں محسوس ہوا کہ مہینوں بعد کسی عورت نے اسے چھوا ہے۔ اسے لگا کہ سیکنڈوں میں اس کی زندگی پُرسکون ہوگئی ہے۔ اس نے کیرن کی طرف دیکھا جو اسے نہیں دیکھ رہی تھی لیکن اس کے تاثرات سے ناراضی اور خوف کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

بیس منٹ بعد وہ شہر کے مضافات میں ایک جگہ رک گئے۔ رات کا اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا اور اطراف کی تمام دکانیں بند تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ اب اسے جانا ہوگا لیکن وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ البتہ کیرن اس کے بارے میں متفکر تھی۔ اس نے کہا۔ ''کیا تمہارا کوئی ٹھکانا ہے؟''

جیر اللہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ کیرن نے قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''میرے پاس بھی کوئی جگہ نہیں ہے کیونکہ میں جہاں رہتی تھی اب وہاں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ باس اور اس کے آدمی شکاری کتوں کی طرح ہماری بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہاری دوست اس اپارٹمنٹ میں واپس آئی ہوگی؟''

''اگر اسے مجھ سے محبت ہوئی تو ضرور آئے گی لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ ایسا کرے گی۔''

کیرن اس کے جذبات کو سمجھ سکتی تھی۔ جیر اللہ نے اس عورت کی خاطر سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس پر جو گزری، اس میں جیر اللہ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ محض اپنا تعاقب کرنے والوں سے پیچھا چھڑانے کی خاطر اس کے پاس بار میں آکر بیٹھ گیا تھا اور جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو کیرن کو بچانے کے لیے اس نے انجیلا کو داؤ پر لگا دیا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ کبھی انجیلا تک نہیں پہنچ سکیں گے۔

''تم نے کار میں جو چال چلی، اس کی کامیابی کا کتنا یقین تھا؟'' کیرن نے پوچھا۔

جیر اللہ کا منصوبہ صرف یہ تھا کہ وہ کسی طرح ان دونوں کی توجہ اپنی جانب کرلے۔ اس طرح کیرن کو کار سے نکلنے کا موقع مل جائے گا۔ اس نے کہا۔ ''مجھے یاد آیا کہ وہ دونوں بار میں بھی آپس میں ایک دوسرے سے بات نہیں کر رہے تھے حالانکہ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا اور ساتھ کام کرنے والے آپس میں تھوڑی بہت گفتگو ضرور کرتے ہیں۔ اس سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ انہیں جان بوجھ کر الگ الگ اس کام پر رکھا گیا ہے تاکہ انہیں ایک دوسرے پر بھروسا نہ ہو اور وہ اپنے طور پر کوئی منصوبہ بندی نہ کرسکیں۔''

کیرن نے اپنی طرف کی کھڑکی کا شیشہ نیچے گرا دیا۔ وہ ایک خوش گوار رات تھی اور دور دور تک سناٹے کا راج تھا، یہاں سے ان دونوں کی راہیں جدا ہو جاتیں اچانک کیرن نے اس سے پوچھا۔ ''تمہارے پاس کچھ پیسے ہیں؟''

''تھوڑے بہت ہیں۔''

کیرن... قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''تین دن کے لیے کافی ہوں گے؟'' اسے یاد تھا کہ جیر اللہ جب چھٹیاں گزارنے بہاماس گیا تو اس کے پاس صرف تین دن کے اخراجات کے لیے رقم تھی لیکن اس نے چھوٹے موٹے کام کر کے اتنے پیسے کما لیے تھے کہ وہ وہاں تین ماہ تک رہتا رہا۔

جیر اللہ اس کا اشارہ سمجھ گیا اور بولا۔ ''تمہیں وہ بات یاد ہے؟'' پھر اس نے کیرن سے کہا۔ ''کیا تم میرے ساتھ لمبی ڈرائیو پر جانا پسند کرو گی؟''

وہ پُرسکون انداز میں بولی۔ ''کہاں؟''

''ساحل کے ساتھ ساتھ۔'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں جانتا کہ ہم کہاں تک جائیں گے لیکن میری خواہش ہے کہ یہ سفر کبھی ختم نہ ہو۔''

وہ اپنی سیٹ پر گھومی اور اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے ذہن میں کیا ہے؟''

جیر اللہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ''سچ۔''

کیرن نے جواب دینے کے بجائے سی ڈی پلیئر آن کر دیا۔ نورا جونز کی آواز فضا میں گونجنے لگی۔ ''میں نے رات بھر کچھ نہیں کیا......''

جیر اللہ نے کار گیئر میں ڈالی اور بولا۔ ''میں نے جھوٹ بولا تھا دراصل میں بھی نورا جونز کو بہت پسند کرتا ہوں۔''

''میں جانتی ہوں۔'' کیرن اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔ ''ہر کوئی اسے پسند کرتا ہے۔''



لکیروں کے اسیر

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

ہاتھ کی لکیروں کو اگر غور سے دیکھا جائے تو ایسا لگتا ہے جیسے کسی منزل کا نقشہ سامنے پھیلا ہوا ہے اور دور تک جاتی ان لکیروں کو چھوٹی چھوٹی کٹی شکستہ لکیریں اپنے جال میں الجھاتی جا رہی ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی سیدھے رستے کی تلاش میں بھول بھلیوں میں قید ہو جائے۔ ایسے ہی ایک روز وہ بھی کسی خوفزدہ ہرن کے مانند امیدوں کے جنگل میں تنہا بھٹکتی رہ گئی تھی، جب اچانک اس کے پیروں تلے سے زمین اور سر سے آسمان کھینچ لیا گیا تھا، گویا ساری کائنات ہی تلپٹ ہو کر رہ گئی تھی۔ کہتے ہیں محبت جتنی تقسیم ہوتی ہے اتنی ہی مضبوط بھی ہوتی جاتی ہے مگر وہ تو شاید محبت کی ضرب در ضرب کا شکار ہو گیا تھا۔ ایک جابرانہ انا کے خول میں بند مرد اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا۔ تین بول نکاح کے پڑھوا کر خوابوں کی دنیا میں قید کیا اور جب حکمرانی کا جنون چڑھا تو طلاق کے تین بول سے زندان کا در وا کر دیا مگر... اس وقت تک پنچھی کو اس حصار کی عادت ہو چکی تھی اس دوران وہ اپنی اونچی اڑان تک بھول گیا تھا۔ پیار کی ہلکی ہلکی بوندا باندی سے موسم نے پلٹا کھایا اور طوفان کی گھن گرج نے گھر کی ملکہ کو در کی باندی بھی نہ رہنے دیا... اللہ نے زندگی کو بہت سہل بنایا لیکن انسان کی جذباتی لغزشوں نے اسے اذیتوں کی کھائی میں دھکیل دیا۔ ایسے میں واپسی کا سفر اسے انگاروں پر چل کر طے کرنا تھا کیونکہ یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے روح کر بدن کا لباس بدلنے پر مجبور کر دیا جائے۔ ایسے میں اسے روز مرنا... روز جینا تھا۔

"مجھے مت چھوڑو...... پلیز...... روبی!"

اس نے دل کی گہرائیوں سے، بڑے عمیق لہجے میں، گریہ وزاری کے سے انداز میں اس کی منت کی تھی۔ روبی نے اس کے لہجے میں بے چارگی اور التجا کو محسوس کر لیا تھا...... اور یہ بھی کہ وہ...... یعنی اس کا شوہر اسد...... اس سے دیوانہ وار اور بے انتہا محبت کرتا ہے جس کی شدت اس کے مجبور سے لہجے سے ہی نہیں آنکھوں سے بھی عیاں تھی۔ ان محسوسات سے قبل ہی...... روبی کو یقین کی حد تک علم تھا کہ اسد شادی سے پہلے ہی اس کی محبت میں مبتلا تھا پھر شادی بھی کچھ ایسے حالات میں ہوئی کہ اسد کی یہ خوشی روبی سے جدائی کے اندیشناک خوف ہی کا شکار رہی اور بالآخر وہی ہوا کہ روبی کو چھوڑنا اس کی مجبوری بن گئی اور روبی کی ضرورت...... مگر اب وہ بچوں کی طرح...... نم ناک آنکھوں میں التجا کے اشک سموئے اس سے آگے ساتھ نبھانے کی بھیک مانگ رہا تھا۔

"روبی! مل کے بچھڑنا میرے لیے بہت اذیت ناک ہوگا۔ میں تم بن نہیں رہ پاؤں گا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ تمہارا اور میرا ملن ہوتا ہی نہیں۔ وہ میرے لیے ایک غم نارسائی تو ہوتا...... جسے بہلایا جا سکتا تھا مگر اب...... اب...... یوں...... تمہارا مل کے بچھڑ جانا میرے لیے زیادہ کربناک ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے بڑی بے تابی سے روبی کا نرم و گداز ہاتھ پکڑ لیا...... روبی کو اس کے مردانہ ہاتھ کی سختی اور گرفت نے ایک لمحے کو خوف زدہ سا کر دیا۔ مجبوراً اسے اپنی زبان پر سختی لانا پڑی۔ بہت دھیرے سے اس نے پہلے اپنا ہاتھ چھڑایا پھر بولی۔

"اسد! میں نے پہلے ہی تم پر ساری بات واضح کر دی تھی تاکہ تم بھی ذہنی طور پر اس کے لیے تیار رہو...... پھر میں نے تم پر بھروسا بھی تو کیا تھا اسد! اور کچھ سوچ کر ہی تمہارا انتخاب کیا تھا کہ تم لائقِ اعتبار ہو اور ایک شریف مرد ثابت ہو سکتے ہو میرے لیے...... خدا کے لیے...... اپنا یہ اعتبار اور میرا یہ مان...... میرے اندر اسی طرح آباد رہنے دو...... میں تاعمر تمہاری ممنون و احسان مند رہوں گی...... مجھے اس بات پر ہمیشہ فخر رہے گا کہ تمہارے سلسلے میں میرا انتخاب...... غلط نہ تھا۔ پلیز اسد! لیوی...... ناؤ...... فار مائی سیک......"

اس کے اندر جیسے ایک چھناکے سے سب کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا تھا...... روبی کے بے رحم لفظوں نے اسے باور کرا دیا تھا کہ...... اب سوچنے سمجھنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔

اسے اب اپنی محبت کو، اپنی روبی کو چھوڑنا ہی تھا...... ہمیشہ کے لیے...... ایک لمحے کو اس کے دل میں سرکشی نے بھی سر ابھارا تھا...... مگر پھر...... تیشۂ محبت نے جیسے ایک ہی وار سے اس کے دلِ مجبور میں ابھرنے والی سرکش لہر کو مٹا ڈالا۔

میز پر رکھے اسٹامپ پیپر پہ قلم پڑا ہوا تھا۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے قلم اٹھایا...... ایسے میں اس کا دل ڈوب رہا تھا...... روح تک رو رہی تھی، اس نے آخری بار ملتجیانہ نظر سامنے کھڑی روبی کے چہرے پر اس امید سے ڈالی کہ شاید وہ ایسا کرنے سے اسے روک دے...... مگر روبی کے سپاٹ چہرے نے اس کے اندر کے مایوس اندھیاروں کو مزید سوا کر دیا۔ بالآخر اس نے...... روبی کو طلاق دے دی۔

☆☆☆

طلاق نامہ پرس میں ڈال کر گھر کی طرف لوٹتے ہوئے روبی کا اندر بھی اتھل پتھل کا شکار تھا۔ جہاں اسے ایک گم گشتہ تعلقِ خاطر کی دوبارہ ملنے کی خوشی تھی، وہاں اسے ایک قلق بھی ہو رہا تھا۔ اس قلق میں دکھ کا شائبہ کم ضمیر کی چبھن زیادہ تھی۔ کیا ضروری تھا کہ شعیب کو دوبارہ پانے کے لیے اسد کا ہی انتخاب کیا جاتا۔ وہ کسی اور شخص کا بھی تو انتخاب کر سکتی تھی...... جبکہ وہ جانتی بھی تھی کہ...... اسد اس سے کس قدر محبت کرتا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ اس مقصد کے لیے اسے موزوں لگا تھا اور قابلِ اعتبار بھی۔ اس نے محبت کی خاطر...... اور اپنے دل پہ جبر کر کے ایک بڑی قربانی دی تھی...... اور روبی نے...... اپنے اندر کی عورت کو اپنی عزتِ نفس کو چکنا چور کر کے ایثارِ محبت کی خاطر شعیب سے تجدیدِ تعلق کی راہ بنائی تھی جو اس کے لیے ہی نہیں ایک عورت کے لیے بھی پلِ صراط پر چلنے کے مترادف تھا...... بہ خیر و عافیت...... طلاق ملنے کی طمانیت کو ایک شرمندگی نے نگل لیا تھا...... کیا وہ کھلونا تھی؟ ایک مرد کے بعد دوسرے مرد کی جھولی میں گرا دی گئی اور پھر دوبارہ پہلے مرد کی جھولی میں ڈال دی جانے والی تھی...... پہلا مرد...... یعنی شعیب بھی ایک طرح سے اس کے لیے اب تیسرا مرد ہی ثابت ہونے والا تھا۔

اس نے اپنی اندر کی چیختی چلاتی عورت کو خاموش کرنے کے لیے یہ تاویل دینے کی کوشش کی۔ اگر وہ کھلونا بنی تھی تو...... شعیب جیسے انسان نے بھی تو کڑوا گھونٹ بھرا تھا۔ اپنی مردانہ انا اور غیرت کا ایک طرح سے اس نے بھی تو سودا کیا تھا اور دونوں ہی بہ عین ایک ہی طرح کی اذیت سے گزرے تھے۔

سوچوں میں وہ بھول ہی گئی تھی کہ...... نعمان ہائٹس کے نیچے شعیب اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اسد کا فلیٹ ساتویں فلور پر تھا۔ وہ لفٹ کے ذریعے نیچے آئی اور باؤنڈری گیٹ سے باہر سڑک کے کنارے تک ہی پہنچی تھی کہ عقب سے کار کے ہارن کی آواز پر چونکی۔ پھر ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ کار میں شعیب تھا۔ روبی پلٹی اور اس کے برابر والی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

''کیا رہا؟'' کار آگے بڑھاتے ہوئے شعیب نے پوچھا۔ اس کے استفساریہ لہجے سے بے چینی ہویدا تھی۔ وہ چالیس، پینتالیس سال کا خوبرو مرد تھا۔ رنگ گورا تھا، مزاج کا تیکھا تھا۔ اس نے نیوی بلیو شرٹ اور سیاہ ڈریس پینٹ پہن رکھی تھی۔

''اس نے مجھے طلاق دے دی ہے۔'' روبی نے ہولے سے بتایا۔ نگاہیں ونڈ اسکرین سے پار کسی غیر مرئی نقطے پر لگی ہوئی تھیں۔

''ویری گڈ۔'' شعیب خوشی سے بولا۔ ایسے میں روبی نے ذرا گردن موڑ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ شاید وہ سمجھنا چاہتی تھی کہ آیا وہ واقعی خوش تھا؟ نظر تو یہی آ رہا تھا...... مگر وہ اس کے چہرے سے ایک مرد کو بھی تلاشنا چاہ رہی تھی جس کی ہلکی سی جھلک بھی روبی کو نظر نہ آئی۔

''اس خوشی میں آج سی ویو کے قریب زبردست ڈنر کریں گے۔'' وہ ایک موڑ کاٹتے ہوئے بولا۔

''آج نہیں...... پھر کبھی......'' روبی نے ٹال دیا۔ نہ جانے کیوں وہ اپنے دل و دماغ پر ایک بوجھ سا محسوس کر رہی تھی بلکہ اس کا پورا وجود ہی بوجھل سا ہو رہا تھا جبکہ شعیب پر اس کا شائبہ تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو بس خوش تھا کہ وہ اب دوبارہ اس کی ہونے والی تھی۔

شعیب ابھی اسے خود سے جدا کرنے کے موڈ میں نہ تھا مگر روبی نے اس سے یہی درخواست کی تھی کہ وہ اسے گھر پر ڈراپ کر دے۔

گھر پہنچ کر ماسی نے اس کا استقبال کیا۔ وہ اس کی خالہ تھی۔ اس کی غمگسار دکھ سکھ کی ساتھی اور رازدار بھی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر خاتون تھی۔ گھر اس کا تھا، بے اولاد تھی، شوہر کے انتقال کے بعد بس وہ تھی اور روبی۔ شوہر ایک سرکاری ادارے میں اوسط درجے کی جاب کرتے تھے۔ ریٹائرڈ بھی یہیں سے ہوئے تھے۔ دو کمروں کا چھوٹا سا گھر اپنا تھا، اب پنشن سے گزارہ ہوتا تھا۔

روبی گھر پہنچ کر بے اختیار ماسی سے لپٹ کر رو پڑی۔ ماسی نے بھی اسے خود سے لپٹا لیا۔ وہ اس کے ہر دکھ درد سے واقف تھی۔

''ماسی! ایک بات بتاؤ نا...... کیا یہ سب صحیح ہو رہا ہے؟ کیا...... کیا...... مجھے مردوں کی اس دنیا میں کھلونا تو نہیں بنایا جا رہا؟'' وہ بڑے دکھ بھرے رسان سے بولی۔ ماسی نے بڑی محبت سے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور سمجھانے کے انداز میں بولی۔

''ایسا مت سوچو بیٹی۔ دل پر خواہ مخواہ کا بوجھ پڑے گا۔ تمہیں کوئی کھلونا نہیں بنا رہا۔ دین نے جو راستے بنائے ہیں، وہ انسان کی بھلائی کے لیے ہیں...... اور اسی میں ان کے لیے سبق بھی ہے...... تم ایسا نہ سوچو۔ چلو اب تم نہا دھو کر فریش ہو جاؤ، میں کھانا لگاتی ہوں۔''

''نہیں ماسی! مجھے بھوک نہیں ہے، چائے پینا ہے مجھے صرف......'' روبی نے تھکی تھکی آواز سے کہا۔ ماسی نے کچن کی راہ لی۔ روبی اپنے کمرے میں آ گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہوئی تھی کہ اس کا سیل فون بجا۔ کال شعیب کی تھی۔ اس نے سیل کان سے لگا کر مختصراً کہا۔

''جی!''

''روبی! کیا تم خوش نہیں ہو؟''

''یہ آپ نے کیسے اندازہ لگا لیا؟''

''آج تم مجھے کچھ اکھڑی اکھڑی سی نظر آ رہی تھیں۔'' وہ بولا۔

''مجھ سے ٹھیک طرح بات بھی نہیں کی تم نے...... کہیں تمہیں کسی بات کا پچھتاوا تو نہیں ہو رہا؟''

شعیب کی بات پر روبی نے ہونٹ بھینچ لیے...... اور ناراضی کے اظہار کے لیے خاموش رہی۔ دوسری طرف شاید شعیب کو بھی اس کا اندازہ ہو گیا۔ فوراً بولا۔

''سوری! تمہیں شاید برا لگا...... مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔''

''شعیب! تمہیں اب اپنی یہ عادت بدلنا ہوگی، اس کا ہم بہت خمیازہ بھگت چکے ہیں۔ بلکہ تم سے زیادہ مجھے بھگتنا پڑا ہے۔ تم مجھ سے اور کتنی قربانیاں چاہتے ہو...... اب تو بس ایک جان ہی رہ گئی ہے، بولو تو وہ بھی دے دوں تمہاری خاطر......''

وہ سسک پڑی تو شعیب تڑپ اٹھا اور اس انداز میں بولا۔

''روبی مائی ڈارلنگ! آئی ایم سوری...... ٹرسٹ می...... پلیز! خفا مت ہوا کرو، مجھے بھی اپنی غلطی کا احساس ہے اور اس بات کا بھی کہ تم نے میری خاطر اپنی زندگی کا کتنا کڑوا گھونٹ بھرا ہے...... مگر...... اچھا چھوڑو...... دراصل میں تمہارا دل بہلانا چاہتا تھا۔ جانتا ہوں میں کہ تم...... پلِ صراط کا سفر طے کر کے آئی ہو۔ میں تمہارے سارے دکھ مٹا ڈالنا چاہتا ہوں۔'' چند ثانیے متوقف ہونے کے بعد اس نے دوبارہ پوچھا۔ ''پھر آج شام آ جاؤں......؟ چل رہی ہو نا میرے ساتھ؟''

روبی نے اسے بالآخر ہاں کر دی۔

☆☆☆

ایک چھوٹے سے ایشو پر بات بڑھ گئی تھی۔ حالانکہ دونوں کی محبت شادی کے بعد ہی پروان چڑھی تھی۔ میاں بیوی کے درمیان اس طرح کی پنپنے والی محبتیں عموماً دیرپا اور پائیدار ثابت ہوتی ہیں، مگر محبت کا ایک عجیب المیہ بھی ہے۔ جتنی زیادہ محبت ہوگی، اتنے ہی شکوک و شبہات کا زہر بھی پروان چڑھتا ہے۔ غلط فہمیاں بھی جنم لیتی ہیں...... اگرچہ دونوں کے درمیان ایسی کوئی بات ابھی پروان نہیں چڑھی تھی مگر شعیب مزاجاً تیز اور طبیعت کا غصہ ور آدمی تھا۔ ایسا آدمی عموماً دل و نیت کا صاف بھی ہوتا ہے۔ شعیب کا بھی غصہ وقتی ہوتا تھا۔

روبی اور شعیب کی شادی کو تین برس بیت چکے تھے۔ ایک عورت شادی کے بعد جو دوسرا خواب اپنی آنکھوں میں سجاتی ہے...... وہ ماں بننے کا ہوتا ہے۔ روبی کو اپنا یہ خواب ہنوز شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے لیے وہ خاصی بے چین اور مضطرب رہنے لگی تھی۔ عورت جب تک ماں نہ بنے خود کو ادھورا تصور کرتی ہے۔ یہی حال روبی کا تھا۔

شعیب ایک گورنمنٹ ڈگری کالج میں کیمسٹری کا لیکچرار تھا۔ بوڑھی ماں تھی اور خود تھا۔ ترقی کرنا جانتا تھا۔ اس نے ایک کوچنگ سینٹر کی بنیاد ڈالی۔ آج وہ ایک بہت بڑا ادارہ بن چکا تھا جہاں انٹری ٹیسٹ کی تیاری بھی کروائی جاتی تھی۔ ابتدا میں دو شفٹیں ہوتی تھیں، اب تین ہونے لگی تھیں۔ روبی بھی اپنے شوہر کے کوچنگ سینٹر کو جوائن کر چکی تھی اور صبح کی شفٹ میں پڑھاتی تھی۔

شعیب کو اس سے کافی آمدنی ہونے لگی تھی اور گلشن اقبال میں اس نے ایک شاندار بنگلا لے لیا تھا۔

وہ روبی سے...... بہت محبت کرتا تھا۔ دونوں بہ ظاہر ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے مگر روبی کے اندر ایک خلا آباد رہتا تھا۔ کوچنگ سینٹر میں مرد و عورتیں دونوں ہی بھرتی کیے ہوئے تھے۔ نویں جماعت سے انٹر تک کے لڑکے لڑکیاں

پڑھتے تھے، سینٹر میں فاخرہ بھی صبح کی شفٹ میں پڑھاتی تھی۔ وہ مطلقہ تھی اور ایک سالہ بیٹی کی ماں بھی تھی۔ روبی کی ہم عمر تھی۔ روبی جیسی حسن و دلکشی کی مالک تو نہ تھی تاہم ایک خاص قسم کی کشش رکھتی تھی، باتونی تھی اور گفتگو کے فن سے آشنا تھی، روبی سے اس کی دوستی ہوگئی تھی۔

وہ گلستان جوہر کے ایک فلیٹ میں رہتی تھی۔ صبح سینٹر آجاتی تھی، بیٹی کو سنبھالنے اور گھر کے دیگر کاموں کے لیے ایک میڈ رکھی ہوئی تھی۔

''ارے یار! تم اپنا اور شعیب صاحب کا میڈیکل چیک اپ کیوں نہیں کروالیتیں؟''

اس روز تھوڑی دیر کے لیے دونوں اسٹاف روم میں ساتھ تھیں اور چائے پی رہی تھیں تو فاخرہ نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ دونوں گہری سہیلیاں بن چکی تھیں مگر روبی نے ابھی اس سے اس موضوع کے سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ کچھ روز پہلے فاخرہ نے خود ہی یہ موضوع چھیڑ دیا تھا۔ ''شعیب صاحب اور تمہاری شادی کو تین سال گزر چکے مگر......''

''ہاں..... جب اللہ کی مرضی ہو۔'' روبی نے اس وقت اپنی سہیلی کو روایتی سا جواب دینے کی کوشش کی۔

''اللہ کی مرضی تو ہوتی ہی ہے مگر بندے کو بھی تو کچھ ہاتھ پاؤں مارنے چاہئیں نا۔''

''کیا مطلب؟''

''ارے بھئی ان چیزوں کا بھی علاج ممکن ہوتا ہے۔ تم دونوں کسی میڈیکل کنسلٹنٹ سے کیوں نہیں رجوع کرتے؟ اپنا اور شعیب کا پہلے میڈیکل چیک اپ تو کرواؤ..... آخر پتا تو چلے..... خرابی کس میں ہے۔ تم میں یا..... تمہارے شوہر میں..... اس کے بعد علاج شروع کرو۔''

وقت تھوڑا تھا۔ سرکاری ادارہ تو تھا نہیں کہ گھنٹوں بیٹھ کر گپیں ہانکی جاتیں، اگلے پیریڈ کی بیل بجی اور دونوں اسٹاف روم سے نکل کر اپنی اپنی کلاس لینے نکل گئیں۔

روبی کو فاخرہ کی بات دل کو لگی تھی۔ اس رات اس نے شعیب سے اس کا اظہار بھی کر دیا۔

''ارے بھئی اتنی فکر کی کیا بات ہے، شادی کو ابھی دو تین سال ہی تو ہوئے ہیں۔ میں نے تو آٹھ، آٹھ سال بعد بھی بچوں کی قطاریں لگتے دیکھی ہیں۔'' وہ مسکرایا۔ روبی منہ پھلا کر بولی۔

''دو نہیں پورے تین سال ہو چکے ہیں ہماری شادی کو..... اور یہ جو آپ آٹھ سال والی مثال دے رہے ہو نا، ایسا بہت کم ہوتا ہے اور اگر ہوتا بھی ہے تو..... صرف ایک..... اس کے بعد کبھی نہیں ہوتا اور اگر ہم بھی اسی طرح لیٹ کرتے رہیں گے تو یہ مناسب نہ ہوگا۔ ہمیں کنسلٹ کرنا پڑے گا۔''

''کیا مطلب؟'' شعیب ایک دم سنجیدہ ہوگیا، وہ بولی۔

''ہمیں اپنا چیک اپ کرانا ہوگا۔''

''پھر.....؟'' شعیب نے گھورنے کے انداز میں روبی کی طرف دیکھا۔ روبی کو احساس ہوا کہ شعیب کا حسب عادت پارا چڑھنے والا ہے مگر اس نے اپنی بات پوری ہی کرنے کی ٹھانی تھی۔ بولی۔

''پھر کیا..... پتا تو چلے ہم دونوں میں سے خرابی کس میں ہے؟''

''اوہ..... خرابی.....'' شعیب تلخ ہونے لگا۔ زہریلے لہجے میں بولا۔ ''تو گویا روبینہ بیگم یہ چاہتی ہیں کہ..... اگر خرابی مجھ میں ہے تو تم خود کو مجھ سے افضل سمجھو..... اور مجھے طنز کا نشانہ بناتی رہو۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ خدانخواستہ میں بھلا ایسا کیوں سمجھوں گی۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ اگر ہم دونوں میں سے کسی میں اگر کوئی نقص ہے تو اس کا علاج.....''

''ناؤ یوشٹ اپ.....'' وہ بھڑک کر بولا۔ ''یہ فضول بکواس ہے..... یہ صرف اوپر والے کی دین ہوتی ہے، علاج معالجے سے کچھ نہیں ہوتا..... اب سو جاؤ..... اور مجھے بھی سونے دو.....'' یہ کہہ کر وہ غصے سے کروٹ بدل کر سو گیا۔ روبی اپنے ہونٹ کاٹتی رہ گئی۔

☆☆☆

انسان کے اندر کوئی دکھ ہو تو وہ..... چاہتا ہے اپنا دکھ..... اپنی الجھن کسی کے ساتھ شیئر کرے۔ لہٰذا وہ اپنی سہیلی فاخرہ کے ساتھ ہی اپنا دکھ شیئر کرلیا کرتی تھی۔ اس نے رات والی گفتگو اور شعیب کی ناراضگی والی بات سے اسے آگاہ کیا تو فاخرہ تنک کر بولی۔

''لو بھلا..... اس میں ناراض ہونے والی کیا بات تھی۔ زمانہ بدل چکا ہے۔ میڈیکل کے شعبے میں آئے روز جدید ریسرچ ہوتی رہتی ہیں، نت نئے علاج دریافت ہونے لگے ہیں۔ بے اولادی بھی ایک میڈیکل پرابلم ہے جس کو مناسب توجہ اور علاج سے دور کیا جاسکتا ہے..... بیوی جائز اسلامی طریقے سے ماں بن سکتی ہے۔''

''مگر یہ بات شعیب کو کون سمجھائے، انہوں نے تو میڈیکل چیک اپ کو ہی اپنی انا کا مسئلہ بنالیا ہے۔'' روبی نے کہا۔

''معاف کرنا یار! اب مجھے یہ کہنے دو کہ تمہارے شوہر اگرچہ میرے بھی باس ہیں مگر..... کہنا پڑتا ہے کہ اتنے پڑھے لکھے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ان کی سوچ.....''

فاخرہ کی بات ادھوری رہ گئی، اچانک اسٹاف روم کے دروازے سے کوئی ہولے سے کھنکھارتا ہوا اندر داخل ہوا۔ درمیانہ قد، خوش شکل، گندمی رنگ اور خاموش طبع..... وہ شخص معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

''معاف کیجیے گا، میں مخل تو نہیں ہوا؟''

فاخرہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور حسب عادت شوخی سے بولی۔ ''آجایئے..... آجایئے..... ہم بھی یہاں مخول ہی کر رہے تھے۔'' پھر روبی کی طرف دیکھتے ہوئے..... نووارد کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ ہمارے نئے کولیگ مسٹر اسد ہیں۔ انگلش میں ماسٹر ہیں اور ظاہر ہے یہاں انگلش پڑھاتے بھی ہیں۔'' اسد نے روبی کی طرف دیکھ کر اپنے سر کو ہلکا سا خم کرکے سلام کیا پھر سامنے والے صوفے پر براجمان ہوگیا۔

''ان سے ملیے.....'' فاخرہ نے اس کی طرف دیکھ کر روبی کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''آپ یہاں کی کرتا دھرتا..... یعنی ہمارے باس شعیب صدیقی صاحب کی بیگم روبینہ صاحبہ ہیں۔ شوہر کا سینٹر ہونے کے باوجود اپنی تنخواہ پوری لیتی ہیں، نہ کم نہ زیادہ۔'' اس کے تعارف کے انداز نے اسد اور روبی دونوں کو بے اختیار مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا۔

اسی وقت بیل بج گئی۔ فاخرہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''ہم تو چلے آخری پیریڈ لینے..... اجازت دیجیے۔'' وہ چلی گئی۔ روم میں اب صرف اسد اور روبی رہ گئے۔ روبی آخر کے ایک گھنٹے میں ایڈمنسٹریشن بلاک میں چلی جاتی تھی اور معاملات کی نگرانی کیا کرتی تھی۔

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر..... میں نے تین روز پہلے ہی آپ کا کوچنگ سینٹر جوائن کیا ہے۔'' اسد نے اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جی اتفاق سے میں تین روز سے چھٹی پر تھی۔ آج ہی آئی ہوں.....'' روبی نے جواباً کہا پھر دانستہ رسٹ واچ میں وقت دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''معاف کیجیے گا۔'' کہہ کر وہ اسٹاف روم سے باہر نکل گئی۔ اسد کچھ سوچتا رہ گیا..... وہ خود کو پل کے پل ایک ان دیکھے حصار میں محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کی ایک وجہ تھی..... بڑی ٹھوس وجہ..... وہ یہ کہ روبینہ کی صورت میں اسے شناسائی کی ایک جھلک سی نظر آئی تھی۔ روبی کے جانے کے بعد وہ اس لیے سوچ میں پڑ گیا..... وہ چہرہ جو برسوں پہلے اس کے دل کے نہاں گوشوں کی گونج بنا رہا تھا، آج یوں اچانک سامنے آیا بھی تو کس طرح..... روبی نے اسے نہیں پہچانا تھا؟ یا پھر..... وہ دانستہ گریز کرگئی تھی؟

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا اور کلاس روم کی طرف جانے لگا۔ یہ دومنزلہ کوچنگ اینڈ اسکول سسٹم تھا۔ صبح میں اسکول اور شام میں کوچنگ کی کلاسز ہوتی تھیں۔ ابھی بیس منٹ کا بریک ہوا تھا۔ اسد نے اٹھ کر اس کوریڈور کا رخ کیا، جدھر ایڈمن کے کمرے بنے ہوئے تھے اور..... اپنے مطلوبہ کمرے کے سامنے پہنچ کر رکا اور نیم پلیٹ پر نظر ڈالی جس پر مسز روبینہ شعیب لکھا تھا...... ایڈمن کے امتیازی صاحب نے جوائننگ کے وقت اسد سے کہا تھا کہ وہ مسز روبینہ شعیب سے اپنا ایمپلائی کارڈ بنوالیں تاکہ تنخواہ کے حصول میں کوئی مشکل پیش نہ آسکے۔ کارڈ لینا ضروری تھا۔ وہ چھٹی پر تھیں، آج آئیں تو اسد نے ادھر کا رخ کیا تھا۔ مگر اس بار صرف کارڈ کا حصول نہیں، حصول تمنا بھی شامل تھی۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سامنے ہی بڑی سی میز کے پیچھے ایک کرسی پر روبینہ میز پر پھیلے کچھ کاغذات کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ دروازے پر کھڑے کئی پل اسے روبینہ کے جھکے ہوئے چہرے کو تکتے ہوئے گزر گئے۔ پھر شاید روبینہ کو خود ہی دروازے پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور اس نے اپنا سر اٹھا کر دیکھا تو اسد گھبرا سا گیا۔

''آپ.....؟''

روبینہ نے گہری سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو اسد نے اپنی چوری گھبراہٹ پر فوراً قابو پاتے ہوئے بات بنائی۔ ''دراصل میں سوچ رہا تھا، آپ مصروف ہیں، کل سہی..... لل..... لیکن.....''

''کوئی کام تھا؟'' روبینہ نے سپاٹ سے لہجے میں پوچھا۔ وہی آواز..... وہی لیے دیے رہنے والا لہجہ..... جس سے ہمیشہ اسد کی ہمت جواب دینے لگتی تھی مگر آج اسے ہمت تو کرنا ہی تھی کیونکہ آمدم برسر مطلب تو بتانا ہی تھا، لہٰذا جھینپی جھینپی مسکراہٹ چہرے پر لیے وہ چند قدم اندر آتے ہوئے بولا۔

''وہ..... امتیازی صاحب نے کہا تھا کہ میں آپ سے اپنا ایمپلائی کارڈ لے لوں..... آپ تین دن سے چھٹی پر تھیں، آج.....''

''آیئے تشریف لایئے۔'' روبینہ نے فوراً کہا۔ اسد

اندر آ گیا۔ روبینہ نے اسے اپنے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ شکریہ کہہ کر بیٹھ گیا۔ ”آپ کا پورا نام اسد شیرازی ہے نا......؟“ روبینہ نے کہتے ہوئے اپنے الٹے ہاتھ کی دراز کھولی تو اسد کے ذہن میں جھما کا ہوا۔

”دراصل یہاں اسد نام کے تین اور بھی ٹیوٹر ہیں۔ امتیازی صاحب نے مجھے آپ کے بارے میں ابھی تھوڑی دیر پہلے آ کر بتایا ہے۔“

روبینہ نے یہ کہہ کر گویا اسد کی خوش فہمی رفع کر ڈالی...... ورنہ وہ تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ وہ بھی اسے پرانے کالج فیلو کے حوالے سے پہچان گئی ہے۔ دس، بارہ سال کا عرصہ کم تو نہیں ہوتا مگر بہرحال شبیہات تو اتنی جلدی نہیں بدلا کرتیں۔ ہاں! تھوڑی بہت صورت میں تبدیلی ضرور آ جاتی ہے۔ مگر اسد کو روبینہ اب بھی بالکل ویسی ہی نظر آ رہی تھی، ویسے ہی ہلکے گندھے ہوئے بال...... وہی شہابی رنگت چہرہ اور نرم و گداز گورے ہاتھ...... مگر آنکھیں...... ہاں...... البتہ گہری کشادہ آنکھوں میں ایک بے نام سی اداسی کی شام ٹھہری ہوئی ضرور محسوس ہوئی تھی۔

”آپ کی فائل میں نے نکال لی ہے۔ دستخط کر کے امتیازی صاحب کو بھجوا دیتی ہوں، وہ کمپیوٹر سے کارڈ بنوا کر آپ کو دے دیں گے۔ مگر کارڈ میں شعیب صاحب کے دستخط ہونا ضروری ہوں گے، اس لیے کارڈ آپ دو دن بعد ہی لے لیجیے گا۔“ روبینہ نے کہا۔

اسد نے ہولے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ سوچتی نظروں سے روبی کے چہرے کو تکتا رہ گیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس سے کچھ پوچھے...... کچھ پرانے حوالوں سے...... مگر ہمیشہ کی طرح وہ اس معاملے میں بودا اور کم ہمت ہی نکلا...... اس دوران روبی نے دوبارہ اس کی طرف دیکھا۔ اسے اپنی طرف... دیکھتا پا کر وہ بولی۔

”اور کچھ پوچھنا ہے آپ کو......؟“ مطلب صاف تھا کہ اب جائیے بھی۔

”نن...... نہیں...... شش...... شکریہ......“ اسد نے کہا اور یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر تیزی کے ساتھ واپس مڑ گیا۔

روبینہ کے چہرے پر پہلی بار ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ پھر وہ ہولے سے اپنا سر جھٹک کر بولی۔ ”عجیب ہی آدمی ہے، ابھی تک نہیں بدلا......“ اسد نے آخری پیریڈ لیا اور کوچنگ سینٹر سے باہر آ گیا۔ پارکنگ میں اس کی سفید رنگ کی سیکنڈ ہینڈ مہران کار کھڑی تھی۔ وہ اس میں سوار ہوا اور روانہ ہو گیا۔

وہ گلشن اقبال میں رہتا تھا۔ جہاں دو اور تین کمروں کے لگژری اپارٹمنٹ حال ہی میں تعمیر ہوئے تھے۔ کسی زمانے میں اس نے ایک بک کروالیا تھا اور اب پچھلے چند ماہ پہلے ہی اسے قبضہ ملا تھا۔ اس سے پہلے وہ موسمیات کے قریب ایک تنگ و تاریک کرائے کے فلیٹ میں رہتا تھا۔ اس کا آبائی شہر سکھر تھا۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد اس کی پرورش اس کے تایا نے کی تھی۔ کیوں کی تھی؟ اس کا عقدہ ان کی بڑی بیٹی صبا کے جوان ہونے پر ہی کھلا...... اسد ابھی شادی وغیرہ کے بکھیڑوں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ وہ تعلیم مکمل کرنے کا بہانہ بنا کر شادی کو ٹالتا رہا۔ پھر جب تایا کی پہلی بڑی بیٹی رخصت ہوئی تو دوسری جوان ہو گئی۔ ایک بار پھر ندا کی صورت میں اس کے سر پر تلوار لٹکنے لگی۔ بڑی مشکل سے اسد نے اسے بھی ٹال دیا تو چھوٹی کے رخصت ہوتے ہی تایا نے اسد کو بھی ٹال دیا یعنی نکال دیا۔

اسد...... بی ایس سی کر چکا تھا۔ تایا کی نظریں بدلتے ہی اس نے اپنا مختصر سا بوریا بستر سمیٹا اور کراچی آ گیا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ تعلیمی اور بعض کاروباری حوالوں سے کراچی بڑا زرخیز شہر ہے۔

سکھر میں رہتے ہوئے اسد پہلے ہی سے کراچی شفٹ ہونے کی داغ بیل ڈال چکا تھا۔ سکھر سے ہی تعلق رکھنے والے اس کے دو دوست کراچی میں کرائے کا فلیٹ لے کر وہاں رہتے تھے، وہ بھی ان میں شامل ہو گیا۔

وہیں اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا...... شام میں ٹیوشنز پڑھایا کرتا تھا۔

اس دوران میں اس کی دلچسپی...... بلکہ دلی وابستگی روبینہ شمس سے ہونے لگی جو اب روبینہ شعیب تھی۔ اسد اپنی طبیعت میں ایک عجیب فطرت رکھتا تھا۔ وہ بہت خاموش طبع واقع ہوا تھا۔ کسی سے بات کرتے ہوئے بھی جھجکتا تھا۔ شاید اس کی وجہ اس کا بے رنگ ماضی تھا کہ اس نے شروع ہی سے خود کو اکیلا اور دوسروں کے در پے پایا تھا۔ نو دس سال کیا عمر ہوتی ہے۔ جب اس کے ماں باپ جاں بحق ہو گئے تھے۔ اوسط درجے سے بھی نچلی سطح کی زندگی تھی ان کی......

البتہ تایا رشید نسبتاً کچھ بہتر معاشی پوزیشن میں تھے۔ ریلوے میں ان کی ملازمت تھی۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا جو سب سے چھوٹا تھا۔ اس لیے انہوں نے اسد کو بھی کچھ سوچ کر سنبھال لیا تھا۔

اسد کو روبی اچھی لگتی تھی۔ ایسے چپ چپ رہنے والے لوگ نفسیات کی رو سے اندر سے بہت طاقت ور

جذبے کے مالک ہوتے ہیں۔ مگر اس کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ کم ہمت تھا اور اس نے سن رکھا تھا کہ محبت میں کم ہمتی، ہمیشہ شکست سے دوچار کرتی ہے...... کئی ایک مواقع اسے ملے تھے، روبی سے بات کرنے اور اس سے مخاطب ہونے کے لیے...... مگر وہ ہمت ہی نہ کر سکا...... ہاں! ایک بار نہ جانے کس طرح یونیورسٹی کی کینٹین میں...... اتفاقاً ہی دونوں کا دوبدو ٹکراؤ ہو گیا۔

اس دن اسد کی صبح دیر سے آنکھ کھلی تھی۔ یونیورسٹی جانا بھی ضروری تھا۔ ایک اہم اسائنمنٹ تھا۔ وہ جلدی جلدی تیار ہونے لگا، مگر ناشتا... نہ کر سکا...... ورنہ یونیورسٹی کا پوائنٹ نکل جاتا اور پھر اسے دو بسوں میں دھکے کھانے پڑتے۔ لیٹ بھی ہو جاتا...... لہٰذا اس نے چائے بھی نہ پی اور یونیورسٹی پہنچ گیا۔

ایک کلاس اٹینڈ کرنے کے بعد اسے بھوک محسوس ہوئی اور اس نے سیدھا کینٹین کا رخ کیا۔ وہاں آج غیر معمولی رش تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی طرح سب ہی آج ناشتا نہیں کر کے آئے۔ وہ مایوس ہو کر لوٹنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک ایک کونے والی میز کی دو کرسیاں خالی ہو گئیں۔ وہ کاؤنٹر سے دو سموسے اور چائے کا کپ لیے سیدھا اس سمت بڑھا۔

ابھی اسے وہاں بیٹھے ذرا ہی دیر گزری تھی کہ ایک رس گھولتی مترنم آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

”ہیلو......! آپ کے ساتھ یہاں کوئی اور تو نہیں؟“

اس نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا پھر جیسے اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ وہ یکدم نروس سا ہو گیا۔ اسی لہجے میں بولا۔ ”نن...... نہیں...... آپ بیٹھیے......“

وہ روبی تھی، اس نے بھی پلاسٹک کی پلیٹ اور چائے کا مگ تھام رکھا تھا۔ ہولے سے ”تھینکس“ کہتی ہوئی وہ اس کے قریب، سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس کی حالت غیر سی ہونے لگی۔ اسے اپنی اس کیفیت پر غصہ بھی بہت آتا تھا۔ روبی غیر محسوس مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اسد نے بھی چور نظر اس کے ملیح چہرے پر ڈالی۔ اسے روبی کے قریب سے ہمیشہ ایک مخصوص اور مسحور کن سی مہک آتی محسوس ہوتی تھی...... روبی کی نازک اندام شخصیت کا سحر اسے پھر بے خود سا کرنے لگا...... پل کے پل جیسے وہ گردشِ دوراں سے بے خبر ہو گیا۔ سب کچھ جیسے تھم سا گیا، کینٹین کا غیر معمولی شور بھی جانے کسی احساس تلے دب چکا تھا۔

”آج تو یہاں غیر معمولی رش دیکھنے میں آ رہا ہے......“ روبی نے گفتگو کی ابتدا کرنا چاہی۔

اسد چونکا۔ اسے اپنا منہ خشک ہوتا محسوس ہوا، بڑی مشکل سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی تھی۔

”جج...... جی......؟ جی ہاں! آج واقعی بہت لوگ ہیں یہاں......“

روبی کے عنابی لبوں پر پھر دل آویز سی مسکراہٹ چمکی۔ اس نے فقط ایک رمزیہ بولتی نگاہ...... اسد کے لرزاں چہرے پر ڈالی اور اسد کی بھی نظر اس پر پڑی تھی...... اسے...... روبی کے ساتھ اس قدر پاس...... بیٹھے ہوئے بہت اچھا لگ رہا تھا اس کا اندر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا...... یہی موقع ہے...... اس سے بات کرو، گھلو ملو...... جان پہچان کرو...... ارے اسد میاں......! یہ یونیورسٹی ہے، جھجک کیسی؟...... اپنے فیلوز سے تو انسان بات کرتا ہے۔

اس کی ہمت کچھ سوا ہوئی۔ اس نے روبی سے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ...... وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔

”تھینکس فار جوائننگ...... بائے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ چلی گئی اور اسد اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے جاتے ہی، ایکا ایکی سب کچھ پھیکا پھیکا سا محسوس ہونے لگا...... کینٹین میں باتوں کا شور اسے اب سخت ناگوار گزرنے لگا۔ اسے سخت پچھتاوا ہونے لگا...... ایک بار پھر اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ ”جاؤ میاں!...... تم کیا عشق کرو گے۔ تمہارے منہ سے آواز تک نہیں نکل پاتی۔“

اس روز اس کا یونیورسٹی میں دل ہی نہ لگا...... یونیورسٹی سے گھر تک وہ خود کو کوستا ہی رہا۔

اسد سادہ فطرت کا صاف دل آدمی تھا۔ روبی کی صورت اس کے دل و دماغ میں رچ بس گئی تھی۔ اس نے خود کو تسلی دی۔ ”روبی کون سا بھاگی جا رہی ہے۔ ایسے مواقع ملتے رہیں گے، اب کے اس سے کھلنے ملنے کی کوشش ضرور کروں گا۔“ اس نے پختہ عزم کیا اور خود کو مطمئن بھی۔

☆☆☆

کبھی انسان وقت کو گزارتا ہے۔ کبھی وقت انسان کو۔ اسد نے بھی بس وقت ہی کو گزارا۔ اب پتا نہیں وہ عشق و محبت کے معاملے میں سنجیدہ بھی تھا یا نہیں...... بس وہ روبی کو دیکھنے دیکھنے میں ہی کام چلاتا رہا۔ اس آس کے ساتھ کہ ایک دن پھر خود ہی اسے تقدیر روبی کے قریب ہونے کا موقع دے گی...... اور ایسا ہوتا بھی رہا...... مگر اسد کے اس

خاموش ''رومانس'' پر اس کی عجیب گوگو طبیعت کا غلبہ ہی سوار رہا۔ حتیٰ کہ یونیورسٹی کا یہ یادگار دور بھی تمام ہوا اور عملی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہوگیا۔

☆☆☆

گویا اسی ''فسانۂ مبتلا'' میں اسد نے بارہ سال گزار دیے۔ آج وہ اپنے دو کمروں کے اپارٹمنٹ میں موجود ان پرانی یادوں کے حوالے سے آہیں بھر رہا تھا۔ مختلف جگہوں پر نوکریاں بھی کرتا رہا تھا، طبیعت میں عجیب بے سکونی تو ابتدا سے ہی شامل تھی، تنہائی پن نے اسے مزید بڑھا دیا تھا۔ پھر ایک قریبی دوست کے مشورے اور اس کی مدد سے اس نے شادی بھی کرلی۔ نگہت نک سک سے تو اچھی تھی مگر تھی بہت کمزور۔ وہ اس کے دوست مذکور کی بیوی کی سہیلی تھی...... یہ شادی بہ مشکل ایک سال چلی اور زچگی کے دوران پیچیدگی کے باعث زچہ بچہ دونوں چل بسے...... اس کے اندر کا خلا مزید بڑھ گیا...... وہ پہلے ہی خاموش طبع تھا، اب تنہائی پسند بھی ہوگیا تھا۔

مزید کچھ عرصہ بیتا تو اس نے قریب کا ایک کوچنگ سینٹر جوائن کرلیا۔ وقت گزاری کے لیے وہ یہاں ڈبل شفٹ کرنا چاہتا تھا یعنی مارننگ ایوننگ مگر سرِدست اسے مارننگ ہی میں ڈیوٹی جوائن کرنے کا آرڈر ملا تھا۔ قریب تھا، آنے جانے میں آسانی تھی۔ اسد کو یہ جاب اچھی لگی...... مگر آج رولی کو وہاں دیکھ کر جیسے اس کی سوچوں اور خیالوں کے ٹھہرے ہوئے تالاب میں کسی نے کنکر اچھال دیا اور اس سے پیدا ہونے والے حصار میں وہ قید ہو کے رہ گیا۔

ایک بار پھر وہ خود کو موسمِ ہجراں کے گم گشتہ جنگل میں ننگے پاؤں چلتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ دل کے کسی گوشۂ نہاں میں دبی دبی وہ شبیہہ...... یادوں کے فریم میں آن سجی تھی جس پر وقت نے گرد تو ڈال دی تھی مگر اسے مٹا نہ پایا تھا۔

اس روز رولی سے بالکل غیر متوقع اور اچانک سامنا ہونے کے بعد سے اسد کے اندر پھر سے ایک اتھل پتھل مچ گئی تھی۔ تقدیر کیا چاہتی تھی؟ رولی کا اس سے دوبارہ سامنا کیوں ہوا تھا؟ اس میں کیا رمز تھا؟ قسمت کا کھیل یا پھر قسمت اس کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ دال میں کچھ کالا تھا...... کچھ ہونے والا تھا مگر کیا......؟

☆☆☆

فاخرہ کی باتیں تلخ ضرور تھیں مگر وہ رولی کے دل کو لگی تھیں اور ایسی لگیں کہ اس کے اندر پہلی بار ایک سرکشی نے سر ابھارا۔ تمرد اور احساسِ محرومی کی کیفیات میں انسان جو سوچتا ہے، وہ کر بھی گزرتا ہے...... رولی نے بھی اس روز شعیب سے کہہ ڈالا۔ ''میں...... کم از کم اپنا چیک اپ ضرور کرواؤں گی اور گائنا کولوجسٹ سے مشورہ بھی لوں گی۔''

شعیب کا چہرہ بگڑ گیا...... وہ گھورتی نظروں سے رولی کی طرف دیکھ کر درشت لہجے میں بولا۔ ''یہ کیا بکواس کر رہی ہو تم۔ کیا تم خود کو اس معاملے میں کلیئر کرنا چاہ رہی ہو...... کیا جتانا چاہتی ہو مجھ پر...... اپنی برتری......''

''یہ بات نہیں شی......!'' رولی نے اسے سمجھانا چاہا۔ ''میں چاہتی ہوں اگر ہم دونوں میں کوئی میڈیکل نقص ہے تو اس کا علاج کروایا جائے، ہمیں دقیانوسی سوچوں سے نکلنا ہوگا۔ ہم پڑھے لکھے اور سمجھدار......''

''شٹ اپ۔'' شعیب آپے سے باہر ہونے لگا۔ ''تم مجھے دقیانوسی کہہ رہی ہو؟ شرم کرو شوہر سے اس طرح کی گفتگو کرتی ہو۔''

''مجھے سمجھ میں نہیں آتا، آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟ آپ کیوں اتنا ایچی ہو رہے ہیں...... یہ بے اولاد جوڑے کا ایک پرابلم ہے اور اس کا علاج کرانا ہم دونوں کا حق ہے اور فرض بھی۔'' رولی کو بھی غصہ آنے لگا تھا۔

شعیب نے طیش آمیز نظروں سے رولی کو گھورا اور نہایت غضب ناک انداز میں چند قدم تیزی کے ساتھ یوں اس کے قریب آیا جیسے اس پر ہاتھ اٹھانے کا ارادہ رکھتا ہو...... دہاڑنے کے انداز میں ایک ہاتھ اٹھا کر بولا۔

''روبینہ بیگم!...... میں اس موضوع کو ختم کرنا چاہتا ہوں...... اور کان کھول کر سن لو...... آئندہ دوبارہ تم نے اس فضول بحث کو چھیڑا...... تو...... تو...... مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ سمجھیں تم؟'' وہ غصے سے پاؤں پٹخ کر کمرے سے نکلتا چلا گیا اور رولی کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی۔

☆☆☆

''شعیب کا مسئلہ مجھے سمجھ میں آرہا ہے۔''

فاخرہ نے اپنے پرس سے سونف سپاری نکالتے ہوئے سامنے رنجور سی بیٹھی...... رولی سے کہا اور دانت کی مدد سے تھیلی کاٹ کر اس کی جانب بڑھائی۔ رولی نے اپنی ہتھیلی بڑھا دی۔ فاخرہ نے سپاری اس کی ہتھیلی پر تھوڑی چھڑکی اور پھر باقی خود پھانک کر بولی۔

''دیکھو...... ایک بات تو طبی نقطۂ نگاہ سے بھی درست ہے...... اس طرح کے مسئلے میں مرد کی انوالومنٹ زیادہ ہوتی ہے۔ یہ حقیقت طے شدہ ہے اور مجھے اچھی طرح معلوم بھی ہے۔'' اس کی بات پر رولی نے قدرے غور کرنے

والے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''آف کورس......'' فاخرہ اس کی مستفسرانہ نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے بولی۔

''اس طرح کے کیسز میں زیادہ نقص مرد میں ہی پایا جاتا ہے۔ اب میں تمہیں کیا تفصیل بتاؤں...... میری ایک بڑی ماہر گائنا کولوجسٹ سے اچھی جان پہچان ہے۔ کہو تو میں تمہیں مشورے کے لیے اس کے پاس لے چلوں......؟''

اس کی بات سن کر رولی نے بڑے کڑے دل سے کہا۔ ''چاہتی تو میں بھی یہی ہوں، مگر شعیب بالکل بھی نہیں مانتے...... پہلے ہی وہ اس بات پر بری طرح بگڑے رہتے ہیں مجھ پر......''

فاخرہ کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ عود کر آئی، بولی۔ ''اس لیے تو کہہ رہی ہوں میں کہ میں شعیب کا مسئلہ سمجھ رہی ہوں...... وہ اس لیے یہ سب نہیں چاہتے کہ انہیں بھی اس حقیقت کا علم ہوگا...... کہ اس معاملے میں زیادہ نقص کا ذمے دار مرد ہی ہوتا ہے۔''

تھوڑے توقف سے وہ بولی۔ ''تم ایک کام کردنا...... کل میرے ساتھ چلی چلو...... دیکھ لینا پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے گا۔''

فاخرہ کا واضح طور پر انداز اسے اکسانے جیسا تھا...... فاخرہ کی اپنی گزشتہ زندگی اپنے شوہر سے خاصی منہ چڑھی گزری تھی، جو بالآخر طلاق پر منتج ہوئی...... یہ بات طے شدہ ہے، مرد کی عورت پر حاکمیت ہوتی ہے مگر اس حاکمیت کا مطلب بیوی پر بے جا حکم ٹھونسنا نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک خاندان کا سربراہ ہوتا ہے۔ بیوی، بچے اور گھر کی دیکھ بھال...... سب اس کی ذمے داری اور فرض ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ قدرتی طور پر بھی مرد کے خمیر میں حاکمیت کا جذبہ بھرا ہوتا ہے۔ اس میں اللہ نے ایک مصلحت رکھی ہے۔ جس میں پورے خاندان کی بھلائی و بقا ہے...... پھر شوہر تو مجازی خدا ہے۔ مرد سب کچھ برداشت کرلیتا ہے مگر حکم عدولی برداشت نہیں کرتا۔

فاخرہ باوجود اس کے...... کہ رولی کا شوہر اس کا باس بھی ہے، اسے بہ دستور اس کے منافی اکساتی رہی۔ حتیٰ کہ اسے اس بات پر مائل کر کے ہی چھوڑا۔ وہ اسے ایک دن مذکورہ لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گئی...... اس نے رولی کا معائنہ بھی کیا اور کچھ ضروری ٹیسٹ بھی کروائے...... جو سب اتفاق سے نارمل ہی ثابت ہوئے۔

فاخرہ کو پھر بولنے کا موقع مل گیا۔

''دیکھا؟ میں نہ کہتی تھی، شعیب میں ہی اس صلاحیت کی کمی ہے۔'' رولی کے دل کو یہ بات لگی تھی، تاہم اس کے ساتھ مذکورہ لیڈی ڈاکٹر نے رولی سے ازراہِ تشفی یہ بھی کہا تھا کہ...... ''اگر ایسا ہے بھی تو آپ کے شوہر کا علاج ممکن ہے، بشرطیکہ وہ اپنا میڈیکل چیک اپ بھی کرانے پر رضامند ہوجائیں اور سنجیدگی کے ساتھ اس پر عمل بھی کریں۔ شکر کرو...... اس میں کہ Pathology نہیں ہے، کوئی پیتھولوجیکل کنڈیشن نہیں ہے۔'' ڈاکٹر کی اس بات سے رولی کو بہت حوصلہ ملا تھا۔ وہ بڑی پرامید بھی اور خوش بھی...... مگر شعیب کے رویے کو یاد کرتی تو اس کا دل بجھ سا جاتا۔ اسے اس بات کا ڈر بھی ہونے لگا کہ...... اس نے یہ سب شوہر کی مرضی کے بنا اسے بتائے بغیر کیا ہے، ہوا اگرچہ اس پر بھی فاخرہ نے اسے اکسانے کی کوشش کی تھی...... مگر سرِدست رولی کی شوہر سے بات کرنے کی ہمت نہ پڑی...... اگلے دن اس کا سینٹر میں دل پڑھانے کو نہیں چاہ رہا تھا مگر فاخرہ سے بھی ملنے کی اسے ایک عادت سی ہوگئی تھی پھر...... شعیب نے بھی اس سے کہہ رکھا تھا کہ آج کل نیو ایڈمشن اوپن ہیں...... لہٰذا اس کا ایڈمنسٹریشن میں صبح کو موجود ہونا ضروری ہے۔ بڑی بے دلی کے ساتھ اس نے کلاس لی پھر...... ذرا ریسٹ کرنے اسٹاف روم میں آگئی تو کچھ چونک پڑی۔ وہاں اسد پہلے سے موجود تھا اور چائے پی رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور سلام کرتے ہوئے بولا۔

''مم...... میں...... بس ذرا چائے پینے ہی آیا تھا، میڈم!'' وہ گھبرا سا گیا تھا۔ آخر کو وہ بھی اس کی باس ہی تھی۔ تاہم اس نے...... اپنی نظریں رولی کے چہرے سے ہٹائی نہیں تھیں۔ رولی کو ہولے سے مسکرانا پڑا۔ پھر وہ ہولے سے ''اٹس اوکے'' کہہ کر اندر آگئی اور ایک طرف صوفے پر براجمان ہوگئی۔

اسد نے اس کے چہرے سے محسوس کیا تھا کہ وہ کچھ مضمحل سی تھی۔ بات سے بات کا موقع نکال کر فوراً بولا۔

''میڈم! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی...... اگر ایسی کوئی بات ہے تو آپ کی کلاس میں لے لیتا ہوں آج...... وہ...... میرا اگلا پیریڈ فری ہے، وجہ آپ کو معلوم ہی ہوگی۔''

''ہاں! مجھے معلوم ہے...... ایگزامز ہو رہے ہیں آج کل......'' رولی نے فوراً جواب دیا پھر سوچا اس کی بات کچھ غلط بھی نہ تھی۔ وہ تھوڑا وقت آفس میں بیٹھ کر کچھ انتظامی امور دیکھنے کے بعد گھر چلی جائے گی، لہٰذا بولی۔

''میرا خیال ہے آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ آج

واقعی میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں، بہت شکریہ آپ کا۔" وہ مسکرائی بھی تھی! اسد کو اس کی مسکراہٹ میں زندگی کے رنگ بکھرتے نظر آئے۔ باوجود اس کے ...... وہ شادی شدہ تھی...... بے شک یونیورسٹی کے دور میں وہ اس کی ایک "خاموش" پسند بھی رہ چکی تھی۔ اسد کو یہ سب اچھا لگا۔ آج نہ جانے اس کے اندر کہاں سے اتنی ہمت سمٹ آئی، جس پر اسے خود بھی حیرت تھی۔ کاش! وہ ایسی ہمت بہت پہلے کر چکا ہوتا۔ مگر وہ "ڈیو" ہی رہا جبکہ محبت کرنے والوں کو ڈیو نہیں "ڈیشنگ" ہونا چاہیے۔ آج اسے اس بات کا احساس ہوا تو ایک ہوک سی اس کے درماندہ دل میں اٹھی، وہ بولا۔

"میڈم! ایک بات کہوں؟"

"جی......" روبی نے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں...... مگر میں آپ کو پہچان چکا ہوں...... ہم دونوں یونیورسٹی فیلو رہ چکے ہیں۔"

روبی نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں! مجھے معلوم ہے۔ میں بھی تمہیں پہچان چکی ہوں۔"

"سچ میڈم!" اسد کے منہ سے یہ الفاظ قدرے بلند آواز میں نکلے۔ اس پر روبی نے بھی خاصا چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ اسد کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ کمرے سے نکل گیا۔

روبی کے چہرے پہ گہری سوچ کے تاثرات پھیل گئے اور اس نے اپنی آنکھیں موند کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

فاخرہ سے اس کی ملاقات جاتے وقت ہوئی تھی۔

"ارے کمال کرتی ہو تم! تم نے کوئی گناہ تو نہیں کیا۔ تمہیں اس بات کا ذکر ضرور کرنا چاہیے شوہر سے......"

روبی نے کہا۔ "ہمت نہیں پڑ رہی...... وہ خفا نہ ہوجائیں۔"

"واہ...... کیوں خفا ہوں گے؟ تم تو کہتی ہو...... وہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں اور یہ محبت شادی کے بعد ہی مزید پروان چڑھی ہے۔ محبت کرنے والوں کو تو ایک دوسرے پر بہت مان ہوتا ہے۔"

"ہاں! وہ تو ہے...... مگر۔" روبی کچھ کہتے کہتے رک گئی تو فاخرہ نے آخری چوٹ کی۔

"دیکھو روبی! تم نے جو کچھ کیا وہ ایک مشترکہ مفاد کی خاطر کیا، تم خود سوچو اس میں صرف تم ماں ہی نہیں بنو گی بلکہ شعیب کو بھی تو باپ بننے کی خوشی ہوگی...... اس سے تمہارا گھر بنے گا، ایک خاندان بنے گا، شعیب کی نسل آگے چلے گی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شعیب کو تمہاری اس حرکت پر ناراض ہونا چاہیے۔ بہرحال آگے تمہاری مرضی...... میں نے دوستی کی خاطر اپنا فرض پورا کر دیا۔" یہ کہہ کر فاخرہ چپ ہوگئی اور روبی پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔

☆☆☆

روبی کے لیے یہ واقعی بہت کٹھن مرحلہ تھا کہ وہ شوہر کو ان ساری باتوں سے آگاہ کرے...... پھر چند دن اسی طرح بیت گئے۔ شعیب کا موڈ بھی ٹھیک رہا۔ اس دوران میں روبی نے بھی شعیب سے کوئی ایسی ویسی بات نہ کی...... شعیب اس سے محبت کرتا تھا۔ اس روز دونوں نے رات کا کھانا باہر کھایا تھا...... شعیب نے اس سے محبت بھری باتیں کی تھیں۔ روبی کچھ حوصلہ اور ہمت پکڑنے لگی۔ اسے خود پر غرور بھی ہوتا کہ شعیب اس کو بے انتہا چاہتا تھا لہٰذا اس رات اس نے شعیب کو ساری بات بتا دی اور اپنی میڈیکل فائل دکھاتے ہوئے اس کی منت سماجت بھی کرنے لگی کہ اب وہ بھی اپنا میڈیکل چیک اپ کروالے اور...... اگر خدانخواستہ اس میں "صلاحیت" کا کوئی نقص ہے تو اس کا خاطر خواہ علاج بھی موجود ہے، جو اسے کروانا چاہیے۔

اس نے دیکھا...... شعیب کا خوشگوار موڈ ایک دم بدل گیا، چہرے پر گمبھیر سناٹا طاری ہوگیا۔ آنکھوں میں ایکا ایکی بے حسی اور سنگ دلی اتر آئی، تب وہ...... روبی کی طرف دیکھ کر پتھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ہوں...... تو گویا تم نے میری بات نہیں مانی......"

"مگر...... شی!...... میں نے ایسا کوئی برا کام تو نہیں کیا...... آپ کے اور اپنے ایک مشترکہ فائدے کے لیے......"

شعیب کی پاٹ دار آواز نے اس کی بات کاٹ دی۔ وہ اپنے سرخ پڑتے چہرے اور غیظ آمیز لہجے کے ارتعاش پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے بولا۔ "روبینہ بیگم......! میں تمہیں...... حکم عدولی کی بنا پر...... طلاق دیتا ہوں......"

روبی کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"تمہیں طلاق دیتا ہوں......"

روبی گنگ ہوگئی۔

"تمہیں طلاق دیتا ہوں......"

روبی کا چہرہ فق ہوگیا۔

روبی کو شعیب کے الفاظ اپنی زخمی سماعتوں میں پگھلے

ہوئے سیسے کی طرح اترتے محسوس ہوئے، پورا کمرا گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس کا حلق سوکھ کر کانٹا ہوگیا۔ اسے غش سا آنے لگا۔ اس کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ...... اتنا بڑا فیصلہ وہ...... یوں آنِ واحد میں کر ڈالے گا اور اسے محض تین الفاظ کی چھری سے اس قدر بے رحمی اور بے حسی کے ساتھ ذبح کر ڈالے گا......

روبی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا...... وہ بہ مشکل دیوار کا سہارا لے کر بت بنے چہرے کے ساتھ...... ہکا بکا سی شعیب کے پتھرائے ہوئے بے رحم چہرے کو تکتی ہوئی...... بیڈ پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

☆☆☆

اس رات وہ اپنا مختصر سا سامان سمیٹ کر آنسوؤں سے لبریز چہرے کے ساتھ ماسی کے ہاں آگئی اور بے اختیار ان سے لپٹ کر زاروقطار رو پڑی۔ ماسی تو اسے بیٹیوں کی طرح چاہتی تھی۔ ماسی بے چاری اسے اس حالت میں دیکھ کر ہی تنگ رہ گئی تھی...... پھر جب اسے اصل حقیقت کا پتا چلا تو اسے بھی بہت دکھ ہوا...... مگر اب جو ہونا تھا وہ تو ہوچکا...... لہٰذا اب وہ خود بے چاری، روبی کو تسلی دینے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی؟

سچی بات تو یہ تھی کہ روبی کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کو اتنا دیوانہ وار چاہنے والے شخص نے اس سے یوں اچانک ناتا توڑ لیا تھا۔ وہ اپنا پن...... وہ بے لوث چاہت...... پیار و محبت کا تعلق...... وہ سب کچھ جو دو محبت کرنے والے دلوں کو جوڑے رکھتا ہے، محض لفظوں کے تین جھٹکوں نے سب توڑ ڈالا تھا۔ ایک پل میں ختم کر ڈالا تھا۔ وہ مجبور و غم ناک دل و دماغ سے سوچتی رہی کہ...... بس میاں بیوی کا رشتہ ایجاب و قبول کے تین بول سے طلاق کے تین لفظوں تک ہی محتاج رہتا ہے۔ روبی کو ابھی تک شعیب کے اس کٹھور پن اور سنگ دلانہ اقدام پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ آخر کب تک...... تلخ اور کریہہ حقیقتیں...... بہت جلد اور بتدریج یہ باور کرا ہی دیتی ہیں کہ...... وہ سب کچھ بھی ہوجاتا ہے...... جس کی انسان کو کبھی توقع ہی نہیں ہوتی۔

☆☆☆

اسد کو فاخرہ کے ذریعے اس افسوس ناک واقعے کا پتا چلا تھا۔ وہ سن ہو کے رہ گیا تھا۔ پہلے تو اسے فاخرہ کی بات پر یقین ہی نہیں آیا...... مگر ظاہر ہے اتنی بڑی بات غلط نہیں ہوسکتی تھی۔ اسد کو اس پر ازحد ملال ہوا۔ وہ روبی کو بہت چاہتا تھا۔ اس کے دل میں اس کی محبت بتدریج پروان چڑھی تھی...... یونیورسٹی کے دور سے وہ اس کی پسند تھی، جو انسیت میں بدلی اور بالآخر ایک خاموش اور یک طرفہ محبت اختیار کر گئی...... اسد بھلا اب کیا کر سکتا تھا۔ جس نے پہلے کچھ نہیں کیا...... وہ اب بھی کیا کر سکتا تھا۔ ایک بار پھر اس کے اندر ایک لاابالی اور کھلنڈرا بچہ...... انگڑائی لے کر بیدار ہوا، جو صرف دور سے چاند کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اسے پانے کی بھی آرزو کرتا ہے، انوکھے لاڈلے کی طرح کھیلنے کو بھی مانگتا ہے، پھر سمجھتا بھی ہے کہ وہ چاند...... وہ ماہ روشن چہرہ...... اس کی شوقِ دید کے سامنے ہوتے ہوئے بھی دور ہے...... وہ بس اس میں خود کو بہلا بہلا کر خوش رہتا ہے۔ مگر اس نے یہ کبھی نہیں سوچا یا چاہا تھا کہ روبی کے ساتھ ایسا افسوس ناک کچھ ہوجائے۔ بھی نہیں، اسے واقعی دکھ تھا۔ وہ پل کے پل میں روبی کے لیے بے چین ہوگیا۔ وہ اسے تصور ہی تصور میں دکھی اور غم زدہ دیکھنے لگا۔ اس کے اشکبار چہرے کی شبیہ چشم تصور کے سامنے گھومنے لگی۔ اگرچہ اس کا دل بہت چاہ رہا تھا کہ وہ اڑ کر روبی کے سامنے پہنچ جائے مگر ان دنوں وہ عدت کے دن پورے کر رہی تھی لہٰذا صبر سے انتظار کرتا رہا۔

یہ سب کیوں ہوا تھا؟ کیسے ہوا تھا؟ وہ جاننے کے لیے بے چین تھا...... تب پھر ایک عجیب بات ہوئی، بہت ہی عجیب...... اسد ڈیو سے یکدم ڈیشنگ بن گیا۔ اسے اندازہ تو تھا ہی کہ روبی...... فاخرہ کے زیادہ قریب تھی۔ اس نے اسے کریدنا شروع کیا اور باتوں ہی باتوں میں اس نے اگلوا لیا کہ...... معاملہ کیا تھا اور شعیب کے روبی کو طلاق دینے کی وجہ کیا تھی؟

اسے فاخرہ پر شدید غصہ آیا۔ اس کے خیال کے مطابق اگر وہ روبی کو...... شعیب کی حکم عدولی پر نہ اکساتی تو شاید شعیب یہ انتہائی قدم کبھی نہ اٹھاتا۔ اس بات پر اس نے دوسرے روز فاخرہ کو اسٹاف روم میں کھدیڑنے اور لتاڑنے کا فیصلہ کیا۔

مگر جب وہ صبح کو چینک سینٹر پہنچا تو اسے ایک چونکا دینے والی خبر ملی...... فاخرہ...... نے اپنی شفٹ تبدیل کروا لی تھی۔ اس نے شام کی شفٹ جوائن کر لی تھی۔

بہت سوچ کر اسد نے بالآخر روبی سے ملاقات کرنے کا سوچا تو ایک بار پھر اس پر عجیب و غریب سوچوں نے یلغار کر دی۔ وہ کس حیثیت سے اس کے پاس جائے؟...... اور اس سے کس بات کا اور کیا افسوس کرے؟ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ میں بھی اپنے ہی کسی "چور" مقصد کے لیے اس کے پاس آیا ہوں...... یہ کس قدر بری بات ہوگی، وہ برا نہ منا لے...... یہ نہ

ہوجائے...... وہ نہ ہوجائے...... جیسی الجھی ہوئی توجیہات اسے گویا ایک بار پھر ویو بنانے لگیں۔

یہی سبب تھا کہ...... یہ فیصلہ کرتے کرتے اسے کئی روز بیت گئے۔ اس کی بے چینی سوا ہوتی رہی۔ بے کلی اسے ادھ موا کرنے لگی تو آخر یکدم اس کے ذہن میں ابھرنے والے ایک خیال نے اس کے اندر کی سرپھری سوچوں، تاویلوں کو ایک طرف کردیا۔ وہ ایک کولیگ کی حیثیت سے بھی تو روبی سے مل سکتا تھا۔ ایک سابقہ کولیگ کی حیثیت سے...... اس خیال نے اسے ہمت دی...... اور کشاں کشاں اس کے قدم ایک روز روبی کے دروازے تک اسے لے گئے۔ پتا وہ پہلے ہی فاخرہ سے حاصل کرچکا تھا۔ اس کی عدت بھی پوری ہوچکی تھی۔

دل کو اپنے بہت سنبھال کر اس نے دستک دی...... اس کا منہ خشک ہونے لگا۔ دل کی دھڑکنیں بے طرح سی ہونے لگیں۔

پھر دروازہ کھلا، سامنے ایک ادھیڑ عمر خاتون تھیں۔ اس نے نہایت شستہ لہجے میں اسے سلام کیا پھر روبی کے حوالے سے اپنا تعارف کرایا۔ یہ خاتون ماسی تھی، وہ اسے سیدھی اندر لے آئی اور نشست گاہ میں لے جا کر بٹھا دیا۔

آنے کو تو وہ یہاں آگیا تھا مگر اب وہ اس الجھن میں مبتلا تھا کہ وہ اس سے کیا بات کرے گا؟ اور کس سلسلے میں؟...... پھر سب سے بڑی بات کس حیثیت سے......؟ طلاق کا پوچھتا ہے، تو کچھ اچھا نہیں لگتا۔ اس پر افسوس کا اظہار کرتا ہے تو یہ بھی کیا بات ہوئی بھلا۔ گویا وہ اپنی فطرت کے مطابق ایک بار پھر عجیب وغریب اور الجھی ہوئی سوچوں کا شکار ہوکے کشش وپنج میں پڑ گیا۔ اب اس کا جی چاہا یہاں سے ایسے ہی اٹھ کر چلا جائے، تب پھر اچانک کسی غیر مرئی قوت نے اسے تھام کر بیٹھا رہنے پر مجبور کردیا۔ کم از کم ایک تعلق تو تھا۔ وہ اس کا ماضی میں یونیورسٹی فیلو تو رہ چکا تھا اور روبی بھی اسے اس حیثیت سے پہچان چکی تھی۔ بس! اس نے اس کی ہمت کو سوا کیا تھا...... اس عالم میں دل بے اختیار وناداں نے کہا۔ ''کاش! اس طرح کی حوصلہ افزائی وہ بارہ سال پہلے بھی کردیتی...... مگر...... وہ تو خود ہی دبو تھا۔'' معاً کسی کی آہٹ پر وہ اپنے ''منتشر'' خیالات سے چونکا۔

''ارے آپ......'' وہی مترنم آواز نے اس کی سماعتوں میں رس گھولا۔ وہ اندر آچکی تھی۔ اسد اس کے ادب میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور نظر بھر کے روبی کے دلدار چہرے کو دیکھا۔ اس میں غم کی پرچھائی اور کشادہ آنکھوں کی ہلکورے لیتی اداسی نمایاں طور پر نظر آگئی۔ وہ عام سے گھریلو شلوار قمیص میں تھی۔ بال کھلے ہوئے تھے۔ اس کے حسن ولطافت سے لبریز چہرے میں اداسی کا شائبہ غم ناک حسن کی نئی تعریف عطا کرتا تھا۔

اس نے سلام کیا، روبی نے اسے بیٹھنے کا کہا۔

''آپ...... خیریت سے ہیں؟'' روبی نے اس کے سامنے والے صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے پوچھا۔ وہ کچھ گہری گہری نگاہوں سے اس کی طرف تکتے ہوئے بولی۔ اسد کو اس کا لہجہ بھی مترنم محسوس ہوا۔ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''وہ...... آپ...... اتنے روز سے کوچنگ نہیں آرہی تھیں...... اس لیے......''

''کیا آپ کی فاخرہ سے بات نہیں ہوئی؟'' روبی نے بدستور الجھے جھجکتے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا اور اسد اس کی بات کا مطلب فوراً بھانپ گیا مگر اسے اظہار کے مناسب الفاظ تلاشنے میں دقت کا سامنا ہورہا تھا۔ پھر جو زبان پہ آیا بولنے لگا۔

''ج...... جی ہاں! فاخرہ سے ہی مجھے اس افسوس ناک خبر کا پتا چلا تو...... میں نے سوچا......'' اسے یہ بھی روبی سے کہتے ہوئے عجیب لگا...... یہی سبب تھا کہ اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا جبکہ روبی بھی اس کی بات کا مطلب سمجھ گئی تھی اور بے اختیار اس نے ایک آزردہ سی سانس بھری۔

''آپ کو برا تو نہیں لگا...... میرا یہاں آنا؟'' اسد نے اس کے چہرے پر غم کی سلوٹ ابھرتے محسوس کرکے یکدم کہا۔

''نہیں......'' روبی نے مختصراً جواب دیا جبکہ اسد کو اس کا مختصر جواب بھی یوں لگا جیسے اس نے برا منایا ہو، وہ بولا۔

''یہ میرے لیے بہت اچانک اور بالکل غیر متوقع خبر تھی...... کیا شعیب صاحب نے مصالحت کی بھی کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دی تھی؟''

''یہ بڑی لمبی بات ہے، اب اسے دہرانے سے کیا فائدہ، اسد صاحب! اس آدمی نے جو کرنا تھا سو کرڈالا......'' روبی نے اپنے ٹوٹے ٹوٹے لہجے کی غم ناکی پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔ اسد کو اس کے لبوں سے اپنا نام لیتے ہوئے اچھا لگا۔ وہ بولا۔

''جی! آپ نے صحیح کہا۔''

''آپ کیا پئیں گے...... چائے یا کولڈ ڈرنک؟'' روبی کو جیسے اچانک آداب میزبانی کا خیال آیا اور یہ پوچھتے ہوئے وہ صوفے سے اٹھنے لگی تو اسد نے فوراً اسے روکنا چاہا مگر وہ یہ کہتے ہوئے چلی گئی۔

''نہیں، آپ پہلی بار آئے ہیں۔''

اسد اسے بڑی محبت سے کمرے سے ایک دوسرے اندرونی دروازے کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اب اسد کو یہ سب اچھا لگ رہا تھا۔ اس پر تھوڑی دیر پہلے جو دباؤ والی کیفیات تھیں، وہ بتدریج رفع ہونے لگی تھیں۔ ایسے میں دل نے اس کے اندر بالکل بچوں جیسی چٹکی دی۔

کتنا اچھا اور لطیف محسوس ہوتا ہے۔ محبوب کو اپنی نظروں کے سامنے دیکھ کر...... اسے اپنے لیے نشست وبرخاست کرتے دیکھ کر...... مگر اس کا محبوب تو دکھی تھا۔ ''روبی! مجھے ایک ذرا موقع دو۔ میں تمہارے دکھ اپنے اندر جذب کرلوں گا۔'' یہ خیال اس قدر بے اختیار انداز میں اس کے دل میں ابھرا تھا کہ اسے ڈر ہوا کہیں یہ بے اختیاری جملہ اس کے ہونٹوں تک نہ آجائے۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی آگئی۔ اس کے ہاتھوں میں چھوٹی ٹرے تھی۔ اس پر چائے کی نفیس پیالی اور ایک پلیٹ میں بسکٹ رکھے تھے۔

''آپ نے بلاوجہ ہی تکلف کیا۔ یہ ایسا کوئی موقع تو نہ تھا۔'' اس نے کھسیاتے ہوئے کہا۔

''اب چھوڑیں اس بات کو...... اسد صاحب!'' وہ ٹرے کو سامنے میز پر رکھتے ہوئے بولی تو ایسے میں اسد کو اس کی قربت اور سیم تن وجود کی ہلکی ہلکی نکہت کا احساس ہوا۔ اس کا دل ودماغ اس خوشبو سے معطر ہوگیا...... اس نے بھی موضوع بدل دیا۔

چائے کا ایک گھونٹ بھر کے اس نے کہا۔ ''آپ چائے بہت اچھی بناتی ہیں، آپ کو یاد ہے۔ یونیورسٹی کے دور میں ایک بار ہم دونوں نے سینٹرل کینٹین میں اسی طرح بیٹھ کر چائے پی تھی اور دوسری بار اب پی رہے ہیں۔''

روبی کو اسد کی اس بات میں بچوں جیسا اشتیاق اور انسیت سی محسوس ہوئی۔ یہی سبب تھا کہ اس کے حنائی رنگ لیے لبوں پہ مسکراہٹ تیر گئی۔ پھر اسی لہجے میں وہ بولی۔

''اتنی پرانی بات آپ کو اب تک یاد ہے؟''

''جی ہاں! اس لیے کہ صرف ایک بار ہی ایسا ہوا تھا اور ایک بار کی بات انسان کو نہیں بھولتی، ہمیشہ یاد رہتی ہے۔ مجھے بھی یاد رہ گئی۔'' اسد کہتا چلا گیا۔ اسے خود حیرت ہوئی، یہ کیسے برملا اور نپے تلے الفاظ اس کے ہونٹوں سے نکلے جارہے تھے۔ روبی بڑے غور سے...... بڑی سوچتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اسد نے چائے ختم کی، اس کا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہوتے ہوئے کہا۔

''کولیگ تو ہم مختصر سے عرصے کے لیے تھے اور بعد میں تھے مگر اس سے پہلے ہم یونیورسٹی فیلوز تو رہ ہی چکے ہیں۔ وہی حوالہ میرے لیے ماضی کے لحاظ سے اہم ہے...... اور رہے گا بھی...... اس اعتبار سے مجھے کہنے دیجیے کہ...... کسی بھی سلسلے میں میری ضرورت پڑے تو اس ناچیز کو یاد کرلیجیے گا۔ مجھے آپ بھولی نہیں ہیں۔''

نہ جانے اسد نے اتنی بڑی بات کیسے کہہ ڈالی تھی اور پھر وہ رکا بھی نہ تھا۔ چلا آیا تھا، اپنے پیچھے...... روبی کو سوچتا چھوڑ کر......

☆☆☆

غصے اور طیش میں کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے سے پہلے انسان کو کسی بات کا ہوش رہتا ہے، نہ احساس...... مگر بعد میں جوش سرد ہونے پر وہی انسان سخت پشیمانی کا شکار ہوجاتا ہے۔ شعیب کو بھی اس بات کا بہت شدت کے ساتھ قلق ہورہا تھا کہ...... جو کچھ ہوا...... وہ غلط ہوا تھا۔ اسے اب اپنے کیے پر پشیمانی ہورہی تھی...... وہ بری طرح پچھتا رہا تھا۔ اس کی خود سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ اچانک کیا ہوگیا......؟ اس نے...... روبی کو...... اپنی محبوب شریک حیات کو طلاق دے ڈالی تھی......؟ اس بیوی کو جس سے وہ شدید محبت کرتا تھا۔ سوچ سوچ کر شعیب کی حالت غیر ہونے لگی۔ اس کا کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ ایک بے چینی تھی جو ناسور کی طرح اس کے دل ودماغ کو...... اس کے درماندہ وجود کو اندر ہی اندر کھا رہی تھی۔ وہ چڑچڑا سا ہونے لگا تھا۔ تنہائی کے لمحات میں تو یہ وحشت پاگل پن کا دورہ بن کر بھی ابھرتی تھی۔ وہ چیزیں اٹھا کر پھینکنے لگتا۔ کمرے کی دیوار پر اس نے مکے برسا کر اپنا ہاتھ تک زخمی کرلیا تھا۔ ایک روز بالآخر اس نے روبی کے سیل فون پر دل بے قرار کے ہاتھوں مجبور ہوکے رابطہ بھی کیا مگر دوسری طرف سے روبی نے کال ہی ڈراپ کردی۔ اس نے کسی اور نمبر سے بھی روبی کے سیل فون پر رابطہ کیا۔ ظاہر ہے وہ نمبر روبی کے لیے اجنبی ہی تھا اس لیے اس نے کال ریسیو کرلی تھی مگر پھر دوسری جانب سے شعیب کی آواز سن کر فوراً کاٹ دی بلکہ اپنا سیل بھی آف کر ڈالا۔ شعیب بری طرح جھنجلا گیا۔ پھر سوچنے لگا اب بھلا اس کا روبی سے کیا تعلق رہ گیا تھا......؟ وہ تو اسے حرف غلط کی طرح مٹا چکا تھا۔ اپنی زندگی سے نکال چکا تھا۔ اس نے تو اب اس مضبوط رشتے کے درمیان میں خلیج حائل کرڈالی تھی، جو خط تنسیخ کا درجہ رکھتی تھی۔ واپسی کی کوئی راہ نہیں چھوڑی تھی۔ طلاق کے بعد روبی سے روابط بڑھانے کا سوچنا بھی گناہ کبیرہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے نامحرم ہوچکے تھے۔

شعیب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ روبی کے فلیٹ پر جا پہنچے۔ یہ خیال آیا بھی تھا اس کے دل میں...... مگر پھر یہ سوچ

کر دہ دل مسوس کر رہ جاتا کہ وہ اس کی کال ہی نہیں اٹینڈ کر رہی ہے..... تو بھلا اس کی صورت دیکھنا کیسے گوارا کرے گی؟ وہ خود کو کوسنے لگتا۔ روبی نے آخر ایسا کیا ہی کیا تھا کہ اس نے یہ انتہائی قدم اٹھا لیا تھا؟ بس! اتنا ہی تو کیا تھا اس نے کہ اس کی اجازت اور مرضی کے خلاف لیڈی ڈاکٹر سے اپنا چیک اپ کروانے چلی گئی تھی۔ آخر ایسا کیا جرم کیا تھا اگر وہ ایک گائناکولوجسٹ سے مشورہ کرنے چلی گئی تھی تو..... وہ عورت تھی، ایک بیوی بھی تھی۔ ماں بننے کی بھلا کس عورت کو آرزو نہیں ہوتی؟ اپنا علاج کروانے کا کیے حق نہیں ہوتا؟ شعیب کو اب یہ سوچ کر خود سے شرمندگی ہونے لگی تھی کہ..... اس نے اس بات کو واقعی اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ وہ روبی کی محبت کا قیدی نہیں تھا بلکہ اپنی مردانہ انا کا قیدی تھا۔ غلطی اس کی اپنی تھی، روبی کی نہیں تھی۔ دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں ڈھل گئے۔ یہ ساری باتیں وہ تقریباً روزانہ ہی سوچا کرتا تھا۔ اسے اب شدت سے احساس ہو چلا تھا کہ اول و آخر غلطی اس کی اپنی ہی تھی مگر اب..... سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ مراجعت کی کیا راہ ہو سکتی ہے؟ وہ اس پر اب سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے لگا۔ سوچنے لگا..... سوچتا رہا..... کہ آخر اس مسئلے کا حل بھی تو کوئی ہوگا۔ قرآن و سنت اس بارے میں کوئی فرمان تو رکھتا ہوگا۔ تو کیا اسے کسی عالم دین سے اس مسئلے کا حل پوچھنا چاہیے؟ بہت سوچ و بچار کے بعد بالآخر یہی بات اس کے دل میں گھر کرنے لگی۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ اس گمبھیر مسئلے کا حل علما ہی بتا سکتے ہیں۔ اگر مراجعت کی کوئی صورت نکل آتی ہے، تب وہ روبی سے ضرور..... خود ملنے کی کوشش کرے گا..... یہ سب سوچ کر اس کے دل کو تسلی ہوئی۔ مگر اب سوال یہ تھا کہ وہ کسی ایسے عالم دین کو جانتا ہی نہ تھا کہ جس سے وہ ملتا۔ تاہم اسے اپنے ایک دوست کا خیال آیا جو ان کے درمیان اٹھتا بیٹھتا تھا۔ اس نے فوراً اس سے رابطہ کیا۔

☆☆☆

ایک عورت کو خدا نے مرد کی نگاہ پہچاننے کی صلاحیت عطا کر رکھی ہے تو ایک بیوی کو وہ وجدان بھی عطا کیا ہے، جس کی بنا پر وہ اپنے مجازی خدا کے مزاج اور طبیعت کو بھانپ لیتی ہے۔ روبی کو بھی شعیب کے ساتھ اس قدر دلی و ذہنی ہم آہنگی ہو گئی تھی کہ اس نے شعیب سے شادی کے چند دن بعد ہی اس کی محبت کو پرکھ لیا تھا کہ وہ اسے کس قدر چاہتا ہے۔ یہی سبب تھا کہ طلاق کے بعد روبی کو خوب اندازہ تھا اس بات کا کہ..... ایک نہ ایک دن..... بلکہ بہت جلد شعیب کو اپنے کیے پر ضرور پچھتاوا ہوگا اور وہی ہوا۔ جب اس کے سیل پر طلاق کے بعد شعیب کی پہلی کال آئی تو روبی نے درد انگیزی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور کال کاٹ دی۔ پھر ہر بار اس کی کال آنے پر وہ دل پہ بھاری پتھر رکھ کر یہی کرتی رہی۔ اسے دکھ بھی ہو رہا تھا..... کئی بار جی چاہا بھی کہ شعیب کی کال اٹینڈ کر ہی لے..... مگر پھر خیال آتا، اب بھلا اس کا شعیب سے رشتہ ہی کیا رہ گیا تھا۔ اس نے تو عام انسانوں والا رشتہ بھی توڑ ڈالا تھا۔ اس رشتے کو داغ دار کر ڈالا تھا۔ طلاق دے کر اس نے بات کرنے کی کوئی عام سی راہ بھی تو نہیں چھوڑی تھی، پھر طلاق جیسا لفظ..... بالخصوص ایک عورت کے لیے مرد سے زیادہ ذلت و رسوائی کے داغ کے ہی برابر ہوتا ہے۔ ایک گالی کی طرح سیدھا عورت کے دل کو لگتا ہے۔ اس سماج میں مطلقہ عورت کو ہی اس کا قصوروار سمجھا جاتا ہے۔ مرد ذات تو جیسے دودھ کی دھلی ہوتی ہے۔ اب وہی دودھ کا دھلا مرد اس سے بات کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا، تڑپ رہا تھا۔ روبی کے اندر کی عورت سختی سے مانع ہو رہی تھی کہ ایسے مرد سے اب بات کرنے کا فائدہ کیا جس نے محبت اور میاں بیوی کے رشتے پر اپنی جھوٹی مردانہ انا کی چھری پھیر ڈالی۔

مگر ہائے ری عورت..... جس کے لیے اوپر سے ہی فرمان اترا ہے..... کہ یہ کمزور ذات ہے..... کچھ روز بعد روبی کو..... اپنے سیل پر..... شعیب کا ایس ایم ایس موصول ہوا۔ لکھا تھا۔ "پلیز روبی! بات کرو۔ ایک غلطی سے تمام راستے بند نہیں ہو جاتے۔" میسج پڑھ کر روبی کو اپنے گلے میں گولا سا اٹکتا محسوس ہوا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر اس میسج کو وہ بار بار پڑھتی ضرور رہی۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ شعیب کی طرف سے دوسرا ایس ایم ایس آ گیا۔ "پلیز روبی....." فقط یہی لکھا تھا۔ روبی نے پھر بھی جواب نہیں دیا۔ کافی دیر گزر گئی، شعیب کا تیسری بار میسج آیا۔ "روبی! خدا کے لیے..... مجھے معاف کر دو..... خدا بھی معاف کر دیتا ہے، ایک ذرا بات کر لو..... پلیز..... آج کی تلخی کو ذرا دیر کے لیے بھلا کر، ماضی کے حسین ساتھ گزرے لمحوں کی یادوں کے احسان تلے ہی سوچ کر..... ان حوالوں کی خاطر..... جو ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ شادمانیوں میں گزارے..... پلیز..... کال کر دوں.....؟"

اس بار کا کچھ طویل میسج پڑھ کر..... روبی کے حلق میں اٹکی ہوئی رقت آنکھوں کے راستے آنسوؤں کی صورت بہہ نکلی۔ سیل فون والا ہاتھ کپکپانے لگا۔ اس کی جامد انگلیوں میں ارتعاش کی کیفیات ابھریں اور..... پتا نہیں کس طرح اس کی انگلیوں نے مختصری حرکت کی اور جواب میں روبی نے ہاں لکھ دیا۔ گویا ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں شعیب کی کال آ گئی۔

روبی نے حلق اور آنکھوں میں اتری ہوئی رقت پر قابو پایا اور لرزیدہ سے ہاتھ میں پکڑے سیل فون کو آن کرکے اپنے کان سے لگا لیا۔ دوسری جانب سے گویا چھوٹتے ہی شعیب کی آواز ابھری۔

''مائی گاڈ...... سو تھینکس ...... روبی! تت...... تم...... تم نے میرا فون اٹینڈ کرلیا۔'' فرطِ مسرت سے شعیب کی آواز ہی نہیں لہجہ بھی کانپ رہا تھا۔ وہ بالکل بچوں کی طرح خوش ہو رہا تھا اور جذباتی بھی...... روبی نے اپنے ہونٹ بھینچ رکھے تھے، وہ آگے بولا۔

''ر...... ر...... روبی...... ! یقین جانو...... ایک پل کے لیے بھی میں چین سے نہیں بیٹھا ہوں۔ مجھے احساس ہے، میں نے تمہیں خود سے جدا کرکے اپنی زندگی کی سب سے بڑی اور بھیانک غلطی کی ہے۔ میں نے اپنی اس حرکت پر خود کو بہت کوسا...... بہت تڑپا ہوں...... تم سے جدا ہوکے روبی...... ! تمہیں طلاق دینے کے محض چند ساعتوں بعد ہی میں پورے جی جان سے تڑپ اٹھا تھا کہ یہ میں نے کیا کر ڈالا۔ اپنی زندگی کو خود سے جدا کردیا۔ اپنے جسم سے روح کو علیٰحدہ کر ڈالا۔ تمہاری سنگت میں اپنی ہنستی بستی زندگی کا نصیب خود اپنے ہاتھوں سے دھکیل کر دور کردیا۔ کتنا بدنصیب ہوں میں کہ خوش نصیبی کو خود سے دور کردیا۔ یقین جانو ایک پل کے لیے بھی چین نہیں ملا ہے مجھے، تمہیں خود سے دور کرکے۔'' وہ بولتا رہا۔ روبی خاموشی سے سنتی رہی۔ وہ ٹوٹ کر بول رہا تھا اور اس کے الفاظ تڑخ کر بکھر سے رہے تھے، اندازہ ہوتا تھا روبی کو...... اس کی درماندگی اور پشیمانی کا...... اس کے لہجے کی تڑپ کا......

''کچھ بولو گی نہیں......؟'' ایک ذرا توقف کے بعد شعیب کی آواز ابھری تو روبی نے بہ مشکل اپنی لرزتی کیفیات پر قابو پایا اور لب لرزاں کو جنبش دی کہ منہ سے نکلا ایک ایک لفظ برچھی کی صورت اختیار کرگیا۔

''اب کوئی فائدہ نہیں رہا ان باتوں کا شعیب احمد صاحب!...... آپ نے اپنی مردانہ انا کے گھمنڈ میں جو کرنا تھا سو کرلیا...... ہاں...... ! ایک حقیقت کا تو پتا چل گیا کہ...... یہ انا...... کس قدر جابرانہ قوت رکھتی ہے کہ...... محبت جیسے طاقت ور جذبے کو بھی ایک ہی لمحے میں ڈھا کر رکھ دیتی ہے......''

''مجھ سے شکوہ کرو...... گلہ کرو...... روبی! مجھے برا بھلا کہو...... اس لیے کہ قصوروار میں ہی ہوں......'' روبی کی بات مکمل ہوتے ہی شعیب تڑپ کر بولا۔

روبی پھیکے پھیکے سے لہجے میں بولی۔ ''آپ نے جو قدم اٹھالیا ہے۔ اس کے سامنے شکوے اور گلے بھی حقیر اور ہیچ لگتے ہیں...... بس! ...... اب آئندہ مجھ سے کوئی رابطہ رکھنے یا استوار کرنے کی امید بھی مت رکھنا...... شعیب احمد صاحب!''

''سنو...... سنو...... پلیز...... ایسا مت کہو روبی......! تم تو یکدم ہی اجنبی بن گئیں۔'' دوسری جانب سے شعیب بےقراری سے بولا۔

''میں رابطہ منقطع کر رہی ہوں......'' روبی نے اچانک کہا تو شعیب جلدی سے بولا۔

''رکو...... رکو...... میری بات سنو...... روبی!...... و...... و...... دراصل...... مم...... میں نے اس طرح کی سچویشن سے متعلق...... مم...... میرا مطلب ہے...... اس قسم کی مراجعت...... کے متعلق...... ایک ممتاز عالم دین سے مشورہ کیا ہے...... اور......'' شعیب کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ روبی نے سلسلہ ہی منقطع کردیا تھا۔

☆☆☆

پھر یوں ہوا...... کہ اس نے کوچنگ سینٹر کی ملازمت چھوڑ دی۔ اس لیے کہ اب وہاں روبی نہیں تھی۔ یوں بھی اب اس کا دل اس کوچنگ سینٹر سے اچاٹ ہوگیا تھا۔ اسے نوکری کی پروا کب تھی، وہ قابل، ڈگری یافتہ اور پڑھا لکھا آدمی تھا۔ شہر میں بھی کوچنگ سینٹرز کی کمی نہیں تھی۔ اسے کسی بھی ایسی جگہ دوسری نوکری مل سکتی تھی، بلکہ وہ تو ایک دن میں دو دو نوکریاں بھی کرتا رہا تھا...... اب اس کے خیالات اس کی سوچوں کا محور...... روبی ہی تھی۔ روبی سے اس بار ہونے والی ملاقات اسد کو کئی پہلوؤں سے اہم محسوس ہوئی تھی کہ...... اس نے اشاروں کنایوں میں ہی سہی...... روبی پر بہت کچھ باور کروا دیا تھا۔ اب وہ بچوں کی طرح بار بار اپنی اس اہم ملاقات کے سیاق وسباق...... پوری صراحت کے ساتھ دل ودماغ میں دہراتا...... یاد کرتا...... اور خوش ہوتا رہتا...... کہ اس نے روبی کو اپنے بارے میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا تھا اور یہی نہیں اسے پتا نہیں اب یہ خوش فہمی ہوگئی تھی...... یا پھر غلط فہمی کہ روبی اس کی ذومعنی باتوں سے اس کے دل میں برسوں چھپی اس خواہش کا اندازہ ضرور لگا چکی ہوگی...... جس کا اظہار وہ اس کے سامنے کبھی نہ کرپایا تھا۔

اس بات کو...... روبی سے اس ملاقات کو...... کچھ دن اور بیت گئے...... اس سے ملنے کی...... اس سے بات کرنے کی جب اور کوئی سبیل نظر نہ آئی تو...... اسد ایک بار پھر ایک دن اس کے فلیٹ جا پہنچا۔

اس روز موسم بھی خوشگوار تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، ہلکی ہلکی نرم اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، فضا میں پُرلطیف احساس رچا ہوا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ ایسی رچی بسی فضا میں بےمقصد نکلا جائے...... گھوما جائے...... اور وہ گھومتے گھومتے...... ایک بار پھر روبی کے دروازے پر جا پہنچا۔ آج اس نے روبی سے ملنے کا خاص اہتمام بھی تو کیا تھا...... بہترین تراش کا لائٹ اسکائی کلر کا کوٹ پینٹ...... اعلیٰ درجے کا پرفیوم...... اسپرے...... اور ہاتھ میں چھوٹا سا خوب صورت پھولوں کا گلدستہ...... تھاما ہوا تھا۔ آج وہ روبی کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دیتا ہوا بھی خاصا پُراعتماد نظر آرہا تھا۔

دستک کے جواب میں اس بار ماسی کے بجائے خود روبی نے دروازہ کھولا تھا...... اور اسد، روبی کو دیکھتے ہی دنگ سا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

شعیب کے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ روبی نے اس کی بات سنی تھی، چاہے ادھوری سہی...... ایک روز گزرنے کے بعد شعیب نے پھر فون کیا اسے...... دوسری جانب بیل جاتی رہی، شعیب کا دل دھڑکتا رہا۔ کال ریسیو نہ کی گئی۔ شعیب مایوس نہیں تھا کیونکہ کال منقطع نہیں کی گئی تھی بلکہ ریسیو ہی نہیں کی گئی تھی۔ کچھ منٹوں بعد شعیب نے دوبارہ نمبر ملایا۔ تیسری رنگ ٹون ابھرنے کے بعد کال ریسیو ہوئی تو شعیب کا دل بےطرح دھڑک اٹھا۔ فوراً بےتابانہ انداز میں بولا۔

''ر...... روبی! پلیز...... میں اپنی غلطی پر نادم ہوں، بہت سخت نادم ہوں، مم...... مجھے معاف کردو۔ میں...... میں...... تم سے ملنا چاہتا ہوں...... صرف...... ایک بار...... پلیز۔'' وہ بڑی لجاجت سے بولا۔ دوسری جانب روبی سیل کو خاموشی سے اپنے کان سے لگائے یہ سب سن رہی تھی، دل اس کا بھی رحزیہ انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔ کچھ بھی تھا، وہ نادم تھا اپنے کیے پر...... اس نے غلطی کی تھی۔ اس پر سخت پچھتاوے کا اظہار بھی کررہا تھا۔ وہ اسے چاہتا تھا، اس کا تو روبی کو بھی علم تھا۔ روبی کے دل میں بھی اس کے لیے چاہت کے جذبات ہنوز موجود تھے۔ دلِ بےتاب نے اسے بھی اندر ہی اندر کھدیڑنا شروع کردیا تھا۔ وہ بہت ہولے سے بولی۔

''کیوں ملنا چاہتے ہو مجھ سے......؟''

شعیب کی سماعتوں سے روبی کی آواز کیا ٹکرائی، وہ یکدم ٹوٹ کر...... تڑپ کر بولا۔ ''مم...... میں...... خود کو...... تت...... تمہارے قدموں میں گرانا چاہتا ہوں...... روبی!...... ہاں...... میں ایسا ہی کرنا چاہتا ہوں...... کیونکہ غلطی میری ہی تھی، پلیز...... انکار مت کرنا، کہو تو ابھی تمہارے گھر چلا آؤں؟''

''ہرگز نہیں......'' روبی نے اٹل لہجے میں کہا۔

''تت...... تو پھر......؟'' شعیب نے سوالیہ کہا۔

''دیکھو انکار مت کرنا روبی! میں خطا کا پتلا ہوں...... میں ایک دن بھی چین سے نہیں رہا ہوں...... تمہارے بغیر...... روز مرتا ہوں، روز جیتا ہوں...... بس! ...... ایک ہی آس پر...... کہ تمہیں دوبارہ پالوں......''

روبی پُرسوچ خاموشی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ تصور کی آنکھ سے اس کی بےتابانہ کیفیات اور تڑپ کا اندازہ کررہی تھی۔ اس کی وارفتگی و والہانہ بےچینی کو بھانپ رہی تھی اور یہ سب اسے سوچنے پر مجبور کررہی تھیں کہ...... شعیب سے جو کچھ ہوا تھا وہ انتہائی غصے کی حالت میں ہوا تھا...... وہ اب اس سے ایک ملاقات کی بھیک مانگ رہا تھا۔ محض اس کے قدموں میں گرنے کے لیے۔ پھر بھی روبی نے دوبارہ پوچھ لیا۔

''کیوں ملنا چاہتے ہو؟''

''تجدیدِ وفا کے لیے......'' دوسری جانب سے شعیب نے فوراً کہا۔

''شاید اب کے تجدیدِ وفا کا امکان نہیں ہے۔'' روبی نے احمد فراز کے ایک شعر کی تشریح میں کہا۔

''یہ امکان...... کیسے نہیں ہے...... کیا یہ محبت اتنی کمزور تھی کہ محض غصے کی حالت میں تین الفاظ نے اسے ختم کردیا؟ ہرگز نہیں روبی...... میں تم سے محبت کرتا ہوں...... روبی! بہت زیادہ......'' وہ کہے جا رہا تھا۔ روبی دھڑکتے دل سے سنے جا رہی تھی۔

''پلیز روبی! ...... صرف ایک بار مجھ سے مل لو......''

''ہم کسی اور جگہ مل سکتے ہیں۔'' معاً روبی نے کہا تو شعیب کا دل خوشی کے مارے بلیوں اچھل پڑا۔ وہ انتہائی جذباتی ہوکر خوشی سے بولا۔

''مائی گاڈ! ...... روبی! ...... تت...... تم ہمیشہ سے مہربان رہی ہو...... تمہارا وجود...... تمہاری ہستی...... ہمیشہ سے سراپا محبت ومہربان رہا ہے میرے لیے...... اب بھی...... اب بھی...... تم نے اس بدنصیب اور ستم رسیدہ اور خودگزیدہ آدمی پر رحم کھا ہی لیا۔''

دونوں کے درمیان طے پایا کہ وہ ایک ریسٹورنٹ میں ملاقات کریں گے اور یہ ملاقات مختصر اور صرف چائے کے ایک کپ تک محدود رہے گی۔ کہیں باہر نہیں نکلا جائے

گا۔ یہ شرائط ظاہر ہے...... روبی کی طرف سے ہی تھیں۔

چند گھنٹوں بعد دونوں مذکورہ ریسٹورنٹ کے ایک نسبتاً الگ تھلگ گوشے میں بچھی میز پر موجود تھے۔ روبی تو...... شعیب کی حالت دیکھ کر ہی دنگ رہ گئی تھی بلکہ کسی حد تک خوف زدہ بھی...... اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر روبی کو تو یوں لگا تھا اگر وہ شعیب سے رابطہ نہ کرتی ...... تو...... تو...... شاید غم کی شدت سے وہ اندر ہی اندر گھٹ کر مر جاتا۔ چہرہ اترا ہوا آنکھیں سوجی ہوئی، شیو بھی نہ جانے کتنے دنوں کی بڑھی ہوئی تھی، صحت بھی گری گری سی نظر آرہی تھی۔

"روبی! میں تمہارے بغیر مر جاؤں گا...... زندہ نہیں رہوں گا۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر رندھے ہوئے لہجے میں بولا۔

روبی کو اس کی حالت پر پہلے ہی ترس آرہا تھا۔ بہت ہولے سے اور دھیرے سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ "یہ آپ نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

"آہ...... روبی!...... کتنی اپنائیت ہے تمہارے لہجے میں میرے لیے اب بھی......" وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا تو روبی نے کن انکھیوں سے اپنے گردوپیش میں ایک نگاہ ڈالنے کے بعد نیچی آواز میں کہا۔

"میں اس ملاقات کو بھی گناہ کے زمرے میں محسوس کر رہی ہوں...... شعیب صاحب!...... جو کہنا ہے جلدی کہیں...."

"روبی! ہم کوئی گناہ نہیں کر رہے...... ہم تو مراجعت کی راہ تلاش کر رہے ہیں۔" شعیب نے کہا۔ پھر روبی کے چہرے پہ بے چینی کے تاثرات ابھرتے دیکھ کر فوراً مقصد کی بات پہ آگیا۔ بڑے رسانیت آمیز ملائمت سے بولا۔ "روبی......! میں نے ایک ممتاز عالم دین سے اس متعلق مشورہ کیا تھا۔ انہوں نے مجھے اس مسئلے کا حل بتایا تھا......"

"حلالہ......؟"

شعیب نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ...... روبی اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے بولی۔ شعیب کی آنکھوں میں ایک چمک آئی۔ "ایگزیکٹلی...... یہی کہا تھا انہوں نے۔"

"لل...... لیکن...... شعیب...... یہ...... یہ...... سب مجھ سے نہیں ہو پائے گا...... کہ...... میں پہلے...... کسی اور کی...... اور پھر تمہاری...... کیا آپ...... یہ برداشت کرلوگے......؟" اب روبی بھی سنجیدگی کے ساتھ اس گمبھیر مسئلے پر سوچنے لگی تھی۔ شعیب کی محبت اور اس کی بے تابی نے بالآخر اسے ایک بار پھر جیت لیا تھا۔ شعیب بولا۔ "روبی! یہی ایک شرعی حل ہے، ہمارے دوبارہ ملن کا۔ اس میں اذیت تو ہے مگر شریعت کے مطابق یہی ایک رستہ ہے ہمارے پاس۔"

"مگر میرے لیے یہ سب سوہانِ روح ہوگا...... شعیب کہ میں پہلے...... ایک مرد کے نکاح میں جاؤں اور پھر اس سے طلاق کے بعد...... اتنی ہمت کہاں سے لاؤں میں یہ سب کچھ کرنے کی...... مم...... مجھ سے شاید نہیں ہوسکے گا یہ سب......"

"میں بھی تو اس عذاب سے گزروں گا...... روبی!" شعیب نے بھی اس کی طرف دیکھ کر ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پلیز روبی......! دوبارہ ملن کے لیے ہمیں یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑے گا۔"

"مگر ایسا آدمی...... کون ہوگا؟ جو یہ سب کرنے پر آمادہ ہوجائے؟" روبی نے پُرسوچ انداز میں زیرِلب کہا اور پھر دفعتاً ہی اس کے ذہن میں ایک نام ابھرا۔ "اسد......"

تھوڑی دیر بعد دونوں کسی حد تک مطمئن ہو کے رخصت ہو رہے تھے۔ روبی نے شعیب کو اسد کے بارے میں بتا دیا تھا۔

☆☆☆

اسد...... آج روبی کی سج دھج دیکھ کر حیران ہی تو ہوگیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کے لبوں پہ اس کے لیے مسکراہٹ بھی چمک رہی تھی۔ چہرے پہ مہربان تاثرات بھی ہلکورے لے رہے تھے۔ وہ اسے دیکھتے ہی بڑے خوشگوار لہجے میں بولی تھی۔ "مجھے معلوم تھا آپ دوبارہ تشریف لائیں گے۔ آیئے...... پلیز۔"

اسد بے چارے پر تو شادیِ مرگ کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ روبی کی طرف سے اس کی "سواگت" نے اسے یک گو مسرت سے دوچار کیا تھا۔ وہ اندر آگیا۔ اس بار دونوں کے درمیان بڑے خوشگوار ماحول میں باتیں ہوتی رہیں۔ کوئی جھجک نہیں تھی، نہ ہی کھنچا کھنچا ماحول تھا۔ اسد نے بہت بے تکلفی محسوس کی تھی اس ماحول میں اور اسے بہت حوصلہ ملا تھا۔ رخصت ہوتے وقت...... روبی نے اس کا سیل نمبر لینے کی بھی فرمائش کر ڈالی تھی۔

دوسرے روز ہی اسد کو...... روبی کی کال موصول ہوگئی۔

روبی نے اسے ایک ریسٹورنٹ میں ملنے کے لیے کہا تھا۔ اسد کی تو خوشی سے حالت ہی دیدنی تھی۔ اسد اس کے ساتھ ایک شاندار کینڈل ڈنر کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مگر روبی نے صرف شام کی چائے پر ہی اکتفا کیا اور آخر میں اشارہ دیا کہ وہ اس کے ساتھ کوئی اہم بات کرنا چاہتی ہے۔ روبی کی طرف سے ملاقات کے ایسے اظہار نے ہی اسد کو عجیب سی خوشی عطا کردی تھی کہ اس کا کسی اور طرف دھیان ہی نہ جاسکا تھا اور لامحالہ وہ یہی سمجھ بیٹھا تھا کہ روبی نے شاید

اس کی دلچسپی کو بھانپ لیا تھا اور...... شاید اس کے مزاج کو بھی۔ اس لیے...... وہ...... خود ہی اس سے شادی وغیرہ کے سلسلے میں گفتگو کرنا چاہتی تھی۔

بہرطور...... دونوں کی مقررہ وقت پر ملاقات ہوگئی۔ روبی نے مناسب لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اسد کو تو ویسے ہی ڈریسنگ کا شوق تھا۔ وہ بہترین تراش کے سوٹ میں ملبوس تھا۔

چائے وغیرہ کے دوران اسد نے روبی کے دلکش چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کیا اچھا ہوتا، ہم ڈنر بھی کرلیتے۔ اس بہانے ملاقات کی طوالت میرے لیے مزید خوشی کا باعث بنتی۔" اسد نے دیکھا، روبی کے چہرے پر ایک گمبھیر سنجیدگی طاری ہوگئی تھی اور اس کے ایک ہاتھ کی مخروطی انگلیاں میز پر دھری...... چائے کی نفیس پیالی سے کھیل رہی تھیں۔ اس میں اضطراب پایا جاتا تھا۔

"اسد صاحب!...... آپ کو معلوم ہے کہ میں نے آپ کو یہاں کیوں بلایا ہے؟" اچانک روبی نے اس کی طرف نگاہیں اٹھا کے کہا۔ اس کو اس کی بات عجیب بھی محسوس ہوئی تھی اور خوشی کا گمان بھی کہ روبی اس کے بارے میں کیا ویسا ہی سوچ رہی تھی، جو وہ اس کے بارے میں بہت پہلے ہی سے سوچ چکا تھا......؟

تاہم وہ مسکرا کر بولا۔ "نن...... نہیں شاید۔"

روبی کو یہ احساس پہلے ہی ہوچکا تھا کہ اسد اس سے کیا چاہتا ہے مگر وہ اسے مزید کسی خوش گمانی میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتی تھی لہٰذا فوراً مطلب کی بات پر آتے ہوئے متانت سے بولی۔

"اسد صاحب!...... ہم دونوں بلاشبہ پرانے اور اچھے شناسا رہ چکے ہیں اور ایک اچھے یونیورسٹی فیلوز بھی۔ مجھے اندازہ ہے آپ کے بارے میں کہ آپ ایک بہت نفیس اور اچھے دوست ہی نہیں اچھے انسان بھی ہوں گے...... شاید اس لیے مجھے آپ سے یہ کہنے کی ہمت ہو پا رہی ہے کہ میں آپ سے آج کچھ مانگوں گی تو آپ کھلے دوستانہ دل سے مجھے وہ شے عنایت کرنے میں کوئی عار بھی محسوس نہیں کریں گے۔"

روبی کی بات پر اسد کے اندر مسرتوں کے دیے جھلکنے لگے...... وہ اپنی خوش گمانی میں جانے کیا کیا خوش فہم اندازے قائم کرتا چلا گیا۔ اس کا جی چاہا وہ آج کھل کر روبی کے سامنے اپنی پرانی محبت کا اعتراف کر ڈالے کہ...... جس کے اظہار کی وہ آج تک ہمت ہی نہ کرسکا تھا مگر...... دماغ نے سمجھایا...... منزل تو خود ہی چل کر اس کے قریب آرہی ہے۔ اب جلد بازی کی کیا ضرورت ہے، بولا۔ "روبی صاحبہ! مجھے خوشی ہوئی ہے، آپ کی بات سن کر کہ آپ میرے بارے میں اس قدر اچھی رائے رکھتی ہیں...... شاید میں اپنی کوتاہ بینی اور کم عقلی کی وجہ سے یہ نہیں سمجھ پایا کہ...... پتا نہیں آپ مجھ سے کیا شے لینا چاہتی ہیں؟"

"میں آپ سے ایک مدد لینا چاہتی ہوں، اسد صاحب!" روبی نے فوراً کہا۔

"مدد؟" اسد کے چہرے پہ الجھن کے تاثرات نمودار ہوگئے۔

"ہاں...... اسد صاحب!...... مدد...... اور مجھے پوری امید ہے کہ آپ میری مدد کرنے سے بالکل بھی انکار نہیں کریں گے۔"

روبی نے اس بار اپنے لہجے پر زور دیتے ہوئے کہا جبکہ اسد کے چہرے پہ ہنوز الجھن آمیزی کے تاثرات موجود تھے اور وہ بہ دستور مستفسرانہ سی نظروں سے روبی کے چہرے کو تکے جا رہا تھا تاہم اسے خاموش پا کر بولا۔

"روبی صاحبہ! آپ کو کس قسم کی مدد درکار ہے مجھ سے؟"

وہ اس قدر ہی کہہ پایا تو روبی نے اپنی گھنیری پلکوں کو کچھ بھینچ کر اوپر اٹھایا تو اسد کو بہ غور اپنی طرف دیکھتا پا کر بولی۔ "اسد صاحب! میں بہت پریشان ہوں اور ایسے میں آپ جیسے دوست کا ساتھ مجھے اس پریشانی سے نکال سکتا ہے۔ میں آپ سے بہت پُرامید ہوں اسد صاحب!" کہتے کہتے روبی کی آواز اور لہجہ رندھ سا گیا۔

اسد بے چین ہوگیا۔ اس نے فوراً روبی کا نرم و نازک ہاتھ دھیرے سے تھام لیا جو ہنوز چائے کی ادھ بھری پیالی سے الجھا ہوا تھا۔ روبی نے نم ناک نگاہوں سے اسد کی طرف دیکھا البتہ اپنے ہاتھ کو اسد کی گرفت سے نہیں چھڑا پائی۔ اس نے وارفتگی سے کہا۔

"پلیز روبی! آخر بات کیا ہے، مجھے بتاؤ تو؟" اور پھر روبی نے ہولے سے اپنا ہاتھ چھڑانے کے بہانے چائے کی پیالی تھام لی۔ اسد نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا اور اس کے بعد روبی دھیرے دھیرے اسے وہ ساری بات بتانے لگی، جس کے لیے وہ کافی دنوں تک سوچتی اور اپنے اندر ہمت پیدا کرتی رہی تھی کہ...... وہ یہ سب اسد سے کس طرح کہے گی؟ مگر اب وہ یہ سب کہہ چکی تھی۔ اسد کے چہرے پہ سناٹے اتر آئے تھے۔ وہ جیسے اپنی جگہ دم بہ خود سا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے اندر ہلچل سی مچنے لگی۔ دل و دماغ جیسے شائیں شائیں کرتی آندھیوں کی زد میں آگیا تھا۔ وہ گم صم سا ہو کر رہ گیا۔ روبی دزدیدہ نگاہوں سے اس کے خاموش چہرے کو تکتے ہوئے شاید اس کی اندرونی کیفیات کو بھانپنے کی کوشش کر رہی تھی اور

سمجھ رہی تھی کہ اسد کے لیے یقیناً یہ بات کس قدر شاکنگ ہوسکتی ہے۔ روبی کو اپنے لبوں پہ خشکی کا احساس ہوا۔ اس نے زبان ہونٹوں پہ پھیری اور اسد کی طرف دیکھ کر بولی۔

"اسد صاحب! یہ باتیں ایسی تو نہ تھیں کہ میں خود آپ سے کرتی مگر مجبوری تھی میری کہ...... آپ جیسا...... قابلِ اعتبار، قابلِ بھروسا شخص کوئی تھا ہی نہیں اور پھر آدمی اس سے ہی مدد مانگتا ہے نا جس سے اس کو امید بھی ہو۔ مجھے آپ سے واثق امید تھی، اب آپ کی مرضی ہے...... مجھ بدنصیب کو ٹھکرا دیں یا پھر میری بے پندار ناؤ کو ساحلِ امید تک پہنچا دیں۔" اسد کو روبی کا لہجہ سسکتا ہوا فریاد رسا محسوس ہونے لگا۔ وہ اندر ہی اندر روبی سے محبت کرتا تھا۔ بہت پہلے سے، اسے چاہتا آیا تھا۔ پسند کرتا آیا تھا پھر تقدیر نے اچانک اسے اپنی گم گشتہ مگر خاموش محبت سے ملوا بھی دیا۔ وہ اس وقت شعیب کی بیوی تھی مگر اسد جیسے ناکام اور درماندہ عاشق نامراد کے لیے یہ بھی کیا کم تھا کہ اس کا محبوب چاہے اب کسی اور کا سہی، اس کی نظروں کے سامنے تو رہتا تھا۔ پھر یوں ہوا، روبی کو اس کے شوہر شعیب نے طلاق دے ڈالی۔ اسد کے لیے یہ ایک غیر متوقع خبر تھی...... اسے دکھ بھی ہوا تھا...... وہ اتنا خود غرض نہ تھا کہ خوش ہوتا مگر اسد جانتا تھا تقدیر کے آگے کس کا بس چلتا ہے۔ ہوا وہی جو ہونا تھا۔ اس نے ایک نخلِ امید کے سہارے اپنے قدم روبی کی طرف بڑھا دیے تھے۔ وہ اسے سہارنا اور تھامنا چاہتا تھا۔ جب اس خوش امیدی میں اس نے روبی کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا تو عقدہ کھلا کہ اسے تو خود تھامنے کی ضرورت پڑ گئی تھی۔

اس نے روبی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ صرف ایک گہری اور دکھی سانس کھینچ کر رہ گیا اور اٹھ کر وہاں سے چلا آیا۔ وہ سارا دن اپنی عجیب و غریب محبت کا ماتم ہی کرتا رہا جس کے نصیب میں کوئی منزل نہ تھی، سوائے محرومیوں کے سنگِ میل کے...... اس کا سفر بے سمتی اور بے منزل ہی رہا۔ کہاں تو اسے اپنی منزل اچانک ہی اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگی تھی اور کہاں...... ایک بار پھر مل کر منزل خود اس سے دور جانے کا کہہ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار روبی کا فریاد رسا، ملتجیانہ چہرہ ابھر رہا تھا۔ کس قدر امید تھی روبی کی نگاہوں میں جو اس نے اسد سے وابستہ کر رکھی تھی۔ وہ سوچنے لگا...... کیا اس کی محبت کا بس اتنا ہی نصیب تھا کہ وہ ایثار کے لیے ہی کام آتی اور پھر حرفِ غلط کی طرح مٹا دی جاتی؟ یہ الفاظِ دیگر پھینک دی جاتی...... وہ سوچتا رہا۔ فیصلہ کرتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہیے...... محبت کا نصیب صرف منزل ہی تو نہیں ہوتی قربانی بھی ہوتی ہے اور محبت اصل میں قربانی دے کر ہی امر ہوتی ہے۔ مگر کیا وہ روبی کو پانے کے بعد چھوڑ پائے گا؟

اگلے دن روبی کا اس کے سیل فون پر رابطہ ہوا اور اسد نے ہاں کہہ دی۔

☆☆☆

بہت سادہ تقریب ہوئی تھی۔ اسد اور روبی رشتۂ ازدواج سے منسلک ہو گئے اور پھر جب طے شدہ معاہدے کے تحت روبی کو طلاق دینے کا وقت آیا تو اسد کے لیے یہ بڑا اذیت ناک لمحہ تھا۔ اس نے روبی کے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور کسی معصوم بچے کی طرح ضد کرنے لگا۔

"مجھے مت چھوڑو...... پلیز...... روبی!"

اس نے دل کی گہرائیوں سے، بڑے عمیق لہجے میں بالکل گریہ وزاری کے سے انداز میں اس کی منت سماجت کی تھی۔ روبی نے اس کے عمیق لہجے میں بے چارگی اور التجا کو واضح طور پر محسوس کیا تھا۔ یہ بھی کہ وہ یعنی اس کا شوہر اسد اس سے دیوانہ وار اور بے انتہا محبت کرتا ہے جس کی شدت اس کے مجبور سے لہجے سے ہی نہیں آنکھوں سے بھی عیاں تھی۔ ان احساسات سے قبل ہی روبی کو یقین کی حد تک علم تھا کہ اسد شادی سے پہلے ہی اس کی محبت میں مبتلا تھا۔ پھر شادی بھی کچھ ایسے حالات میں ہوئی کہ اسد کی یہ خوشی، روبی سے متوقع جدائی کے اندیشناک خوف ہی کا شکار رہی اور بالآخر وہی ہوا کہ روبی کو چھوڑنا اس کی مجبوری بن گئی اور روبی کی ضرورت...... مگر وہ اب بچوں کی طرح، نم ناک آنکھوں میں التجا کے اشک سموئے اس کے آگے ساتھ نبھانے کی بھیک مانگ رہا تھا۔

"روبی! ال کے بچھڑنا میرے لیے بہت زیادہ اذیت ناک ہوگا۔ میں تم بن نہیں رہ پاؤں گا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ تمہارا اور میرا ملن ہی نہ ہوتا۔ وہ میرے لیے ایک غمِ نارسائی تو ہوتا...... مگر اب...... یوں...... تمہارا مل کے بچھڑنا میرے لیے زیادہ کرب ناک اور اذیت انگیز ہوگا۔"

کہتے ہوئے اس نے بڑی بے تابانہ تڑپ سے روبی کا نرم و گداز ہاتھ پکڑ لیا۔ روبی کو اس کے مردانہ ہاتھ کی سختی اور گرفت نے ایک لمحے کو خوف زدہ سا کر دیا تھا۔ مجبوراً اسے اپنی زبان پر سختی لانا پڑی۔ بہت دھیرے سے اس نے پہلے اپنا ہاتھ چھڑایا پھر بولی۔

"اسد! میں نے پہلے ہی تم پر ساری بات واضح کر دی تھی تاکہ تم بھی ذہنی طور پر اس کے لیے تیار رہو پھر...... میں

نے تم پر بھروسا بھی تو کیا تھا اسد!...... اور کچھ سوچ کر ہی تمہارا انتخاب کیا تھا کہ صرف تم ہی لائقِ اعتبار اور ایک شریف مرد ثابت ہو سکتے ہو میرے لیے...... خدا کے لیے اپنا یہ اعتبار اور میرا یہ مان، میرے اندر اسی طرح آباد رہنے دو۔ میں تاعمر تمہاری ممنون و احسان مند رہوں گی۔ مجھے اس بات پر ہمیشہ فخر رہے گا کہ تمہارے سلسلے میں میرا انتخاب غلط نہ تھا۔ پلیز اسد! لیوی...... ناؤ فار مائی سیک......"

اسد کا جیسے ایک چھناکے سے سب کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ روبی کے بے رحم لفظوں نے اسے باور کرا دیا تھا کہ اب سوچنے سمجھنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اسے اب اپنی محبت کو، اپنی روبی کو چھوڑنا ہی تھا۔ ہمیشہ کے لیے۔ ایک لمحے کو اس کے دل میں سرکشی نے بھی سر ابھارا تھا۔ انتہائی دکھ کے احساس تلے...... ایک ایسے خیال نے اسے جبر پہ اکسایا بھی تھا مگر پھر...... تیشۂ محبت نے جیسے ایک ہی وار سے اس کے دلِ مجبور میں ابھرنے والی سرکش لہر کو مٹا ڈالا۔

میز پر رکھے اسٹامپ پیپر پہ قلم پڑا ہوا تھا۔ اسد نے کپکپاتے ہاتھوں سے قلم اٹھایا، ایسے میں اس کا دل ڈوب ڈوب رہا تھا۔ روح تک جھیروں جھیر ہو رہی تھی۔ ایک آخری ملتجیانہ، عاجزانہ اور فقیرانہ نظر اس نے سامنے کھڑی روبی کے چہرے پر اس امید سے ڈالی کہ شاید وہ اسے ایسا کرنے سے روک دے۔ مگر روبی کے سپاٹ چہرے نے اس کے اندر کے مایوس اندھیاروں کو مزید سوا کر دیا۔

بالآخر اس نے روبی کو طلاق دے دی۔

☆☆☆

عدت کے بعد وہ دونوں ایک بار پھر رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے تھے یعنی...... شعیب اور روبی۔ شعیب روبی کو دوبارہ پا کر بہت مسرور تھا مگر روبی جیسے کہیں کھو گئی تھی۔ انسان کوئی ایسا عمل کر گزرے جو وہ نہ کرنا چاہتا ہو تو، بعد میں اسے یہ احساس کچوکے ضرور لگاتا ہے۔ روبی خود سے بارہا سوال کر چکی تھی کہ اس نے آخر کیا سوچ کر اسد کا انتخاب کیا تھا؟ جو اس سے محبت کا دم بھرتا تھا۔ آخر ایسے انسان کو ہی اس نے اپنی غرض کی خاطر قربانی کا بکرا کیوں بنایا تھا جو اس کی محبت کا ایک خاموش دعوے دار تھا؟ روبی کو خود سے ندامت محسوس ہونے لگی۔ اس کے خیال میں یہ اس کی ایک گھٹیا حرکت تھی کہ اس نے اسد کی یکطرفہ محبت کو آزمایا تھا۔ وہ تو اپنی محبت میں قربانی دے کر سرخرو ہو گیا تھا اور اس نے اپنا قد بھی روبی سے اونچا کر لیا تھا جبکہ روبی اب خود کو بہت چھوٹا محسوس کرنے لگی تھی۔ اسے اپنی عزتِ نفس مجروح ہوتی محسوس ہونے لگی تھی۔ شعیب اپنی دھن میں مگن تھا، اسے روبی کے اندر...... اس کی ذات میں ہونے والی شکست و ریخت کا بالکل اندازہ نہ تھا۔ ہوگا بھی تو اس کی اسے پروا نہ تھی مگر روبی اپنی ذات میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ پتا نہیں کیا بات تھی، روبی کو اس بار شعیب کے ساتھ زندگی بتاتے ہوئے وہ فخر، وہ مان اور وہ مسرت محسوس نہیں ہو رہی تھی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ اب اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ شعیب کے ساتھ یہ زندگی مستعار لے کر اور چار و ناچار گزار رہی ہو۔ یہ زندگی اسے روکھی پھیکی محسوس ہونے لگی تھی۔ روبی نے بارہا کوشش کی تھی کہ ایک بھیانک خواب سمجھ کر وہ سب بھلا دے جس نے اس کے اندر کی عورت کو مجروح کیا تھا، مگر ایسا نہ ہو پایا تھا۔

زندگی گویا ایک سمجھوتے کے ساتھ گزر رہی تھی۔ شعیب نے اس کی وقت گزاری کی خاطر اسے دوبارہ اپنے کوچنگ سینٹر میں مصروف کر دیا تھا۔ یوں وہ ایک بار پھر ایڈمن کی حیثیت سے مصروف ہو گئی تھی۔

☆☆☆

روبی کو اب اپنی زندگی میں ایک بے نام سے تلخی گھلی گھلی محسوس ہونے لگی تھی۔ اگرچہ شعیب اسے ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔ مگر روبی اسے جس نظر سے دیکھنا چاہ رہی تھی، وہ اس نظر میں نہیں آ پا رہا تھا۔ وہ خود کو تو چھوٹا محسوس کر ہی رہی تھی مگر شوہر کو وہ بلند دیکھنا چاہتی تھی اور جب بھی وہ ایسا سوچتی یکدم اسد اس کے شوہر شعیب کے مقابل آن کھڑا ہوتا اور روبی کو شعیب کے مقابلے میں اسد زیادہ قد آور، باوقار اور غیرت مند محسوس ہونے لگتا تھا۔ وہ جھلا جاتی۔ بات اب پہلے جیسی کچھ پنپ نہیں رہی تھی۔ بہرطور وقت گزرتا رہا۔ وقت بہت بدلحاظ ہے، رکتا نہیں ہے۔ تقدیر کی طرفہ کاری اور تماشا سازی شاید ابھی باقی تھی۔ روبی کے پاؤں بھاری ہونے لگے۔ ماں بننے کے احساس نے اسے یکدم ہی سرشار کر ڈالا کہ اسے اپنے اندر کی ساری کدورت دھلتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ انہونی کیسے ہو رہی تھی...... مگر ہو چکی تھی۔ خدا کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔ روبی کو تو اپنے بارے میں پہلے ہی سے علم تھا کہ وہ بالکل نارمل تھی، اس میں کوئی نقص نہیں تھا۔ جو اہم "ایشو" بہت پہلے شعیب اور روبی کے درمیان ایک حساس تنازعے کی شکل اختیار کر گیا تھا اور جس کے نتیجے میں دونوں کے درمیان طلاق بھی واقع ہو گئی تھی، اب وہ دوبارہ بڑے بھیانک انداز میں ابھرا تھا کہ جس کا روبی کو تو

احساس نہ ہوا البتہ شعیب کو یکدم چپ سی لگ گئی۔

روبی کے تو خوشی کے مارے زمین پر پاؤں نہیں ٹک رہے تھے۔ اس نے خوشی کے بے پایاں اظہار کے دوران شعیب سے کہا بھی تھا۔

''دیکھو شعیب! اللہ نے آخر ہماری سن ہی لی۔ میں نہ کہتی تھی مایوسی گناہ ہے۔ یہ سب اسی کی دین ہے۔ وہ جب چاہے دے۔'' شعیب نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔

شعیب، جو اپنی محبوب بیوی روبی کو دوبارہ پا کر خوش اور شادمان تھا، بچے کی آمد کی خبر اس کے لیے بھی مسرت کا پیغام بن سکتی تھی مگر اب...... ایسا نہیں تھا۔ اس کے اندر بڑے زہریلے احساسات اور سوچیں کوڑیالے ناگ کی طرح پھن اٹھا اٹھا کر پھنکاریں مار رہے تھے...... یہ بچہ کس کا ہے؟ کس کا ہو سکتا ہے؟...... شعیب کو یوں لگا جیسے اس بار وہی پرانا مسئلہ ...... زہریلے ناگ کی طرح دوبارہ پھن کاڑھے کھڑا ہو گیا ہے۔

شعیب کو ایک گم صم سی سوچ نے آلیا تھا۔ شعیب کو یاد تھا۔ طلاق سے پہلے اس کی روبی سے شادی کو دس بارہ سال کا عرصہ بیت چکا تھا اس دوران روبی کی گود خالی رہی تھی جس نے روبی کو ایک غم ناک سی اداسی میں مبتلا کیے رکھا تھا۔ پھر وہ بہ ضد ہوتی رہی تھی کہ اپنا اور اس کا میڈیکل چیک اپ ہونا چاہیے۔ اس پر شعیب کو سختی سے اعتراض رہا۔ مگر روبی نے اپنا طبی معائنہ کروا ہی لیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے اسے ہر طرح سے صحت مند اور فٹ قرار دیا جبکہ شعیب نے روبی کے...... بے حد اصرار کے باوجود اپنا طبی معائنہ کرانے کی ضرورت محسوس ہی نہ کی بلکہ وہ برافروختہ ہو گیا۔ یہ معاملہ بعد میں اتنا سنگین صورت اختیار کر گیا جو بالآخر طلاق پر منتج ہوا۔ شعیب کو بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور دونوں نے مل کر مراجعت کی راہ نکالی۔ اسد کو قربانی کا بکرا بنایا گیا کیونکہ مراجعت کی اب یہی صورت تھی کہ روبی حلالہ کے عمل سے گزر کے دوبارہ اپنے سابق شوہر شعیب کے عقد میں آتی۔ لہٰذا روبی کا اسد کے ساتھ نکاح ہوا، میاں بیوی کی شریعت پوری کرنے کے بعد حلالہ جائز ہوا اور روبی پہلے سے ایک طے شدہ معاہدے کے تحت اسد سے طلاق لے کر دوبارہ اپنے سابقہ شوہر شعیب کے عقد میں آگئی۔

یہ وہ باتیں تھیں جو اب روبی کے ماں بننے کے بعد ایک بار پھر شعیب کے دماغ میں ایک نئے مردانہ قسم کا خناس ابھارنے کا سبب بن رہی تھیں تاہم کچھ ابہام تھا جس کے لیے شعیب نے سوچا کہ وہ اپنا طبی معائنہ کروالے مگر روبی کو نہ بتائے۔ شعیب کو اب شرمندگی بھی محسوس ہو رہی تھی کہ جس بات کو اس نے خود ایک سلگتا ہوا ایشو بنایا تھا، اب خود ہی اس پر عمل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر اس نے جلد ہی اپنی شرمندگی پر قابو پایا اور ایک معروف کنسلٹنٹ سے اپنا چیک اپ کروا لیا۔ جب رپورٹ اس کے ہاتھ میں آئی تو وہ سن ہو کر رہ گیا۔ وہ باپ بننے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ ایک خنجر تھا جو اس کے سینے میں پیوست ہو گیا تھا۔ اس کی مردانہ انا کو ٹھیس پہنچی تھی۔ ایک بار پھر اس کے اندر کا انا پرست مرد انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا تھا۔ مگر اب وہ کیا کر سکتا تھا۔ وہ روبی سے بھی کچھ نہیں کہہ سکا۔ تاہم یہ بات اب طے ہو چکی تھی کہ روبی کا ہونے والا بچہ اس کا نہیں بلکہ...... اسد کا تھا۔ شعیب اندر سے گھٹ کر رہ گیا۔ وقت اور حالات نے اس کے لب سی دیے تھے۔ وہ سرِدست مہر بہ لب ہو کر رہ گیا تھا۔

روبی نے ایک پیارے اور صحت مند سے بچے کو جنم دیا تھا۔ اس کا نام روبی نے ہی رکھا تھا احمد...... وقت گزرتا رہا اور تقدیر انسانی ہاتھوں کی لکیروں کو ان کا اسیر بناتی اپنا تماشا دکھاتی رہی۔ شعیب کو خاموش اور چپ چپ سا پا کر روبی بھی کبھی کبھی کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتی تھی اور شاید وہ بھی اس کی وجہ اپنے تئیں جاننے کی کوشش کرنے لگی تھی اور سب کچھ سمجھ کر وہ بھی گویا مصلحتاً چپ رہتی تھی۔ سمجھوتے پر ایک عمر تمام ہو جاتی ہے۔ ان کو بھی بیس برس تمام ہو گئے۔ احمد اب جوان ہو چکا تھا، شکل و صورت کا بھی خوبرو تھا وہ بی سی ایس کر چکا تھا۔ اب آئی ٹی کر رہا تھا۔ اس کے اندر بھی ایک شخصیت پنپنے لگی تھی ایک شخص تھا جو بہت دھیرے دھیرے اندر بیدار ہونے لگا تھا۔ احمد ایک ذہین اور حساس نوجوان تھا۔ روبی کے بالوں میں چاندنی جھلکنے لگی تھی۔ شعیب بھی وقت کو خراج دیتے دیتے تھکا تھکا نظر آنے لگا تھا۔ نظر کا چشمہ تو وہ پہلے بھی استعمال کرتا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ چشمے کے عدسے موٹے ہو گئے تھے۔ سر کے بال سفید...... باوجود کوشش کے وہ احمد کو باپ جیسی شفقت اور پیار نہ دے سکا تھا جس کا قلق نہ صرف روبی کو بلکہ احمد کو بھی تھا۔ شعور کی منزل تو بعد کی بات تھی۔ بچہ تو احساسات کی زبان جلد سمجھ لیتا ہے۔

احمد جب بچہ تھا تو اس نے ماں کو ہی ہمیشہ اپنے قریب پایا تھا۔ باپ کی اسے وہ توجہ نہیں حاصل ہوئی تھی، جو اس کا حق بھی تھی۔ روبی کو وجہ معلوم تھی مگر چونکہ وہ پہلے ہی ایک پل صراط سے گزر چکی تھی...... اس لیے دوبارہ اس میں اس کی ہمت نہ تھی۔ اس لیے اس نے بھی اب تک مصلحتاً خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ یہاں تک کہ احمد جوان ہو گیا۔

صغیر سنی سے کبیر سنی تک احمد کو اس تلخ حقیقت پر پختہ یقین ہو چلا تھا کہ اس کا باپ شعیب اس سے وہ پدرانہ محبت و شفقت نہیں کرتا جو اسے کرنی چاہیے تھی۔ نتیجتاً احمد بھی اس سے کھنچا کھنچا رہنے لگا تھا۔

شعیب اور روبی کے درمیان اب ایک خاموشی...... تالے کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ وہ کسی ایسی بات پر بحث کرنے سے گریزاں ہی رہتے تھے۔ جس سے ماضی کے حوالے سے کوئی چنگاری بھڑک کر گھر کا سکون چھین لے کیونکہ اب شاید دونوں ہی تھک چکے تھے۔ کسی نئی پریشانی یا مجذوبانہ ذلت کو برداشت کرنے کے اہل نہیں رہے تھے۔

احمد نے کئی بار اپنی ماں (روبی) سے پہلے اشاروں کنایوں میں پھر واضح لفظوں میں جاننا بھی چاہا تھا کہ باپ کا اس کے ساتھ ایسا رویہ کیوں تھا؟ جیسے...... جیسے وہ ان کی اولاد ہی نہ ہو...... روبی، بیٹے کی اس بات پر دہل سی جاتی۔ وہ اسے کیا بتاتی، یہ کیا معاملہ تھا اور کس قدر گمبھیر بھی...... نیز ان کے والدین کے درمیان طلاق بھی ایک بار ہو چکی تھی اور اس کی ماں...... حلالہ کرنے کے بعد دوبارہ اس کے باپ کے عقد میں آئی تھی۔ بیٹے کو یہ حقیقت بتانا روبی کے لیے بلکہ ایک ماں کے لیے احساسِ شرمندگی کی سولی پر لٹکنے کے مترادف ہی تھا۔ اس لیے وہ اس اہم راز کو راز میں ہی رکھنا چاہتی تھی۔ آخری دم تک...... مگر یہاں معاملہ تو اس سے بھی زیادہ سنگین تھا اور وہ تھا نسل کا...... کیونکہ احمد آج تک اپنے باپ کی سرد مہری اور عدم شفقت کی وجہ تو نہ جان سکا تھا تاہم روبی تو اسی روز سے کھٹک گئی تھی جس دن احمد کی پیدائش ہوئی تھی اور مصلحتاً اس نے بھی ایک غیر استفساریہ خاموشی طاری کر رکھی تھی۔ پھر ایک روز اچانک روبی کے ہاتھ شعیب کی وہ میڈیکل رپورٹ لگ گئی جس میں بتایا گیا تھا کہ وہ باپ بننے کی اہلیت سے محروم تھا۔ تب...... روبی بھی دھک سے رہ گئی تھی۔ سمجھ تو گئی تھی مگر اب اسے اس کی وجہ بھی سمجھ آچکی تھی کہ شعیب، احمد سے کھنچا کھنچا اور بے اعتنا سا کیوں رہتا تھا۔ بات واضح تھی، احمد...... شعیب کا نہیں...... اسد کا بیٹا تھا۔

روبی سمیت شعیب کے لیے بھی یہ ایک گمبھیر اور حساس نوعیت کی سنگین صورت حال تھی جس پر چپ سادھ لینا ہی دونوں کے لیے زیادہ بہتر تھا۔ ورنہ ایک بار پھر ان کی زندگی کالے طوفانوں کی زد میں آسکتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ جب یہی سوال، احمد کے جوان ہونے پر اس کی زبان پر آیا تو روبی دہل گئی تھی مگر وہ اسے ٹالنے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی کہ اس کے باپ کا مزاج ہی ایسا تھا۔

احمد کے شعور میں جب تک لڑکپن تھا تو وہ ماں کا یہ جواب سن کر چپ ہو جایا کرتا تھا مگر جب شعور میں کچھ پختگی آئی تو...... اسے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ بات محض اتنی سی نہ تھی جتنی اس کی ماں اسے بتا کر محض مطمئن کرنا چاہتی تھی۔

اس کے اندر اپنے باپ سے متعلق کھوجنے کا غبار گہرا اور کثیف ہونے لگا۔ وہ اس کی وجہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر ایسا کیوں تھا؟ کہ وہ صرف اپنی ماں کا لاڈلا تھا جبکہ باپ اسے ہمیشہ نظر انداز کر دیا کرتا تھا حالانکہ وہ ان کی اکلوتی اولاد تھا۔ پھر کیوں وہ صرف اپنی ماں کی آنکھ کا تارا تھا، باپ کا وہ کچھ بھی نہیں تھا؟

☆☆☆

احمد اپنی تعلیم مکمل کر چکا تھا۔ یونیورسٹی میں اس روز الوداعی تقریب کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس لیے فارغ التحصیل ہونے والے طلبا کے والدین کو بھی خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ یہ پرائیویٹ یونیورسٹی تھی اور اس کا معیار کافی بلند تھا۔ احمد کے ساتھ حسبِ معمول صرف اس کی ماں روبی تھی۔ تقریب میں تقسیمِ اسناد کے علاوہ یونیورسٹی میں گزارے ہوئے ماہ و سال کے حوالے سے چیدہ چیدہ طلبا کو ڈائس پر آکر اپنے تاثرات کا مختصراً اظہار بھی کرنا تھا۔ تقریب میں دیگر فیکلٹیز کے طلبا بھی تھے۔ احمد اپنے تاثرات کا اظہار کر کے واپس اپنی ماں کے پاس آکر بیٹھ گیا، سب سے آخر میں ایک جواں سال لڑکی مصباح نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا تو احمد اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ مصباح کا تعلق آرٹ فیکلٹی سے تھا۔ احمد کو حیرت تھی کہ اتنا عرصہ یونیورسٹی میں رہتے ہوئے وہ اس ماہ وش سے بے خبر ہی رہا تھا۔ شاید اس کی کچھ وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ دوسرے شعبے سے تعلق رکھتی تھی، دوسرے یہ کہ احمد کی خود اپنی شخصیت ذرا لیے دیے رہنے والی تھی۔ وہ کسی سے زیادہ گھلنے ملنے کا عادی نہ تھا۔ خاموش طبع اور اپنی پڑھائی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے دوست بھی گنتی کے تھے، ان سے بھی وہ کم کم ہی ملتا تھا۔

وہ آج پہلی بار خوب صورت دوشیزہ کو یک ٹک تکے جا رہا تھا۔ اس کے لہجے میں لطافت تھی، آواز میں ترنم تھا۔ دونوں ہی خوبیاں اس کی دلکش حسین شخصیت سے ہم آہنگ تھیں......

جسم کو زندہ رہنے کے لیے دل کا دھڑکتے رہنا ضروری ہوتا ہے مگر ان دھڑکنوں میں اگر سازِ حیات کے علاوہ سازِ الفت بھی شامل ہو تو دل گویا یکتارا بن جاتا ہے۔ جو ایک ہی دھن بجاتا ہے کہ

اے وحشتِ دل کیا کروں......؟

وہ ابھی اس نازنین حسن دل آرا کی مدھر بانی میں کھویا ہوا تھا کہ...... دفعتاً اسے اپنے قریب میں بیٹھی ماں کی چونکتی ہوئی آواز سنائی دی جس نے اس کی محویت کا سحر توڑ ڈالا۔

"ارے فاخرہ! کک...... کیا یہ تم ہو؟" یہ اس کی ماں کے پُرتحیر الفاظ تھے جو اس نے اپنے ساتھ بیٹھی ایک اپنی ہم عمر خاتون سے کہے تھے۔ وہ بھی ان کی طرف متوجہ تھی۔ پھر تو جیسے باتوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ فاخرہ بھی اپنی کئی برس پرانی کولیگ روبی کو پہچان چکی تھی، فاخرہ...... روبی کے شوہر شعیب کے کوچنگ سینٹر میں ہی جاب کرتی تھی۔ اگرچہ روبی کا رویّہ فاخرہ کے لیے ایک باس کا تھا...... مگر دونوں کے آپس میں دوستانہ مراسم ہی تھے۔ دونوں پرانی سہیلیاں بالکل اچانک غیر متوقع اور اتفاقیہ ایک دوسرے سے مل کر رو ہی پڑی تھیں۔ دونوں باقاعدہ ایک دوسرے سے لپٹ گئی تھیں۔ پھر وہ نئی پرانی باتوں میں مصروف ہوگئیں۔ احمد بور ہونے لگا۔ اس نے دوبارہ اپنی توجہ ڈائس پر کرلی۔ وہ ماہ جبیں یعنی مصباح اب ڈائس سے فارغ ہوکے اتر رہی تھی...... ایسے میں اچانک اسے اپنی ماں کی آواز سنائی دی جو اپنی سہیلی سے کہہ رہی تھیں۔ "یہ میرا بیٹا ہے...... احمد شعیب......"

"ماشاء اللہ بہت اسمارٹ اور پیارا ہے، ہاؤ آر یو کڈ؟" فاخرہ نے اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ بڑھایا۔ احمد نے جبری مسکراہٹ چہرے پہ لاتے ہوئے خاتون سے مصافحہ کیا اور مختصراً بولا۔ "فائن تھینکس آنٹی......!"

"لیجیے! اب ہماری بیٹی مصباح سے ملیے۔" فاخرہ نے قریب آتی، مصباح کی طرف دیکھ کر بڑی محبت سے کہا تو احمد کو ایک خوشگوار حیرت کا جھٹکا لگا۔ کہاں تو وہ اپنی ماں کی اس پرانی دوست سے بوریت سی محسوس کررہا تھا اور اب جیسے ایک دم اسے خود بھی اس اتفاق پر مسرت محسوس ہونے لگی تھی۔

"بڑی پیاری بچی ہے، ہاؤ آر یو بیٹا؟" روبی نے بھی مسکراتے ہوئے مصباح کی طرف دیکھا۔ وہ بھی مسکرا کر ملی۔ روبی اور فاخرہ پرانی سہیلیاں تھیں، کافی دیر وہ باتیں کرتی رہیں، پھر سیل فون نمبرز کے تبادلے ہوئے۔ احمد اور مصباح بھی آپس میں گھل مل گئے تھے۔

"اتنا عرصہ یونیورسٹی میں رہے، کبھی آپ کو دیکھا نہیں۔" احمد نے پُراشتیاق نظروں سے مصباح کے دلکش سراپا کو دیکھتے ہوئے مسکرا کے کہا۔

"یہی حال میرا بھی سمجھ لیں......" وہ دلنشین مسکراہٹ سے بولی۔ "ویسے یہ کتنا عجیب اتفاق ہے۔ میری اور آپ کی ممی پرانی سہیلیاں نکلیں۔"

"یقیناً بلکہ گم گشتہ سہیلیاں۔" احمد نے گہری مسکراہٹ سے کہا تو مصباح بے اختیار ہنس پڑی۔ اس کے موتیوں جیسے دودھیا دانتوں کی قطار احمد کو خاصی جاذبِ نظر محسوس ہوئی۔

ان لوگوں میں اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر اپنے اپنے راستوں پر رخصت ہوگئے۔ مگر احمد تو گویا اپنے گھر کا راستہ بھول کر کسی اور ہی راہ کا راہی بن چکا تھا۔ گھر پہنچ کر وہ کافی دیر تک مصباح کے تصورِ جاں فزا میں کھویا رہا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کی ماں اپنی سہیلی اور ان کی بیٹی مصباح کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دے۔ وہ خود ماں سے ایسا کہنے سے جھجک رہا تھا۔ اس دوران میں بدقسمتی سے روبی کا سیل فون کھو گیا اور جتنے نمبرز تھے، اس سے بھی محروم ہونا پڑا۔ اس میں فاخرہ کا نمبر بھی تھا۔ احمد کا دل گھٹ کر رہ گیا۔ روبی نہیں جانتی تھی کہ اس کا جواں سال بیٹا اس کی سہیلی فاخرہ کی بیٹی، مصباح کو اپنا دل دے بیٹھا ہے...... وہ اداس اور کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ روبی کو بیٹے کی اندرونی کیفیات کا بالکل اندازہ نہ تھا۔

چند دن گزرے، احمد اپنے ایک قریبی دوست حارث کے ساتھ شاپنگ کرنے نکلا۔ ایک معروف شاپنگ مال میں احمد کی نظر دو سہیلیوں کے درمیان کھڑی تیسری پر پڑی اور...... جیسے اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ وہ مصباح تھی۔ وہ دوست کو چھوڑ کر تیر کی طرح مصباح کی طرف یوں کھنچا چلا گیا جیسے اس میں مقناطیسی قوت ہو۔ ابھی نہیں قریب پہنچنے پر مصباح کی بھی نگاہ جیسے ہی احمد پر پڑی تو وہ بے اختیار خوشی سے دمک گئی۔ اس کا رخِ روشن مزید چمک گیا۔ وہ بھی اپنی دونوں سہیلیوں کو چھوڑ کر بے اختیار اس کی طرف لپکی۔ دل کو دل سے راہ شاید اسی کو کہتے ہیں۔ دونوں کے چہروں پہ پھول جیسی خوشی چمک رہی تھی۔ قریب ہی ایک کولڈ ڈرنک کارنر تھا۔ وہ وہاں جا بیٹھے۔ احمد نے اسے بتایا کہ اس کی مما کا سیل فون کھو جانے کے باعث ان سے رابطہ نہ ہوسکا تھا۔

بہرطور...... دونوں کافی دیر تک باتیں کرتے رہے اور جب گفتگو کا رخ احمد کی جانب سے پسند ناپسند اور محبت کی طرف مڑنے لگا تو مصباح نے فوراً بریک لگانے کی خاطر بتایا کہ وہ اس سے سینئر ہے لہٰذا عمر میں کچھ بڑی بھی ہے اس لیے معذرت مگر...... دل کے آگے کب کوئی سنتا ہے۔ لاکھ بند باندھنے کے باوجود محبت کا ریلا دونوں کو بہا کرلے گیا لہٰذا ان کے درمیان محبت کی یہ ضرورت...... نظریۂ ضرورت سے بھی بڑھ کر مجبوری بننے والی تھی۔ ایسی مجبوری جس میں دو دلوں کی بے تابی ایک دوسرے سے منسوب ہوکر رہ جاتی اور دونوں کو ایک دوسرے کی عادت ہوجاتی ہے۔

وہ دن بلکہ وہ شام دونوں کے لیے بھی یادگار تھی کہ اس شام نے احمد اور مصباح کے ایک تعلقِ خاطر کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اس دن اور اس شام کے بعد پھر جیسے پیاسے اور بے قرار دلوں کا آرام وسکون چھن گیا۔ شوقِ دل میں ملن کی نخلِ امید تابندہ تھی۔ یہ امید..... خوابِ فردا کو ایک درخشاں مستقبل کی نوید دیتی تھی۔ اس لیے بھی کہ دونوں کی مائیں آپس میں نہ صرف گہری بلکہ پرانی سہیلیاں بھی تھیں۔

مصباح ایک بار اپنی ماں فاخرہ کے ساتھ ان کے ہاں آبھی چکی تھی۔ احمد اور روبی بھی جاچکے تھے۔ دونوں بچوں کی تعلیم مکمل ہوچکی تھی اس لیے روایتی ماؤں کی طرح فاخرہ اور روبی کو بھی ان کی شادی کی فکر تھی۔ مگر یہ فکر ان کے بچوں نے حل کردی۔ جب ایک دن احمد نے اپنی ماں روبی کے گوش گزار کردیا کہ وہ ان کی سہیلی کی بیٹی کو پسند کرتا ہے۔

معاملہ دوستی سے رشتے داری کی طرف بڑھنے لگا تو روبی کو گھر کے سربراہ کی کھوج پڑی۔ کچھ اتفاق ایسا رہا کہ جب بھی آنا جانا ہوا تو نہ شعیب گھر پہ موجود تھا، نہ مصباح کے والد..... جو لیکچرار تھے۔

چنانچہ اس بار رشتے کی بات چیت کے لیے روبی نے شعیب کو ساتھ لے جانے کا ارادہ کیا تھا۔ شعیب نے پہلے تو ناک بھوں چڑھائی تھی مگر پھر بے دلی کے ساتھ ہاں کہہ دی تھی۔

روبی نے اسی روز فاخرہ سے بات کی کہ وہ آج شام چائے پر اس کے ہاں آرہے ہیں۔ فاخرہ نے بھی خوش دلی سے اثبات میں جواب دیا۔

اس شام روبی اور شعیب تیار ہو کے فاخرہ کے ہاں روانہ ہوگئے۔ ان کے گھر سے نکلتے ہی احمد اپنے کمرے کی طرف دوڑا۔ اس کا دل خوشی سے بے قابو ہو رہا تھا۔ اس نے فوراً اپنے سیل پر..... مصباح سے رابطہ کیا۔ وہ بھی بہت مسرور تھی۔ احمد نے تسلی کی خاطر مصباح سے پوچھا۔

”اس بار ..... مما اور پپا دونوں آرہے ہیں۔ تمہارے ڈیڈی تو موجود ہیں نا.....؟ ایسا نہ ہو ہماری بات ادھوری رہ جائے۔“

”خاطر جمع رکھو..... پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ دوسری جانب سے مصباح کی پرشوخ آواز ابھری۔ ”ممی بھلا ڈیڈی کو اس خاص ایونٹ میں کہاں نکلنے دیں گی..... وہ بھی گھر پر ہی ہیں۔“

پتا نہیں کیا ہوا کہ..... اچانک احمد بولتے بولتے خاموش سا ہوگیا۔ مصباح نے یہ محسوس کرلیا۔ فوراً مستفسر ہوئی۔ ”کیا ہوا احمد؟ تم خاموش ہوگئے؟“

وہ بولا۔ ”مصباح! تمہیں میں نے اپنے پپا کے بارے میں بتایا تھا نا کہ..... پتا نہیں وہ کیوں مجھ سے کھنچے کھنچے سے رہتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہیں ان کے رویے سے تمہارے ممی ڈیڈی.....“

اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو..... مصباح اس سے ازراہِ تشفی بولی۔

”اس کی تم فکر نہ کرو..... میں نے اس بارے میں ممی کو بتادیا ہے اور انہوں نے یقیناً پپا کو بھی اعتماد میں لے لیا ہوگا۔“

”تھینکس مصباح! بس مجھے اس بات کا ڈر سا ہو رہا تھا۔“ احمد نے مطمئن ہو کر کہا۔

”احمد! ایک بات بتاؤ۔ کیا تم نے کبھی اس بارے میں کھوج لگانے کی کوشش نہیں کی کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ اپنی مما سے تو تم نے کبھی پوچھا ہی ہوگا؟“

جواباً احمد نے ایک طویل سانس بھری اور بولا۔ ”تم کیا سمجھتی ہو مصباح؟ اپنی زندگی کے اس اہم ایشو کو میں نے نظر انداز کردیا ہوگا؟ ہرگز نہیں مگر مجھے اس کا آج تک تسلی بخش جواب نہیں ملا۔ ڈیڈی سے تو امید ہی نہیں تھی مگر مما بھی ٹال جاتی ہیں تاہم اس استفسار پر کہ ڈیڈی کا آخر مجھ سے اس قدر اکھڑا اکھڑا اور روکھا بے اعتنا رویہ کیوں ہے؟ اس سوال پر مما کو میں کئی دنوں تک ایک عجیب سی پریشانی اور تشویش میں ہی مبتلا دیکھتا آیا ہوں پھر میری ممی سے یہ پوچھنے کی ہمت ہی نہیں ہو پاتی۔“

”اوہ.....“ دوسری طرف سے مصباح کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔ ”یہ معاملہ گمبھیر ہی لگتا ہے احمد!..... لیکن بہرحال تم ٹینس مت ہو، اللہ بہتر کرے گا۔ بعد میں بات کرتے ہیں، میں ذرا مما کے ساتھ کچن میں ہاتھ بٹا رہی ہوں..... آنٹی اور انکل آنے والے ہیں نا.....“ آخر میں اس کے لہجے میں شرم سی عود کر آئی اور احمد نے طمانیت بھری سانس لے کر مصباح کو رخصت دے دی۔

☆☆☆

روبی اور شعیب کار سے اترے۔ ان کا فاخرہ اور اس کے شوہر نے استقبال کیا۔ فاخرہ کے شوہر سے روبی کی آج پہلی بار ہی ملاقات ہو رہی تھی مگر..... شاید یہ ملاقات پہلی تھی ہی نہیں۔ یہ تو وہ ملاقات تھی جس نے اس کے اور شعیب کے ماضی کو ہی نہیں بلکہ حال کو بھی جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ بائیس چوبیس برس کا گزرا ہوا عرصہ کم تو نہیں ہوتا۔ بہت کچھ آنکھوں کے سامنے وقت کی دھول میں دھندلا جاتا ہے مگر وقت کی کتاب کے کچھ تلخ باب..... کڑوی یادوں کے ”بک

مارک“ بن کر وہیں اٹکے رہتے ہیں اور کسی بھی وقت کھل کر نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔ ماضی کی کتاب کا ایک یہ باب بھی وا ہو کر نظروں کے سامنے تھا۔ شعیب تو شاید نہیں پہچان پایا تھا مگر روبی تو اسد کو پہلی ہی نگاہ میں پہچان چکی تھی اور..... شاید اسد بھی..... کیونکہ روبی کی طرح اسد بھی اسے ہکا بکا نظروں سے تکے جا رہا تھا۔ روبی کے تو سان گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کی پرانی سہیلی اب اسد کی بیوی تھی۔ مگر روبی کے لیے صرف اس قدر ہی اذیت ناک شاک نہ تھا یہ جتنا..... کسی ڈراؤنی عفریت کی طرح منہ پھاڑے ایک اور حقیقت سامنے آن کھڑی ہوئی تھی اور وہ اس کے اپنے بیٹے احمد کی پسند تھی۔ کیونکہ اب روبی کے سامنے یہ حقیقت آشکار ہوجانے کے بعد کہ مصباح اسد کی بیٹی تھی تو اس لحاظ سے احمد کی وہ اب سوتیلی بہن بھی بلکہ باپ کے حوالے سے سگی بہن تھی۔ کسی الجھی ہوئی زنجیر کا ایک سرا پکڑ کر اسے سلجھانے کی کوشش کی جاتی تو نہ جانے روبی کے سامنے ہی نہیں، دنیا والوں کے سامنے بھی ایسی کس قدر کریہہ الوجود حقیقتیں آشکار ہونے لگتیں، جن کا تصور ہی روبی کے لیے سوہانِ روح تھا۔ اب وہ کیسے کسی کو بتاتی کہ وہ یہاں اپنے بیٹے کے لیے اس کی بہن کا رشتہ لینے آئی تھی؟ نعوذ باللہ.....

یہ سب سوچتے ہوئے، روبی کو بڑے زور کا چکر آگیا اور پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

اس روز بات آئی گئی ہوگئی۔

روبی کی اچانک طبیعت کی خرابی نے رشتے کی بات ہی آگے نہ بڑھنے دی مگر کب تک.....؟ احمد پھر اصرار کرنے لگا۔ روبی بری طرح تشویش اور ایک جاں گسل مخمصے میں پڑگئی تھی۔ بیٹے کو حقیقت بتا کر باز رکھنے کی کوشش بھی کرتی تو کیسے.....؟ اس کے لیے احمد کو یہ حقیقت بھی بتانا پڑتی کہ جس لڑکی سے وہ محبت کرتا ہے، اس کے باپ سے اس کی ماں کا حلالہ ہوا تھا۔ ایک جوان بیٹے کو یہ حقیقت بتانا روبی کے لیے ایسا ہی تھا جیسے اسے برہنہ کسی چوراہے پر کھڑا کردیا گیا ہو۔ ظاہر ہے مصباح سے شادی سے باز رکھنے کے لیے بیٹے کو یہ حقیقت بتانا پڑتی۔

روبی چند دن تک تو بیٹے کو اپنی طبیعت کی خرابی کے بہانے پر ٹالتی رہی مگر آخر کب تک.....؟ وہ سوچ سوچ کر پاگل ہوتی جا رہی تھی۔ اب تو تشویش اور پریشانی اس کے چہرے سے چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ وہ اس مسئلے کے حل کے لیے دن رات کیا ہر وقت سوچ بچار میں مصروف رہتی، جس کے باعث اس کا دماغ تک پگھلنے لگا تھا۔ ایک دن تو اس نے احمد کو اس کے دوبارہ اصرار پر بری طرح جھڑک بھی دیا۔ جس پر احمد بھونچکا رہ گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ماں کو دیکھنے لگا کیونکہ آج سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اس کی ماں نے کبھی اتنے زور سے اسے ڈانٹا ہو۔ انہوں نے تو کبھی اس سے سخت لہجے میں بات بھی نہ کی تھی، پھر آج.....؟ اس کا احساس روبی کو بھی تھا۔ وہ ذہنی طور پر پریشان تھی۔

بالآخر اس گمبھیر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل تو نکالنا ہی تھا۔ شترمرغ کی طرح ریت میں منہ دبا کر معاملہ مزید گمبھیر صورت اختیار کرسکتا تھا..... لہٰذا باہم سوچ بچار اور مسئلے کی تمام جزئیات پر اچھی طرح غور وخوض کرنے کے بعد روبی کے ذہن میں ایک حل سوجھتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اس نے اس پر فوری عمل کرنے کا فیصلہ بھی کرلیا۔ اگرچہ یہ بھی اس کے لیے ایک کڑوا گھونٹ پینے کے مترادف ہی تھا لیکن اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اس ایک کڑوے گھونٹ کے پینے سے، ناسور کا علاج ہونا کسی حد تک ممکن نظر آرہا تھا روبی کو۔

اس نے ایک روز کسی طرح فاخرہ سے باتوں کے دوران اگلوا لیا تھا کہ اس کا شوہر اسد آج کل کس کالج یا کوچنگ سینٹر میں پڑھا رہا ہے چنانچہ ناظم آباد میں واقع ایک کوچنگ سینٹر کا اسے پتا چلا، جدھر اسد صبح کی شفٹ میں پڑھایا کرتا تھا۔

وہ سیدھی مذکورہ سینٹر جا پہنچی۔ ایڈمن بلاک سے معلوم ہوا کہ اسد اس وقت ایک کلاس لے رہا تھا۔ وہ پندرہ منٹ میں فارغ ہونے والا تھا۔ اسے ویٹنگ روم میں بٹھادیا گیا۔

تھوڑی دیر بعد اسد اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر روبی کا دل جانے کس احساس تلے یکبارگی دھڑکا۔ وہ آج اسے پہلی بار بغور دیکھنے لگی۔ وہی فراخ پیشانی، جو کھلے دل کی غمازی کرتی تھی۔ نظر کے چشمے کے پیچھے جھانکتی خاموش آنکھیں، وہی چال مگر..... ایک شے بدل گئی تھی۔ وہ تھی اس کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں کی ہلکی مسکراہٹ..... کبھی اس مسکراہٹ میں میٹھا پن ہوتا تھا مگر اب وہاں ایک تلخ گھونٹ بھرنے جیسا تاثر جھلکتا محسوس ہو رہا تھا۔ عمر نے اس کے بالوں کا رنگ بدل دیا تھا۔ مگر انداز واطوار نہیں بدلے تھے۔ طبیعت میں فطری مضطربانہ پن اب بھی موجود تھا.....

دونوں کے درمیان رسمی علیک سلیک ہوئی۔ روبی کو اسد کے انداز سے یوں لگا جیسے یہ سب اس کے لیے چونکنے کا سبب نہ ہو۔ اسے جیسے پہلے سے اس اچانک ملاقات کی توقع ہو۔

”جی..... آپ مجھ سے ملنے آئی ہیں..... خیریت؟“

وہ اس کے سیدھے ہاتھ والے صوفے پر دھنستے ہوئے بولا۔ پھر اپنی رسٹ واچ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مگر بدقسمتی سے میں آپ کو زیادہ وقت نہیں دے سکوں گا۔ ابھی دس منٹ بعد مجھے دوسری کلاس لینی ہے۔'' روبی کو اس کا رویہ خشک اور قدرے روکھا محسوس ہوا۔ روبی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''بات شاید طویل ہو مگر اسے دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ وقت کا زیاں ہی ہوگا۔ آپ تو جان ہی گئے ہوں گے کہ اس روز آپ کے ہاں میری طبیعت اچانک کیوں بگڑی تھی؟''

''ہاں! وجہ معلوم ہے مجھے۔'' اس نے بے پروا لہجے میں کہا۔

''آ...... آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کی بیٹی مصباح اور احمد کی شادی ہونا قطعی ناممکن ہے۔''

''کیوں......'' اسد نے رکھائی سے اور بہت مختصراً کہا۔

''مصباح اور احمد دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہنے لگے ہیں۔ یہ جانے بغیر کہ وہ دونوں بھائی بہن ہیں۔ چاہے سوتیلے سہی۔'' روبی نے اپنے تئیں جیسے انکشاف کیا اور اس کا ردِعمل دیکھنے کے لیے اسد کے سپاٹ پڑتے چہرے کے تاثرات کا بھی جائزہ لینے کی کوشش کی۔ مگر وہاں تو الجھن کی ایک سلوٹ، تشویش کی ایک رمق تک نہ ابھری۔

اس نے بہ دستور اسی سپاٹ پن سے کہا۔ ''ہاں ٹھیک ہے تو پھر اپنے بیٹے احمد کو یہ حقیقت بتا دیں۔''

روبی کے ہونٹ سوکھنے لگے۔ بہت ہمت مجتمع کر کے بولی۔ ''مم...... مگر...... احمد کو صرف اتنی ہی حقیقت بتانا کافی نہ ہوگا۔ اسے...... اسے اور بھی بہت کچھ بتانا پڑے گا، جو میں نہیں بتانا چاہتی اسے۔''

''اچھا......!'' اسد نے استہزائیہ انداز میں کہتے ہوئے ایک زہریلی مسکراہٹ اس پر نچھاور کی اور جانے کیوں روبی ایک لمحے کو اندر سے دہل کر رہ گئی۔

''یہ حقیقت...... اور بہت سی حقیقتیں تو آپ کو اپنے بیٹے کو بتانا پڑیں گی ہی۔'' وہ آگے بول رہا تھا۔ روبی کو اس کی آواز اس کا لہجہ، عناد بھرا اور خار کھایا محسوس ہو رہا تھا۔ کہاں تو ہر وقت وہاں اس کے لیے وارفتگی چاہت والفت کے جام چھلکے رہتے تھے مگر اب وہاں زہریلی کاٹ رچی ہوئی تھی۔ روبی کو یہ کہنے میں آج تک کوئی عار محسوس نہیں ہوا تھا کہ شعیب کے مقابلے میں اسد اس سے زیادہ محبت کرتا تھا، مگر پتا نہیں کیوں روبی نے شعیب کے سوا کسی کو لائقِ مائل، الفت سمجھا ہی نہ تھا۔ اپنی ساری کج رویوں اور کدورتوں کے باوجود...... شعیب کی جگہ وہ کسی اور کو نہ دے پائی تھی اور اسد سے محض ایک حد تک وہ متاثر تھی کہ وہ اس سے یکطرفہ اور بے لوث محبت کا دعوے دار تھا تو روبی نے بھی اپنے دل و دماغ میں اس کے لیے ایسا کچھ نہیں محسوس کیا تھا۔

اس نے بڑے رسان سے کہا۔ ''اسد صاحب! آپ میری مجبوری یقیناً سمجھ رہے ہیں۔ میں یہ سب کچھ اپنے ایک جوان بیٹے سے نہیں کہہ سکتی۔ میں اس کی ماں ہوں اور ایک عورت بھی...... اور میں چاہتی بھی نہیں ہوں کہ احمد کو......''

''یہ پتا چلے کہ اس کے ماں باپ ماضی میں اپنے ذاتی مفاد کی خاطر کس قدر شرمناک گل کھلا چکے ہیں۔''

بڑے زہریلے انداز میں اسد نے روبی کی بات کاٹ کر یہ زہریلا جملہ تھی کیا تھا جو پگھلے ہوئے سیسے کی طرح روبی کو اپنی مجروح سماعتوں میں اترتا محسوس ہوا تھا وہ تڑپ کر اور ملتجیانہ لہجے میں بولی۔

''پلیز، اسد صاحب! ایسا تو مت بولیے۔ ہم نے جو کچھ کیا تھا وہ جائز طریقے سے اور شریعت کے مطابق کیا تھا۔ کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔''

''اچھا!'' اسد نے نہایت تلخی سے کہا۔ ''تو پھر بتا کیوں نہیں دیتیں اپنے بیٹے کو یہ حقیقت؟''

روبی کو اسد سے ایسے رویے کی بالکل توقع نہ تھی، وہ ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں بولی۔

''اسد صاحب! ایک بار میں پہلے بھی آپ کے پاس پوری امید سے آئی تھی اور آپ نے مجھے خالی نہیں لوٹایا تھا۔ آج کئی برسوں بعد بھی میں آپ کے پاس اس امید سے آئی ہوں کہ آپ مجھے خالی نہیں لوٹائیں گے۔''

''اس امید کی وجہ جانتی ہیں آپ......؟''

اسد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں پوچھا...... تو روبی نے سر جھکا کے ہولے سے جواب دیا۔ ''ہاں......''

''صرف ہاں نہیں، روبینہ صاحبہ! صرف ایک جملے میں میرا جواب مکمل کریں۔''

''آ...... آپ کو مجھ سے شدید محبت تھی۔'' روبی نے بالآخر اٹکتے اٹکتے کہا تو اس نے اسد کو ایک گہری زخمی پُرآزار اور حسرت زدہ سی سانس لیتے دیکھا۔

''اب آپ کیا چاہتی ہیں مجھ سے؟''

''صرف اتنا۔'' روبی امید بھرے لہجے میں بولی۔

''اسد صاحب! آپ کوئی بھی وجہ بتائے بغیر اس رشتے سے انکار کر دیں۔ آپ گھر کے سربراہ ہیں۔''

''یہ کام تم بھی کر سکتی ہو۔''

''میں ایسا کر سکتی تو آپ کے پاس کیوں آتی؟ میں انکار کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ فقط آپ ہی ایسا کر سکتے ہیں جبکہ میں اپنے بیٹے کی نظروں کے سامنے خود کو مجرم نہیں بنانا چاہتی۔''

''تو میں کیسے اپنی بیٹی مصباح کی نظروں میں مجرم بن جاؤں؟''

''اسد صاحب! آپ جانتے ہیں کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک گناہ ہوگا۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی بیٹی آپ ہی کے بیٹے سے......'' روبی کہتے کہتے رکی۔ شرمندگی کے انتہائی احساس تلے وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر پائی تو کچھ پُرسکون ہو کر بولی۔

''احمد آپ ہی کا بیٹا ہے...... یہ صرف میں جانتی ہوں اور شعیب بھی......'' روبی کا خیال تھا کہ اس کے منہ سے یہ انکشاف سن کر اسد تڑپ اٹھے گا، چونک پڑے گا مگر اس کے سرد و سپاٹ رویے پر جوں تک نہ رینگی تھی۔

کچھ ٹھہر کر وہ آگے بولی۔ ''آپ مرد ہیں۔ آپ کا کہنا اور بات ہوگی بلکہ میں آپ سے التجا کروں گی اسد صاحب کہ آپ اپنی بیٹی مصباح اور فاخرہ کو حقیقت بتائے بغیر اس رشتے سے ہی صاف انکار کر دیں۔ فقط اتنا کہہ دیں آپ کو یہ رشتہ اپنی بیٹی کے لیے پسند ہی نہیں۔'' ملتجیانہ انداز میں یہ بات کہنے کے بعد وہ اسد کے چہرے کی طرف امید بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

''یاد ہے آپ کو روبینہ صاحبہ! آج سے کئی سال پہلے میں نے بھی آپ سے ایک التجا کی تھی۔ بہت ٹوٹ کر منت کی تھی تمہاری اور بڑے عاجزانہ انداز میں تمہارے آگے ہاتھ بھی جوڑے تھے میں نے کہ پلیز روبی! مجھے مت چھوڑو مگر تم نہایت سفاکی کے ساتھ......''

''میں اس سلسلے میں پہلے ہی آپ کو اعتماد میں لے چکی تھی۔ آپ کی وہ ضد بچوں جیسی اور بے معنی تھی۔''

روبی نے فوراً اس کی بات کاٹ کر کہا تو اسد نے فوراً کھڑے ہوتے ہوئے رکھائی سے کہا۔ ''سوری! میری کلاس کا وقت ہو گیا ہے، میں اب چلوں گا۔''

روبی بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور بڑے منت آمیز اور ملتجیانہ لہجے میں بولی۔ ''پلیز...... اسد صاحب! میں آپ کے پاس بڑی امید لے کر آئی تھی۔ ایسا مت ہونے دیں۔ پہلے بھی آپ نے مجھے ایک کڑے امتحان سے نکالا تھا، آج پھر میرے سر پر کڑا امتحان ہے۔''

''میں دوسری بار قربانی کا بکرا نہیں بن سکتا۔ تمہیں خود یہ حقیقت اپنے بیٹے کو بتانا ہوگی۔''

''میں شرم سے مر جاؤں گی۔'' روبی ٹوٹ کر بولی مگر اسد کمرے سے نکل چکا تھا۔

☆☆☆

روبی کو اسد سے اس بے رخی اور سرد مہری کی بالکل توقع نہ تھی۔ وہ پہلے بھی اس امید سے اس کے پاس آئی تھی، جب حلالہ ہونے کے لیے اس نے اسد سے مدد چاہی تھی اور اسے یقین تھا کہ اسد اس سے دیوانہ وار محبت کرتا ہے۔ وہ انکار نہیں کرے گا اور ہوا بھی ایسا ہی تھا مگر اس بار تو اسد نے اس کی التجا کو ٹھکرا دیا تھا۔ روبی ازحد پریشان اور ذہنی طور پر ہیجانی کیفیت میں مبتلا تھی۔ کچھ دن اور گزر رہے۔ اس نے دوبارہ ایک آخری امید کے سہارے اسد سے اس بار سیل فون پر رابطہ کیا جو اس نے احتیاطاً اس روز کوچنگ سینٹر سے حاصل کر لیا تھا۔

''آپ تو مجھ سے محبت کے بڑے دعوے دار تھے اسد صاحب! تو کیا وہ سب محض جھوٹ تھا جسے وقت کی دھول نے مٹا ڈالا؟'' روبی نے اسے ایک حوالے سے جوش دلایا تو دوسری جانب سے اسد کی پھر وہی زہریلی آواز ابھری۔

''اوہ...... تو گویا آپ ایک بار پھر میری یکطرفہ محبت کو اپنی غرض پہ قربان کر کے ''کیش'' کرانا چاہتی ہیں روبینہ صاحبہ!''

''اس میں صرف میری نہیں آپ کی غرض بھی شامل ہے، اسد صاحب!'' روبی بولی۔ ''کیا آپ چاہیں گے کہ آپ کی بیٹی آپ ہی کے بیٹے......'' کہتے کہتے روبی نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو اسد نے بے پروائی سے کہا۔

''میں ایسا کیوں چاہوں گا بھلا...... میں تو مصباح کو یہ حقیقت بتا سکتا ہوں۔''

''اسے مت بتائیے گا، پلیز...... اس راز کو راز میں ہی رہنا چاہیے ورنہ میں ساری عمر اپنے جوان بیٹے سے نظریں نہیں ملا سکوں گی۔''

''اوہ...... تو ثابت ہو گیا نا...... کہ اس میں صرف آپ کی غرض شامل ہے، میری قطعاً نہیں۔''

''اسد! تم مجھ سے واقعی محبت کرتے تھے...... جس کی خاطر تم نے قربانی بھی دی تھی، میرے لیے؟'' روبی نے اچانک پوچھ لیا تو دوسری جانب دم بھر کے لیے پُرسوچ خاموشی طاری رہی پھر اسد نے کوئی جواب دیے بغیر سلسلہ

منقطع کردیا۔ روبی یکدم تشویش آمیز بے چینی کا شکار ہوگئی۔ اس نے دوبارہ اس کا نمبر ری ڈائل کیا مگر دوسری جانب سے اس کا سیل آف تھا۔

روبی کا ذہنی خلجان فزوں تر ہونے لگا۔ ایک طرف اسے اس بھیانک اور کریہہ آمیز راز کے آشکار ہونے کا جاں گسل خوف تھا تو دوسری طرف اسے اپنے بیٹے احمد کی بھی فکر تھی کہ جب اسے حقیقت کا علم ہوگا جس لڑکی کو وہ جی جان سے پسند کرتا ہے وہ اس کی کبھی بھی بیوی نہیں بن سکتی تو...... آگے سوچ کر ہی وہ ہلکان ہوجاتی تھی کہ جانتی تھی، محبت کرنے والے...... بے منزل ہوجائیں تو ان کی شکل زندہ لاش کی سی ہوجاتی ہے۔ روبی گویا اب دہری تہری مشکل اور پریشانی کا شکار تھی۔ کبھی کبھی اسے یوں لگتا تھا جیسے اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوجائے گا۔ ایک عذاب مسلسل تھا جس میں وہ مبتلا تھی۔ سوچ سوچ کر وہ ادھ موئی ہوتی جارہی تھی۔

☆☆☆

احمد اور مصباح بری طرح کھٹک گئے تھے، ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ...... بہ ظاہر صاف اور سیدھی نظر آنے والی صورت حال میں یہ اچانک کیسی نامعلوم سی گمبھیرتا کھل گئی تھی کہ ان کے انوٹ ملن کی متوقع سہل دکھائی پڑتی راہیں...... بے وجہ رکاوٹ کا کیوں شکار ہونے لگی تھیں؟ اب تک دونوں کے سامنے یہ بات تو واضح ہو ہی چکی تھی، ان کے رشتے کی پیش رفت کے سلسلے میں دونوں طرف کے خاندانوں کو کوئی اعتراض نہ تھا مگر پھر اچانک...... درمیان میں یہ ڈیڈلاک کیوں پیدا ہوگیا تھا؟ احمد کو زیادہ حیرانی تھی کیونکہ اس سہل پڑتی راہ کا ”اٹکاؤ“ اس کی ممی کی طرف سے پیدا ہورہا تھا۔

مصباح نے اس روز بڑی تشویش آمیز بے چینی سے احمد کے سامنے اس کا اظہار بھی کیا تھا۔

”آخر تمہاری مما...... کیوں لیت و لعل کا شکار ہیں؟ ایسی کیا وجہ ہوگئی ہے احمد......؟“

”میری تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آرہا...... مصباح! مما نے رشتے پر اچانک کیوں خاموشی اختیار کرلی ہے۔“ احمد بھی الجھن آمیز پریشانی سے بولا۔

”وہ تمہاری مما ہیں احمد!“ مصباح نے پُرزور لہجے میں کہا۔ ”کیا تم نے ان سے ٹال مٹول کرنے کی وجہ دریافت نہیں کی ابھی تک......؟“

”وہ یہی کہتی ہیں کہ ان کی ابھی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ فقط ’ہاں‘ ہی تو کرنی ہے، کسی بھی وقت تمہارے ہاں آکر کردیں گی وہ......“

”نہیں احمد! معاملہ کچھ اور ہے۔“ مصباح نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ”مجھے...... مجھے تو لگتا ہے انہیں یہ رشتہ ہی پسند نہیں ہے۔“

”ایسا مت کہو مصباح!“ احمد اس کی بات سن کر یکدم تڑپ کر بولا۔ ”مما کو ہر لحاظ سے تم اور یہ رشتہ پسند ہے اور پھر مما میری پسند کو ہی فوقیت دیتی ہیں مگر پتا نہیں......“

”پھر تمہیں آنٹی سے اس پراسرار خاموشی کی وجہ پوچھنا ہی پڑے گی احمد!“

”ہاں مصباح! بہت ہوچکا۔ اس بار اگر مما نے مجھے ٹالنے کی کوشش تو میں مما سے باز پرس تو ضرور کروں گا۔“ احمد نے اٹل لہجے میں کہا۔

☆☆☆

روبی...... ٹی وی لاؤنج میں موجود تھی۔ ٹی وی پر اس کی پسند کا ایک ٹاک شو چل رہا تھا مگر اس کا دھیان اور دماغ کہیں اور تھا۔ محض دکھاوے کی خاطر یا اپنا دھیان بٹانے کی خاطر وہ ٹی وی کے آگے بیٹھی تھی۔ باوصف ان کے...... پریشان کن سوچوں کی یلغار اس کے دل و دماغ کو جکڑے رہتی تھیں۔ وہ اپنے بیٹے احمد سے بھی اب کترانے لگی تھی مگر کب تک......

”مما! میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ معاً بیٹے کی آواز پر وہ چونکی۔ نگاہیں بہ ظاہر اس کی ایل سی ڈی پر تھیں مگر خود وہ سوچوں کے گرداب میں غوطہ زن تھی۔

”آؤ...... آؤ بیٹا! کیسے ہو؟“ بیٹے کو دیکھ کر روبی نے اپنی کیفیات پر قابو پاتے ہوئے بظاہر مسکرا کر کہا۔

احمد بہ غور ماں کے چہرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ تاہم خاموشی سے ان کے ساتھ والے صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے بولا۔ ”مما! کیا بات ہے، آپ کی جب سے مصباح کے ہاں جاکر اچانک طبیعت بگڑی ہے، میں محسوس کررہا ہوں کہ پھر نہیں سنبھل سکی ہے۔ آپ شاید کسی ٹینشن کا شکار رہنے لگی ہیں؟“

بیٹے کی بات روبی کے لیے بلاشبہ غیر متوقع تھی کیونکہ وہ یہی سمجھی تھی کہ احمد اس سے مصباح کے سلسلے میں بات پکی کرنے کا اصرار دہرائے گا۔ روبی ایک بار پھر جیسے خود کو بیٹے کی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہوا محسوس کرنے لگی۔ بات بناتے ہوئے بولی۔

”نہیں بیٹا! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ کبھی کبھی میرا بلڈ پریشر بہت لو ہوجاتا ہے۔ یہ میری پرانی بیماری ہے۔“

احمد نے بہ دستور ماں کے چہرے پہ نظریں مرکوز رکھتے ہوئے اصل بات کہہ ڈالی۔ ”مما!...... مصباح کے

سلسلے میں بات پکی کرنے کا آخری مرحلہ ہم لوگوں کی طرف سے اٹکا ہوا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا...... ہے کہ...... آپ ان کے ہاں جانے سے یوں اچانک کترانے لگی ہیں۔ کوئی وجہ ہے تو پلیز مما!...... اب پہلے مجھے وہ وجہ بتائیں۔“

بیٹے کی بات پر روبی نے متوحش ہوکر اس کے چہرے کی طرف بہ غور دیکھا تھا۔ بیٹے کے چہرے کے تاثرات بھانپ کر ایک لمحے کو وہ بھی اندر سے دہل سی گئی تھی۔ وہ کب تک وجہ بتائے بغیر محض ایک معمولی سی بیماری کا بہانہ بناکر بیٹے کو ٹالتی رہے گی مگر آج تو بیٹے کے تیور ہی اور نظر آرہے تھے۔ وہ مصباح کے ہاں جانے پر آج بضد ہونے کے بجائے وہاں جانے سے کترانے کا عذر جاننے پر مصر تھا۔

روبی کو اندر سے اپنا وجود کانپتا ہوا محسوس ہورہا تھا کہ وہ بیٹے کی بات کا کیا جواب دے؟ جواب تو تھا مگر وہ شاید قیامت تک یہ جواب بیٹے کو نہیں دے سکتی تھی جبکہ بیٹا آج حتمی ارادہ کیے ہوئے تھا۔

”یا اللہ! میری مدد فرما...... میں کیا کروں......؟“ روبی نے دل ہی دل میں دعا کی تھی کہ اچانک اس کے سیل فون کی بیل گنگنائی۔ اسکرین پر اسد کا نام دیکھ کر وہ بری طرح ٹھٹکی۔ پھر بیٹے کی طرف دیکھا۔ کچھ سوچ کر اس نے سیل فون اپنے کان سے لگا کر ہیلو کہا۔ اس کا دل جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا۔ دوسری جانب سے اسد کی آواز ابھری۔

”روبی! تم شعیب کے ساتھ آجاؤ ہمارے ہاں...... تمہاری خواہش کے مطابق میں اس رشتے سے نہ صرف انکار کردوں گا بلکہ اس راز کو بھی راز میں رکھوں گا تاکہ تمہیں اپنے جوان بیٹے کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔“

اسد کے ان الفاظ نے جیسے روبی کے تن مردہ میں جان ڈال دی۔

”تھینک یو...... سو مچ...... ایکسٹریملی سو تھینکس......“ وہ اتنا ہی کہہ پائی۔ دوسری جانب اسد نے سلسلہ منقطع کردیا۔ روبی کو ایک تسلی ہوگئی تھی۔ اب وہ اپنے بیٹے کو مثبت جواب دینے کی پوزیشن میں تھی۔ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

”ہاں بیٹا! تم کچھ کہہ رہے تھے؟“

”مما! میں پوچھ رہا تھا، آخر آپ مصباح کے گھر جانے سے کیوں کترا رہی ہیں؟“

”ارے نہیں بیٹا! ایسی کوئی بات نہیں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اب میں بالکل بھلی چنگی ہوگئی ہوں۔ جب کہو گے تم...... چلے چلیں گے۔“

ماں کی بات سن کر احمد کا پژمردہ سا چہرہ یکدم کھل اٹھا۔ وہ بچوں جیسی مسرت کے ساتھ اٹھ کر ماں کی طرف بڑھا اور جھک کر اس کی پیشانی پر بوسہ دے دیا۔ ”تھینک یو سو مچ...... مما! آئی لو یو...... میں ابھی یہ خوش خبری، مصباح کو سناتا ہوں۔“

وہ خوشی سے بے قرار ہوا جارہا تھا اور سیل فون جیب سے نکال کر اپنے کمرے کی طرف دوڑا۔ وہ یہ نہ دیکھ سکا تھا کہ اس کی ماں کی آنکھیں اشکبار تھیں۔

روبی کو بیٹے کی اس دیدنی حد تک خوشی دیکھ کر ترس آنے لگا۔ دکھ کا ایک غبار تھا جو روبی کے اندر سے ہوک بن کر اٹھ رہا تھا۔ وہ بیٹے کا خوشی سے کھلتا دمکتا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ مگر خود اندر سے دکھی ہورہی تھی کہ بیٹا نہیں جانتا تھا وہ جس بات پر بے پایاں خوشی محسوس کررہا ہے وہ بہت جلد دھواں بن کر اڑ جانے والی تھی۔ ایک ماں کی حیثیت سے روبی کو بیٹے کی خوشی...... ایک ناختم ہونے والے غم میں بدلنے پر جو دکھ اور قلق ہوگا...... اسے بھلا ایک ماں سے زیادہ اور کون سمجھ پائے گا۔ روبی کو اب ایک فکر سے آزادی ملی تو اس غم نے اسے جکڑ لیا کیونکہ وہ احمد کو بہرحال غم زدہ نہیں دیکھ سکتی تھی، مگر...... وہ بے بس تھی، تقدیر کے آگے۔ اندر گھٹ کر ہی رہ گئی تھی، تاہم احمد کے مسرور ہوکے وہاں سے جانے کے بعد اس نے اسد کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اسے ایک آخری فون کرنا ضروری سمجھا۔

رابطہ ہوتے ہی بولی۔ ”اسد صاحب! میں آپ کی تہ دل سے مشکور ہوں......“

”اس کی ضرورت نہیں۔ آپ کب آرہی ہیں؟“ اس نے کہا۔ لہجہ نارمل تھا۔

”شاید کل ہی آجاؤں......“ وہ بولی۔ ”ایک بات پوچھ سکتی ہوں؟“

”پوچھیں۔“

”جس طرح مجھے اپنے بیٹے احمد سے محبت ہے، بالکل اسی طرح یقیناً آپ کو بھی اپنی بیٹی مصباح سے محبت ہوگی۔ لہٰذا آپ کا رشتے سے انکار جس سے ظاہر ہے، میں بھی سو فیصد متفق ہوں ہمارے بچوں کے لیے کس قدر دکھ کا باعث بنے گا۔ وہ دونوں بے چارے ٹوٹ کر رہ جائیں گے۔ مجھے ڈر ہے...... کہ...... کہ...... کہیں وہ ایک دوسرے کی دائمی جدائی میں کوئی ایسا ویسا قدم نہ اٹھا لیں۔ اس کے بارے میں آپ نے بھی کچھ سوچا ہے؟“

روبی نے اپنی بات ختم کی تو دوسری جانب چند ثانیوں تک خاموشی طاری رہی۔ روبی سوچنے لگی۔ اس نے

شایدایک ایسی فضول بات اسد سے پوچھ لی تھی جس کا جواب اس کے پاس بھی نہ تھا۔ وہ ابھی معذرت ہی کرنے والی تھی کہ دوسری جانب سے اسد کی آواز ابھری......

”روبی! تم اپنے بیٹے اور میری بیٹی مصباح کی خوشی کی بات کرتی ہو، مجھے تو تمہاری خوشی عزیز ہے۔ بے فکر رہو اسد کی محبت یکطرفہ اور نامراد سہی...... مگر وہ تمہیں کبھی بھی غمزدہ نہیں ہونے دے گی، کبھی نہیں......“

اسد نے بڑے عجیب سے لہجے میں یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کردیا اور...... روبی مارے حیرت کے گنگ سی رہ گئی۔

☆☆☆

مقررہ وقت پر روبی...... مصباح کے گھر پہنچی۔ شعیب پہلے آچکا تھا۔ اس بار نہیں آسکا تھا لہٰذا روبی کے ہمراہ احمد ہی چلا آیا تھا۔ روبی ذہنی طور پر شدید دباؤ اور دکھ کا شکار تھی۔ احمد کے چہرے سے پھوٹی پڑتی دیدنی حد تک خوشی ایک ماں کے لیے باعثِ آزار تھی جو نہیں جانتا تھا کہ یہ خوشی عارضی تھی۔

بہرطور فاخرہ اور اسد نے ان کا بڑی خوش دلی سے استقبال کیا۔ روبی کن انکھیوں سے اسد کے چہرے کا بھی جائزہ لے رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ روبی کو جانے کیوں ایک عجیب سا اطمینان محسوس ہو رہا تھا۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد جب رشتے کی بات ہونے لگی تو روبی نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر کہا۔

”ہمیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اب آپ اپنا عندیہ دے دیں تو بات آگے بڑھائی جاسکے۔“ یہ کہہ کر وہ ان دونوں کے چہروں کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے پورا یقین تھا کہ اس کے اور اسد کے درمیان ہونے والے ایک خاموش اور خفیہ معاہدے کے تحت اسد کو اس رشتے سے بغیر کوئی عذر بتائے انکار کر دینا تھا۔ فاخرہ نے پہلے اپنا اثباتی عندیہ دے کر شوہر کی طرف دیکھا۔ روبی کی بے چین نگاہیں اسد کے چہرے پہ جمی ہوئی تھیں۔ وہاں سے وہ انکار کی منتظر تھی۔ اسد نے ہولے سے کھنکھار کر کہا۔

”مجھے بھی اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں۔ احمد اچھا لڑکا ہے اور مجھے پسند ہے بلکہ مجھے یقین ہے، احمد اور مصباح دونوں مستقبل میں ہنسی خوشی زندگی گزاریں گے۔ اس لیے مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہے...... میری طرف سے بھی ہاں سمجھا جائے۔“

اسد کے منہ سے خلافِ توقع اثباتی جواب سن کر...... روبی کا چہرہ فق ہوگیا۔ وہ پھٹی پھٹی اور غیر یقینی نگاہوں سے اسد کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے یکلخت یوں محسوس ہونے لگا، جیسے اسد اس سے کسی پرانی عداوت کا انتقام لے رہا ہو۔ ظاہر ہے، اس کا اس رشتے پر انکار کے بجائے اقرار کا جواب روبی کے لیے غیر متوقع ہی نہیں سوہانِ روح بھی تھا۔ ایسا کہہ کر اسد نے کیا اسے اپنے ہی بیٹے احمد کی نظروں کے سامنے گرانا چاہا تھا کہ وہ چیخ پڑے اور بالآخر اپنے منہ سے کہہ ڈالے کہ...... یہ رشتہ نہیں ہوسکتا...... کیونکہ...... اس کا بیٹا احمد اور مصباح...... دونوں بھائی بہن ہیں اور اس کی وجہ کیا تھی......

روبی کا سارا وجود پسینے سے شرابور ہوگیا، اسے چکر آنے لگے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا اور پھر وہ صوفے پر بیٹھے بیٹھے ڈھے گئی۔

☆☆☆

ہوش آنے پر اس نے خود کو ہنوز وہیں ایک بیڈ پر پایا۔ یہ اسد کا ہی گھر تھا۔ ایک ڈاکٹر اسے دیکھ کر جاچکا تھا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ وہ متوحش سی ہوکر اٹھ بیٹھی۔ ٹھیک اس وقت اسد اندر داخل ہوا۔ وہ اسے دیکھتے ہی غصے سے پھٹ پڑی۔

”دھوکے باز...... تت...... تم نے مجھے بیٹے کے سامنے ذلیل کرنا چاہا تھا...... تو پھر مجھ سے......“

”شش...... آہستہ...... برابر والے کمرے میں سب موجود ہیں۔ تم غلط سمجھ رہی ہو۔“ اسد نے ہولے سے مسکرا کر کہا اور چند قدم اٹھاتا ہوا اس کے بیڈ کے قریب آگیا۔ ”میں نے کہا تھا نا...... روبی کہ مجھے تمہاری خوشیاں عزیز ہیں۔ اب یہ حقیقت بھی جان لو کہ مصباح میری بیٹی نہیں ہے۔ وہ فاخرہ کی بیٹی ہے۔ کیا تم بھول گئیں کہ فاخرہ نے جب تمہارے شوہر شعیب کا کوچنگ سینٹر جوائن کیا تھا تو وہ مطلقہ ہی نہیں بلکہ ایک ننھی منی بیٹی کی ماں بھی تھی۔ یہی مصباح تھی جو اس کے پہلے شوہر سے تھی۔ اگر یقین نہیں آتا تو فاخرہ سے تم اس کی تصدیق کرسکتی ہو، ورنہ تم بھی اتنا جانتی ہو کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں بھلا ایسے رشتے پر اقرار کرکے...... اتنے بڑے شرمناک گناہ کا مرتکب ہوسکتا تھا؟ کبھی بھی نہیں...... ہاں البتہ فاخرہ کی بیٹی احمد سے عمر میں کچھ بڑی ہے۔ اگر چاہو تو انکار کردو...... اس سبب پر نہ تو تمہیں کوئی شرمندگی ہوگی اور نہ مجھے۔“

یہ کہہ کر اسد خاموشی سے پلٹ گیا...... اور...... روبی کے سارے وجود میں طمانیت وخوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔

”مجھے یہ رشتہ منظور ہے...... اپنے بیٹے کی خوشیوں کو ایک بے بنیاد اعتراض کی وجہ سے تباہ نہیں کرنا چاہتی۔“ جاتے ہوئے اسد کو پکارتے ہوئے روبی نے جلدی سے کہا۔